اردو

جلد ۱۵ | جنوری سنہ ۱۹۳۵ ع | حصہ ۵۷

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرست مضامین

اُردو جنوری سنہ ۱۹۳۵ع

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مولانا حالی مرحوم	ایڈیٹر	۱
۲	حالی اور غزل	سر شیخ عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل لندن۔	۱۸
۳	نثر حالی	جناب شیخ چاند صاحب ایم' اے۔ ایل ایل'بی۔	۲۳
۴	سید مرتضیٰ بینش مدراسی	جناب محمد حسین' محوی' صاحب صدیقی' لکھنوی (از مدراس)۔	۳۶
۵	ضرب الامثال اور اُن کا ماخذ۔	جناب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی۔	۸۶
۶	اثر کی تاریخ وفات	جناب محمد اسد خاں صاحب بی اے۔	۱۲۸
۷	جائزۂ زبان اُردو	ایڈیٹر	۱۳۰
۸	بادۂ کہن		۱۵۲
۹	تبصرے	ایڈیٹر و دیگر حضرات	۱۵۷

مولانا حالی مرحوم

(تقریر جو بزم حالی (عثمانیہ کالج اورنگ آباد) کے جلسۂ افتتاح
میں ۵ نومبر سنہ ۱۹۳۴ ع کو ایڈیٹر اردو نے پڑھی تھی)

سنہ ۱۹۰۵ ع کا ذکر ہے - غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی کا زمانہ تھا - حیدر آباد میں عجیب رونق اور چہل پہل تھی - مرحوم اپنے آخری زمانے میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز ہو گئے تھے - رعایا کا ہر طبقہ بلا امتیاز اُن سے محبت اور عقیدت رکھتا تھا - اور یہ ہر دلعزیزی صرف اُن کی رعایا ہی تک محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں لوگ ان کا ذکر بڑی محبت سے کرتے تھے - وہ اسم بامسمیٰ تھے اور محبوب علی سے محبوب خلائق ہو گئے تھے - اُن کی سالگرہیں ہر طبقے اور ہر فرقے میں ایسے خلوص اور جوش عقیدت سے منائی جاتی تھیں کہ الفاظ اس کیفیت کو ادا کرنے سے قاصر ہیں - جوبلی کے زمانے میں یہ جوش عقیدت دلوں سے اُبلا پڑتا تھا جسے دیکھ کر ایک اجنبی اور غیر متعلق شخص پر بھی اثر ہوتا تھا - اُس وقت یہ مسئلہ سمجھ میں آیا کہ راعی کیسا ہونا ہے اور رعیت کیسی ہوتی ہے - مولانا حالی کا یہ شعر جو انہوں نے اعلیٰ حضرت مرحوم کے حق میں فرمایا تھا کس قدر سچا اور واقعی تھا اور سچ پوچھو تو اصول حکومت کا لب لباب اس میں آگیا ہے —

رعیت شاد، مُلک آباد اور آزاد ہر ملت
ادا حق کر دیا شاہ دکن نے حکمرانی کا

مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے اُن کے بلانے کا مقصد یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت مرحوم کے حالات اور ان کے عہد کے فیوض اور برکات پر ایک کتاب لکھوائی جائے اس کی تحریک نواب عماد الملک مرحوم نے کی تھی - جب وہ تشریف لائے تو نظام کلب میں ٹھیرائے گئے - نظام کلب اس وقت اس عمارت میں تھا جہاں آج کل محبوبیہ گرلز اسکول ہے - ان کا قیام عمارت کے مغرب رویہ اوپر کی منزل کے دو کمروں میں تھا -

زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک اُن سے ملنے آتے رہتے تھے - خصوصاً شاعروں کا مرجوعہ بہت زیادہ تھا - شاعر کو اپنے کلام کی داد سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی اور جسے وہ قدر دان سمجھتا ہے اُس کے لیے تو وہاں جان ہو جاتا ہے - یہ حضرات آتے تھے اور اپنا کلام رطب و یابس سب کچھ سناتے اور طالب داد ہوتے تھے - مولانا گھنٹوں چپ چاپ سنا کرتے اور موقع موقع سے داد بھی دیتے رہتے تھے' لیکن باوجود اس کے کبھی تیوری پر بل نہ آتا تھا - یہ کمال کی سزا تھی - ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجوایٹ تھے اور یہاں ایک معزز عہدہ پر فایز تھے مولانا سے ملنے آئے - ٹم ٹم پرسوار تھے اور سیڑھیوں کے قریب اترنا چاہتے تھے لیکن سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جاکر کھڑی کی - یہ دیکھنا تھا کہ ٹم ٹم نشین صاحب آپے سے باہر ہوگئے اور سات آٹھ ہنٹر اس غریب سائیس کے رسید کردیے - مولانا یہ نظارہ برآمدے میں اوپر کھڑے دیکھ رہے تھے - اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے - مولانا سے ملے' مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر باتیں کیں اور رخصت ہوگئے - میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا - وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ "ہائے ظالم نے کیا

کہا"۔ اس روز وہ کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد ٹہلنے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو درد و کرب مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

اس ایک واقعہ میں مولانا کی سیرت اور شاعری کا پورا نچوڑ موجود ہے۔ اور اس ایک واقعہ سے ان کے اخلاق اور کلام کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام انسانیت ہے۔ مولانا نے جو انسانیت کی تعریف اپنی ایک نظم میں کی ہے وہ پوری پوری اُن پر صادق آتی ہے —

چیست انسانی تپیدن از تب ہمسایگاں
وز سموم نجد در باغ عدن بریاں شدن
خوار دیدن خویش را از خوارئی ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن
آتش قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت
بر فراز تخت مصر از تاب آں بریاں شدن

حقیقت یہ ہے کہ ہم میں بڑا وہی ہے جو دوسروں کے لیے دکھ سہتا ہے۔

ایک بڑے شخص کا قول ہے کہ ادیب کا کلام اس کے دماغ کا آئینہ ہے۔ اگر اس معیار پر مولانا حالی کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی سیرت اور اُن کی حیات سرتاپا اُن کے کلام میں موجود ہے۔ وہ مجسم ہمدردی اور مجسم درد تھے اور یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کا ہر مصرع درد بھرا تڑپتا ہوا جگر پارہ ہے۔ ہماری زبان میں اور بھی ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں عجیب اثر اور درد ہے لیکن ان کا درد ذاتی، مخصوص اور محدود ہے، حالی کا درد ساری قوم کا

درد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پر درد نغموں نے قوم کے دلوں کو ہلادیا، سوتوں کو جگا دیا اور کاہلوں کو ہشیار کردیا —

اس میں شک نہیں کہ انسان فطرت سے بھی ایک طبیعت لے کر آتا ہے لیکن اس کی جلا اور ترقی گرد و پیش کے حالات اور ماحول پر ہوتی ہے - حالی کی تعلیم اگرچہ پرانے طرز پر معمولی طور سے ہوئی تھی، لیکن انہیں صحبت شروع سے بڑی شستہ اور پاکیزہ ملی تھی۔ شیفتہ سے صاحب ذوق اور غالب سے عالی دماغ شاعر کی صحبت ایک بے بہا نعمت تھی - لیکن یہ ان کی طبیعت کی فطری صلاحیت، سنجیدگی، مطالعہ کا ذوق اور غور و فکر کی عادت تھی جس نے حالی کو حالی بنایا —

لیکن حالی کے بنانے میں ایک اور زبردست ہاتھ کی تحریک بھی شریک ہے جس نے ان کی عنان فکر کو دوسری طرف موڑ دیا - سر سید احمد خاں مرحوم کی تحریک سے ملک میں ایک نئی تحریک کا دور دورہ شروع ہوا جس نے مسلمانوں کی دماغی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی تھی - حالی نے ان خیالات کا گیت گایا - اسلامی حکومتوں کے زوال نے اس کے دل میں عجیب و غریب درد پیدا کردیا تھا اور اس نے اس کھوئے ہوئے عظمت و جلال کو اس سوز و گداز سے بیان کیا ہے کہ اس سے قبل ہماری کسی زبان میں اس کا جواب نہیں ملتا - اس نے اپنے مسدس میں تاریخی زمانۂ گذشتہ ہی کو زندہ نہیں کیا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زندگی کا عبرتناک مرقع بھی نہایت تفصیل سے کھینچا ہے - اگرچہ اس کی شاعری کی بنیاد زوال یافتہ قوم کی گہری بے آواز مایوسی پر ہے جسے پڑھ کر بے اختیار ہمارے آنسو نکل پڑتے ہیں لیکن وہ انہیں ان کی بھیانک تصویر دکھا کر جو بالکل صداقت پر مبنی ہے ہمیشہ کے لیے

مایوس کرنا نہیں چاہتا بلکہ انہیں عبرت اور غیرت دلانا ہے - محنت پسندی کی مدح اور کاہلی کی مذمت کرتا ہے ' شرافت محنت ' غم خواری بنی نوع انسان ' فضیلت علم ' اتحاد عمل کا ترانہ سنا کر ہمت بڑھاتا ہے اور ان کو اُبھارنے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے - غرض وہ اس ڈھئی ہوئی عمارت کو پھر بنانا اور تعمیر کرنا چاہتا ہے —

کارلائل کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی دنیائے خیال کی بنیاد Sartor Resartor پر رکھی اور باقی جو کچھہ کہا اور لکھا وہ اسی کی تفصیل ہے - اس معاملے میں کارلائل اور مولانا حالی میں بہت کچھہ مشابہت پائی جاتی ہے - مسدس لکھتے وقت جو قومی درد ان کے دل میں پیدا ہوا تھا وہ آخر وقت تک قائم رہا - وہی اُن کے خیالات کا اصل سر چشمہ ہے جس سے نئی نئی سوتیں پھوٹتی ہیں ' باقی تمام کلام اسی ایک خیال کی تفسیر ہے - البتہ اسے طرح طرح سے نئے نئے رنگ میں جلوہ گر کیا ہے- اس کتاب میں زبان کی فصاحت و روانی ' تسلسل بیان ' جوش اور قوت ' بیان کا نیا انداز ' واقعات کی تصویر ' اور اس کے ساتھہ صداقت اور خلوص یہ چیزیں ایسی ہیں جو اردو زبان کی کسی کتاب میں ایک جا نہیں پائی جاتیں —

حالی میں ایک اور بات بھی عجیب پائی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی ہر نظم کو ایک خاص رنگ میں اور نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے - مسدس میں مسلمانوں کو اُبھارنے کے لیے ایک خاص ڈھنگ اختیار کیا ہے ' شکوۂ ہند میں انہیں غیرت دلانے کے لیے ایک دوسرا پیرایۂ بیان ہے - اور مناجات بیوہ میں بیواؤں کی حالت زار دکھانے کے لئے ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے — یہ آخری نظم اردو ادب کے جواہرات میں ایک انمول موتی ہے- یہ

بیوہ کی دکھہ بھری کہانی ہے اور وہ بھی اُس کی اپنی زبانی ' اور کس کے آگے ؟ بارگاہ باری تعالیٰ کے سامنے - یہ وہ دکھہ درد ہے جسے ایک دکھیا یا تو اپنے دل سے کہہ سکتا ہے یا اپنے خدا سے ' انسان کے کان اس کے اہل نہیں ہو سکتے - یہاں مولانا نہ مصلح کے رنگ میں نظر آتے ہیں نہ واعظ کے روپ میں ' حالانکہ اصلاح اور نصیحت دونوں کا موقع تھا لیکن انہوں نے اس درد دکھہ کو خود بیوہ کی زبانی ایسے پیرایے میں بیان کیا ہے کہ وعظ و تلقین سے کہیں بڑھ گیا ہے اور یہ اُن کا کمال شاعری ہے - اس نظم کے لئے مولانا نے ایسی زبان اختیار کی ہے جو ہماری شاعری کے لئے بالکل نئی اور انوکھی تھی - یہ ایسی سادہ ' پاک صاف ' مضمون کے مناسب اور دلگداز ہے کہ پتھر کا دل بھی ہو تو پگھل جاے - میر کے بہتر نشتر مشہور ہیں لیکن یہاں ہر شعر تیز نشتر کا حکم رکھتا ہے اور ہر مصرع درد و سوز میں بجھا ہوا ہے —

میں اس نظم کے چند شعر جو اِدھر اُدھر سے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں آپ کو سناتا ہوں - خدا کی حمد میں کہتے ہیں -

ناؤ جہاں کی کھینے والے دکھہ میں تسلی دینے والے
جب اب تب تجھسا نہیں کوئی تجھہ سے ہیں سب تجھسا نہیں کوئی
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا تو پاس اور گھر دور ہے تیرا

دنیا کی بے ثباتی -

ریت کی سی دیوار ہے دنیا اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
بجلی کی سی چمک ہے اس کی پل دو پل کی جھمک ہے اس کی
پانی کا سا دھارا ہے یہ پچھارا جگنو کا سا ہے چمکارا
ساتھہ سہاگ اور سوگ ہے یہاں کا ناؤ کا سا سنجوگ ہے یہاں کا

ہار کبھی اور جیت کبھی ہے　　اس نگری کی ریت یہی ہے

پیاس کا عالم ملاحظہ ہو —

آئیں بہت دنیا میں بہاریں　　عیش کی گھر گھر پڑی پکاریں
پڑے ہیں بہت باغوں میں جھولے　　ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں　　برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی　　وہ جو کلی مرجھائے تھی دل کی
آس ہی کا یہاں نام ہے دنیا　　جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھہ　　جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھہ
رونا اُن بن باسیوں کا ہے　　دیس نکالا جن کو ملا ہے
حکم سے تیرے پر نہیں چارا　　کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
زور ہے کیا پتے کا ہوا پر　　چاہے جدھر لے جاے بہا کر
تنکا ایک اور سات سمندر　　جاے کہاں موجوں سے نکل کر
قسمت ہی میں جب تھی جدائی　　پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی
تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا　　بندے کا یہاں بس نہیں چلتا
مارے اور نہ دے تو رونے　　تھپکے اور نہ دے تو سونے
تو مارے خواہ نوازے　　پڑی ہوں میں تیرے دروازے
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں　　تجھہ سے نہیں تو کس سے کہوں میں
ماں ہی سدا بچے کو مارے　　اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

گھر برکھا اور پیا بدیسی　　آیو برکھا کہیں نہ ایسی

شرط سے پہلے بازی ہاری   بیاہ ہوا اور رہیں کنواری
سیلانی جب باغ میں آئے   پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں   جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ ٹوٹی جب پایا پیتم   جب ہوئی پیت گنوایا پیتم
خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا   دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہنچانی   کاٹنی ہے بھرپور جوانی
شام کے مردے کا ہے یہ رونا   ساری رات نہیں ہے سونا

تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں   نون کو ترسی میں سانبھر میں
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی   سدا برت سے چلی ہوں بھوکی
رہی اکیلی بھری سبھا میں   پیاسی رہی بھری گنگا میں

سارا دکھڑا رونے کے بعد آخر میں خدا سے یہ دعا کرتی ہے--

دل میں لگن بس اپنی لگا دے   سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
نیہر کے رشتے توڑ دے سارے   دل کے پھپھولے پھوڑ دے سارے
جب مجھے تنہا کیا ہے پیدا   تو مجھے بلد ہوا کر نہ کسی کا
وہاں سے اکیلی آئی ہوں جیسی   ویسی ہی یہاں سے جاؤں اکیلی
ساتھ کوئی غم لے کے نہ جاؤں   تیرے سوا کھوؤں جسے پاؤں
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکتا   کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشاں پیاروں کا مٹادوں   پیار کے منہ کو آگ لگادوں
تو ہی ہو دل میں توہی زباں پر   مار کے جاؤں لات جہاں پر
پاؤں تجھے ایک اک کو گنوا کر   خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

اس نظم کو مسلسل پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ایک انسان کیونکر ایک دکھیاری کے جذبات میں ڈوب کر ایسی چیزیں لکھ سکتا ہے اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ کلام انسانی نہیں الہامی ہے - میں نے ایک بار مولانا سے کہا کہ اگر آپ چاہیں کہ پھر ایک صفحہ بھی ایسی نظم کا لکھیں تو شاید آپ نہیں لکھ سکتے - انہوں نے اس کا اعتراف کیا کہ یہ بالکل سچ ہے - یہ ایک ایسی نظم ہے کہ ویسی نہ اس سے پہلے کوئی تھی اور نہ اس کے بعد کوئی ہوگی - یہ ہمیشہ زندہ رہے گی اور اپنے پڑھنے والوں کو تڑپاتی رہے گی —

ایک بار مجھ سے مہاتما گاندھی نے فرمایا کہ میں اردو سیکھنے کے لیے کون سی کتاب پڑھوں ، تو میں نے کہا مناجات بیوہ - انہوں نے پوچھا کیوں ؟ میں نے کہا کہ اس بدنصیب ہندوستان میں اگر کوئی ایک اور مشترکہ زبان کبھی ہوگی تو وہی ہوگی جو مناجات بیوہ کی ہے —

درد مندوں کی ہمدردی اور ضعیفوں کی حمایت مولانا کی سیرت اور کلام دونوں میں پائی جاتی ہے - خصوصاً ہندوستان کی عورتوں کے حق میں جو سب سے بے بس اور ضعیف طبقہ ہے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ہمارے ادب میں اس کی نظیر نہیں ہے - ابتدائی زمانے میں جسے تقریباً ساٹھ ستر سال ہوتے ہیں مولانا نے ایک کتاب مجالس النسا کے نام سے لکھی - یہ ہندوستانی گھرانے کا فرضی قصہ ہے جس کے ذریعے سے لڑکیوں کو حسن معاشرت کی تعلیم دینی مقصود ہے - مناجات بیوہ کا تو میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اور سب سے آخر میں "چپ کی داد" ایک نظم لکھی جس میں ان کی مہر و وفا ، عادت و حیا ، صبر و رضا کا نقشہ کھینچا ہے اور تعلیم کی خوش خبری دی ہے - اردو زبان میں یہ نظم بھی خاص درجہ رکھتی ہے

دوستو! زمانہ بدل چکا ہے - دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے ' بہت سے پرانے اصولوں اور توہمات کے تار پود بکھر چکے ہیں - ہم اگر اپنے ڈھنگ نہیں بدلیں گے تو کبھی نہیں پلپ سکتے ' دیکھو جنگ عظیم کے بعد جب ناخدا ترس یورپین دول نے ترکوں کو پیس کر خاک کردیا تھا ' وہ اسی خاک سے اٹھے اور اپنی جواں مردی سے اپنی کھوئی ہوی آزادی پھر حاصل کی ' اس آزادی کے حاصل کرنے میں عورتوں کا بھی بڑا حصہ تھا - ہندوستان اگر کبھی اپنی جہالت اور غفلت سے بیدار ہوا تو اسی جزو ضعیف کی مدد سے ہوگا - اس وقت حالی کی صدائیں یاد آئیں گی اور ان کی سچی قدر ہوگی —

اس نظم کے عنوان کے انتخاب میں بھی شاعر نے اپنا کمال دکھایا ہے - دیکھنے میں " چپ کی داد ' دونہایت سادہ اور معمولی لفظ ہیں لیکن ان میں ہزاروں خنجر اور ہزاروں نشتیں بھری ہوئی ہیں ہمارا ادب عورتوں کے چرتر اور ان کی عیاری اور مکر و فریب کی داستانوں سے مملو ہے لیکن حالی ان کی مہر و محبت اور وفا کے گن گاتا ہے - دیکھو وہ کس سادگی اور کس شان سے خطاب کرتا ہے —

اے ماؤ بہنو بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگین دلوں کی شادیاں دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا

گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے
مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ستونتیو لے دے کے اب ست تم سے ہے

جو سنگ دل، سفاک پیاسے تھے تمہارے خون کے
ان کی تو تھیں بے رحمیاں مشہور عالم میں مگر
تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ
شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہو برادر یا پسر
الفت تمہاری کر گئی گھر دل میں جس بے دید کے
وہ بدگماں تم سے رہا اے بے نصیبو عمر بھر
گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو، تم علم و دانش سے رہو محروم یہاں
آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی، نہ دنیا کو تمہاری کچھ خبر
جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سربسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا وہاں جواب

تعلیم کی ضرورت پر مولانا نے اپنے کلام میں جگہہ جگہہ اور طرح طرح سے زور دیا ہے اور یہی ضرورت وہ عورتوں کے لئے تسلیم کرتے ہیں جن کی بے علمی ملک اور قوم کے لیے بہت بڑا عذاب ہے اور اس کا الزام

مردوں پر ہے -

حضرات! دریاؤں اور سمندروں کی تھاہ کا مل جانا آسان ہے لیکن انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنا مشکل ہے - مولانا حالی نے انسان کے جذبات کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کی ہے جہاں ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی رسائی نہ تھی اور دلوں نے کھوٹ اور نفس کی چھپی ہوئی چوریاں پکڑ پکڑ کر عجیب عجیب رنگ سے بیان کی ہیں - کہیں ظرافت کے پیرایے ہیں، کہیں اپنے نفس پر یا زاہد پر ڈھال کر کہیں حکیمانہ رنگ میں اور کہیں صاف صاف - ان چوریوں کا پتا لگانا بہت مشکل ہے لیکن ان کو دلاویز پیرائے میں بیان کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے - چند مثالیں سن لیجیے --

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم وفضل میں جس طرح بن آے پیدا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصلیف اور تالیف میں سعی بلیغ اس میں ایک اپنا پسینا اور لہو کردیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہوکر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

اس خیال کو کہ دنیا میں اچھے اور برے کی تمیز کرنے والے بہت کم ہیں اور نالایق بھی لائق لوگوں سے کچھہ کم کامیاب نہیں رہتے، ہیرے اور آبگینے کے مکالمے میں بیان کیا ہے ہیرا جب اُسے اس کے ہیچ وپوچ ہونے پر الزام دیتا ہے تو وہ کہتا ہے --

مجھہ میں اور تجھہ میں مگر کرسکتے ہیں جو امتیاز
ہیں مبصر ایسے اس بازار نا پرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھہ سے اے الماس لیکن اچھے پڑرہتے ہیں کم

یا مثلاً ایک شخص دوسرے سے پوچھتا ہے کہ آپ سید احمد خاں کے مخالف کیوں ہیں' آپ جو اُسے ملحد و کافر' تارک صلوٰۃ وغیرہ کہتے ہیں تو آپ بھی تو کچھہ ایسے پابند شرع اسلام نہیں ہیں' تو اس کے جواب میں پٹھے کی یہ بات کہتا ہے : —

رنج کچھہ اس کا نہیں مجکو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

نکل آنے کی مے کشی کی بھی حلت
اگر مل گیا کر ہمیں یار واعظ

کوئی بات دیکھی نہیں تجھہ میں لیکن
سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجکو خبر ناصح کچھہ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

ہے ادب مسند پہ جو کچھہ ہے رئیس شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

تھا نہ استحقاق تحسین پر سنی تحسین سدا
حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
ملنے نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں
ان سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

کرتے ہیں طاعت تو کچھہ خواہاں نمائش کے نہیں
ہر گناہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا اُن دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم
ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کرسکتے ہیں صبر
درد خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم
گو بھلائی کرکے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہے جی
نہ نہیں اس میں مگر دردِ ریا پاتے ہم

ترک دنیا کے علائق تو کئے سب زاہد
گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی

اس طرح کثرت سے ان کے کلام میں حکیمانہ نکتے نظر آتے ہیں جنھیں بڑے حسن و خوبی سے ادا کیا ہے ۔ مثلاً :—

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
نہیں چھوتے عیب آتی ثروت سے تیرے خدا دے تجھے خواجہ دولت زیادہ

فرماتے ہیں کہ سچ کہاں ہے —

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقل صواب اندیش کی سب تونے جا
ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھسے الگ
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے

بکار مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تاحشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو علم میں بھی یونہیں ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

" عالم آزادگاں ہے ایک جہاں سب سے الگ " یہ پوری غزل کی غزل کی اس عالم کے باب میں ہے - ایک دوسری مسلسل غزل بھی " کاٹے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح " اسی نوع کی ہے -

بعض صاحبوں نے حالی کے کلام پر یہ تنقید کی کہ وہ واعظ و ناصح ہیں شاعر نہیں - یا واعظ و تلقین کی وجہ سے وہ شاعری کے منصب سے گر گئے ہیں - ان لوگوں نے نہ تو حالی کے کلام کو غور سے پڑھا ہے اور نہ اُس زمانے کی ضرورت سمجھے ہیں - ہمیں اُس زمانے میں ایسے ہی شاعر کی ضرورت تھی - وہ شاعری ہی کیا جو ہمیں اعلیٰ خیالات اور اعلیٰ اخلاق کی طرف مائل نہ کرے - واعظ اور فلسفی دونوں اس منصب کو پوری طرح انجام نہیں دے سکتے - ایک مذہبی احکام کے بل پر کام کرتا ہے اور دوسرا شکوک اور بحث میں پڑ جاتا ہے اور خیر و شر کا جھگڑا پیش کر کے پریشانی میں ڈال دیتا ہے - شاعر سیدھا دل تک پہنچتا ہے جو تمام جذبات کا سر چشمہ ہے - اور اس کا لطف بیان اور تخیل ' نکتہ چینی اور شکوک کو دبا دیتا ہے - حالی نہ واعظ ہے نہ فلسفی ' لیکن دونوں کے فرائض وہ شاعرانہ رنگ میں ادا کرتا ہے - شاعری حالی کے لیے صداقت کا جذبہ ہے - اس میں عرب شاعروں کاسا مردانہ پن ہے اور بعض اوقات صداقت کی خاطر وہ فن کے حسن سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے - اٹلی کے نامور نقاد بینی ڈٹو کروچے (Benedittо Croce) نے خوب کہا ہے کہ :—

" شاعری وہ قوت ہے جس کی مدد سے ہم اُن نقابوں کو ہٹاتے ہیں جو حقیقت کو چھپائے ہوئے ہیں تاکہ ہم اُس صداقت

کو دیکھ سکیں جو ظاہر صورت کے پیچھے دبکی پڑی ہے"—

حالی' نے صداقت کے اظہار میں نہایت جرأت سے کام لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس پر اعتراضات اور طعن و تشنیع کی بوچھار ہوئی' مگر آخر اس کی صداقت اور اس کا درد دل اثر کرگیا—

سر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

اگرچہ حالی کو انگریزی زبان یا انگریزی ادب کی تحصیل کا کبھی موقع نہیں ملا تھا مگر مغربی ادب کی روح کو جیسا وہ سمجھے تھے ویسا کوئی انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھا۔ حالی نے اپنے ملک میں مغربی لٹریچر کی سچی ترجمانی کی ہے مگر وہ پکا اور سچا حقیقت نگار (Realist) ہے اور مغربی خیالات کی رو میں اس کے پانو اکھڑنے نہیں پاتے۔ اُس نے اپنے کلام میں مشرق اور مغرب کو سمویا ہے اور اُردو زبان میں ایک نئی شان پیدا کردی ہے—

نظم ہی حالی کی ممنون نہیں' نثر بھی اس کی مرہون منت ہے اس کی نثر میں جو پختگی' متانت اور حقیقت نگاری کی قوت ہے وہ اُردو کے کسی دوسرے ادیب میں نہیں پائی جاتی۔ اردو زبان میں جدید طرز کی سوانح عمری اور ادبی تنقید کی بنیاد حالی کے دم سے پڑی۔ ان کا ادبی ذوق نہایت سلیم اور صحیح تھا۔ حیات سعدی' یادگار غالب اور خصوصاً مقدمۂ شعر و شاعری ان کی ادبی تنقید کی بہت بڑی یادگار کتابیں ہیں۔ حیات جاوید اُردو انشا پردازی کے انتہائے کمال کو ظاہر کرتی ہے۔ واقعات کے بیان میں اور حقیقت کے ذہن نشین کرنے میں حالی کو کمال حاصل تھا—

حالی نے اُردو لٹریچر میں نئی جان ڈالی ہے۔ اس اعلیٰ کیرکٹر کا شخص جس قوم میں بھی ہوتا تو باعث فخر ہوتا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ادب کی روح صداقت اور خلوص ہے۔ محض لفظوں کے داؤ پیچ اور ترکیبوں کے ہیر پھیر سے اثر پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ ادیب یا شاعر کی سیرت ہے جو الفاظ میں معانی کا رنگ بھرتی ہے۔ بیشک بڑے کام کے لیے بڑی سیرت کی ضرورت ہے—



حالی اور غزل

از

(سر شیخ عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل لندن)

[یہ تقریر جناب شیخ صاحب نے پرنسپل صاحب اورنگ آباد کالج کی فرمائش پر لکھکر بھیجی تھی جو بزم حالی کے جلسۂ افتتاح میں پڑھ کر سنائی گئی] —

مجھے اپنے ایک دوست کا قول یاد ہے کہ جب میں نے ان سے کہا - "آپ نے مولانا حالی کا دیوان دیکھا ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا - "نہ دیکھا ہے نہ دیکھنے کا ارادہ ہے" میں نے تعجب سے پوچھا - "یہ کیوں"؟ تو بولے - "میں مولانا حالی کے مسدس کا قایل ہوں - وہ قومی رنگ میں خوب لکھتے ہیں- مگر ان کو غزل گوئی سے کیا واسطہ" - یہ اس زمانے کی بات ہے جب دیوان حالی پہلے پہل شایع ہوا - میں نے اسے نہایت شوق سے پڑھا تھا- حالی کی غزلوں کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادگی نے میرے دل پر ایک خاص اثر کیا تھا - میں نے اپنے دوست کی رائے کو تعجب سے سنا - مگر بحث میں اُلجھنے کی بجاے میں نے اُن سے کہا کہ مجھے کچھ شعر پسند آئے ہیں وہ سناتا ہوں -اور جو شعر یاد رہ گئے تھے انہیں سنائے- میرے وہ دوست منصف مزاج تھے ان اشعار سے متاثر ہوے اور کہنے لگے " یہ شعر

تو واقعی خوب ہیں - آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں" - میں نے کہا "ایسے ہی اور بہت سے ملینگے آپ دیوان حالی دیکھیں تو سہی" - انہوں نے دیوان منگوایا اور اس کے مطالعہ کے بعد حالی کی غزل گوئی کے مداح ہوگئے-

حالی کی غزلیں کچھہ پرانی ہیں کچھہ نئی - یعنی کچھہ اس زمانے کی ہیں جب وہ عاشقانہ غزل لکھنے سے پرہیز نہ کرتے تھے۔ گو اس میں بھی اپنی متانت کو ہاتھہ سے نہ دیتے تھے اور کچھہ اس وقت لکھی گئیں - جب وہ چاہتے تھے کہ غزل کو پند و نصیحت کا ذریعہ بنائیں اور اپنے ملک اور قوم کے خیالات کو بلند کریں - شعر کی نفاست اور شوخی کے دلدادہ خواہ پند آمیز شاعری کو شاعری تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں - مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا - کہ سعدی یہ حالی جیسے استادان فن جب شعر کی خدا داد دلفریبی کو حکمت آموزی کا آلۂ کار بنائیں تو وہ نصیحت کے رنگ میں شاعری کا حق خوب ادا کرتے ہیں - بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو بلند پایہ سخنور شاعری کی معمولی روش کو چھوڑ کر شعر میں حکمت اور فلسفے کو ملا دیتے ہیں - وہ اس مجبوری سے یہ طریق اختیار کرتے ہیں کہ پرانے رنگ میں وہ اپنے جو ہر آسانی سے نہیں دکھا سکتے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ قصداً ایسا رستہ اختیار کرتے ہیں - جس میں وہ گمراہوں کی رہبری کرسکیں - گرے ہوؤں کو اٹھائیں اور گرتے ہوؤں کو سنبھالیں - اور اپنے ہم عصروں اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے ایسی مشعل ہدایت جلائیں جس سے زندگی کی تاریک راہیں روشن اور کڑی منزلیں آسان ہوجائیں - حالی نے اپنی غزلوں سے یہی کام لیا ہے - اور مولانا حالی کی غزلوں کو اگر دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا حصہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے - جب ان پر دہلی کا اثر غالب تھا - بلکہ بعض

تو ان دنوں لکھی گئی تھیں جب مولانا حالی دہلی میں مقیم تھے اور اپنے شفیق استاد مرزا غالب اور ان کے مقتدر معاصرین کے فیض صحبت سے مستفید تھے۔ ان غزلوں میں تغزل کی طرز قدیم کے اچھے اچھے نمونے موجود ہیں۔ دوسرے حصے کو اس دور سے تعلق ہے جس کا آغاز مولانا حالی کے لاہور میں آنے اور ان ادبی مجالس میں شریک ہونے سے ہوتا ہے جن میں مولوی محمد حسین آزاد اپنی طبع رواں کے جوہر دکھا رہے تھے اور جہاں اردو میں انگریزی طرز تحریر کا رنگ سرایت کر رہا تھا۔ اس آغاز کی تکمیل کے لیے ایک اور زبردست اثر علی گڈھ کی تعلیمی تحریک سے پیدا ہوا۔ مولانا حالی کے جو گہرے تعلقات سر سید احمد خاں بانئی مدرسۃ العلوم علی گڈھ سے تھے اور جو دلچسپیاں سرسید کے لگائے ہوئے اس پودے سے ان کو ہمیشہ رہیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری کا رنگ یکسر بدل گیا۔ اور انہوں نے اس پایہ کی قومی نظمیں لکھیں جن کی بدولت مسلمانان ہند میں بیداری پیدا ہوگئی اور وہ ازسرنو ترقی اور عروج کے خواستگار بن گئے۔ قوم کو جگانے اور قوم کے نوجوانوں میں ذوق عمل کی ایک نئی روح پھونکنے کا خیال مولانا کی غزلوں میں بھی برابر جلوہ گر ہے۔ مثال کے طور پر ان کی دو مشہور غزلوں کے چند شعر پیش کرتا ہوں۔ کامل انسان کا جو تخیل ان شعروں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ مولانا فرماتے ہیں —

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلایشوں میں، بلد شوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ

ایک دوسری غزل اسی قسم کی ہے - جس میں ایسی ہی اعلیٰ زندگی کا تخیل اس طرح پیش کیا گیا ہے —

کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہی کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گزرتے اپنے آپ سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

ان دو غزلوں میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہر ایک کا مقطع مولانا کی طرز شاعری پر ایک خاص روشنی ڈالتا ہے- پہلی غزل کے مقطع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے لیے ایک نئی راہ ڈھونڈھ کر نکالی ہے - اور جان بوجھ کر پرانی ڈگر کو چھوڑا ہے - کس قدر سچی بات مقطع میں کہدی ہے —

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

میرے خیال میں گاہکوں کے بے خبر ہونے کی جو شکایت اس شعر میں کی گئی ہے وہ اب تک درست ہے- گو مولانا حالی کے مداح ملک بھر میں بے شمار ہیں اور ان کے کلام کا اکثر حصہ بہت مقبول ہو چکا ہے، لیکن اب بھی بہت لوگ ہیں جنھیں اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہے کہ اس باکمال محب قوم و وطن نے غزل

میں ایک نیا رنگ پیدا کرکے ادب اردو کی کس قدر خدمت کی ھے —

دوسری غزل کا مقطع " سب سے الگ " والے مضمون سے بھی زیادہ پرلطف ھے - اس میں شعر کی اُس خوبی پر زور دیا گیا ھے جسے سادگی کہتے ھیں - مقطع ملاحظہ ھو —

کہتے کیا 'حالی' نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

اس مقطع میں مزے کی بات یہ ھے کہ اس میں ایک لطیف تعلّی ھے مگر انکسار کے ساتھہ - بظاھر تو شاعر یہ کہہ رھا ھے کہ وہ مجبوراً سادہ اشعار لکھتا ھے - کیونکہ اسے رنگین بیانی نہیں آتی - لیکن دکھانا یہ مقصود ھے کہ سادگی اختیار کرنے کے قابل چیز ھے اور کلام حالی کی خاص صفت ھے - چنانچہ اس مشہور قطعہ میں جو حالی نے شعر کو مخاطب کرکے لکھا ھے - اس خیال کی یوں توضیح کی گئی ھے —

صنعت پہ ھو فریفتہ عالم اگر تمام
ھاں سادگی سے آنکھ اپنی نہ باز تو

مولانا حالی نے یہ اصول نہ صرف بہ طور نصیحت پیش کیا بلکہ عمر بھر خود اس اصول پر کار بند رھے لیکن اس کے ساتھہ یہ ان کے کمال فن کا ثبوت ھے کہ اُن کے سادہ سے سادہ شعر بھی اثر سے بھرے ھوئے ھیں - ذیل کے دو شعر ملاحظہ ھوں —

ھوا کچھہ اور ھی عالم میں چلتی جاتی ھے
ھنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ھے
عجب نہیں کہ رھے نیک و بد میں کچھہ نہ تمیز
کہ جو بدی ھے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ھے

ان اشعار کی سلاست کو دیکھیے ' بلاغت کو دیکھیے کہ چار مصرعوں میں کیا کچھہ کہہ دیا ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر کیسا صحیح تبصرہ کیا ہے - اس مختصر سے مضمون میں یہ گنجائش نہیں کہ میں مولانا کے دیوان کے بہت سے قابل انتخاب شعر پیش کروں - شائقین خود اس بحر میں غواصی کریں اور بے بہا موتی نکالیں - مگر ایک اور غزل کے دو شعر لکھے بغیر نہیں رہ سکتا - جو مجھے بہت پسند ہیں - اور جو میں اکثر پڑھا کرتا ہوں پہلے تو مطلع دیکھیے —

پردہ ہو لاکھہ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جمال تمہارے شہید کا

میرے خیال میں واقعۂ شہادت امام حسین (رض) کے بیان کرنے کا اس سے بہتر پیرایہ ذہن میں آنا مشکل ہے - اس شعر میں ایک طرف تو رتبۂ شہادت کو غیر معمولی طور پر بلند دکھایا ہے اور دوسری طرف شیعہ و سنی کے جھگڑے کو کسی خوبی سے ختم کیا ہے - یعنی شمر و یزید کی کیا مجال تھی کہ وہ حضرت امام حسین کو مار ڈالتے - شہادت کی دولت جو حضرت کے حصے میں خدا کی طرف سے آئی تھی - وہ اُن کو ملنی تھی - شمر و یزید کا کینہ ایک بہانہ بنا ' جس کے پردے میں مشیت ایزدی پوری ہوئی-

اِسی غزل میں ایک اور شعر جان غزل ہے اور وہ یہ ہے —

قفل در مراد سب اک بار کُھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

اس زمین میں حالی کے دو مشہور معاصرین یعنی داغ دھلوی اور امیر مینائی لکھنوی نے بھی معرکہ کی غزلیں کہی ہیں اور داد سخنوری دی ہے ' مگر کلید کا قافیہ جس خوبی اور لطافت سے حالی نے باندھا ہے ' اسی کا حصہ ہے - (باقی پھر کبھی)

نثرِ حالی

از

جناب شیخ چاند صاحب ایم ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی ۔

(یہ تقریر بھی بزم حالی کے جلسۂ افتتاح میں پڑھی گئی تھی)

اُردو دنیا کی بہت کم سن زبانوں میں ھے ' اس میں شبہہ نہیں کہ محققین اس کی عمر کا تعین پانسو سال سے کچھہ اُوپر کرتے ھیں ' لیکن اس طویل مدت میں اس کا جو سرمایہ ھے ' وہ تمام تر شعر ھے ' اس میں بھی غزل کا حصہ غالب ھے (دوسری اصناف سخن بھی ھیں لیکن کم ، نثر کا بھی پتا چلتا ھے ' لیکن کیفیت و کمیت کے لحاظ سے اُس پر نثر کی پوری تعریف مشکل سے صادق آتی ھے ' علمی نثر کا باضابطہ آغاز در اصل سنہ ۵۷ کی شورش کے بعد سے ھوتا ھے) اِس سے قبل بعض مقامات میں علمی تحریکوں کی بنا پر علمی نثر کی ابتدا ھو چکی تھی ' لیکن اُن تحریکوں کے دب جانے سے یہ سلسلہ منقطع ھوگیا ' اور پھر نثر کی زمین بنجر ھوگئی ' سنہ ۵۷ کی شورش نے ھمیں بہت سے صدمے پہنچائے ۔ یہ وہ قیامت خیز سانحہ تھا جس نے ھندوستان میں اسلامی سلطنت کے تار و پود بکھیر دیے اور زوال و ادبار کی سچی تصویر ' اور بے بسی و بیکسی کا عبرت ناک مرقع آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ' مایوسی کی وہ کالی گھٹائیں

چھاگئیں کہ حکومت و دولت کے ساتھہ علم و فن ' عزت ، ناموس ' تہذیب و تمدن غرض ہر چیز تاریکی میں آگئی اِس بے بسی و یاس و حسرت کے عالم میں اچھے اچھوں کے دل بیٹھہ گئے - مولانا حالی نے اپنی بہارِ شباب میں اِسلامی حکومت کو خزاں سے ہمکنار ہوتے دیکھا تھا ' اُن کے تخیل پر اس کا ایسا گہرا نقش بیٹھا اور دل پر ایسا زخم آیا کہ وہ مدتاً لعمر اس سے بے تاب رہے ' اُس زمانے میں کوئی مسلمان اِس دل گردے اور دماغ کا نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی ڈوبی ہوئی کشتی کو تباہی و بربادی کی تہ سے نکال لاتا - یہ سب سرسید احمد کا طفیل تھا کہ اُس نے اپنی قوم کو ورطۂ ہلاکت سے نکالنے میں اپنے غیر معمولی تدبر ' ہمت ' ان تھک کوششوں اور پختہ ارادوں کے جوہر دکھائے اور اپنے اثر سے ' اپنے حامیوں اور ہم خیالوں کی ایسی جماعت پیدا کرلی کہ جس نے ہر منزل میں اس کا ساتھہ دیا —

اِس اولوالعزم اور باہمت جماعت میں مولانا حالی بھی تھے ' انھوں نے اپنے پر درد ' بلند پایہ اور انقلاب انگیز کلام سے لوگوں کو تڑپا دیا اور اصلاح و ترقی کا صور اس زور سے پھونکا کہ قوم میں نہ صرف بیداری بلکہ اضطراب پیدا کردیا)- اُن کے کلام اور شاعری پرکافی لکھا جا چکا ہے اور بعض اساتذۂ تنقید نے نہایت سخن گسترانہ مُوشگافیاں کی ہیں ' ہمیں صرف ان کی نثر سے بحث کرنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میدان میں انھوں نے کیا جوہر دکھائے اور (اپنے قلم کی جنبش سے نثر کے دائرے کو کس قدر وسیع کیا-)

ہم نے اِس مضمون کو بخیال سہولت دو حصوں میں منقسم کیا ہے ' پہلے میں ہم نثر حالی کے موضوعات پر نظر ڈالیں گے اور دوسرے میں اُن کے اسلوب و طرز بیان سے بحث کریں گے ' اور آخر میں یہ بتائیں گے کہ ہماری

نثر میں مولانا کا کیا پایہ ہے ' حالی کی تصانیف جہاں تک ہمیں علم ہے حسب ذیل ہیں - " تریاقِ مسموم ' حالی نے یہ کتاب اپنے ایک ہم وطن عیسائی کی کتاب کے جواب میں لکھی تھی ' جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا ' اس کے بعد کتاب " مولود شریف " لکھی ' اس کے نام سے ظاہر ہے کہ محض بخیال ثواب لکھی گئی ' " علم طبقات الارض " کی ایک کتاب کا ترجمہ حالی نے لاہور میں کیا تھا ' اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی ' جسے ایک مصری عالم نے عربی کا لباس پہنایا تھا ' اور حالی نے عربی سے اُردو میں اُسے منتقل کیا تھا - تعلیم نسواں کے سلسلے میں ایک کتاب " مجالسِ النساء " کے نام سے دو حصوں میں قصے کے پیرایے میں لکھی تھی ' حالی کی (یہ ابتدائی کوششیں تھیں اُن کی باضابطہ ادبی و علمی نثر نگاری کا آغاز کتاب " حیات سعدی " کی تحریر سے ہوتا ہے ' اس کے بعد فن تنقید پر ایک کتاب " مقدمۂ شعر و شاعری " کے نام سے لکھی ' اور آخر میں دو سوانح عمریاں " یادگار غالب " اور " حیات جاوید " لکھیں ' اِن مستقل کتابوں کے سوا ' ان کے " ۳۲ " علمی و ادبی مقالے ہیں لکچروں اور تقریروں کی بھی کافی تعداد ہے ' اِس کے سوا بہت سی تقریظیں اور تبصرے ہیں ' نثری کارناموں میں وہ مقدمات بھی شامل ہیں جو خود حالی نے اپنی نظموں وغیرہ پر لکھے ہیں ' اُن کی نثر میں اُن کے خطوط بھی قابل ذکر ہیں یہ دو جلدوں میں " مکتوبات حالی " کے نام سے شایع ہو چکے ہیں -)

یہ مولانا کے نثری کارناموں کی فہرست ہے ' جن کے موضوعات میں (بظاہر بہت کم تنوع معلوم ہوتا ہے) ہماری نظر خاص طور پر تین اہم موضوعات پر پڑتی ہے ' یعنی مذہب ' سوانح نگاری ' اور ادبی تنقید ' یہی اُن کے خاص موضوع نظر آتے ہیں ' لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اُن کی

تصانیف کے موضوعات میں اس قدر تنوع ہے کہ اب تک شاید ہی کسی ادیب یا مصنف کے ہاں ہو'(مستقل تصانیف سے قطع نظر کرکے اگر ہم ان کے مجموعۂ مضامین کو لیں تو ان میں بھی غیر معمولی تنوع نظر آتا ہے) یہ کُل "۳۲" ہیں لیکن ان میں موضوعات کی بہت کافی رنگا رنگی ہے' مذہب اخلاق' تعلیم' ادب' فلسفہ' سیاسیات وغیرہ وغیرہ اُن کے مخصوص موضوعات ہیں' اِن مضامین کے سوا' متنوع موضوعات کی کتاب "حیات جاوید" ہے' یہ کوئی ہزار صفحے کی کتاب ہے اس کے گوناگوں اور رنگارنگ مضامین کے متعلق اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اُس(میں سرسید کی زندگی اور مشاغل کے ہر پہلو پر جامعیت اور تفصیل کے ساتھ تنقیدی بحث کی گئی ہے') سرسید کے واقعات زندگی' شمائل' اوضاع و عادات' اخلاق و کردار اور ان کے معاشرتی' تعلیمی' مذہبی' ادبی' صحافتی اور خطیبانہ اور سیاحانہ مشاغل اور کارگزاریوں کا اس میں تفصیلی ذکر ہے' "حیات جاوید" کی یہ نہایت اِجمالی اور ناتمام فہرست ہے' ورنہ سرسید کے کاموں کے متعلق یہ فقرہ بالکل صادق آتا ہے کہ "یک سر و ہزار سودا" حالی کی تقریریں بھی مختلف موضوعات پر ہیں' اسی طرح ان کے مکتوبات میں بھی کافی بوقلمونی ہے —

اِن تمام موضوعات پر یہاں بحث کرنے کا موقع نہیں' ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ(حالی کے قلم نے موضوعات کے تمام میدان پامال کردیے ہیں اور ہر شعبے میں نئی نئی راہیں کھول دی ہیں اور ہماری نثر کو غیر معمولی طور پر وسیع و فراخ کردیا)' ہم یہاں خاص طور پر ادبی تنقید اور سوانح نگاری کو لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ حالی نے اُن پر کیفیت و کمیت کے اعتبار سے کس پایہ کا ادب چھوڑا اور اس کا درجہ ہماری

ادبیات میں کہا ہے —

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (حالی نے تین سوانح عمریاں لکھیں ' حیات سعدی ' یادگار غالب ' اور حیات جاوید ' حیات سعدی لکھ کر حالی نے اردو زبان میں فن سوانح نگاری کا سنگ بنیاد رکھا ' اس سے قبل اردو میں کوئی سوانح عمری اس نہج پر نہیں لکھی گئی تھی تذکرہ و ترجمہ اور فن رجال کے اعتبار سے بہت سی کتابیں اسلامی ادبیات میں قدیم سے موجود ہیں ' لیکن جو علمی انداز حیات سعدی کے لیے اختیار کیا گیا ہے ' وہ بالکل جدید اور ممتاز ہے یہ کتاب اس قسم کی سوانح عمریوں میں شامل ہے ' جن میں سوانح نگار کو کوئی زیادہ دقت و دشواری پیش نہیں آتی ہے ' اُن مشاہیر کی سوانح عمریاں جن کی عظمت و شخصیت مدت سے زائد ہو کسی خاص محنت کی محتاج نہیں ' صرف مختلف کتابوں وغیرہ سے واقعات جمع کر کے اخذ و استنباط کی جا سکتی ہیں اور اگر سوانح نگار ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہے تو اپنے خاص نقطۂ نظر سے مرتب و مدون کر کے نمایاں حیثیت پیدا کر لیتا ہے ' حیات سعدی بھی اسی نوع کی سوانح عمری ہے ' لیکن اس میں واقعات کی ترتیب اور اخذ نتائج میں جو اُصول پیش نظر رکھے گئے ہیں ' وہ اُردو زبان کے لیے خاص کر اور دیگر اسلامی زبانوں کے لیے بڑی حد تک نئے تھے ' اس لیے یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے ' کہ اس میں تحقیق و تنقید دونوں سے جدید اصولوں پر کام لیا گیا ہے ' اور اسی وجہ سے وہ اردو زبان کی پہلی حقیقی سوانح عمری ہے —)

(' حالی ' کے بعد ان کے معاصرین اور خصوصاً ' شبلی ' نے اس قسم کی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں ' لیکن تقدم و فضیلت حالی ہی کو حاصل ہے - ' حالی ' نے جہاں سوانح عمری کی اردو زبان میں داغ بیل ڈالی

وہاں اپنے ہاتھوں سے اس کو پروان بھی چڑھایا اور اس میں اس قدر وسعت، جامعیت اور استحکام پیدا کیا کہ ان کی تصانیف ہمارے لیے کامل نمونہ بن گئیں)۔

حیات سعدی کے علاوہ باقی دو سوانح عمریاں ایک خاص قسم سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاصرین کی سوانح عمریاں ہیں، جن کے مدون و مرتب کرنے میں خاص محنت و لیاقت درکار ہے، معاصرین کے متعلق موافق و مخالف رائے رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں، ان سب کو اپنے بیان سے قائل کرنا اور ان کو اپنا ہم خیال بنانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، اس کے سوا چونکہ معاصرین کے حالات کہیں ایک جگہ نہیں ملتے ہیں بلکہ منتشر و پراگندہ رہتے ہیں اور قرب زمانی کی وجہ سے بکثرت ہوتے ہیں، اس لیے ان سب کو یکجا جمع کرنا، ان کو خاص تبویب و ترتیب کا جامہ پہنانا اور خاص اصول و ضوابط کے تحت لانا بڑی مہارت اور استادی کا محتاج ہے)—

معاصرین کی سوانح عمریاں اب تک ہماری زبان میں بہت کم لکھی گئی ہیں، یہ تقدم صرف حالی کو حاصل ہے کہ اس نے اس قسم کی دو بلند پایہ سوانح عمریاں لکھی ہیں، (یادگار غالب میں حالی نے غالب کے سوانح حیات جس ترتیب و تبویب کے ساتھ قلم بند کیے ہیں اور واقعات کے انبار سے جو مطالب اور کام کی ضروری باتیں یکجا سلیقے سے جمع کر دی ہیں وہ ان کی قوت استادی اور دماغی و عقلی سلجھیدگی کی دلیل ہے) وہ واقعات کے ہجوم سے گھبراتے نہیں ہیں، بلکہ نہایت استقلال اور خاطر جمعی سے ان گوناگوں اور مختلف و متضاد نوعیتوں حالات و واقعات کو قابو میں لا کر قلم بند کرتے ہیں، یہ دقتیں ہمارے سوانح نگاروں کو بہت کم پیش آئی ہیں،

میں ؛ اس وقت تک حالی کے سوا شبلی بھی سوانح نگار کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں، لیکن چونکہ ان کے ہیرو ایسے اشخاص تھے جن کے حالات و سوانح مختلف کتابوں میں قلم بند تھے اور جن کی عظمت مسلم و نافذ تھی، اس لیے ان کو واقعات کی ترتیب و تبویب میں کوئی دقت پیش آئی اور نہ اپنے ہیرو کی عظمت نافذ کرانے میں کوئی رکاوٹ [وہ تلاش و کوشش سے ایسی چیزیں جمع کر لیتے تھے جو عام مسلمانوں کے جذبات و خیالات سے موافقت کرنے والی تھیں، اسی لیے ان کی تحریریں فوراً مقبول ہوگئیں - لیکن حالی کو جو دقتیں پیش آئی ہیں، ان سے آج تک ہمارا کوئی سوانح نگار دو چار نہیں ہوا (بیچارے خوش صفات، خاموش مزاج اور سنجیدہ دماغ حالی کے حصے میں دو ایسی سوانح عمریاں آئیں جن کے اشخاص ان کے معاصرین تھے اور اپنے زمانے) کی سطح سے بہت بلند - ان سے مری مراد غالب اور سرسید ہیں، جن کے اعمال و افعال اور خیالات و اعتقادات مسلمہ طور پر اپنے زمانے اور (ماحول سے بالکل مختلف اور ممیز تھے) (مرزا غالب کی شخصیت ظاہر اور مشہور ہے کہ عام سطح سے کس قدر بلند تھی ، ان کی موافقت اور مخالفت میں کیا کچھ نہ ہوا ، اسی طرح سرسید کی شخصیت اور بھی زیادہ مختلف و متضاد خیالات و آراء کی مورد تھی)—

(ان دونوں کتابوں میں حیات جاوید ہر اعتبار سے ممتاز اور بلند درجہ رکھتی ہے اس کی وسعت ، ضخامت ، جامعیت اور مضامین کی نوعیت ایسی چیزیں ہیں کہ خود حالی اس کو اپنی دوسری سوانح عمریوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم اور معرکۃ آلاراء سمجھتے تھے) میں حیات جاوید کے دیباچے سے چند سطریں سناتا ہوں، جن سے حیات جاوید کی اہمیت و انفرادی شان کا اندازہ ہو سکے گا اور ان اصولوں کا علم ہو سکے گا

جو مصنف کے پیش نظر تھے —

"ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے، اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں" ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں- اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی، لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، جنھوں نے اس موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے، ان کو سب نے بھلا جانا کیوں کہ ان کو کسی کی بھلائی یا برائی سے کچھ سروکار نہ تھا، وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیوں کہ انہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیکھ سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا، لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے، جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علماء و مفسرین کو للکارا ہے، اِماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے، اور جس کو پالٹیکس کے لحاظ سے کسی نے تائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھراپن ٹھونک

بچا کر دیکھا جائے، وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی
لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لیے مناسب ہے
کہ سب سے پہلے اسی کی لائف سے اس کی پیروی کی جائے اور
نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔" —)

حالی نے جن اُصولوں کا ذکر کیا ہے، ان کو نہایت استقلال اور دیانت کے ساتھ نبھایا۔ اُنھوں نے سر سید کی زندگی کے ہر اہم واقعے اور شعبے کا ذکر کیا، انھوں نے صرف واقعات ہی جمع نہیں کئے بلکہ ان کو کسوٹی پر کس کر دیکھا۔ اس سے ثابت ہے کہ وہ ہر مسئلے اور موضوع پر اپنی قطعی اور ایک رائے رکھتے تھے اور اس کا اظہار نہایت صاف طور پر کرتے تھے، چاہے اس میں انھوں نے سر سید کی طرف داری کی یا مخالفت و نکتہ چینی، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ مختلف و متضاد پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کرنے، ان پر جرح و تنقید کرنے، اور ان سے خاص نتائج اخذ کرنے میں غیر معمولی قوت رکھتے تھے۔ اگر وہ ان موضوعات اور ان کے جزویات سے واقف نہ ہوتے تو کبھی اس قدر مدلل، محققانہ اور ناقدانہ بحثیں نہ کر سکتے۔ ان کے معاصرین اور خصوصاً مولانا شبلی نے ان کے طرز استدلال اور اخذ و استنباط کی قوت کو دیکھ کر کہا ہے کہ حیات جاوید کو میں مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔ 'شبلی' کی اس تنقید سے پہلے تو ہمیں اتفاق نہیں، اگر بالفرض یہ صحیح بھی ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ 'حالی' نے اندھا دھند واقعات کا انبار نہیں لگایا بلکہ خاص اصول و ضوابط کے تحت ان کو مرتب کرکے اپنی ذاتی رائے کی روشنی میں تنقید کی اور نتائج اخذ کئے ہیں، یہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو خود بھی تمام مسائل پر عبور اور

تبصر رکھتا ہو۔ حالی میں یہ جامعیت اور قوت استادی موجود تھی —

سر سید ایک بلند مرتبہ مصلح اور قوم پرست ہیں' ان کی زندگی گزشتہ مشاہیر کے حالات اور ماحول سے ہر طرح مختلف تھی - ہم نے حالی کے ایک اقتباس سے اس کے متعلق پہلے ہی کہہ دیا ہے - اس لحاظ سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ (اس قسم کی سوانح عمری اور ان موضوعات کے بیان اور ادا کرنے کا کوئی نمونہ اسلامی ادبیات میں موجود نہ تھا- یہ ' حالی ' کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے سوانح عمری کو خاص اصول و ضوابط کے تحت علمی طریقے سے مرتب کیا اور ان مسائل کو اس استادی سے سب سے اول قلم بند کیا ہے کہ یہ کتاب اسلامی ادبیات میں پہلی سائنٹفک سوانح عمری کہلائی اور زبان' بیان' انداز اور اصول فن کے اعتبار سے مکمل نمونہ بن گئی - اچھے اچھے ادیب اور انشا پرداز اس سے رہبری و ہدایت حاصل کرنے لگے" چنانچہ مرحوم سید علی بلگرامی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ "جس زمانے میں تمدن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے تو صبح اُٹھ کر اول چند ورق حیات جاوید کے پڑھ لیتے تھے اس کے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے"-)

سوال پیدا ہوتا ہے اور جو اکثر نئے تعلیم یافتہ حضرات کر بیٹھتے ہیں کہ حیات جاوید کو وہ شہرت و مقبولیت کیوں حاصل نہ ہوئی جو اس کے ہیرو اور مصنف دونوں کے شایاں ہے - بات یہ ہے کہ سر سید کو ہم نے قرب زمانی کی وجہ سے نہایت بیدردی سے بھلا دیا ہے اور نہایت ناشکری کے ساتھ اس کے انقلاب انگیز احسانات پر پردہ ڈال دیا ہے - اب رہا مصنف کے کارنامے کی طرف سے تغافل تو اس میں ایک حد تک خود تصنیف کا بھی قصور ہے - یہ اس قدر ضخیم کتاب ہے کہ کسی کو اس کے مطالعے کی ہمت نہیں ہوتی - ایک اور سبب اس کی طرف سے بدگمانی

کا ہے۔ اس کی نسبت یہ مشہور ہوگیا کہ اس میں سر سید کی تصویر کا ایک رخ دکھایا گیا ہے اس سے مدعا یہ ہے کہ حالی نے صرف سر سید کے مناقب و محاسن بیان کئے ہیں اور معائب و نقائص پر پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ گویا 'حالی' کو فنی نقص کا الزام دینا ہے۔ اس الزام کی تاریخ تاریکی میں نہیں بہت آسانی سے معلوم ہوسکتی ہے لیکن شاید آسانی سے نہیں سنی جاسکتی۔ حیات جاوید کی تنقیص میں عموماً تین لفظ کہے جاتے ہیں :— یک رخی تصویر' مدلل مداحی' اور کتاب المناقب - یہ تینوں لفظ مولوی شبلی کے قلم سے نکلے ہیں - مولوی شبلی نے کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں لیکن ان کی یہ رائے دیکھ کر ہمیں ان کی فن دانی پر شبہ ہوتا ہے - یہاں تفصیلات میں پڑنے کا موقع نہیں لیکن ہم صرف ایک سوال کرتے ہیں کہ کیا شبلی کی سوانح عمریاں مناقب و محاسن کے دفتر نہیں ؟ ان کی کس سوانح عمری میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا گیا ہے ؟ شبلی کے ان تنقیدی الفاظ پر ان کے سب سے زبردست اور پر جوش معتقد و مداح مہدی حسن مرحوم نے سب سے پہلے یہ اعتراض کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب دینے سے شبلی کی سوانح عمریاں قاصر ہیں - ہم آئندہ کسی موقع پر مولوی شبلی کی اس تنقید پر روشنی ڈالیں گے —

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ (حالی نے ہماری زبان میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی اور اس کو تکمیل کے اس درجے پر پہنچا دیا کہ آج تک ہم اس سے بصیرت و ہدایت حاصل کرسکتے ہیں) اب ہم (حالی کی تنقید نگاری) سے بحث کریں گے —

ادبی تنقید کے فوائد اور اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ یہی (وہ شعبہ ہے جو دراصل تخلیقی ادب کا باعث ہے) ذہن نے اب تک تخلیق

و ایجاد کے میدان میں اس قدر جولانیاں دکھائی ہیں کہ کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جو پامال نہ ہوچکا ہو۔ جدید مضامین مشکل سے ہاتھ آتے ہیں، بلکہ بعض منکرین کے بقول اب ہاتھ نہیں آتے ہیں اس لیے اگر قدیم موضوعات پر قوت تخلیق کو صرف کیا جائے تو جدت فنا، اور تخلیقی زمین ازکار رفتہ ہوجائے (تنقید ہی وہ قوت ہے جو نئے نئے راستے بتاتی ہے اور نئی نئی جولانگاہوں کا پتا دیتی ہے۔ ہماری زبان میں فن تنقید بالکل مفقود تھا، حالی پہلا ادیب اور انشا پرداز ہے جس نے اس فن کی اُردو زبان میں بنیاد ڈالی اور اس کو تکمیل کے اس درجے پر پہنچایا ہے کہ ہم آج تک اس سے مستفید ہوتے ہیں، اور اپنی ادبی فتوحات میں اس سے رہبری و ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ تنقید کے سلسلے میں ہماری نظر ان کے مشہور مقدمۂ شعر و شاعری پر پڑتی ہے۔ یہ فن شعر پر ایسی بلند پایہ اور حکیمانہ تنقید ہے) کہ اسلامی ادبیات میں نہ تو اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ آج تک کسی کو لکھنے کی ہمت ہوئی۔ اس موضوع پر جو لوگ خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ سب اسی بے مثل تنقید کی خوشہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ اس میں وہ افراط تفریط نہیں جو تہمت مغربی یا مشرقی خیالات کی پیروی سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ اس میں فن شعر پر جو خیالات پیش کیے ہیں وہ ہمارے لیے ہیں تو جدید لیکن ان کو اس طرح اعتدال و توازن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ہماری شاعری کے حق میں ان سے بہتر نہیں ہوسکتے۔ اس میں بہت سی ذیلی اور ضمنی بحثیں آگئی ہیں، لیکن اس کے بنیادی مضامین حسب ذیل ہیں: شعر کی غرض و غایت، اس کی ماہیت، اس کا درجہ اور اس کے لوازم، اصناف سخن کی عروضی و بیانی حالت،

اُن میں اصلاح و ترمیم کی تدابیر وغیرہ وغیرہ - اس کتاب میں اسی اصولی اور نظری روشنی میں اُردو شاعری پر تنقید کی گئی ہے' اور اس کسوتی پر کس کر اس نے کھوٹے اور کھرے پن کو الگ الگ کر کے دکھایا ہے' اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ کس طرح ہر صنف سخن میں اصلاح کر کے اُسے مفید بنایا جاسکتا ہے اور شاعری کے موضوعات و اسالیب اور زبان و الفاظ میں وسعت پیدا کر کے اُسے زیادہ فطری' کارآمد اور دلکش بنایا جاسکتا ہے - یہ ایسی بے مثل تنقید ہے اور عین ایسے وقت لکھی گئی کہ اردو شاعری کی مردہ کھیتی لہلہا اُٹھی - اس سے نہ تو مغربی شاعری کے دلدادہ' جدید خیال تعلیم یافتہ گروہ نے اردو شاعری کو بے سود اور مہمل ولغو دفتر جانا اور نہ قدیم گروہ کے شعراء نے مستغنی از اصلاح - جدید گروہ اس کی طرف مائل ہوا اور قدیم نے اپنی پرانی روش چھوڑی' دونوں کے ملنے سے ایک خوشگوار اعتدال تو پیدا ہوگیا' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہماری شاعری کے لیے موزوں و مناسب وقت نہیں آیا بلکہ 'اکبر' اور 'اقبال' کے بعد ہماری شاعری کی زمین اب تک بنجر ہے (یہ اسی بنیادی اور انقلاب انگیز تنقید کا فیضان ہے کہ ہمارے مذاق میں عظیم الشان تغیر پیدا ہوگیا' اور ہمارے خیالات کی فضا میں غیر معمولی وسعت' اس نے ہماری شاعری کا رخ پھیردیا - اس لحاظ سے یہ تنقید نہ صرف پہلی اور بنیادی ہے بلکہ انقلاب انگیز اور عصر آفرین بھی - یہ اپنے کام اور اثر کے لحاظ سے جس طرح بے مثل اور بیش بہا ہے اسی طرح اپنی زبان اور طرز ادا کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے' اس میں وہ زبان استعمال کی گئی ہے' اور وہ پیرایہ اختیار بلکہ ایجاد کیا گیا ہے کہ جس سے بہتر تنقید کیلئے کوئی دوسرا اسلوب نہیں ہوسکتا - ہماری ادبی تنقید کا یہی پیرایہ اور

زبان ہے کہ جس پر ہم نے اب تک بہت کم اعتنا کیا ہے —)

(مقدمۂ شعر و شاعری بڑی حد تک تنقید کے نظری پہلو سے متعلق ہے) اس پہلو پر انھوں نے اور بھی چند تحریریں لکھی ہیں - میں یہاں ایک تحریر کا ذکر کرتا ہوں جس میں ظرافت نگاری پر حکیمانہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں - اس تحریر سے میری مراد 'حالی' کا وہ مقالہ ہے جو "مزاح" کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں چھپا تھا' اس میں ظرافت نگاری کی غایت' اس کے اظہار کا مناسب وقت اور طریقہ' اس کے ضروری اجزاء' اس کے اعتدال و توازن کا فائدہ' اس میں تجاوز کرنے کے اخلاقی و قومی نقصانات' یہ سب مسائل بیان کیے گئے ہیں' آخر میں یہ بتایا ہے کہ اسلامی ادبیات میں یہ کس طرح داخل ہوتی گئی' سیاسی اور معاشرتی اُمور میں اس کو کیا دخل ہے' اسلامی ادبیات میں بتھد سنین اس کی کیا حالت تھی' اور ہندوستان کے مسلمانوں یعنی اُردو زبان میں اس کا کیا درجہ ہے اور اس کی اصلاح کیوں اور کس طرح ہو سکتی ہے —

یہ ایسے بنیادی امور ہیں' جن پر اردو زبان میں پہلی مرتبہ لکھا گیا ہے' مغربی نقادان فن نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور بڑی سخن گسترانہ بحثیں کی ہیں' لیکن جو کچھ 'حالی' نے آج سے ساٹھ سال قبل لکھا تھا اس میں آج تک وہی تازگی ہے' اور آج بھی ہمیں ان اصلاحی خیالات سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے —

[ادبی تنقید میں حیات سعدی کا وہ حصہ بھی شامل ہے جس میں شیخ سعدی کی شاعری پر تبصرہ لکھا ہے - اس تبصرہ سے حالی کا مقصد سعدی کے شاعرانہ محاسن دکھانا ہے - یہ تبصرہ ہمیں سکھاتا تھا کہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کس طرح کیا جانا چاہیئے اور ان کی شاعرانہ

ڈھانچوں کو کیونکر سمجھنا چاہئے - قدیم اساتذہ کے پیش نظر جو خیالات اور مضامین رہتے تھے اور زبان و بیان کا جو معیار ان کے پیش نظر تھا ان کو معلوم کرنے کے طریقے اس تبصرہ سے معلوم ہوسکتے ہیں- آج جب کہ شاعری کے نظریے بدل گئے ہیں اور اس کا معیار کچھہ سے کچھہ ہو گیا ہے اس لئے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں جدید تنقید کی روشنی میں قدیم شاعری کو نہ جانچا جاے اور اس کی اصل روح کو سمجھے بغیر غلط نتیجے پر نہ پہنچیں- اس تبصرہ کی روشنی میں اگر ہم قدیم اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کریں تو ان کے حقیقی خیالات و مضامین کا سراغ لگ سکتا ہے اور ان کی زبان و بیان کے ڈھنگ معلوم ہوسکتے ہیں' ورنہ اگر جدید معیارِ تنقید پر قدیم شعر کو توڑ موڑ کر جانچا جائیگا تو ناکامی و مایوسی کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلیگا - اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص قیمتی ہیرے کو نظر سے پرکھنے کی بجاے سونے کی کسوٹی پر کس کر دیکھے - یہ کتاب ہمیں تنقید کے اس راز سے واقف کراتی ہے کہ جدید معیار تنقید قدیم شعر کے لئے قطعاً ناموزوں ہے —

(یادگار غالب بھی اسی قسم کی کتاب ہے - اس میں غالب کی اردو و فارسی نظم و نثر پر تبصرہ لکھا ہے - اس میں تنقید نگاری کا جو مقصد حالی کے پیش نظر ہے وہ بھی محاسن نگاری ہی کا ہے - اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ غالب کے پیش نظر کس قسم کے خیالات و مضامین تھے اور ان کے اظہار میں وہ کس طرح نزاکت' ندرت اور دلکشی پیدا کرتا تھا - خیال' زبان اور بیان کا جو ارتقا غالب کی شاعری میں ہے اس کو نہایت استادی سے اس میں دکھایا گیا ہے اور ایسے معیار قایم کردیے ہیں کہ ہر بلند پایہ شاعر کے شاعرانہ دماغ کا مطالعہ ان کی روشنی میں کیا

جا سکتا ہے۔ اور اس کی زبان و بیان کی نزاکتوں اور باریکیوں کو جانچا جا سکتا ہے۔ اس کتاب نے غالب کو روشناس اور مقبول کرانے میں بڑا بنیادی کام کیا ہے۔ غالب کے متعلق جو مخالفانہ خیالات تھے ان کا ازالہ اس کتاب نے بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ لوگ غالب کی شاعری کے محاسن اور خوبیوں کے قایل ہوتے گئے اور آج یہ حال ہے کہ غالب کی سی ہر دلعزیزی کسی اردو شاعر کو نصیب نہیں۔ اس تبصرہ پر تنقید کے بہت سے وار ہوے لیکن اس کی حیثیت و عظمت میں سر مو فرق نہ آیا۔ اس کے بعد غالب پر بہت سی تنقیدیں لکھی گئیں اور جدید تنقید ی جوش و ہیجان میں بہت کچھ افراط و تفریط برتی گئی لیکن چونکہ ان کی بنیاد قیاس اور خیالی اصولوں پر تھی اس لیے وہ برقرار نہ رہ سکیں۔ حالی کے تبصرہ کی بنیاد صداقت پر تھی۔ اس نے اسی روشنی میں غالب کے کلام کا مطالعہ کیا جس میں خود غالب اپنے اشعار لکھتا تھا۔ حالی اس سے واقف تھا کہ جدید تنقید کی روشنی میں غالب کے دماغ کو ڈھونڈھنا نہ صرف بے سود بلکہ مجنونانہ فعل ہے۔)

تنقیدی کارناموں میں وہ دیباچے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں جو حالی نے خود اپنی نظموں وغیرہ پر لکھے ہیں۔ اپنے دیباچے میں وہ اپنی تصنیف کا مقصد بیان کرتے ہیں، ان اصولوں کا اعلان کرتے ہیں جو پیش نظر تھے۔* قابل توجہ چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جن چیزوں پر ان کو اطمینان نہیں ہوتا ہے یا جن کو وہ مزید تحقیق و کوشش کا محتاج سمجھتے ہیں ان کا بھی ذکر

---

* ہم نے نمونے کی عبارتیں اور اقتباسات بخوف طوالت حذف کردیے ہیں۔ آیندہ سطروں میں بھی بعض مقامات پر اقتباسات عمداً درج نہیں کئے گئے۔ جس نے حالی کی تحریریں پڑھی ہیں اس کا ذہن جگہ جگہ خاص خاص مقامات کی طرف منتقل ہوتا رہیگا ——

کردیئے ہیں - ان کے یہ دیباچے بڑی تنقیدی قیمت رکھتے ہیں - ہمارے مشہور مصنفوں میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس صفائی سے اور بے لاگ انداز میں اپنی تصانیف کے اہم مباحث کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا بھی ذکر کرے - ان سے کتابوں کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مباحث پر کس حد تک مزید لکھنے یا غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر میں مزید تحقیقات اور اصلاح و ترقی کے کس قدر وسیع امکانات تھے —

(تنقید کے سلسلے میں ان تقریظوں ' تبصروں اور رایوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً دوسروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں - تقریظ کی جو حالت ہمارے ادب میں تھی وہ بے کہے ظاہر ہے -(حالی کی تقریظیں اور تبصرے تنقید کا حق تو ادا نہیں کرتے ہیں لیکن وہ بے لگام مدح سرائی سے بھی اپنے قلم کو آلودہ نہیں کرتے بلکہ نہایت نرمی ' متانت اور خوشگوار انداز میں مصنف کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں - وہ محض مدح سرائی کو بے سود اور تنقیدی اصولوں کے منافی بلکہ نقصان دہ سمجھتے ہیں) اس کے باوجود وہ اسقام کے مقابلے میں خوبیوں کو زیادہ اہمیت دے کر بیان کرتے ہیں - اس کی وجہ انہوں نے خود اپنے تبصروں میں بتادی ہے کہ ہمیں فی الحال تنقید کا تعمیری پہلو پیش نظر رکھنا چاہئیے اور حتی الامکان تخریبی آلات سے کام نہ لینا چاہئیے اس لئے کہ تنقید کا مدعا تعمیر ہے نہ کہ تخریب —

حالی کی تنقیدی رائیں ان کے مکتوبات میں بھی ملتی ہیں ۔ ان کا عام انداز ان میں وہی ہے جو دوسرے تبصروں کا ہے لیکن یہاں

وہ زیادہ صفائی سے اور دل کھول کر تنقید کرتے ہیں - ان مکتوبات میں بعض معاصرین اور ان کی کتابوں کے متعلق بڑی دلچسپ اور قابل قدر رائیں درج ہیں —

ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ (حالی ہماری تنقید کے بانی اور مجتہد ہیں اور انہوں نے اس فن پر نظری و عملی دونوں قسم کا بیش بہا ادب ہمارے لئے چھوڑا ہے جو ادبی مہمات کے سر کرنے میں ہماری قیادت کر سکتا ہے) —

ہم نے حالی کے موضوعات میں سے صرف سوانح نگاری اور ادبی تنقید سے بحث کی ہے اور ان میں حالی کا جو رتبہ ہے اس کو اپنی بساط کے موافق دکھایا ہے ' ان کی دوسری تحریریں بھی اپنے موضوع اور پیرایۂ بیان کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہیں ' ان سب پر فرداً فرداً تفصیلی بحث کرنے کے لئے وقت درکار ہے ' ہم اپنے مضمون کے آخری حصہ میں ان کی طرز تحریر سے بحث کریں گے —

جس طرح (حالی کا دل پاک اور دماغ سلجھا ہوا ہے) اسی طرح (ان کی تحریریں پاک صاف ' سنجیدہ اور متین ہیں - وہ پیچیدہ سے پیچیدہ اور طویل سے (طویل مسائل کو عام فہم اور پاکیزہ انداز میں صحت و روانی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں ' مضمون کے اعتبار سے پیرایہ اختیار کرتے ہیں اور نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں - وہ واقعات کی تفصیل اور مسائل کی نزاکت سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ ان پر قابو پاکر ضبط تحریر میں لاتے ہیں) جب مصنف خیالات و واقعات کے الجھیڑوں سے پریشان ہو جاتا ہے ' اور ان کو سلجھانے کے لئے قلم کو درماندہ پاتا ہے تو وہ خوبصورت لفظوں ' فقروں اور ترکیبوں کی بازی گری شروع کر دیتا ہے یا علمی لغات و اصطلاحات کے پردے

۱۳۲ / ۳۸ / ۱

میں اپنی الجھن کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اس سے نہ تو مضمون پورے طور پر ادا ہوتا ہے اور نہ کوئی تاثیر رکھتا ہے، پڑھنے والے کا ذہن مضمون سے زیادہ الفاظ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔(حالی کی نثر کا انداز نہایت جچا تلا اور سنجیدہ و متین ہے، وہ خیال کے اعتبار سے زبان و بیان اختیار کرتے ہیں اور موثر و دل نشیں انداز میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرتے ہیں، ان کے خیالات کے سمجھنے میں سامع یا قاری کو کبھی دشواری پیش نہیں آتی، اور وہ بے تکان مصنف کی پرواز خیال کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے، لفظی صناع اپنے قاری کو دھوکا دیتا ہے اور اپنے خیالات کی الجھن کو چھپا کر نمائشی و ظاہری تماشے دکھاتا ہے، لیکن حالی اپنے پڑھنے والے کو وہ جلوے بے نقاب کر کے دکھاتا ہے جس کو خود مصنف کے تخیل کی آنکھ دیکھتی ہے۔ وہ لفاظی اور بے جا تصنع کا کبھی شکار نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کو اپنے خیالات کا تابع کردیتا ہے اور ان کی اس طرح کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ کرتا ہے کہ خیال کے جسم پر ٹھیک اترتے ہیں۔ اس سلاست و سادگی میں بھی انشا و بیان کی خوبیاں زائل ہونے نہیں پاتیں بلکہ زور بیان اور فصاحت زبان کا رنگ زیادہ نمایاں اور جاذب نظر ہوجاتا ہے۔ حالی خیال کو صفائی اور صحت کے ساتھ بیان کرنا انشاپردازی کا ہنر سمجھتا ہے اور نہایت متانت کے ساتھ اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر صحیح خط و خال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ قاری یا سامع کو خوش کرنے یا اس کو اپنی تحریر کے مطالعے کی رغبت دلانے کے لئے کبھی تمسخر اور رکیک باتوں کو داخل نہیں کرتا ہے، اس کی تحریروں میں کوئی سبک اور رکیک لفظ نظر نہیں آتا ہے۔ اس نے نہ صرف لفظی آرائش اور تصنع و التزام کو پس پشت ڈال دیا بلکہ وہ پیرایہ اختیار کیا جس سے بہتر

کوئی دوسرا پیرایہ علمی و ادبی مسائل کے لیے موزوں و مناسب نہیں ہو سکتا) جو لوگ نہایت خوبصورت ' دل چسپ ' اور دلفریب تحریریں لکھتے ہیں ' اگر انہیں کوئی علمی و ادبی موضوع دیا جائے تو ان کی جو گت بنتی ہے وہ ناگفتہ بہ ہے ' ان کی لفظی آرائش علمی خیالات کو ادا نہیں کرسکتی اور وہ صداقت و دیانت کے ساتھ ان کی ترجمانی کرنے میں ناکام رہتے ہیں- زبان کی خوبصورتی کے لئے لازم ہے کہ مبالغے اور شاعرانہ لفظ طرازیوں سے کام لیا جائے ' یہ شاعرانہ تحریروں میں کام دے سکتا ہے ' لیکن علمی و ادبی خیالات کی صحت و باریکی شاعرانہ صناعی کو قبول نہیں کرتی ' اس کا قدم آیا اور علمی مسائل کی نزاکت فنا ہوگئی ' اس لحاظ سے دیکھا جائے تو (حالی کی طرز تحریر ادیبانہ اور انشاپردازانہ ہی نہیں' بلکہ علمی اور خالص تنقیدی بھی ہے -)

جو لوگ حالی کی تحریروں کو روکھی پھیکی کہتے ہیں ' ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ادبی ذوق سے بے بہرہ ہیں اور انہیں کبھی بدقسمتی سے اہم ادبی مسائل پر غور کرنے کا موقع نصیب نہ ہو سکا ' اگر وہ علمی و ادبی مضامین کی مہم قدیم لفاظی سے سر کرنا چاہیں تو ان کو پہلے ہی قدم پر ناکامی کی ٹھوکر کھانی پڑیگی ' چنانچہ ہمارے اکثر لطیف گو انشا پردازوں کو تلخ تجربہ اٹھانا پڑا ' انہوں نے شاعرانہ پیرایہ تو اختیار کیا لیکن مضامین کو مایا میٹ کردیا ' لباس کو سنوارا لیکن جسم کو بد وضع کردیا -(یہ کہنا بھی بڑی بدمذاقی ہے کہ حالی دلچسپ اور شاعرانہ طرز میں نثر لکھنے پر قادر نہ تھے ' جہاں موقع آیا انہوں نے وہ دلچسپ پیرایہ اختیار کیا اور زبان کی فصاحت و لطافت کے وہ جوہر دکھائے کہ اس کی مثال نظر نہیں آتی ' " زبان گویا " کا جو مضمون ہے وہ اپنے بیان و زبان کے اعتبار سے اس قدر مکمل ہے

کہ اس کے مقابلے میں مشکل سے کوئی تحریر جچتی ہے)؛ یہ طرز حالی نے موقع بہ موقع اختیار کیا ہے لیکن اس (کے پیش نظر جو چیز رہتی تھی وہ خیال اور زبان کا توازن ہے، اس نے کبھی لفظ کی خاطر اپنے خیال کو قربان نہیں ہونے دیا)۔

(حالی کی نثر کی ایک اور خصوصیت استدلال ہے) وہ اپنے خیالات کو نہایت مدلل طور پر پیش کرتا ہے، اس کی تحریروں میں مشکل سے کوئی ایسا خیال ملتا ہے جس کی بنیاد استدلال پر نہ ہو، وہ اس استادی سے اپنے خیال کو پیش کرتا ہے اور اس کی تائید میں ایسی قابل قبول چیزیں بیان کرتا ہے کہ ہر شخص اس کے استدلال کو مان لیتا ہے اور اس کا ہمنوا ہو جاتا ہے - (وہ اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے اکثر تمثیلوں سے کام لیتا ہے) اس کی تحریروں میں تمثیلوں کی بہتات ہے، یہ ایک حد تک (علمی تصانیف میں معیوب سمجھا جاتا ہے ' لیکن حالی نے اپنے اصلاحی خیالات کو سمجھانے اور ان کو مقبول و نافذ کرنے میں غیر معمولی استادانہ مثالیہ نگاری سے کام لیا ہے ' اس سے اس کی قوت مشاہدہ اور حکیمانہ تجربے کا ثبوت ملتا ہے ' اس کی تمثیلیں اس قدر دلچسپ اور برمحل ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا خیال کو بے تامل قبول کر لیتا ہے اور تمثیل کے نازک و لطیف استعمال سے حظ اٹھاتا ہے —)

حالی کے انداز بیان کا یہ معنوی پہلو تھا ' اگر اس کے ظاہری پہلو پر غور کیا جائے تو وہ بھی نہایت مکمل نظر آتا ہے - اس کے جملوں کی ساخت پختہ اور بے رخنہ ہوتی ہے ' وہ اس عمدگی اور استادی سے الفاظ کو بٹھاتا ہے کہ کوئی لفظ جگہہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا ' وہ لفظ کو استعمال کرکے اس کی نشست کو مقرر کردیتا ہے اور اس کے معنی و مفہوم کو ہمیشہ

کے لئے متعین۔ اس لحاظ سے اس کی تحریریں محققین لغات کے لئے بیش بہا سرمایہ ھیں - حالی نے ایسے ایسے لفظ استعمال کیے ھیں کہ ھمارے نکتہ سنج شعرا اور ادیب ان سے بچتے تھے اور ان کو عامیانہ سمجھ کر اپنی تحریروں میں لانا کسر شان اور عار جانتے تھے' لیکن حالی نے ان متروک و مردود الفاظ کو دربار فصاحت میں جگہہ دی اور ان کو برمحل بٹھاکر ان کا رتبہ ھمیشہ کے لئے نافذ کردیا ھے' اس لحاظ سے اس نے زبان کو نہ صرف سنوارا بلکہ اس کو وسعت دی' اس کی نہ صرف اصلاح کی بلکہ نئی زبان ایجاد کی وہ بانی بھی ھے اور مصلح و مجتہد بھی

یہ حالی کی نثر نگاری کا ایک بہت سرسری اور نا تمام خاکہ تھا جو طالب علمانہ نہ کہ عقیدتمندانہ مطالعے کے بعد مرتب کیا گیا - حالی کی نثر نگاری پر ناقدانہ تنقید کے لئے فرصت اور لیاقت درکار ھے اور اتفاق سے موجودہ راقم ان دونوں چیزوں سے محروم ھے اور اسی لیے وہ اس طویل سمع خراشی کی ادب سے معافی چاھتا ھے —

مضمون میں صرف دعوی ہی دعوی ہے۔ دلیل نہیں اور دلیل ورنہ غالباً دی ہے جو مضمون نگار نے آخر میں ظاہر کی ہے یعنی عدم لیاقت اور عدم واقفیت۔

سید مرتضیٰ بینش مدراسی

(آج سے تقریباً ایک سو سال قبل کے مدراس کے ادبی ذوق پر ایک نظر)

از

محمد حسین، محوی، صدیقی، لکھنوی (از مدراس)

تمہید | حضرت اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ہی ہندوستانی مغلیہ حکومت کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے منتشر ہوچکا تھا، اس عظیم الشان سلطنت کا چراغ، شمع سحری کی طرح ٹمٹمانے لگا تھا۔ طوائف الملوکی نے ملک کے ہر حصے میں جدا جدا مرکز حکومت قائم کردیے تھے۔ اودھ میں فیض آباد، پھر لکھنؤ بہار میں عظیم آباد پٹنہ، بنگال میں مرشد آباد، یو پی میں رام پور، جنوبی ہند میں اورنگ آباد پھر حیدرآباد، اور دکن کے بالکل کنارے، ساحل سے قریب اِدھر ارکاٹ میں، اُدھر میسور میں خود مختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں۔ حکومت دہلی کی اطاعت کا جوا برائے نام گردنوں پر رہ گیا تھا۔ شہنشاہ دہلی کی سیادت کاغذی رہ گئی تھی —

میسور کی اسلامی حکومت کا تو بہت ہی جلد خاتمہ ہوگیا، اب رہا ارکاٹ، (مدراس) تو یہ بھی اور ہندوستانی ریاستوں کی طرح مشرقی ارباب علم و فضل کا گہوارہ اور ارباب ہنر کا مرجع تھا۔ یہاں بھی ادب

و شعر کے ہنگامے برپا تھے - عربی علوم اور فارسی شاعری کا زور تھا اس لیے کہ یہی تمام ہندوستان کی دفتری اور علمی زبان تھی - کرناٹک کے نواب اپنی فیاضیوں اور قدردانیوں سے شمالی ہند کے علماء اور شعرا کو اپنی راجدھانی کی طرف کھینچ رہے تھے - اور نواب ارکاٹ کا چونکہ خاندانی اور وطنی تعلق مضافات لکھنؤ کے ایک مشہور قصبۂ گوپامئو سے تھا ۔ اس سبب سے اودھ کے بہت لوگ یہاں آے اور یہاں کی قدر دانی اور خاک دامن گیر نے وہ روز دکھایا کہ آخر یہیں کے ہو رہے - مگر یہ عجیب بات ہے کہ اُدھر اردو زبان اور ریختہ کا مذاق غالب تھا اور اِدھر فارسی کا —

اس علمی فضا پیدا کرنے میں ان بزرگوں کا بھی بڑا حصہ ہے جو انگریزی حکومت کی خدمت کے سلسلے میں یہاں آکر مقیم تھے - ریاست کی طرف سے بھی ان کی مناسب طور پر حوصلہ افزائیاں ہوتی تھیں -

ان سب اسباب کا قدرتی طور پر یہ اثر ہوا کہ یہاں بھی بہت سے ارباب فضل و کمال پیدا ہوے' اُبھرے اور ہمیشہ کے لیے اپنی بہت سی ایسی علمی یادگاریں چھوڑ گئے ' جن پر جنوبی ہندوستان فخر و ناز کرسکتا ہے- لیکن بد قسمتی سے اُن کی بد ذوق' شکستہ حال اور بے علم اولاد کے ہاتھوں آج وہ یادگاریں یا تو بالکل تلف ہوگئیں یا نذر گمنامی ہیں اور ایک آدھ کے سوا اُن علمی خاندانوں کا بھی پتہ نہیں —

یوں تو تقریباً سب نواب علم و فن کے قدردان اور اہل کمال کے دلدادہ تھے - مگر سب سے زیادہ زرین دور نواب محمد غوث خان کا نظر آتا ہے جو حکومت برطانیہ کے زیر سایہ برائے نام نواب کرناٹک تھے اور مدراس میں رہتے تھے یہ خود بھی بہترین شاعر تھے - اعظم ان کا تخلص تھا - دو تذکروں ' صبح وطن ' اور گلزار اعظم ' کے مصنف ہیں - صاحب دیوان ہیں-

بہت کم عمری سے شعر کہنے لگے تھے سنہ ۱۲۴۰ ھ میں پیدا ہوئے اور کم عمر ہی میں وارث تخت و تاج ہوگئے تھے —

نواب اعظم مرحوم کے عہد میں شعراء و علماء کا بہت اچھا مجمع ہوگیا تھا بہت سی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں شعراء کے کئی تذکرے لکھے گئے - اُن میں سے بعض کتابیں طبع ہوئیں اور بعض ہنوز اپنے اسی قدیم فرسودہ لباس میں یادگار زمانہ اور زبان حال سے زمانے کی بے مہریوں کی شکایت کر رہی ہیں —

سید مرتضی بینش

انہیں کی محفل علم و ادب کی ایک درخشان شمع سید مرتضی بینش بھی ہیں —

بینش کے اسلاف اور آبائی وطن

بینش کے باپ داداؤں کا قدیم وطن مشہد مقدس ہے - ان کے بزرگوں میں سے بعض نے اپنے مقدر کی رہنمائی سے ہندوستان کی مقدس سرزمین میں قدم رکھا' یہاں اترکر وہ کشور دکن میں آے اور جنوبی ہند کے مشہور شہر ' گلبرگہ ' شریف کو اپنا وطن بنایا- انہیں بزرگوں میں ایک صاحب ' شاہ ابراہیم ' مصطفوی حسینی تھے ' جو حضرت 'گیسو دراز رح ' کے ماموں ہوتے تھے - (یہ وہی گیسودراز ہیں جن کی برکت قدم سے ' گلبرگہ ' آج گلبرگہ شریف ہے اور اسے بقاے دوام حاصل ہے)

' شاہ ابراہیم ' کی اولاد میں سے ' شاہ نوراللہ حسینی رح ' ' نواب سعادت اللہ خاں ناظم ملک کرناتک کے دور حکومت میں یہاں وارد ہوے اور ' ارکاٹ ' میں قیام کیا جو ناظمان کرناٹک کا پایہ تخت اور جس کا عرف اس زمانے میں ' دارالنور محمد پور تھا- انہیں دنوں مقام چیت پیٹھ میں (جو اب مدراس کا ایک محلہ ہے)فرانسیسیوں کی شرکت سے ایک معرکہ ہوا اسی معرکے میں شاہ صاحب مرتبۂ شہادت پر فائز ہوے اور جنت خلد کی راہ لی —

مدراس اور ولادت بہلش

سانحۂ شہادت کے بعد اُن کے فرزند شاہ 'ابراہیم حسینی' سید بہلش' کے حقیقی دادا نواب والا جاہ (محمد علی) جنت آرام گاہ کے عہد میں وہاں سے 'چھنا پٹن' میں چلے آے - اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نواب والا جاہ* بڑے سادات نواز تھے- یہاں 'شاہ ابراہیم' عزت کے ساتھہ زندگی گزارنے لگے - اور یہیں 'بہلش' سنہ ۱۲۲۶ھ میں پیدا ہوے —

بہلش کے والد

کا نام 'میر صادق علی' ہے ' جو شاہ 'متّان حسینی' کے بھتیجے اور اُنہیں کے داماد تھے ' یہ بھی علم و فضل میں ' اپنے زمانے میں مشہور و مسلّم بزرگ تھے - 'میر صادق' نے اِنہیں سے علم و فضل حاصل کیا تھا ' اور سخن وری کی بھی کافی استعداد پیدا کرلی تھی - مگر اپنے زہد اور تقویٰ کی وجہ سے اپنی زبان و قلم کو مجازی محبوبوں کے زلف و رخسار اور خط و خال کے وصف میں آلودہ نہیں کیا- البتہ حمد و نعت' اور اولاد رسول کی منقبت میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے تھے - فارسی کے زبردست عالم تھے' اس مُلک کے اکثر فارسی خواں اُن کے شاگرد اور ان کے خوان علم کے خوشہ چین تھے - تاریخ نکالنے میں بھی انہیں بڑا ملکہ تھا —

تاریخ گوئی کا ایک واقعہ

نواب رضوان مآب نے ایک بار حضرت قادر ولی رح کی زیارت کے لیے 'ناگور' شریف کا عزم کیا ' لوگوں نے اس سفر کی ہزاروں تاریخیں نکالیں مگر 'میر صادق' کی تاریخ بے مثل رہی - اِنہوں نے (یا علی موسیٰ رضا) ایک چاندی کے ٹکڑے پر کندہ کراکے نواب کے بازو پر باندھ دیا - اِس میں تاریخ (سنہ ۱۲۳۸ھ) نکلتی

---

* اِن کی بیوی شیعہ تھیں -

تھی - نواب بہت محظوظ و مسرور ہوئے - تین سو روپیہ عالم گیری صلے میں مرحمت فرمایا —

سنہ ۱۲۵۳ھ میں 'میر صادق' نے وفات پائی - 'بینش' نے اُن کا صرف ایک نعتیہ مطلع اپنے تذکرے میں درج کیا ہے' آپ بھی سن لیجئے :

اے تارک تو نازش تاج پیمبری وے عرش راز پائے تو معراج برتری

تعلیم و تربیت بینش کے ہوش سنبھالتے ہی ان کے والد بزرگوار نے اِن کی تعلیم و تربیت پر اپنی پوری توجہ صرف کی' چنانچہ باپ کے فیض تعلیم سے بارہ سال کی عمر میں ضرورت کے موافق فارسی لکھنے پڑھنے میں مشاق ہوگئے اس کے بعد بینش نے مدراس کے دیگر ارباب علم و فضل کی خدمت میں زانوے شاگردی تہ کر کے کچھہ علوم عربیہ اور دیگر متفرق علوم کی تحصیل سے فراغت حاصل کی - بقول اعظم عربی 'شرح جامی' تک پڑھی' اور فارسی کی سند تکمیل حاصل کی —

اساتذہ ان کے تذکرے کی ورق گردانی سے ان کے بعض اساتذہ کا بھی پتہ چلتا ہے' مثلاً مولانا محمد حسن † ماہلی جونپوری کے متعلق لکھتے ہیں کہ "میں نے ان سے چلد سبق وقائع 'نعمت خان عالی کے پڑھے تھے"- "فقیر کے حال پر بہت زیادہ مہربانی مبذول فرماتے تھے - افسوس کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ ان کے فیض صحبت سے میں کچھہ ہوجاتا"

---

* (تذکرۂ اشارات بینش صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱) -

† مولانا محمد حسن ماہلی اس دور کے بڑے زبردست اور مشاہیر علماء میں تھے - عالم یگانہ و فاضل فرزانہ تھے - علم عربی و فارسی میں منتخب زمانہ تھے - اکثر ارباب کمال نے کسی نہ کسی علم میں ان سے استفادہ کیا ہے - یہ انگریزی حکومت کی طرف سے کلکتے سے مدراس آے - پہلے سرکاری کالج کے پروفیسر ہوے' پھر مفتی صدر عدالت کے اعلیٰ عہدے پر فائز کئے گئے - سنہ ۱۲۵۸ھ میں انتقال فرمایا - زمانے کے اقتضا سے کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے' حسن تخلص تھا —

واقف | اس زمانے میں مولوی میران محی الدین قادری ایک زبردست عالم اور نامور شاعر تھے - اس ملک کے اکثر لوگ اُن سے فیضیاب ہوے ہیں - 'بینش' نے بھی ابتدا میں (بقول خود) دیوان 'مظہر جان جاناں' کا کچھ حصہ اور 'مرزا بیدل' کے چند رقعات ان سے پڑھے - گلزار اعظم* کا بیان ہے کہ "از مولوی 'واقف' درین فن (شعر) "بہرۂ" فراندوخت" لیکن اس باب میں خود 'بینش' خاموش ہیں - اپنے اساتذۂ شعر کا کچھ ذکر نہیں کرتے --

وفا | میرزا عبدالباقی الشریف الرضوی بغداد کے رہنے والے اور گورنمنٹ ایجنٹ مدراس کے میر منشی تھے - ایران کی سیاحت کے بعد حیدرآباد اور پھر سنه ۱۲۲۶ ھ میں مدراس پہنچے ان کی نسبت بینش کا بیان ہے که اهل زبان' فصیح البیان' صاحب کمالات تھے - علوم عربیه اور مختلف علوم و فنون میں بہرۂ وافی رکھتے تھے ملک کرناٹک میں ان کا جیسا باکمال ولایت سے کم آیا ہوگا - ہفت قلم خوشنویس تھے --

مغلیه خاندان والے انہیں وزیرزادۂ ایران مانتے اور ان کے سامنے زانوے ادب ته کرتے تھے - محاورات فارسی میں یه حکم مانے جاتے تھے' بینش نے بھی ان سے بہت کچھ فیض صحبت پایا اور محاورات فارسی معلوم کیے ہیں † --

ذہانت اور ذوق سخن | بینش ابتدا ہی سے ذہین' تیز طبع اور فطین آدمی تھے - چودہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے گلزار اعظم کا بیان ہے "بجودت طبع و رسائی فکر شہرت داشت" ‡ محبوب الزمن - معترف ہے که بینش ذکی الطبع و صحیح الفکر

---

* گلزار اعظم صفحه ۱۱۹ - † (صفحه ۱۹۶ تذکرۂ بینش) - ‡ (صفحه ۱۱۹ گلزار اعظم) -

شاعر تھا شاعری میں بے بدل تھا ' شعرائے معاصرین سے خوب خوب مناظرہ و معارضہ کرتا تھا ؛ صاحب نتائج لکھتا ھے : جوانے است خوش خلق و فہمیدہ و نکتہ فہم و سنجیدہ ' طبع موزوں و فکر رسا دارد " صفحہ ۱۸ نتائج الافکار قدرت اللہ خاں گوپاموی - حکم مشاعرہ یہ تذکرہ بھی نواب اعظم کے حکم سے کشن راج کے مطبع میں باھتمام محمد حسین راقم مصنف کی تصحیح اور محمد غوث کاتب سرکار کی کتابت سے ۲۹ ماہ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۵۹ ھ مطابق ۲۸ ماہ جولائی سنہ ۱۸۴۳ ع کو طبع ھوا ھے - اس کے علاوہ ھمارے پاس ایک اور قلمی نسخہ بھی ھے جو محمد معصوم ساکن قمر نگر عرف کرنول نے لکھا ھے اور کتابت سے ۱۱ شعبان المعظم سنہ ۱۲۷۸ ھ کو فراغت ھوئی ھے —

اپنے بچپن کی ذھانت کا ایک واقعہ راغب کے بیان میں لکھتے ھیں کہ " بندہ ان کی خدمت بارفعت میں کمال رسوخ رکھتا ھے ، اور ان کی نوازش میرے حال پر ھمیشہ مبذول رھی ھے ' مشق سخن کی ابتدا کے زمانے میں جس وقت اس فقیر کے شعر اُن کے ملاحظے سے گزرتے تھے تو اپنی زبان گوھر فشاں سے تحسین و آفرین کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ بچہ کچھہ ھونے والا ھے - " سالے کہ نکوست از بہارش پیدا " بندہ اس حوصلہ افزائی کے نشے سے مست رھتا اور اس فن میں جہد بلیغ کرتا تاآں کہ موصوف کی پیشین گوئی کی اب تصدیق و تکمیل ھوگئی " —

اپنے ذوق سخن کے متعلق لکھتے ھیں کہ شعر گوئی کا جو ملکہ تھا اس نے کم سنی ھی میں اپنا جلوہ دکھایا ' بہت جلد جوھر کُھلنے لگے

؛ جلد اول ...... صفحہ ۳۰۵ مولف مولوی عبدالجبار خاں صوفی ' ملکا پوری ' برادی حیدرآبادی ' مطبوعۂ حیدرآباد سنہ ۱۳۲۹ ھ -

مزاج موزونیت کی طرف مائل ہوا ' اوستاد ازل (خدا) کے باطنی فیضان سے شعر و شاعری کے لئے طبیعت بھی مناسب واقع ہوئی تھی ، بہت تھوڑے عرصے میں اس دور کے سخن وروں کے فیض صحبت اور نامی شعراء کے دواوین کے مسلسل مطالعے سے نظم شعر میں کامل دستگاہ اور پوری مہارت بہم پہنچائی - سب سے پہلے جو شعر نہاں خانۂ دل سے عالم ظہور میں آئے وہ نواب اعظم کی ولادت باسعادت کا حسب ذیل قطعۂ تاریخ ہے :—

شدہ طالع چو نیر اعظم ماحیء ظلمت از جمال آمد
سال مولودش از فلک جستم گفت (خورشید لازوال آمد)

اس مادے سے (۱۲۴۰) نکلتے ہیں - اس وقت بہلش کی عمر چودہ سال کی تھی ' اس سے ان کی فن شعر سے طبعی مناسبت اور ذہانت کا اندازہ ہوسکتا ہے —

حسن اتفاق عجیب اتفاق ہے کہ نواب کی ولادت کو بہلش نے طلوع نیر اعظم سے تعبیر کیا اور آگے چل کر بھی لفظ اعظم نواب کا تخلص ہوا - اس کو اگر کنایتاً پیشین گوئی کہا جاے تو کیا بیجا ہے - اور اس حساب سے کہ نواب اعظم کی ولادت ' اور بہلش کے لخت جگر (شعر) کی پیدایش ایک ہی سن میں ہوی ' ان کی شاعری اور اعظم دونوں ہم عمر ہوے ' یہ بھی بہلش کے لئے کچھہ کم فخر کی بات نہیں —

بہلش نے اپنی مشق سخن کی ترقی کو ایک بڑے لطیف انداز سے بیان کیا ہے جی نہیں مانتا کہ اُسے چھوڑ دیا جاے وہ لکھتے ہیں کہ مربی حقیقی (اصلی تربیت کرنے والے) خدا کی تربیت سے جس قدر نواب

کے وجود با جود کا نہال گلشن کامرانی میں نشو و نما پارہا تھا ' اُسی قدر میری مشق سخن کی کاوش بھی محض قدردانی نواب کی اُمید پر روز بروز ترقی کر رہی تھی - اور اب خدا کے فضل سے (نواب بھی) (اور یہ بھی) عین عالم شباب میں ہے -" چشم بد دور و دیدۂ حاسد کور " * جودت طبع اور رسائی فکر میں شہرت رکھنے کے علاوہ نہایت خوش تقریر اور حاضر جواب بھی تھے - اور اس پر اپنی پوری ہمت صرف کرتے تھے - مشاعرۂ اعظم میں اپنے ہم طرحوں پر اعتراض کرتے تھے - دوسرے ان کے کلام پر اعتراض کرتے تو اُن کے جواب دینے کی پوری کوشش کرتے اگر اعتراض ٹھیک ہوتا تو مان بھی لیتے تھے - (گلزار صفحہ ۱۱۹) جی چاھتا تھا کہ ہم بھی اُن کی ذہانت اور تیزی طبع کے کچھہ نمونے دکھاتے ' لیکن مضمون بہت طویل ہوگیا ہے اس لیے ترک کرتے ہیں -

پیشہ | یوں تو دنیا میں بہت سے پیشے ہیں - مگر ایک خاص پیشہ ایسا بھی ہے جو مشرقی ممالک کے سوا کہیں نہیں ' اور وہ شاعری ہے - ایک زمانے تک یہ پیشہ بہت کامیاب رہا - ہمارے یہاں بہت سے پیشہ ور شاعر گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں ' مگر انگریزی حکومت اور مغربی اثر کی وجہ سے بیچاروں کو کوئی نہیں پوچھتا ' ورنہ اُسی پیشہ نے بہتوں کو شہرت دوام کا خلعت دلوا دیا ' اور ہماری بہت سی حکومتوں کا تختہ بھی الٹ دیا ' بادشاہوں ' امیروں ' رئیسوں کو بیکار کر دیا '

حضرت بیلش نے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بھر شاعری کے سوا کوئی کام نہیں کیا - ان کی شاعری کی شہرت ملک میں کافی ہو چکی تھی لیکن سکون خاطر کے اسباب مفقود تھے آمدنی کا کوئی ذریعہ اور قدر

* صفحہ ۴۲ -

دانی شعر کا کوئی وسیلہ نہ تھا - اپنے بھائی کے مدرسے میں طلبہ کو دیکھ لیا کرتے تھے ، مگر اس سے کیا ہوتا ہے آخر حیدر آباد گئے ' وہاں بھی کچھ کام نہ چلا ' ۳۵ سال اسی طرح گزر گئے لکھتے ہیں " اور یہ فن ایسا ہے کہ جب تک اطمینان حاصل نہ ہو چمکتا نہیں - اس آرزو کے حصول کی ہوس دل میں مضمر تھی ' مگر سخن گوئی کے اسباب ' مقصود کے موافق موجود نہ تھے ' شاہد مدعا سے ہم کنار نہ ہوسکے - ہاں سچ ہے کہ جو دل زمانہ کے پنجۂ شدائد میں گرفتار ہو ' اور جو آنکھ نیرنگیٔ روزگار کے تماشے میں محو ہو رہی ہو ' اسے یہ مہلت کہاں کہ متین مضامین کی تلاش ' اور رنگین الفاظ کی تحریر میں مصروف ہو سکے - اور شعر کو عمدہ طور پر لکھ سکے - شوق کی آگ بجھی ہوئی تھی ' اور تمنا کا پھول کمھلایا ہوا تھا ' آخر نواب اعظم وارث تخت و تاج ہوے - ان کی جوہر شناسی و قدردانی کا شہرہ اور فیض رسانی کا آوازہ ہر طرف پھیلا سنہ ۱۲۹۲ ھ میں جب کہ بینش کی عمر ۳۶ سال کی تھی ' مدراس میں مجلس مشاعرہ قرار پائی ' نواب نے ازراہ بندہ نوازی ان کو حیدر آباد سے بلایا * - اور قدردانی فرما کر درباری شعرا کے زمرے میں شامل کیا " - یہ تو بینش کا بیان ہے - مگر اسی واقعے کو گلزار اعظم یوں بیان کرتا ہے کہ " جس وقت (نواب) اعظم کی محفل مشاعرہ کی آراستگی سے شعر و شاعری کی گرم بازاری ہوئی ' بینش حیدر آباد میں تھے ' اس محفل کا غلغلہ سنتے ہی بیتاب ہو گئے ' اور فوراً یہاں پہنچے - میر مجلس کی اجازت سے سخن سنجوں کی بزم میں داخل ہو کر اضافۂ مشاعرہ سے کامیاب † ہوے " - اس

* صفحہ ۸ اشارات —

† صفحہ ۱۱۹ گلزار اعظم

کا مہابی نے ان کے حوصلۂ سخن مشق سخن ' اور شہرت میں ا و ر چار چاند لگا دیے—

بدیہہ گوئی

شاعرانہ قدرت اور مشاقی ا و ر بدیہہ گوئی کا واقعہ سنیے - ایک بار کا ذکر ہے کہ بھوھن اپنی ایک غزل تازہ فکر کرکے ان کے پاس لائے اور انھیں سنائی - فی البدیہہ انہوں نے بھی اسی وقت اُسی زمین میں اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا - دو شعر آپ بھی سن لیجیے فرماتے ہیں . —

بر ملمّع دلا فریب مخور   سیم تن قلب آهنین دارد

ره بینش زند به چین جبین   چشمۂ مهر موج کین دارد

معشوق کے رخ کو چشمۂ مہر کہہ کر اس کے چین جبیں کو موج کین کہنا کیسی پاکیزہ تشبیہ ہے - مگر پہلا شعر کچھہ نہیں - غرض بھوھن نے دونوں شعر سن کر اپنی عادت کے موافق یہ فقرہ کہا کہ " کاش یہ شعر میرے ہوتے * " —

ایک روز بندگان عالی کے مشاعرے میں ایک طرح ہوئی' اور یہ طے پایا کہ اسی وقت شعرا فکر کریں ' سب قلم دوات لے کر بیٹھہ گئے ' ہر شاعر نے اپنی فکر کے موافق غزل کہی - بینش نے بھی ایک پانچ شعر کی غزل ذوبحرین (دو بحروں میں) جو تین قافیوں اور ردیفوں پر مبنی تھی' سب سے جلد فکر کرکے حضور میں پیش کی اپنی قدر دانی اور جوہر شناسی سے نواب نے بہت تعریف کی - اور فرمایا کہ یہ تمہارا ہی کام ہے - اس کے دو شعر یہ ہیں :

سرد شد از روے تو بازار گل   زرد شد از خوی تو رخسار گل

در رهت اے غیرت ابر بهار   گرد شد از بوی تو انبار گل

---

* صفحہ ۳۸ و ۳۹ اشارات -

حقیقت تو یہ ہے کہ بیلش نے کمال ہی کردیا - ایسی چھوٹی بحر اور قافیے اور تین ردیفوں کی قید - کوئی معمولی بات نہیں ہے - شد از، بو، گل ردیفیں ہیں اور زرد، خوی، رخسار، قوافی —

ایک اور واقعہ

ایک رات مفید الدولہ بہادر علیم نے جو ان کے ہونہار شاگرد تھے، بیلش سے فرمایش کی کہ اس زمین میں غزل کہیے-

بید سافانہ　چو رامش　گیرم　گویند م دور کہ کارے دارم

ہر چند بیلش نے عذر و انکار کیا، مگر ایک پیش نہ گئی، اصرار بڑھتا ہی گیا - قلم، دوات کاغذ، سامنے لا کر رکھ دیا گیا، اور علیم خود بھی فکر سخن میں مشغول ہوگئے غرض کہ رطب و یابس جو کچھ زبان پر آیا، لکھ مارا، اس طرح آدھے گھنٹے میں (۹) شعروں کی ایک غزل تیار ہوگئی - ان میں سے دو شعر یہ ہیں :

من کہ چوں دام بخود می پیچم　فکر تسخیر شکارے دارم
بیلش از تنگئی گورم غم نیست　در غمش بسکہ فشارے دارم

تاریخ گوئی

میں بھی انہیں بہت اچھی قدرت حاصل تھی، اور یہ چیز تو گویا انہیں اپنے باپ اور بھائی سے ورثے میں ملی تھی - ۱۲ سال کی عمر میں اپنے قدر دان نواب کی ولادت پر جو قطعۂ تاریخ کہا تھا وہ تو آپ کی نظر سے گزر چکا ہے، دو ایک اور سن لیجئے اپنے ایک شاگرد 'ذکا' کے دیوان ریختہ کا مادۂ تاریخ نکالا ہے " چشم بیلش روشن " (۱۲۹۱ھ)

ایک دوسرے لائق شاگرد 'دید' نے عروض کے دو نقشے تیار کیے - اور اپنے استاد سے اس کی تاریخ طلب کی - استاد نے " مجمع العروض " ۱۲۹۰ھ) مادۂ تاریخ نکالا —

راغب ایک بزرگ تھے، جو بیلش کی ابتدائی مشق کے زمانے میں ان

کی بہت حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے۔ اگرچہ بزرگ تھے مگر بے تکلف دوستوں کا سا معاملہ تھا۔ ان کی محبوبۂ جاں نواز نے ہمیشہ کے لیے اپنے بوڑھے عاشق سے مفارقت کی ٹھان کر جنت کی راہ لی - خود راغب نے مثنوی کی شکل میں اس بیوقت جدائی پر بہت واویلا کی ہے - بینش نے ان کی تخلص کی رعایت سے مرغوب (۱۲۹۵) تاریخ نکالی *—

بینش کے تلامذہ اور احباب خاص | ہم لکھ چکے ہیں کہ بینش کی شاعری کافی شہرت حاصل کر چکی تھی۔ اب وہ اس مرتبے پر پہنچ گئے تھے کہ اس فن شریف کے نئے دلدادہ ان کے فیض سے سیرابی حاصل کرتے، چنانچہ ان کے کئی شاگرد تھے —

امیر | ان میں ایک صاحب سید اسمعیل کے فرزند سید امیرالله تھے - سنہ ۱۲۴۱ ھ میں پیدا ہوئے - کتب متداولہ 'ثاقب' اور 'بینش' سے پڑھیں - مشق سخن بھی کرتے تھے - سخن رس، معنی یاب اور زود فکر نوجوان تھے، باوجود نو مشقی کے ان کا کلام بے مزہ نہیں ہے - کہتے ہیں:

شکست رنگ من از بسکہ امشب جلوہ ہا دارد
فضاے کلبہ ام رنگیں تر از صحن چمن باشد

دستگاہ نالہ ام از ضعف ہرگز کم نہ شد
مشت خاک من مگر از کوچۂ زنجیر بود

---

* یہی سنہ بینش کے تذکرے کی تالیف کا سن ہے، معلوم ہوتا ہے اس تذکرے کی تالیف راغب کے حق میں بہت منحوس ثابت ہوئی - راغب کا خیال ادھر نہیں گیا - ورنہ بڑی مشکل پڑتی - محوی -

دید | محمد عزیزالدین گھٹالہ بھی 'بینش' کے ایک شاگرد تھے۔ اِن کے بزرگ شرفائے دکن میں سے تھے۔ لیکن 'گھٹالہ' 'ارکاٹ' میں پیدا ہوئے اور وہیں رہے۔ ایک تیز طبع، رنگین مزاج، زود فکر نوجوان تھے۔ ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کی درسی کتابیں اس زمانے کے علماء سے پڑھیں۔ علم عروض و قافیہ اور مختلف فنون مثلاً رمل، نجوم، تکسیر میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اور اِن علوم میں چند رسائل بھی تالیف کیے ہیں۔ عروض میں دو خاص قسم کے شجرے تیار کئے تھے۔ جن میں یہ کارستانی دکھائی تھی کہ شعر کی تمام بحریں مع زحافات† کے عمدہ طریقے سے استنباط کی جا سکتی تھیں۔ دید نے چند روز تک اِن سے اصلاح لی ہے۔ کلام تلاش سے خالی نہیں، دو شعر ملاحظہ ہوں:

نتواں داشت زیر داماں مہر		عشق نہفت پردہ داری ما
خوردہ گیرند بہم در خور شیرینی شعر		شہد چوں پرمزہ افتاد مگس بسیار است‡

ذکا | بینش کے یہ سب سے زیادہ لائق شاگرد تھے، جن کا لوہا خود اُستاد کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا، اور اپنی استادی کی سپر شاگرد کے سامنے ڈال دینی پڑی۔ ایسے شاگرد اُستاد کے لئے باعث فخر ہوتے ہیں اور بینش کو بھی ان پر ضرور ناز تھا، جو ان کے بیان کے لفظ لفظ سے ٹپکا پڑتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "اِن کا نام محمد حبیب اللہ نائطی ہے۔ اِن کے اجداد بیجاپور سے آکر کرناٹک میں پہنچے، باپ اور چچا اچھے عہدوں پر سرفراز و ممتاز تھے۔ 'ذکا' 'نیلور' میں سنہ ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے، بعد شعور کے بعد 'مدراس میں وارد ہوئے فارسی کی درسی کتابیں 'بینش' اور ان کے بڑے بھائی ثاقب سے پڑھیں اور مشق

---

* گلزار اعظم کا بیان ہے کہ صرف ایک قصیدہ فکر سخن کی ابتدا میں 'بینش' کو دکھایا ہے۔ صفحہ ۱۹۰۔

† شعر کے ارکان میں عروضی تغیر کو زحاف کہتے ہیں۔ زحافات اس کی جمع ہے۔

‡ (صفحہ ۷۱ و ۷۲)۔

سخن بھی انہیں سے ہے - خدائے تعالیٰ نے ان کی طبیعت کو وہ تیزی اور ذہن کو اس بلا کی جودت بخشی ہے کہ اس سن و سال (کم سنی) میں ان کی نثر و نظم بختہ کار سخن سنجوں کے نزدیک پسندیدہ اور ملتفیان زمانہ کی نگاہوں میں مقبول ہے - نازک اور بلند مضامین کو بڑی چستی کے ساتھہ باندھ دیتے تھے - اور گزشتہ پیشوایان سخن میں سے ہر ایک کی طرز میں لکھہ سکتے ہیں - خاص کر نثر میں مرزا بیدل اور نظم میں میر ناصر علی کی پیروی کرتے ہیں - اور ایسی کہ اس دشوار گزار راہ میں ان کے پائے فکر کو کہیں لغزش نہیں ہوتی - تمام اصناف سخن میں داد سخن وری دیتے ہیں - حقیر (بینش) پاس شاگردی سے نہیں بلکہ ازروے انصاف کہتا ہے کہ میں نے اس زمانے میں ان کا ثانی نہیں دیکھا - اس بندے کی کیا حقیقت ہے - ایک ریختہ دیوان مرتب ہوچکا ہے ' جس میں بہت تلاش کا ثبوت دیا ہے مگر بیچارے تتلاتے ہیں - ان کی تیغ زبان تقریر کے معرکے میں کثرت لکنت کی وجہ سے اندر نیام ہے ' مگر ان کے قلم کا تیز گھوڑا تحریر کے میدان میں نہایت تند خرام - طبیعت کی حد درجہ شوخی کی وجہ سے کبھی کبھی ہجو بھی کہہ لیا کرتے ہیں - ایک بار کا ذکر ہے کہ ذکا نے اپنا ایک قصیدہ اور چند فارسی غزلیں اپنے استاد کی معرفت نواب ممدوح کے حضور میں نیلور سے بھجوائیں - مشاعرے کے دن بینش نے پیش کیں ' حضور نے تعریف و تحسین کی اور تمام موجودہ سخن فہموں نے یک زبان ہوکر داد دی گلزار اعظم کا بیان ہے کہ ایک بار بزم مشاعرۂ اعظم میں بینش کی کوشش سے اپنے کو پہنچایا اور اپنا کلام خود سنایا - غالباً یہی صحیح بھی ہے *

---

* صفحہ ۱۹۷ گلزار اعظم -

بینش نے اپنے اس لائق شاگرد کا کلام نو ۹ مقطعوں میں دیا ہے مگر ہم صرف دو تین شعروں پر کفایت کرتے ہیں۔ کہ ملک اب فارسی مذاق سے کم آشنا ہے —

ملاحظہ ہو:

گردیدہ است بادہ پرستی سرشت ما　　بودہ است خط جام مئے سر نوشت ما

طپش دل خبرم می دہد از مقدم تو　　نامۂ راز ترا بر پر بسمل بستند

خون ما را ز نزاکت نتوانند برداشت　　تہمتے بود کہ بر گردن قاتل بستند

ذہین | ان کا نام علی دوست ہے۔ حکیم شفا دست خاں کے بھتیجے تھے۔ یہ بھی نائطی ہیں۔ سنہ ۱۲۳۵ھ میں بمقام اول کلکتہ پیدا ہوئے۔ ثاقب کی خدمت میں بدرجۂ کمال رسوخ رکھتے ہے بینش کابیان ہے کہ نوجوان زبان آور ہے فارسی نظم و نثر کی جو کچھ کتابیں پڑھیں ہم سے پڑھیں۔ اس کی غیرت مند طبیعت دوسروں سے استفادہ کرنا ننگ سمجھتی ہے۔ دقیق اور مغلق مضامین تک جلد پہنچتی ہے۔ بارہا اپنے مدرسہ والوں میں امتحان کی طور پر اساتذہ کے اشعار کے معنے پوچھے اس کا ذہن سب سے پہلے ان کی تہہ تک پہنچا اسی لیے ان کا تخلص ہم نے ذہین رکھا۔ لگے ہاتھوں ایک شعر بھی سن لیجئے:

مست می گشتی و پیغامے فرستادی مرا　　کرد گل از شاخ مینائی گل شادی مرا

رسا | محمد رحمۃ اللہ نائطی ویلوری بینش کے دوست اور در اصل ان کے بھائی ثاقب کے شاگرد تھے۔ رسا کے اصرار سے کبھی کبھی بینش بھی تصرف کر دیا کرتے تھے۔ مگر ذرا اس کمال اخلاق کو دیکھئے کہ اپنی اصلاح کو کن الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں:

"بعض جا در کلام رسا امتثالاً لامرہ بلند نیز گستاخی نمودہ

ام" * رسا کا نمونۂ کلام یہ ہے:

زدیر و کعبہ از تیغ تغافلہاے او رستم
کہ شد محراب طاعت زخم پنہانی کہ من دارم
بہ پرسش گر بگردم در لباس مہر جاے خود
کنوں ہر بود گوئی سبقت از تقدیر تدبیرم

علیم | نواب محمد علیم اللہ خاں بہادر فیروز جنگ مفیدالدولہ ایک تیز طبع شوخ مزاج بے پروا وضع نوجوان ہیں۔ "یک چند شعر خود را از نظر فقیر می گزرانید" - تھوڑی ہی مدت میں علیم نے شاعری میں نام پیدا کرلیا۔ تاریخ گوئی میں معاصرین سے گوے سبقت لے گئے۔ اکثر بیلش کے سامنے ہی فی البدیہہ تاریخیں نکالیں اور عمدہ نکالیں *۔ افسوس کہ عین عالم شباب میں انتقال کیا ÷ رنگ کلام یہ ہے:-

ترسم کہ شود چاک ز بےتابی شوقم
کیں اطلس چرخ است قباے کہن ما

کیا پاکیزہ شعر کہا ہے - ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے شوق کی بےتابی سے یہ آسمان (اطلسیں) جو ہماری پرانی قبا (کے مانند) ہے چاک چاک نہ ہو جاے —

بہ محفلے کہ لب ساغر است در گفتار ہر یدنی است زبان کسے کہ در پند است

یہ شعر بھی بہت عمدہ کہا ہے - ایک مقطع میں استاد کے ساتھ عقیدت

---

* صفحہ ۱۰۱ و احیاناً بسید مرتضیٰ بیلش هم رسانده - گلزار صفحہ ۲۲۵ —

÷ صفحہ ۱۳۵ — ÷ گلزار اعظم صفحہ ۲۶۳ —

کا یوں اظہار کرتے ہیں:

بیلش رساندہ است بجاے ترا علیم
کز سعی چشم تیر شود برنشانہ بلند

فرحت | محمد صبغۃ اللہ نائطی سنہ ۱۲۲۳ ھ میں پیدا ہوے تھے- فارسی کی مروجہ درسی کتب کے فارغ تھے- پہلے 'واقف' اور 'ولا' کے شاگرد ہوے پھر اپنے والد کے اشارہ و حکم سے 'بیلش' کو اپنا کلام دکھانے لگے* 'جوان سلیم الطبع' فہمیدہ و نزاکت مآب ہیں- اکثر فارسی محاورے اور مصطلحات از بر ہیں- کلام کا رنگ یہ ہے:

گر بود صد پیرہن چوں بوے گل برتن مرا
ذوق عریانی بروں آرد ز پیراہن مرا

لائق | غلام دستگیر غیاث سنہ ۱۲۴۳ ھ میں پیدا ہوے- صاحب 'گلدستہ کرناٹک' کے بھائی ہیں کتب درسیہ عربیہ' فارسی اور طب کی تکمیل کی ہے- ذہین اور تیز مزاج آدمی ہیں- واقف اور راقم کے علاوہ اپنا کلام انہیں بھی دکھاتے تھے† کلام ملاحظہ ہو:

ساقی مرا ز پیر خرد کاروبار نیست
جز دخت رز بخلوت من سازوار نیست

---

* صفحہ ۱۳۹ گلزار کا بیان: بیلش نے اپنے تذکرے میں اپنی طرف اس کی شاگردی کی نسبت کی ہے- 'فرحت' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحت پر مبنی نہیں- بلکہ ہم طرحی کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے اشعار دیکھ لیتے تھے اور اپنے اپنے کلام کے عیوب سے آگاہ ہوجاتے تھے-

† گلزار اعظم اس کی تائید نہیں کرتا-

احباب بینش ان شاگردوں کے علاوہ 'بینش' کے چند خاص احباب بھی تھے۔ جن کو ان سے اور ان کو ان سے خاص اخلاص تھا۔ اس موقع پر ان کا ذکر بھی بیجا نہیں معلوم ہوتا۔ ان میں ایک صاحب حافظ محمد انوار الدین 'انور' فاروقی گوپا موی تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

"یہ فقیر سے بہت محبت رکھتے تھے۔ ان کی حسب طلب میں نے ان کا دیوان خوش خط لکھ کر انہیں دیا"* ۔

بے ہوش یہ نائطی تھے۔ ان کا نام محمد قادر غنی تھا۔ عربی کے عالم و ماہر اور ذہین و روشن طبع آدمی تھے۔ لیکن ذرا سر پھرے بھی تھے۔ دنیا کے سخن وروں میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور نہ اپنے برابر سمجھتے تھے۔ فارسی میں اگرچہ چند مختصرات کے سوا نہیں پڑھی تھیں، مگر طباعی کا یہ عالم تھا کہ اساتذہ کے مغلق و مشکل اشعار 'بینش' اُن کو سناتے اور امتحان لیتے تھے۔ یہ فوراً اُن کے معانی کی حقیقت و کُنہہ کو پہنچ جاتے تھے، کسی کا شعر پسند آتا تو فرماتے کہ "کاش یہ میرا ہوتا"۔ باوجود اس بد دماغی کے 'بینش' کو مانتے تھے۔ اُن کی سخن گوئی و سخن فہمی پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ اپنی طبیعت کے خلاف 'بینش' کو اپنا دست راست جانتے تھے۔ آہ کیا لوگ تھے۔ پھر اُن کا کلام نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ خدا بخشے، فارسی زبان کے محاورے اور محاسن شعری نہ جاننے کی وجہ سے اُن کا کلام سخن فہمان زمانہ کی نگاہوں میں چنداں منظور نظر نہ تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

خود بینش دمے نہ دہد فرصت چمن از حیرتم کہ دیدۂ نرگس براہ کیست

---

* صفحہ ۲۸ ۔

ز کلام پست گماں بری که بلند بام جہاں شوی

تو چه بیہشی که ہمی کنی زپر کلاغ ہما طلب ٭

واصف مولوی محمد مہدی 'واصف' - عارف الدین خاں 'رونق' کے بیٹے بڑے صاحب کمال اور فصحاے اہل عجم کے صحبت یافتہ تھے۔ محاورات فارسی میں عبور رکھتے تھے۔ علوم عربیہ کے فارغ اور صاحب تصانیف تھے۔ 'بینش' پہلی ہی ملاقات میں اُن کے جوہر ذاتی کو تاڑ گئے۔ اور باہم خوب گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں میں باہم یہ عہد ہوا کہ اپنا اپنا کلام ایک دوسرے کو دکھایا کریں۔ اور اگر کوئی سقم نظر آئے تو اسے بے تکلف ظاہر کریں بلکہ تصرف کر دیا کریں۔ وہ بھی 'بینش' کو ناچیز نہیں سمجھتے تھے۔ زندگی اکثر تصنیف و تالیف میں گزری۔ 'معدن الجواہر' تذکرۂ شعرا یادگار† ہے —

'بینش' نے تصنیفات میں صرف تذکرے کا ذکر کیا ہے لیکن ایک زبردست تالیف 'دلیل الشعرا' راقم الحروف کی نظر سے گزری ہے۔ یہ فارسی محاورات اور لغات خاص کی ایک جامع کتاب ہے، تقریباً (۳۰۰) حجم ہوگا۔ مدراس گورنمنٹ کے قلمی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ موقع ملا تو کبھی اس پر بھی ریویو ہوگا۔ 'معدن الجواہر' تذکرہ اب تک ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

اخلاق بینش جو واقعات اوپر گذر چکے ہیں ان سے پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ 'بینش' کی طبیعت کا کیا انداز تھا، ان کے اخلاق کیسے تھے، وہ اپنے معاصرین اور شعرا کا ذکر بھلائی سے کرتے ہیں۔ کسی کی برائی نہیں کی، ایک آدھ کے متعلق البتہ دبی زبان سے کچھ اشارتاً کہہ دیا ہے مثلاً خدا بخشے محاورات فارسی نہ جاننے کی وجہ سے کلام منظور نظر نہ

٭ صفحہ ۳۸ و ۳۹ -   † صفحہ ۱۸۹ -

تھا - " یہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے- اپنے سوا کسی کو برا نہیں سمجھتے تھے"
ایسے دو ایک ہی ہیں - احباب کا ذکر بڑی محبت و اخلاص سے کرتے
ہیں - بزرگوں کا بڑے احترام و ادب اور عقیدت سے - اگرچہ شیعہ تھے '
لیکن کوئی بات تذکرے میں ایسی نہیں آنے دی جس سے تعصب کی
ذرا سی جھلک بھی نمایاں ہو- بزرگوں اور دوستوں کا تو کیا ذکر ہے '
شاگردوں تک کے بیان میں وہ اخلاق و اخلاص اور وہ انکسار و محبت کا
اظہار ہے کہ حیرت ہوتی ہے - اُن کے معاصر تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی
خوش اخلاقی کو مانا ہے - دو ایک مختصر واقعات ہم بھی بیان کرتے ہیں :

علیم ان کے ایک شاگرد رشید ہیں - ان کی غزل پر غزل کہتے ہیں '
پھر ان کے دو شعر اور اپنی غزل کا ایک مطلع پیش کرکے لکھتے ہیں : "اگر
انصاف سے پوچھا جائے تو فقیر نے مطلع کو نہیں پہنچتا " مگر یہ صرف
انکسار ہی نہیں بلکہ عین انصاف اور شاگرد کی حوصلہ افزائی بھی ہے-
دونوں مطلعے ملاحظہ ہوں - (بینش کا مطلع) :

عمرت گزشت دل بہ خدائے یگانہ بند
شد جوی خشک ' کشتی خود برکرانہ بند

(علیم) بردار دل زھر دو جہاں بایگانہ بند
چوں تیر از دو خانہ نظر بر نشانہ بند

اپنے شاگرد ذکا کی نسبت لکھتے ہیں " شعری تو کیا حقیقت ہے - فقیر
نے اس زمانے میں ان کا ثانی نہیں دیکھا " -

رسا کے متعلق فرماتے ہیں : رسا کے کلام میں بعض بعض جگہ محض ان
کے حکم کی تعمیل کے خیال سے بندے نے بھی کچھ گستاخی کی ہے —

تذکرے کی تالیف کے وقت جی چاہا کہ جو سوال و جواب اور اعتراضات اہل مشاعرہ میں باہم ایک دوسرے کے کلام پر ہوئے رہے ہیں، ناظرین کے تفنن طبع کے لئے زبان قلم کے حوالے کریں مگر طالب آملی کا یہ شعر یاد آگیا کہ :

خسیس از ہنر پیشگان عیب بیند
مگس بیشتر بر جراحت نشیند

فوراً یہ خیال بدل گیا، کہ یہ بات آئین مروت کے خلاف اور طریق وفتوت کے منافی ہے —

اپنے تذکرے میں اپنے کلام کا انتخاب اس انکسار کے بعد درج کیا ہے —

چونکہ چمن میں خار و خس (کانٹوں اور کوڑے کرکٹ) کا وجود بھی ضروری ہے، اور ' گلدستہ ' کے لئے ایک دھاگے کی ضرورت بھی یقینی ہے، اگر میں بھی سخن وروں کے ذیل میں داخل ہوجاؤں، اور اپنے پوچ لچر خیالات کو ان کے دُر نثار اشعار کے سلسلے میں درج کردوں تو امید ہے کہ بزرگان فن خردہ گیری نہ کریں گے، غلطی نہ سمجھیں گے —

نیکوں کے طفیل میں بدوں کو بھی قبول کرلیتے ہیں - " جو بندھ جائے وہ موتی " تاگے میں جو بھی پرو دیا جائے وہ واپس نہیں کرتا (صفحہ ۲۱ تا ۲۳) ' مشاعرۂ اعظمی ' میں سرفرازی پر لکھتے ہیں : " اس اہل کمال کے خرمن سے خوشہ چینی کرنے اور جوتوں کی صف میں بیٹھنے والے ناچیز کو یاد فرماکر، اس بے قدر کی قدر ایک سے ہزار درجے تک بڑھائی، اور اس بے قیمت پوت کو آبدار موتیوں کے ساتھ پرودیا، میں بھی

بھی ان صبیم نفس سخنداںوں کے اس مجمع میں اپنے خرافات کو پیش کرتا رہتا تھا —

اخلاص و محبت

اپنے احباب سے دلی محبت رکھتے تھے، حاضرانہ اور غائبانہ محبت کا رنگ ایک ہی تھا، دو ایک واقعے حوالۂ قلم ہیں :

ایک صاحب ویلور میں عبدالنفاد 'ہمراز' تھے ان کی غائبانہ تعریف اکثر اپنے شاگرد 'دک' سے سن کر محبت ہوگئی - کہتے ہیں کہ "اگرچہ ان سے ملاقات جسمانی کا موقع نہیں ملا، مگر محبت روحانی میں شک نہیں" -

حیدرآباد میں ایک صاحب 'قمر' لکھنوی تھے، ان کا ذکر بارہا سنا تھا، بے حد اشتیاق ملاقات ہوگیا تھا، بلکہ غائبانہ محبت، جب 'بیلش' حیدرآباد پہنچے تو ان کا انتقال ہوچکا تھا - ان کو نہایت رنج تھا، کہتے ہیں کہ "ایک رات یاران رنگیں اور دوستان خوش آئیں میں اپنے اشعار پڑھ رہا تھا، احباب مزے لے رہے تھے اور داد دے رہے تھے - مگر ساتھ ہی حیدرآباد وارد ہونے اور قمر مرحوم کے انتقال پر بہت افسوس و تاسف کر رہے تھے، فقیر بھی بے حد ملول تھا کہ کاش قمر کی صحبت نصیب ہوتی - اس لئے کہ مدت سے ایک دوسرے کے تشنۂ دیدار تھے، اور غائبانہ خلوص و محبت رکھتے تھے - اسی رات عالم خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ محفل مشاعرہ بھری ہوئی ہے، بہت سے شعرا جمع ہیں، اسی مجمع میں ایک بزرگوار خوش رو، گندمی رنگ، سفید ریش لکھنوی لباس میں جلوہ افروز ہیں - میں نے دیکھا تو دل میں خیال گزرا کہ ہو نہ ہو یہ ہی بزرگوار قمر لکھنوی ہیں- جناب 'ثاقب' (ان کے بڑے بھائی) بھی اس محفل میں موجود تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا 'قمر' لکھنوی یہی ہیں ؟ انہوں نے

یا ھاں ! جاؤ ، معانقہ کرو کہ تمہاری ملاقات کے بہت زیادہ آرزو مند تھے -
ں گیا اور معجزو ادب سے سلام کیا - قمر بڑے دوق و شوق سے اٹھہ کر بغل
ہوئے ، میری پیشانی پر بوسہ دیا - پھر میں جاگ اٹھا اور ان کے مزار پر
ضر ہوا جو میر مومن (قدس سرہ) کے دائرے میں واقع ہے اور فاتحہ
ڑھا - ایک روز ثاقب صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ
س صورت میں تم نے دیکھا یہ سمجھہ لو کہ بعینہ انہیں کو دیکھا - خدا
ھی ! کیا لوگ تھے - اور کیا دن تھے - ان بزرگوں کے اخلاق اور دلی
خلاص کا کیا کہنا ہے —

ارکات میں ان کے ایک عزیز دوست حکیم غلام محی الدین ' بصارت '
ھتے تھے - لکھتے ہیں کہ " یہ مولف کے ساتھہ صاحبزادگی (استاد زادہ
پیر زادہ) ہونے کی وجہ سے بہت محبت رکھتے تھے - میں بھی ان کو
ہت عزیز وگرامی جانتا تھا - اور بارہا ان کے ساتھہ ہم سخنی کا موقع
وا تھا سنہ ۱۲۹۴ ھ میں میرا اتفاق سے ارکات جانا ہوا تو لوگوں نے بہت
سف کے ساتھہ ان کا ذکر کیا - میں نے پوچھا کہ کیا حال ہے ؟ بیان
یا گیا کہ سخت بیمار ہیں ' اور اب زندگی کے صرف چند لمحے باقی رہ
ئے ہیں - ہماری آنکھیں پھر ان جیسا صاحب کمال انسان نہ دیکھیں گی " -
یں بھی یہ سن کر بہت آبدیدہ ہوا - اور دست بزانو افسوس کر رہا
ھا ' رات کا وقت تھا ' اور ان سے ملنا اس وقت دشوار تھا ' آخر
بر کیا ' اور صبح ہوتے ہی پہنچا ' بصارت کے عزیزوں نے میرے آنے کی خبر
نہیں سنائی - بڑے شوق سے مجھے طلب کیا - میں گیا اور سلام علیک کر کے
پنا ہاتھہ ان کے سینے پر رکھہ کر پوچھا کہ " آپ مجھے پہچانتے ہیں ؟ "
یری طرف آنکھہ پھیر کر کہا کہ " جائے بینش ہمیشہ در چشم اہل بصارت

است" مرتضی اسی روز انتقال کیا اور میں نے تاریخ وفات کہی۔ (شاعروں سے اِس کے سوا اور کوئی کیا سکتا ہے) —

ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ مشاعرۂ اعظم میں دستور تھا کہ اگر کسی شاعر کے کلام میں کوئی نقص ہو تو اُسی وقت ظاہر کیا جاے اور اساتذہ کے کلام سے سند طلب کی جاے ' بینش ' بھی اکثر شعرا پر نوک جھونک کرتے رہتے تھے اور اُن سے الجھتے تھے دوسرے بھی اُن پر بہت لے دے کرتے رہتے تھے۔ آخر عمر میں انہیں کربلاے معلیٰ جانے کا خیال ہوا۔ جب کہ انسان سفر آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور " توشۂ منزل کا بھروسہ " کا خیال اسے دامنگیر ہوتا ہے خیال ہوا کہ احباب کی میں نے بہت دل شکنی کی ہے۔ چل چلاؤ کا وقت ہے ' خدا جانے وہاں سے واپسی نصیب ہو کہ نہ ہو۔ اِن سے معافی مانگ لینا چاہیے کہ عاقبت بخیر ہو چنانچہ مشاعرے میں حاضر ہوکر ایک معذرت نامہ ۱۹ شعروں کا خود اپنی زبان سے حاضرین جلسہ کے سامنے پڑھ کر سنایا ' اپنی گذشتہ دل شکنیوں اور زیادتیوں کی معافی چاہی اور سب احباب کے دل کا غبار صاف کر کے سدھارے۔ اس کے لفظ لفظ سے عجز اخلاص کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ شیر بیشۂ سخن بوڑھا ہوگیا ہے ' جوانی کے زور و جوش سرد پڑگئے ہیں ' دنیا کے ہنگاموں سے دل سیر ہو چکا ہے ' اللہ سے لو لگانی ہے ' سفر آخرت اور اپنے اعمال پر پشیمانی کا احساس ہے' اور " دل بدست آور کہ حج اکبر است " پر عمل پیرا ہے۔ (وہ قطعہ گلزار اعظم سے ہم نقل کرتے ہیں) —

اے بمیزان خرد سنجیدہ گاں معنی ہر نیک و بد فہمیدہ گاں
روشناں آسمان اعتلا گوہران قلزم صدق و صفا
حسن را ہم عشق را نور و ظہور از شما اے شاعران با شعور

صاف چوں آئینه دل های شما　　حسن معنی را بود صورت نما
یک قلم هستید شاگردان حق　　در فن خود برده اید از هم سبق
مولوی فرموده در نیکوتری　　"شاعری جز ویست از پیغمبری"
خوش سامان پاکی وقف شماست　　از سخن حکمی شما را بر هواست
نے مرا علمے است نے فضل و هنر　　از کرم بنواخت شاه نامور
بنده را جا داد در بزم شما　　سر بگردونی رساند این خاک را
نام این محفل بود بزم سخن　　هر یکی دامی رسد حرفی زدن
خویش را چیزے مگر انگاشتم　　با شما ها گفتگو می داشتم
بردم از انگشت بر حرفی کسے　　یا نمودم دخل بیجا چوں خسے
یا نهادم گر زحدّ خود بروں　　یا کسے را از شما گفتم زبوں
یا ز شوخیها بر آوردم نفس　　یا زدم بانگ بلندی چوں جرس
جز تفنن نیست مقصود ازاں　　این چنین بوده است طرز شاعراں
گر شکر آمیست اے دریا دلاں　　بایدش چوں موج کردن بر کراں
هست عرش الله قلوب المومنین　　پاک سازید از غبار بغض و کین
نیست اے یاران من در روز گار　　اعتمادے بر حیات مستعار
عزم می دارم سوے خیرالبلاد　　دوستاں گویم شما را خیر باد

آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس وقت بینش نے درد کے ساتھ یہ قطعہ پڑھا ہوگا تو ان کی سچائی کا کیا کچھ اثر نہ ہوا ہوگا —

۱۔ سفرحیدرآباد / سفر بینش

تذکرے کے مختلف مقامات سے صرف اِن کے تین سفروں کا پتہ چلتا ہے اول تو سفر حیدرآباد ' یہ نہیں معلوم کہ ایک ہی بار گئے ہوں یا کئی بار وہاں کے شعرا سے ملاقاتیں ہوئیں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوئے ہیں- وہاں کے احباب میں خوب شعر و

شاعری کے ہنگامے گرم رہے ہیں - 'معنی' حیدرآبادی کے حالات میں لکھتے ہیں کہ " راجہ بالا پرشاد کے مشاعرے میں ایک بار اُنہیں دیکھا ہے ' اُنکی اقامت وہاں دو ماہ سے زیادہ نہیں رہی ' اِس سبب سے اِس جگہہ کے اکثر ارباب کمال کی ملاقات سے قاصر رہا - اور اِن کے حالات سے زیادہ تفصیل کے ساتھہ واقف نہ ہوسکا " - (صفحہ ۱۹۹)—

'قمر' کے حالات میں اپنے خواب اور قیام حیدرآباد کا حیرت انگیز واقعہ ' اُوپر گزر چکا ہے - یہیں دریاے کرشنا کے کنارے ایک روز اُن سے مرزا سعید بیگ 'طلب' سے ملاقات ہوئی ' ' اور بہت جلد اتحاد ہو گیا - اور کیونکر نہ ہوتا کہ ہم مشرب (شاعر) بھی تھے اور ہم مذہب (شیعہ) بھی - (صفحہ ۱۴۸)- اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف سیر و سیاحت کے طریق پر آے ہوے تھے - یہ سفر اُن کا سنہ ۱۲۶۲ ھ میں ہوا ہے - جب نواب اعظم کے مشاعرے کا غلغلہ بلند ہوکر اِن کے کانوں تک پہنچا تو یہ بھی سر پر پاؤں رکھہ کر بھاگے اور مدراس پہنچے —

۲- سفر ارکاٹ | دوسرا سفر ارکاٹ کا ہے جس کا تذکرہ بہارت کے حالات میں انہوں نے کیا ہے اور ہم اُن کے اخلاق و محبت کے ذیل میں لکھہ آے ہیں —

۳- سفر کربلاے معلی | یہ سفر بہلش کا سب سے آخری اور سب سے زیادہ طویل سفر ہے - اس کو گلزار اعظم نے یوں لکھا ہے کہ "سنہ ۱۲۶۵ھ میں (تذکرہ کی تصنیف کے بعد) حضرات عالیات کے عتبات * کی زیارت کا شوق اُن کے دل میں موج زن ہوا - اِس مبارک سفر کے لئے سرکار سے تین سال کی رخصت حاصل کی - اور مشاعرے میں آکر ایک معذرت نامہ

* عتبہ ' چوکھٹ ' آستانہ مجازاً امام حسنین رضی اللہ عنہما وغیرہ کے مزارات -

سفا یا احباب اور عزیزوں سے معافی مانگی اور اپنے تمام متعلقین کو ہمراہ لے کر قافلے کے ساتھ روانہ ہوگئے جس وقت بصرے پہنچے ہیں وہاں کی آب و ہوا بہت خراب تھی' تمام اہل بدرقہ کے مزاج خراب اور سب کے سب تپ و لرزہ میں گرفتار ہوگئے- قافلے کے انتظام کا شیرازہ کچھ ایسا درہم برہم ہوا کہ اس غریب الوطنی کے عالم میں ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی ' اسی ہراسانی و پریشانی کی حالت میں قافلے کے بعض لوگ تو بغداد شریف کی جانب چل دیے اور کچھ لوگوں نے نجف اشرف کا رستہ لیا - 'بینش' بھی اسی وبا میں مبتلا ہوکر بڑی خرابی و مصیبت کے بعد جلد سے جلد 'نجف اشرف' پہنچے - ایک مدتے تک وہاں قیام کیا - مگر وہاں کسی (مرد مومن) کو اپنا پرسان حال نہ پایا تو کربلاے معلیٰ کی راہ لی - اس مقدس مقام میں پہنچ کر اپنا رخت سفر کھولا اور نقد جاں کو اس آستان غربت نشان پر نثار کرکے روضۂ مبارک کے صحن میں ہمیشہ کے لئے آرام لیا - کیوں نہ ہو وہ خود کہہ چکے تھے : 'بینش' بہ کربلا ست بیاد تو یا حسین ع

پابند گرچہ ہست بہ ہندوستاں ہنوز

یہ شعر مشاعرہ کی طرحی غزلوں میں سے ایک غزل کا ہے ' اب اس کا مضمون صادق آیا اور 'بینش' کا قصہ 'عرفی' کے مشہور قصے * کے موافق ہوگیا † —

---

* 'عرفی' کا یہ قصہ اکثر تذکروں میں مذکور ہے - ہم کلمات الشعراء سرخوش (صفحہ) اور نتائج الافکار (صفحہ) سے نقل کرتے ہیں :

† (گلزار صفحہ ۱۲۲) -

مذہب بینش | بینش نسباً حسینی یعنی حضرت حسین علیہ السلام کی اولاد میں تھے - اور مذہباً ' شیعہ ' (اثنا عشری) انہوں نے اپنے مذہب کا کہیں تذکرہ نہیں کیا سارا تذکرہ پڑھ جائیے آپ کو یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ یہ شیعہ تھے یا پکے سنی - نعت کے سلسلے میں انہوں نے اردو شریف " صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم " لکھا ہے - یعنی اصحاب کو بھی شامل کیا ہے - ورنہ شیعہ مصنفین (وآلہ) تک درود ختم کردیتے ہیں - پھر نواب اعظم کے حالات میں " خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب کو رضی اللہ عنہ " لکھتے ہیں - اور معاصر تذکرہ نویس بھی مذہب کا کوئی ذکر نہیں کرتے —

' بینش ' کے ایک چچا زاد بھائی میر عاشق حسین زائر کربلائی تھے " یہ عتبات عالیات " کی زیارت کے لئے مع بال بچوں کے گئے - پھر وہیں رہنے لگے - بارہ برس رہ کر وہیں طاعون میں انتقال کیا - اور صحن مبارک میں دفن ہوے - اُن کی اس مبارک موت اور اس خوش قسمتی پر ' بینش ' کو بھی رشک آیا ' کہتے ہیں " خوشا بحال او " پھر یہ دعائیہ قطعہ اپنے حوالہ قلم کرتے ہیں :

بارا اِلٰہا نہ پسندی کہ گل مادر ہند خشت دیوار ہمہ خانۂ کفار شود
کربلا مدفن ما ساز کہ تا تربت ما سجدہ گہہ ' خاک شفا' سبحۂ ابرار شود

یہ دعا مقبول ہوئی ' ایسے گئے کہ پھر اس " کفرستان وطن " میں آنا نصیب نہ ہوا —

بینش کے اور اعزہ بھائی | اس مضمون میں ثاقب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُن کے اور ' بینش ' کے دیگر اعزہ کے متعلق مختصراً کچھہ لکھا جاے - ان کا نام ' میر مہدی حسین '

تھا - بینش سے تین سال بڑے تھے - سنہ ۱۲۲۳ ھ میں پیدا ہوئے تھے - فارسی کے استاد تھے - ان کا مدرسہ ہمیشہ شاگردوں سے پُر آوازہ رہتا تھا - ' بینش ' بھی یہاں درس دیتے تھے طبیعت شعر سے پوری مناسبت رکھتی اور نازک معانی پیدا کرتی تھی - خوش نویس تھے خط نستعلیق و شفیعا خوب لکھتے تھے - تاریخ گوئی میں بھی مہارت شایستہ رکھتے تھے - رنگینی و لطیفہ گوئی مزاج میں اس قدر تھی کہ ہر شخص ان کی صحبت کا مشتاق اور ملک کے عمائد ان کی ملاقات کے آرزومند رہتے تھے - ان کی خوش خلقی وغیرہ کی ' اعظم' نے بھی بہت تعریف کی ہے - بعض احباب مدراس سے معلوم ہوا کہ ان کا دیوان چھپ گیا ہے - مگر کم یاب ہے راقم الحروف کی نظر سے اب تک نہیں گزرا —

ان کے کلام کے نمونہ کے علاوہ بینش نے اپنے تذکرے میں اپنے دو چچازاد بھائیوں کا اور ذکر کیا ہے - بیوی بچوں کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس سنہ میں انتقال کیا ' اس لحاظ سے ' بینش ' کی تاریخ حیات کا یہ باب ناقص سمجھیے اور ہمیں مجبور —

تالیف تذکرۂ اشارات بینش

ان حالات کو پڑھ کر آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ مدراس آج سے تقریباً سو سال پہلے کیا تھا - نواب اعظم کی ادب نوازیوں سے کیسے کیسے لوگ یہاں جمع تھے - اور اس زمانے کا رنگ کیا تھا - شعر و سخن اور تصنیف و تالیف کا رجحان بھی بمصداق " الناس علی دین ملوکہم " بڑھا ہوا تھا - ' بینش ' کیونکر اس فضا سے اثر پذیر نہ ہوتے لیکن ایک تذکرے کے سوا ان کی کسی اور تصنیف کا پتہ نہیں چلتا - نہ یہ اتا پتا دیتے ہیں نہ کوئی اور معاصر تذکرہ نویس - یہ تذکرہ انہوں نے اپنے

معاصرین کا لکھا ہے - جیسا کہ آگے چل کر خود ان کے بیان سے ثابت ہوگا - یہ اُن کی اور اُن کے بہت سے بزرگوں، استادوں، دوستوں اور شاگردوں کی ایک آنست علمی یادگار ہے - اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کتنی جلدی یہ صحبتیں درہم و برہم ہو گئیں - آج پورے سو برس کا زمانہ بھی نہیں ہوا مگر دیکھیے ایسی کایا پلٹی کہ اُن پاکیزہ صحبتوں کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا - ہر چیز بدل گئی، نہ وہ حُسن معاشرت ہے - نہ وہ اخلاق و اخلاص، نہ وہ مذاق ہے نہ وہ زبان - نہ وہ لباس ہیں نہ وہ وضع داریاں، آج آپ مدراس کو دیکھیں گے تو حیرت کریں گے - یہ ایک زبردست تجارتی شہر ہے اور گورنر کا پایہ تخت - ہر طرف انگریزی زبان ہے، انگریزی ادب اور معاشرت ہے - انگریزی تہذیب و تمدن کا اثر ہے - آپ کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ یہ قوم کبھی مشرقی علوم و فنون سے ذوق آشنا تھی اور یہاں یہ زبان کبھی راج کر چکی ہے -

تذکرہ کی حالت

خیر یہ تو دردناک مرثیہ ہے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا - غرض کہ تذکرۂ بینش جس کا تاریخی نام اشارات بینش ہے اُن کی تنہا علمی یادگار ہے - اور یہ سنہ ۱۲۶۵ھ میں تالیف ہوا ہے - نواب اعظم نے اپنے سرکاری مطبع میں از راہ قدردانی چھپوا دیا ہے - وہ لکھتے ہیں: ایک تذکرہ جس کا نام 'اشارات بینش' ہے، تالیف کیا ہے، اور اب وہ رسالہ سرکاری مطبع میں چھپ گیا ہے - اس کی تقطیع ۱۸ × ۲۲ ہے ہر صفحے میں ۹ سطریں ہیں، قلم واضح اور کاتب اچھا خوشنویس ہے - چھپائی بھی بری نہیں متوسط درجے کی ہے - کاغذ ذرا میلا سفید ولایتی غالباً فرنچ ہے --

حجم ۲۰۸ صفحات ۱۱ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۶۸ھ کو کتابت سے فراغت

ہوگی - یعنی تاریخ تالیف سے تین سال بعد ہی اسے طباعت کا شرف حاصل ہو گیا کاتب "اضعف العباد" عبدالصمد (سرکاری کاتب ہیں) - پریس کا نام نہ شروع میں ہے نہ آخر میں آخری (۵) صفحوں میں معاصرین کے قطعات تاریخ طبع ہیں، ہر شاعر کا تخلص جس کے حالات شروع ہوتے ہیں - حاشیے پر بھی لکھہ دیا گیا ہے - اور ۷۵ شعراء کا اس میں ذکر کیا ہے جن کی فہرست یہ ہے :—

(۱) اعظم، (۲) احسن، (۳) احقر، (۴) احمدی، (۵) اظہر، (۶) اکرم، (۷) امیر، (۸) انوار، (ب) (۹) بصارت، (۱۰) بلیغ، (۱۱) بہجت، (۱۲) بہشود، (۱۳) بیتوا، (۱۴) بہوش، (۱۵) بینش، (ت) (۱۶) ثاقب، (ج) (۱۷) جوہر، (ح) (۱۸) حاجب، (۱۹) حسن، (۲۰) حشمت، (خ) (۲۱) خالص، (د) (۲۲) دید، (ذ) (۲۳) ذکا، (۲۴) ذہین، (ر) (۲۵) راغب، (۲۶) رائق، (۲۷) راقم، (۲۸) رسا، (۲۹) رفعت، (۳۰) رونق، (ز) (۳۱) زائر، (س) (۳۲) سعید، (ش) (۳۳) شائق، (۳۴) شاعر، (۳۵) شمس، (ص) (۳۶) صادق، (۳۷) صاحب، (ض) (۳۸) ضمیر، (ط) (۳۹) طلب، (ع) (۴۰) عاشق، (۴۱) عارف (۴۲) عتیق، (۴۳) عشق، (۴۴) علیم، (ف) (۴۵) فاروق، (۴۶) فائق، (۴۷) فائز، (۴۸) فرحت، (ق) (۴۹) قادر، (۵۰) قدرت، (۵۱) قدیر، (۵۲) قمر، (ل) (۵۳) لائق، (م) (۵۴) مجرم، (۵۵) مختار، (۵۶) مخلص، (۵۷) مست، (۵۸) معاون، (۵۹) معلی، (۶۰) منتظر، (ن) (۶۱) نامی، (۶۲) ناسی، (۶۳) ناصر، (۶۴) ناظر، (۶۵) ندرت، (۶۶) نظیر، (و) (۶۷) والا، (۶۸) واقف، (۶۹) واصف، (۷۰) واصف، (۷۱) وفا، (۷۲) وفا، (۷۳) ولا، (ہ) (۷۴) ہمراز، (ی) (۷۵) یگانہ —

سبب تالیف | یہ تذکرہ بینش نے اس وقت تالیف کیا ہے جب کہ ان کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہو چکی ہے' دیباچے میں فرماتے ہیں : اپنے بخت کی یاوری اور فیروزمند طالع کی مدد سے جب اس ناز و نعمت کے نزہت کدے میں پہنچا' اور ایک مدت تک معنی رس نکتہ سنجوں اور صبح نفس سخندانوں کے اس مجمع میں اپنے مزخرفات بھی پیش کرتا رہتا تھا - ایک دن خیال آیا کہ جو شعرا اس سے پہلے تھے' ان کے بہت سے تذکرے تالیف اور زمانے کے ہاتھوں میں یادگار ہیں - مگر ان سخن وروں کے مخصوص حالات میں اب تک کوئی تذکرہ کسی نے نہ لکھا' جن کو یہ دور (اعظمی) پانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے - اگر اس کام کی تکمیل کے لیے کمر سعی باندھ لوں اور ان "تلامیذ الرحمان" کی خدمت ادا کروں تو رائے گاں نہ ہوگی - بس درگاہ الٰہی سے اعانت طلب ہوکر حصول مقصود کی فکر میں پڑ گیا - مشاعرے کی تمام غزلیں اور اس عصر کے دوسرے شاعروں کے اشعار ہر شہر وہر دیار سے کمال تلاش سے بہم پہنچائے - پھر انتخاب کے بعد اپنی استعداد کے موافق ان کو مرتب کیا - اور ارباب سخن میں سے ہر ایک کا حال مختصر لکھا کہ ناظرین کے لیے ملال خاطر کا سبب نہ ہو -

اپنے حالات کے شروع میں لکھتے ہیں :

یہ خاکسار سراپا انکسار خادم الفقرا سید مرتضیٰ ہے - جو اپنی چالیس سالہ عزیزالوجود عمر کے خرمن کو برباد اور انسانی جوہر کے بیش قیمت موتی کو ہوا وہوس کے غبار سے آلودہ کرچکا ہے —

تذکرے پر تبصرہ | تذکرہ کی ترتیب اور اکثر و بیشتر تذکروں کی طرح حروف تہجی کے لحاظ سے یعنی ردیف وار ہے - اور نواب اعظم کے نام سے شروع کیا ہے - حالات شعرا کے ضمن میں بہت سے

علماء، فضلاء کا ذکر آگیا ہے جو اس دور میں ممتاز تھے - کوئی عربی میں، کوئی فارسی میں، کوئی طب یا کسی اور علم میں - پہلے شاعر کا تخلص لکھا ہے پھر پورا نام اور خطاب والقاب وغیرہ، اس کے بعد اس کے باپ کا نام، پھر حسب اور آبائی وطن، پیدایش، موجودہ سکونت اور تعلیم وغیرہ، کسی خاص فن میں ممتاز ہے تو اُس کا ذکر کردیا ہے کوئی خاص صفت کسی میں نمایاں ہے تو وہ بیان کردی ہے - حتی الامکان ولادت اور وفات کا سن بھی لکھتے ہیں - بعض اساتذۂ درس اور اساتذۂ شعر کا بھی ذکر کرتے ہیں - پھر مختصر الفاظ میں ذہانت، ذکاوت اور شاعری پر تبصرہ کرتے ہیں - باوجود اختصار کے بہت سی مفید، دلچسپ اور اہم باتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں آخر میں کلام کا نمونہ وانتخاب پیش کرتے ہیں - کلام کے متعلق کوئی خاص واقعہ ہوتا ہے تو لکھتے ہیں - اکثر جگہہ اپنی ہم زمین غزل کا ایک آدہ شعر لکھہ دیتے ہیں - کہ یہ فقیر بھی اس زمین میں غزل رکھتا ہے فقیر نے بھی اس زمین میں خیال خام پکایا ہے - "ہوس پختہ است" وغیرہ - ایک آدہ جگہ اپنی تعریف بھی دبی زبان سے کردی ہے - کہیں سکوت کر کے ناظرین کی راے پر فیصلہ چھوڑدیا ہے -

بیان میں سنجیدگی، عبارت میں پختگی ہے - فارسی ان کی بہت عمدہ ہے، بہترین ادیب و انشا پرداز معلوم ہوتے ہیں - بیان میں کہیں رکاکت، تعصب، بدمزاجی، ناراضی اور عداوت نہیں محسوس ہوتی - یہ تو کہہ چکا ہوں کہ بزرگوں کا کمال ادب واحترام، احباب کی عزت و محبت، شاگردوں کے ساتھہ شفقت اور اخلاص نمایاں ہے، نہ بیجا تعلی کہیں اپنے متعلق کی ہے نہ کسی کی بد گوئی اور عیب جوئی سے کام لیا ہے - اس زمانے کی تہذیب و شایستگی اور اخلاق کا پورا اندازہ ہوتا ہے، یہ

شعر کی طرح نثر پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں، اگرچہ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی اس دور کا عام مذاق تھا مگر کہیں گنجلک اور بھدا پن نہیں پیدا ہوا نہ کہیں اغلاق اور توالیٔ اضافات ہے اور نہ مشکل پسندی - اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس تذکرے کے دیکھنے سے اس زمانے کے اخلاق، شعرا اور اہل علم کے باہمی تعلقات اور علمی فضا پر ایک مجمل روشنی پڑتی ہے، بہت سے حالات معلوم ہوتے ہیں - یہ پتہ چلتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ موجود تھے - کوئی متقی عالم ہے تو کوئی نامور شاعر، کہیں درس و تدریس کے مشغلے ہیں تو کوئی طبی مہارت سے خلق اللہ کی خدمت کر رہا ہے - کوئی معرفت اور روحانیت میں زیادہ شغف رکھتا ہے - کسی کو علم رمل و نجوم وغیرہ سے دلچسپی ہے، کوئی ریاضی کا ماہر ہے، کسی کو فارسی زبان اور اس کے محاورات میں کمال ہے تو کوئی عربی زبان کا فاضل ہے - کوئی نثر اعلیٰ درجے کی لکھنے میں مشہور ہے تو کوئی نظم میں زیادہ ممتاز نظر آتا ہے - کسی کو 'بیدل' کا رنگ بھاتا ہے، کسی کو 'ظہوری' کا اتباع - کوئی 'ناصر علی' سرہندی کا دم بھر رہا ہے تو کوئی 'صائب' کا - کہیں عجز و انکسار ہے تو کہیں اپنے علم و فضل پر ناز بھی - بعض بزرگ تصنیف و تالیف میں منہمک ہیں - غرض یہ سب کچھ ہے - لیکن پریشانی کا نام و نشان نہیں - سب خوش و مسرور ہیں اطمینان و فراغت کا دور دورہ ہے، اپنے اپنے مشغلوں میں لگے ہوئے ہیں اللہ اللہ کیا زمانہ تھا —

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

اب ہمیں ایک فرض سے اور سبکدوش ہونا ہے اور وہ بینش کے کلام کا انتخاب ہے —

کلام بینش | تذکروں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ بینش اردو میں بھی شعر کہتے تھے - انہوں نے خود بھی ذکر نہیں کیا - غالب یہی ہے کہ فارسی ہی کے شاعر تھے نہ ان کے صاحب دیوان ہونے کا پتہ چلتا ہے اور نہ دیوان کا - اور چونکہ ملک میں اب فارسی کا مذاق بہت کم ہے خاص کر مدراس میں، اس لئے انتخاب کلام میں ہم زیادہ طول سے کام نہ لیں گے فیصلہ آپ کی راے پر ہے - فرماتے ہیں :

نتواں یافت جز بکوچۂ یار دل از خود رمیدۂ مارا

کیا پاکیزہ شعر ہے ' کہتے ہیں کہ ہمارا دل "از خود رمیدہ" جو آپ اپنے سے بھاگتا ہے ' کوے جاناں کے سوا کہیں نہیں مل سکتا —

حیرانم از چہ رو دل نازک مکدر است آئینہ ات نفس زدۂ دود آہ کیست

قاعدہ ہے کہ منہ کی بھاپ یا سانس سے آئینہ دھندلا ہوجاتا ہے ' معشوق کے دل کو آئینہ سے تشبیہ دے کر شاعر حیرانی ظاہر کرتا ہے کہ تیرا نازک دل آخر کیوں دھندلا ہو رہا ہے ' پھر پوچھتا ہے آخر کس کی آہ کے دھوئیں کی سانس سے یہ تکدر ہے ؟ —

از شوق می پرند زہر سو نہانہا ایں طرز جادوانۂ تیر نگاہ کیست

یہ شعر بھی بہت پاکیزہ ہے - اور کہتے ہیں -

چہ سحرہا است کہ ترکان بیک کمند نگاہ ہزار رستم وبہرام را اسیر کنند

بکفت یار بشوخی مبیں جمال مرا نہادم از مژہ بر چشم اشکبار انگشت

اسی زمین میں انداز معشوقانہ کی ایک اور تصویر ملاحظہ کیجئے -

اگر گلے بہوس پیش یار ہدیہ برم بناز می نہد آشوخ بر عذار انگشت

میں بڑے شوق سے محبوب کے سامنے ہدیتاً پھول پیش کرتا ہوں مگر

بس جلوہ ہائے رنگیں دارد کف غبارم
از دامن کہ یا رب برباد رفتہ باشد

صبر از دل، دل زمن، از در دلبر جدا
کس مبادا در جہاں چوں من پریشاں روزگار

نالہ ام حسن ترا شوخی دیگر آموخت کرد روشن سبق سرکشی از باد آتش

یہ شعر مشاعرۂ 'اعظم' کی ایک طرحی غزل کا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ اکثر شعرا نے ایک دوسرے کے قریب مضمون باندھا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ بینش کا شعر بینش ہی کا ہے' سب نے زور لگائے مگر اس شعر کو نہیں پہنچے۔ اور سنیئے :—

بیک اشارۂ ابرو بکشت چشم توام فدائے قاتل و قربان ایں خم و چم تیغ

ہمدماں از تپ نہ می دارم بلب تب خالۂ
در قفس از ناتوانیہا گرہ شد نالۂ

کیا پاکیزہ و نادر شعر کہا ہے' سبحان اللہ :—

دل بےمعرفت را با بتے کن آشنا زاہد چو مستاں برسر سنگے بزن مینائے خالی را

یہ بیت 'کلیم' ہمدانی کے مندرجۂ ذیل شعر سے تقریباً ہم مضمون ہے :—

ز سینہ ایں دل بےمعرفت را می کنم بیروں چرا بیہودہ گیرم در بغل مینائے خالی را

اس پر 'بینش' خود لکھتے ہیں کہ "مگر چشم انصاف ہو تو شعر میرا ہی ہے" حالانکہ یہ مضمون جناب نے اسی کلیم کے شعر سے اُڑایا ہے :—

زبس تاریک باشد کلبه ام از دود یارب ها
چراغم داغ حسرت می نماید در دل شب ها

کیا عمدہ شعر کہا ہے ' سبحان اللہ - اور دو چار شعر سن لیجئے :-

---

محفل عیش حریفاں به رخصت فردوس است   نیست صہبا کشی ما به بہاراں محتاج

کجا ز روی ادب خم شوند راست قداں   مگر بمصلحت تقلید پشت پیر کنند

اشکی که ضبط گشت بدل اضطراب شد   آوارگان کوئے ترا از وطن چه سود

بچشم اگرچه فتادم زبزم فیض تو دور   بدل چوں معنی برجسته بوده ام به حضور
اگر رحمے بمن داری بکش خنجر بکش ظالم   چنیں تاکے دل آزاری بکش خنجر بکش ظالم

بمحفل در آمد بت شوخ و شنگے   بکف سهم خامے ' بدل سخت سنگے
من از حسن اومست او مست نغمه   دل من به چنگش ' دل او به رنگے

چنیں سوزنده و بے پرده گستاخانه می آئی
مگر اے اشک گلگوں مست از میخانه می آئی

اور زیادہ ہم آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے خدا نے چاہا تو
پھر کسی صحبت میں دیکھ لیں گے —

ضرب الامثال اور اُن کے ماخذ

از

جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

(۱)

دنیا کی تمام زبانوں میں ضرب المثلیں اور کہاوتیں جس کثرت اور زیادتی کے ساتھہ پائی جاتی ہیں - یہ اُن کی بڑھی ہوئی مقبولیت کی دلیل ہے - دنیا کی کوئی قوم خواہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہو - یا وحشی اور جاہل - ایسی نہیں ملیگی جس کی مادری زبان میں ضرب المثلوں کا کافی ذخیرہ موجود نہ ہو - اور ہر چھوٹا بڑا مرد ہو یا عورت - شہری ہو یا دیہاتی اُن کو بلا تکلف سمجھتا اور استعمال نہ کرتا ہو - یہاں تک کے دیہات کی اَن پڑھ عورتوں تک کو صدھا مثلیں اور کہاوتیں زبانی یاد ہوتی ہیں -

ضرب الامثال کے چھوٹے چھوٹے مقفیٰ مگر سادہ جملوں میں کچھہ اس غضب کی دلچسپی اور دلکشی ہوتی ہے کے لٹریچر کے دوسرے اصناف اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں - اور یہی وجہ ہے کہ ضرب الامثال ہر شخص کی زبان پر بڑی آسانی سے چڑھ جاتی اور حفظ ہو جاتی ہیں - ضرب المثل کے ایک معمولی جملے میں جس قدر معنی اور مطلب پنہاں ہوتا ہے - بالیقین نثر عبارت کے لمبے لمبے فقرے بھی اسے پورے

طور پر ادا نہیں کر سکتے —

لٹریچر کا یہ اہم ترین سرمایہ عالم وجود میں کس طرح آتا ہے ؟ اس سوال کا جواب دینا جس قدر آسان ہے - اس کی مسلسل اور مکمل تاریخ بیان کرنی اسی قدر مشکل ہے - مثلوں کی ابتدا تو عام طور پر اس طرح ہوتی ہے کہ کسی خاص موقع پہ کسی شخص کی زبان سے بے ساختہ اور اتفاقیہ طور پر کوئی ایسا موزوں فقرہ نکل جاتا ہے جو اپنے اندر پیش آمد واقعہ کی تمام جزئیات کمال خوبی کے ساتھہ محفوظ رکھتا اور مختصر ہونے کے با وجود جامعیت الفاظ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے - رفتہ رفتہ یہ فقرے ایک شخص سے دوسرے کو پہنچتے اور نقل محفل بنتے رہتے ہیں- پھر آہستہ آہستہ کثرت استعمال سے کہاوت اور ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگتے ہیں - بعد زمانی کے ساتھہ ساتھہ واقعہ لوگوں کے حافظہ سے محو ہوتا جاتا ہے - اور پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ یہ کہاوت کب اور کس طرح شروع ہوئی تھی ؟ اور یہ فقرہ کس نے کس موقع پر استعمال کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم مثلیں ایسی ہیں جن کی ابتدا اور ماخذ کو ہم تاریخ کی روشنی میں بالتفصیل بیان کر سکتے ہیں - مگر افسوس ہے کہ اردو زبان کا دامن اُس سے بہت حد تک خالی ہے - یہاں ابھی تک لٹریچر ہی کی کوئی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی ضرب الامثال کو تو کون پوچھتا - اور حقیقت یہ ہے کہ اردو میں اس کی مکمل تدوین ہے بھی نا ممکن بات - کیونکہ ہر مثل کے ماخذ کتابی یا روایتی طور پر ہمارے پاس محفوظ نہیں - صرف چند گنتی کی ضرب الامثال ایسی ہیں جن کے متعلق ہماری ادب کی کتابوں میں کچھہ اشارات ملتے ہیں - اور اُن میں بھی غالب حصہ گھڑی ہوئی اور فرضی حکایتوں کا ہے جو بے فکر اصحاب نے فرصت میں

بیٹھ کر تصنیف کی ہوں گی - بالخصوص وہ کہانیاں جو جانوروں کی زبان سے بیان کی گئی ہیں ظاہر ہے کہ سراسر مصنوعی ہوں گی - مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہیں دلچسپ اور مزیدار —

زیر نظر مضمون میں ہم نے اس قسم کی وہ تمام حکایتیں جمع کر دی ہیں جو اردو ضرب الامثال کے ماخذوں کے طور پر مشہور ہیں اور ادب و تاریخ کی کتابوں میں لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں - عام اس سے کہ وہ تاریخی واقعات پر مبنی ہیں یا محض تفنن طبع کے لیے فرضی طور پر بنالی گئی ہیں - البتہ مضمون کی ترتیب میں ایک بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور وہ یہ کہ ایسی تمام ضرب الامثال کی متعلقہ حکایات سے اس مضمون کو پاک رکھا گیا ہے جو فحش یا خلاف تہذیب تھیں - یا پھر ایسی تھیں جو کسی قوم یا ملت کے لیے ناگواری یا دل آزاری کا باعث ہو سکتی تھیں - تمام ضرب الامثال کو حروف تہجی کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے - اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر ضرب المثل کے ساتھ اس کا مطلب اور صحیح محل استعمال بھی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے - خدا کرے کہ قارئین کرام مضمون کو دلچسپ پائیں —

آب آب کر مرگئے اور سرہانے دھرا رہا پانی

جب کوئی شخص عرصہ دراز تک غیر لوگوں میں رہنے کے بعد اپنے وطن واپس آئے اور وہاں رہنے کی وجہ سے اپنے ہاں کے محاورے اور زبان بھول جائے - اور وہیں کی بولی بولے جہاں وہ عرصہ تک رہ کر آیا ہے اور پھر اس وجہ سے اُسے کچھ نقصان پہنچ جائے تو ایسے موقع پر یہ مثل بولا کرتے ہیں - کہتے ہیں کہ اس مثل کی ابتدا اس طرح ہوئی

کہ ایک مرتبہ کسی بنئے کو آب و دانہ کی کشش کابل کھینچ کر لے گئی۔ جہاں اُس کو بہت دنوں تک رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس عرصہ میں بہت سے فارسی الفاظ اس کی زبان پر چڑھ گئے۔ مدت کے بعد گھر آیا تو چونکہ عرصہ سے مادری زبان بولنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور قوت حافظہ بھی کمزور تھی اس لیے اپنی زبان کے بہت سے الفاظ بھول گیا۔ شامت اعمال کہ آتے ہی سخت بیمار پڑ گیا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آ پہنچا۔ نزع کی حالت میں پیاس کی جو شدت ہوئی تو لگا "آب آب" کرنے۔ گھر والوں نے یہ انوکھی بولی کبھی کاہے کو سنی تھی۔ خاک نہ سمجھے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ آخر وہ بیچارہ آب آب کرتا مر گیا مگر اسے پانی نہ مل سکا۔ بعد میں گھر والوں کو پتہ چلا کہ دراصل وہ پانی مانگ رہا تھا اور لطف یہ کہ پانی اس کے پلنگ کے پاس ہی رکھا تھا۔ ایک زندہ دل نے بھی یہ واقعہ سنا تو بیساختہ یہ دوہا کہا --

کابل گئے بانیا اور سیکھی مغل کی بانی آب آب کر مر گئے سرہانے دھرا رہا پانی

اُسی وقت سے اس کا دوسرا مصرع بطور ضرب المثل مشہور ہو گیا —

آپ خورادے آپ مرادے

یہ مثل خود رائے شخص کے متعلق بولتے ہیں۔ اس کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ کوئی شہزادہ گردش روزگار کے ہاتھوں تنگ آکر گھر سے نکل کسی دور و دراز سفر پر روانہ ہوگیا۔ اس غربت میں کوئی غلام ساتھ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ سلطنت کی بو دماغ میں سمائی ہوئی تھی جب منزل پر پہنچتا تو اترتے ہی کہتا " کوئی حاضر ہے؟" پھر خود ہی کہتا " صاحب عالم حاضر "۔ پھر فرضی حکم دیتا " پلنگ پر

بچھونا بچھاؤ - خاصہ تیار کرو - پان لگاؤ" - اور خود ہی جواباً کہتا "بہتر حضور" پھر خود بچھونا بچھاتا کھانا تیار کرتا پان لگاتا - اور اس کے بعد کہتا "کوئی حاضر ہے"؟ پھر خود ہی جواب دیتا "صاحب عالم حاضر" حکم دیتا "اچھا کھانا لاؤ" - پھر خود ہی کھانا نکالتا اور کھا پی کر کہتا "کوئی حاضر" پھر خود ہی کہتا "غریب پرور حاضر" - کہتا - "ہاتھ دھلاؤ - پانی پلاؤ" ہاتھ وغیرہ خود دھوکر پھر کہتا "کوئی حاضر" پھر خود ہی کہتا "حضور حاضر" اس کے بعد کہتا "اچھا حقہ بھر لاؤ" پھر خود ہی اٹھتا اور حقہ بھر کر پینے لگتا - غرض اس نے اپنا تمام سفر اسی طرح طے کیا - اس کی اس حالت کو دیکھ کر کسی نے مندرجہ بالا فقرہ کہا - جب سے مشہور ہوگیا —

آپ سے آئے تو آنے دے

یعنی جو چیز خود بخود بغیر طلب اور کوشش کے ہاتھ لگے، اس کے لے لینے میں کچھ مضائقہ نہیں- کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی قاضی صاحب کے گھر میں اتفاقاً محلہ کی ایک مرغی چلی گئی- بیوی نے پکڑ ذبح کر لی اور چولھے پر چڑھا دیا - قاضی صاحب اس وقت کہیں گئے ہوے تھے - واپسی پر یہ قصہ معلوم ہوا تو گھر والوں پر قیامت آگئی - سخت ناراض ہوئے- آخر بیوی نے کہا - "اب تو سہواً یہ گناہ ہوگیا، آئندہ کے لیے عہد کرتی ہوں کہ غیر کی چیز کبھی آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھوں گی - اگر آپ حکم دیں- تو پکی پکائی ساری ہنڈیا باہر پھنکوا دوں - مگر گھی اور مصالحہ اس میں بہت سا ڈالا تھا وہ سب ضائع جائے گا - لیکن اب جو آپ کا ارشاد ہو" - قاضی صاحب نے سوچا یہ تو بری ہوئی، گھی وغیرہ کو ہرگز ضائع

نہ جانے دینا چاہئے اس پر رقم خرچ ہوئی ہے۔ یہ سوچ کر کہنے لگے " نہیں پھینکنے کی کیا ضرورت ہے، ہم تو صرف شوربے سے لگا لگاکر روٹی کھا لیں گے۔ کچھ مضائقہ اور پانی تو ہمارا اپنا ہے، لہذا بہر حال پاک ہے۔ باقی ہڈی بوٹی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں"۔ جب کھانا پک کر تیار ہوگیا اور خادمہ رکابی میں شوربا انڈیلنے لگی تو اتفاقاً تین چار بوٹیاں بھی ہنڈیا میں سے رکابی میں آپڑیں۔ خادمہ نے بوٹیوں کو اٹھاکر دوبارہ ہنڈیا میں ڈالنا چاہا۔ قاضی صاحب نے دیکھ لیا۔ زور سے للکارا " او نم بخت! کیا غضب کرتی ہے۔ آپ سے آئے تو آنے دے"۔ اس پر بیوی نے دبی آواز سے کہا مرغی بھی تو خود ہی آئی تھی، کون سی میں اسے بلانے گئی تھی" قاضی صاحب بولے "اخوہ! یہ بات ہے۔ تم نے مجھے پہلے سے نہ بتایا۔ بیشک اب یہ مرغی حلال ہے، خوب کھاؤ"۔ اور خادمہ جو سالن نکال رہی تھی اس سے کہنے لگے۔ " لابھئی! چار پانچ اچھی اچھی بوٹیاں میری رکابی میں اور ڈالدے"۔ خادمہ نے اس واقعہ کا محلہ والوں سے ذکر کیا۔ چونکہ دلچسپ تھا، فوراً سارے شہر میں مشہور ہوگیا۔ اور بعد میں بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

آپ موئے جگ پرلو

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خود ہی مرگئے تو دوسروں کی کیا پروا۔ چاہے مریں چاہے زندہ رہیں ہمارے نزدیک تو اپنے مرنے کے ساتھ ہی دنیا میں قیامت آجاتی ہے۔ اس مثل کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اتفاقاً کوئی شخص دریا میں ڈوبنے لگا۔ اس نے شور مچایا کہ لوگو! مجھے نکالو ورنہ ابھی ساری دنیا ڈوب جائیگی۔ لوگ

دوڑ پڑے اور اسے بمشکل دریا میں سے نکالا - جب ذرا کچھ ہوش آیا تو اس سے پوچھا "کیوں بھائی! تیرے اکیلے کے ڈوبنے سے ساری دنیا کس طرح ڈوب جاتی؟" اس نے جواب دیا "تم سب لوگ عقلمند ہو - ارے میاں " آپ موے جگ پرلو " - مجھے کیا فائدہ اگر میرے بعد کوئی زندہ رہے - میرے نزدیک تو میرے مرنے کے ساتھ ہی قیامت آجاتی' - چونکہ فقرہ موزوں تھا - بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

آپ ہی کے جوتیوں کا صدقہ ہے .

یہ مثل از راہ ظرافت اس موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی بے تکلف دوست کی دعوت یا خاطرداری میں اپنی گرہ سے کچھہ خرچ نہ ہوا ہو اور بے خبری میں اسی دوست کی کوئی چیز رہن یا بیع کر کے اس کی دعوت کا سامان کیا گیا ہو - اس مثل کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص کو دوستوں نے مجبور کیا کہ ہماری دعوت کرو - وہ صاحب بھی نہایت ہوشیار واقع ہوئے تھے کچھہ سوچ کر جھٹ منظور کرلیا اور کہنے لگے " جمعہ کے دن سب دوست آجائیں انشاالله دعوت کا انتظام خاطرخواہ ہو جائے گا " - روز معینہ پر سب دوست ان کے مکان پر پہنچ گئے - آپ نے سب کو نہایت تپاک کے ساتھ ایک دالان میں بٹھایا - جب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھہ گئے تو ایک ملازم کو اشارہ کیا جس کو پہلے ہی سے سب کچھہ سمجھا رکھا تھا - اس نے نہایت خاموشی اور ہوشیاری کے ساتھ سب حاضرین کی جوتیاں اٹھائیں اور بازار میں جاکر اونے پونے فوراً نیلام کرڈالیں - اور وصول شدہ رقم سے بہت پھرتی کے ساتھ نہایت پرتکلف کھانا تیار کر کے مہمانوں

کے سامنے لاکر چن دیا۔ مہمانوں میں سے بعض احباب کہنے لگے "حضرت! آپ نے اس قدر تکلف کیوں کیا؟ بڑی تکلیف ہوئی"۔ مہربان صاحب تو مطمئن تھے کہ گھر سے دھیلا خرچ نہیں ہوا اور دعوت مفت میں ہوگئی۔ آپ نے نہایت متانت کے ساتھ جواب دیا کہ "جناب میں کس لایق ہوں۔ یہ بھی جو کچھ تھوڑا بہت ہوگیا ہے محض آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے"۔ جب دوست دعوت سے فارغ ہوئے اور جوتیوں کی تلاش کرنے پر ان پر اصل حال منکشف ہوا تو نہایت نادم ہوئے۔ اور غم و غصہ کھاتے ہوئے ننگے پاؤں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ اور پھر کبھی ان سے دعوت کی فرمائش نہیں کی۔ چونکہ واقع مضحکہ خیز اور پر لطف تھا بہت جلد سارے شہر میں پھیل گیا۔ اور بعد میں یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔

آتا ہے تو ہاتھ سے نہ دیجئے جاتا ہے تو غم نہ کھیجئے

یعنی جو شے حاصل ہورہی ہو اس کو چھوڑ مت اور جو ہاتھ سے جاتی رہے اس کا افسوس نہ کر۔ اس مثل کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کوئی مینا کسی چڑی مار کے جال میں پھنس گئی اور رہائی کی کوئی صورت نہ دیکھ کر چڑی مار سے کہنے لگی کہ اگر تو مجھے چھوڑ دے تو میں تجھے ایسی تین بڑی بڑی باتیں بتاؤں گی جن سے تجھے آیندہ زندگی میں بڑا ہی فائدہ اور نفع ہوگا۔ چڑی مار نے کہا۔ اچھا بیان کر۔ مینا بولی پہلی بات تو یہ ہے کہ —

سن کوئی ہزار کچھ سنائے - کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے

دوسری نصیحت یہ ہے کہ :—

قابو ہو تو کیجئے نہ غفلت - عاجز ہو تو ہارئے نہ ہمت

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ :—

آتا ہو نرھا تو، سے نہ دیجئے - جاتا ہو تو اس کا غم نہ کھجئے

چڑی مار کو یہ نصیحتیں پسند آئیں اور مینا کو چھوڑ دیا - وہ سامنے کے درخت پر جا بیٹھی اور کہنے لگی - تو نے مجھے ناحق چھوڑا - میرے پیٹ میں ایک نہایت بیش قیمت ہیرا ہے ' اگر تو مجھے حلال کرتا تو اس ہیرے کو فروخت کر کے بڑا مالدار بن جاتا - یہ سن کر چڑی مار بہت پچھتایا اور افسوس کرنے لگا - مینا یہ دیکھ کر بولی "تو بڑا بے وقوف ہے - اس قدر جلد میری نصیحتوں کو بھول گیا - اگر میری باتوں کو یاد رکھتا تو ہرگز مجھے نہ چھوڑتا - اور جب چھوڑ دیا تھا تو اب افسوس نہ کرتا - عقلمند' کہیں پرندہ بھی ہیرے نگلتے ہیں - یہ فقرہ تو میں نے صرف تیرے حافظہ اور عقل کا امتحان لینے کے لئے کہا تھا ورنہ میرے پیٹ میں ہیرا کہاں" - یہ کہا اور اُڑ گئی —

آدھے قاضی قدوہ آدھے باوا آدم

یہ مثل ایسے موقع پر بولا کرتے ہیں جہاں کسی شخص کی بہت کثرت کے ساتھ اولاد ہو اور اس کی اولاد کی بہتات دکھانی منظور ہو - کہتے ہیں کہ دسویں صدی ہجری میں اودھ کے کسی شہر میں ایک قاضی صاحب رہتے تھے - "قدوہ" ان بزرگ کا نام تھا - قاضی جی کی بیویاں خیر سے ایسی بھاگوان تھیں کہ اُن کے ستر بیٹے پیدا ہوئے - بادشاہ نے جو دیکھا کہ بیچارے قاضی جی بہت کثیرالعیال آدمی ہیں تو اس نے ازراہ مراحم خسروانہ ، قاضی جی کو اودھ کے صوبہ میں ستر گاؤں جاگیر میں دیدیے تاکہ اپنا اور اپنے بچوں کا بہت آسانی سے پال سکیں —

اس وقت سے کثیر الاولاد انسان کے لیے قاضی قدوہ کا نام بطور ایک ضرب المثل کے استعمال ہونے لگا - اس کے متعلق کسی شخص کا مصرع بھی ہے ع —

قدوہ نمود خلق میں آدم سے کم نہیں

آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

ایسی بے خبر عورت کے متعلق بولتے ہیں کہ چاہے اس کے سامنے اس کا کتنا ھی نقصان ھوجاے مگر اسے مطلق خبر نہ ھو - کہتے ھیں کہ یہ فقرہ سب سے پہلے حضرت امیر خسرو کی زبان سے نکلا تھا - چونکہ نہایت موزوں تھا - بطور ضرب المثل لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا - اس کا قصہ یوں ھے کہ ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو کہیں جارھے تھے راستے میں پیاس جو لگی تو ایک کنوئیں پر پانی پینے کھڑے ھوگئے وھاں اس وقت چار پنہاریاں پانی بھر رھی تھیں - یہ کہنے لگے ' ذرا سا پانی پلا دو - انہوں نے نام پوچھا - امیر خسرو نے اپنا نام بتایا - تو انہوں نے کہا " ہم نے سنا ھے آپ بڑے شاعر اور تک بند ھوں - ھم چاروں ایک ایک چیز کا نام لیتی ھیں ، ان سب کو ایک شعر میں جوڑ دو تو پانی پی لو" - امیر خسرو مسکراے اور کہنے لگے " واہ اچھی جگہ شاعری کا امتحان دینا پڑا - اچھا بہلو! یہ بھی سہی - مجھے تو پانی پینا ھی ھے - اپنا اپنا لفظ بیان کرو" - اس پر ایک بولی ' کھیر ' دوسری نے کہا ' چرخا ' تیسری نے کہا ' کتا ' چوتھی نے جواب دیا ' ڈھول ' - امیر خسرو نے پھرتی کے ساتھ جواب دیا لو تمہارا شعر بن گیا - لاؤ پانی اور جھٹ ایک دوھا سنا دیا - جو یہ تھا -

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا - آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا -

پنہاریاں اس حاضر جوابی پر حیران رہ گئیں اور امیر خسرو نے پانی پی کر اپنی راہ لی - بعد میں اس کا دوسرا مصرع ایک ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا —

ابے چھوڑ میرا پاؤں دکھتا ہے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں بڑی ہوشیاری کے ساتھ اچانک کسی کو دھوکا دیا گیا ہو - اس مثل کی ابتدا یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ ایک چور نے رات کے وقت کسی مکان میں نقب لگائی اتفاقاً گھر والے جاگ اٹھے - اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ نقب لگائی جا رہی ہے تو گھر والوں میں سے ایک شخص خاموشی کے ساتھ نقب کے دہانے پر جا کھڑا ہوا - چور ایسے موقع پر بجائے سر کے احتیاطاً پہلے اپنے پاؤں اندر داخل کیا کرتے ہیں - چنانچہ اس چور نے بھی پہلے اپنی ایک ٹانگ باہر نکالی - آدمی موقع کا منتظر کھڑا ہی تھا فوراً اسے مضبوط پکڑ لیا - ادھر چور بھی کوئی فطرت انسانی سے واقف اور نہایت ہوشیار تھا - جھٹ کہنے لگا - "ابے چھوڑ میرا پاؤں دکھتا ہے" - اس شخص نے گھبرا کر پاؤں چھوڑ دیا - اور چور صاحب فوراً فرار ہوگئے - بعد میں آپ کو نہایت افسوس ہوا کہ میں چور کے فقرے میں آن کر گھبرا گیا اور اس کا پاؤں چھوڑ دیا - مگر اب وقت ہاتھ سے جا چکا تھا یار لوگوں نے جو یہ قصہ سنا تو ان کو دل لگی کے لیے ایک عمدہ موقع ہاتھ آیا اور مدتوں وہ ان کا مذاق اڑاتے رہے —

اترا شحنه مردک نام

جب کوئی معزز اور صاحب اختیار شخص ذلیل اور معزول ہو جاتا ہے، یہ مثل اس کے لیے بولتے ہیں - اس کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک شہر کا کوتوال نہایت ظالم اور جابر تھا - شہر کے لوگ اس کے ہاتھ سے بہت تنگ تھے - گردش زمانہ سے کوتوال کسی مقدمے میں پھنس کر نوکری سے برخاست ہو گیا - جب اپنے وطن کو جانے لگا تو شہر کے لوگوں نے جو اس سے بہت جلے ہوئے تھے پکڑ کر خوب مارا، یہاں تک کہ ادھ موا کردیا - اور مار مور سڑک پر چھوڑ کر چل دیے - ایک عقلمند نے یہ کیفیت دیکھی تو مذکورۂ بالا فقرہ کہا، جو بعد میں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوگیا - شحنہ کے معنی کوتوال یا محافظ کے ہیں —

اڑھائی پہر کی سقے نے بھی بادشاہت کی ہے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی چھوٹے درجہ کا انسان چند روز کےلئے عروج پر پہنچ جاے - اس مثل کی ابتدا ایک تاریخی قصہ سے ہوتی ہے - اور وہ یہ ہے کہ جب ہمایوں کو شیرشاہ کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور تمام شاہی لشکر تتر بتر ہوگیا تو مجبوراً ہمایوں کو بھی راہ فرار اختیار کرنی پڑی - دریا پر پہنچا تو پار اترنے کا کوئی ذریعہ نظر نہ آیا - دشمن تعاقب میں تھا اور گرفتاری میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی کہ عین وقت پر اس کی فوج کے ایک سقے نظام محمد نامی نے اپنی مشک پر بٹھاکر اُس پار پہنچادیا - اوراس طرح ہمایوں کی جان بچ گئی - موت کے منہ سے اس طرح بچ نکلنے سے ہمایوں سقے کا نہایت ممنون ہوا اورکہنے لگا - شاباش! تو نے اس وقت خوب حق نمک ادا کیا - مانگ

کیا مانگتا ہے - سقہ نے ہاتھہ جوڑ کر عرض کی جہاں پناہ اس وقت حضور پر وقت پڑا ہے میں کچھہ نہیں چاہتا - خدا کرے جب حضور کو دوبارہ تخت شاہی نصیب ہو تو صرف ڈھائی پہر کی بادشاہی مجھے مرحمت فرمائیں - ہمایوں نے نہایت خوشی سے اس بات کو منظور کرلیا - اور دونوں جدا ہوگئے - ہمایوں چھپتا چھپاتا ایران پہنچا - اور وہاں سے فوج لاکر دوبارہ تخت حاصل کیا - اتنا عالی ظرف اور نیک دل بادشاہ تھا کہ اتنے عرصے کے بعد بھی اپنے اقرار کو نہ بھولا اور بادشاہی ملتے ہی نظام سقہ کو بلایا اور اعیان و ارکان سلطنت سے کہہ دیا کہ ڈھائی پہر تک میاں نظام کی حکومت ہے تم سب اس کی تابعداری کرو - نظام نے نہایت چالاکی اور پھرتی کے ساتھہ اس قلیل عرصہ میں چمڑے کا سکہ چلا کر ہزاروں اور لاکھوں روپے پیدا کرلئے اور پشتوں تک اپنے خاندان میں دولت و ثروت کی جڑ جمادی ــ

اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی

اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ اکیلے سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں - اس مثل کی ابتدا کے متعلق جو قصہ بیان کیا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہے -

دھلی سے دس میل فرید آباد کے قریب ایک نالہ ہے - وہاں درختوں کے جھنڈ بکثرت ہیں - ایک بڑھیا اس نالے پر بیٹھہ کر آنے جانے والوں سے بھیک مانگا کرتی تھی - اور اس کے بیٹے پوتے وغیرہ آس پاس درختوں میں چھپے رہتے تھے - جب ایک دو مسافر ادھر سے گذرتے تو بڑھیا صدا لگاتی " اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی " - اس پر وہ چور درختوں سے نکل کر اس کا مال و اسباب لوٹ لیتے - اور جب کبھی زیادہ مسافروں کا مجمع ادھر سے

کوئی شخص باوجود مالدار ہونے کے اپنے آپ کو نہایت غریب اور مفلس بتائے اس کے متعلق بولا کرتے ہیں —

ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب ایک خاندان، ایک گھرانے کا کوئی فرد یا دو بھائی بہنوں میں سے کوئی ایک یہ ظاہر کرنا چاہے کہ میں اپنے بھائی یا اپنے گھر یا خاندان کے دوسرے شخص سے کسی بات میں کم نہیں ہوں - اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ کسی مقام پر دو سگی بہنیں تھیں - بڑی تو چست و چالاک اور صورت شکل کی اچھی تھی - مگر چھوٹی سست اور مجہول ہونے کے ساتھ بد صورت بھی تھی - جب ان کے والدین کا انتقال ہوگیا تو تمام مال و دولت پر بڑی بہن قابض ہو گئی - چھوٹی بہن نے ترکے میں سے اپنا حصہ مانگا تو بڑی بہن نے کہا "ذرا اپنی صورت تو دیکھ یہی شکل حصہ لینے کی ہے تجھ جیسی کالی کلوٹی کو کون میری بہن کہے گا" اس پر چھوٹی بہن نے جواب دیا کہ "بہن اپنی صورت پر مغرور مت ہو - ہم دونوں ایک توے کی روٹیاں (یعنی ایک ہی ماں باپ کی بیٹیاں) ہیں - اور "ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی" سب برابر ہیں - اگر تیری صورت اچھی ہے اور میں بد صورت ہوں تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ترکے میں میرا کچھ حصہ نہیں - جب سے یہ مثل بولی جانے لگی —

این ہم بر بالائے علم

یہ فارسی ضرب المثل اردو میں بھی مستعمل ہے اس لئے یہاں لکھی

گئی - اس کے معنی ہیں "یہ بھی جھنڈے کے اوپر" - جب آدمی پہلی مرتبہ کوئی گناہ کرنے کے بعد پھر وہی گناہ کرنے لگے اور اس وقت اسے کوئی منع کرے مگر خود اس کا دل وہ گناہ کرنے کو چاہتا ہو تو ایسے موقع پر گناہ کا مرتکب یہ مثل استعمال کرتا ہے - اس کہاوت کی ابتدا کس طرح ہوئی اس کے متعلق یہ دلچسپ قصہ مشہور ہے کہ ایک درزی تھا جو عام درزیوں کی طرح جو کپڑا اس کے پاس سلنے کے لیے آتا اس میں سے ضرور کچھ نہ کچھ چرا لیا کرتا - مدت تک وہ اسی طرح کرتا رہا - ایک مرتبہ اس نے خواب میں دیکھا کہ دوزخ کے اندر ایک بہت اونچا علم گڑا ہوا ہے - اور اس کے اوپر وہ تمام کپڑے ٹنگے ہوے ہیں جو اس نے اب تک ہزارہا لوگوں کے چرائے تھے - یہ دیکھ کر اسے بڑی عبرت اور ندامت ہوئی - آنکھ کھلی تو بڑے خشوع و خضوع سے توبہ کی اور پکا ارادہ کر لیا کہ آئندہ ہرگز کسی کا کپڑا نہ چراؤں گا - خیر تھوڑے دن تک تو توبہ قائم رہی مگر ایک روز ایک نہایت خوبصورت اور نفیس کپڑا اس کے پاس سلنے کے لیے آیا، جس کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ میں پانی بھر آیا - اور دل چاہا کہ اس میں سے تو جس طرح بن پڑے کچھ نہ کچھ کپڑا چرانا چاہئے - یہ خیال آتے ہی معاً وہ دوزخ والا جھنڈا اس کی آنکھوں کے آگے پھرنے لگا - مگر لالچ بری بلا ہے - اس کا دل بے اختیار کپڑا چرانے کو چاہ رہا تھا - اب وہ چکّر میں پڑ گیا - کبھی کپڑے کی خوبصورتی اور نفاست کا لالچ آتا، کبھی دوزخ والے جھنڈے کا خیال کرکے کانپ اٹھتا، کبھی دل کی ملامت پر نظر کرتا - لیکن جب بالکل نہ رہ سکا تو آخر یہ کہہ کر کہ "این ہم بر بالاے علم" فوراً اس میں سے کچھ کپڑا کاٹ لیا - یعنی جہاں اور ہزاروں کپڑے علم پر ٹنگے ہوے ہیں وہاں اگر

یہ کھوا بھی جھلنے پر تنگ جاے تو کیا مضائقہ ہے - جہاں مردے پر سو من مٹی وهاں سوا سو من سہی - اس وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

بارہ برس سیئی کاشی مرنے کو چلے مگدہ کی پاٹی

یہ مثال ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں ساری عمر کوئی شخص نیک اور اچھے کام کرتا رہے مگر بڑھاپے اور آخری عمر میں برے کام کرنے شروع کردے اور اسی حالت میں دنیا سے گذر جاے - اس مثل کے متعلق یہ قصہ کتابوں میں لکھا ہے کہ کہتے ہیں کہ مگدہ دیش کا ایک راجہ اپنا راج پاٹ چھوڑ کر مکتی کی امید میں کاشی جی یعنی بنارس آرہا تھا - کیونکہ اہل ہنود کے اعتقاد کے موافق کاشی کی سرزمین میں جس شخص کی موت آجاے وہ مرتے ہی سورگ (بہشت) میں پہنچ جاتا ہے - چنانچہ راجا صاحب بھی اسی امید میں یہاں آکر رہے کہ زندگی کے آخری ایام اب یہیں پورے کریں گے - بہت دن تک تو بیچارے نہایت صبر و استقلال سے بیٹھے رہے - مگر آخر کو خبر نہیں کیا بات ہوئی کہ یہاں رہتے رہتے دل گھبرا گیا اور واپس اپنی راجدھانی کو چلے گئے - خدا کی قدرت وهاں جاتے ہی مرگئے - اور یہ حسرت کہ کاشی میں میرا انتقال ہو اپنے ساتھ لے گئے - کسی سادھو نے بھی یہ واقعہ سنا تو بیساختہ اس کی زبان سے مذکورۂ بالا فقرہ نکلا - چونکہ موقع کی بات تھی اور پھر موزوں بھی لہذا بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگی —

بارہ وفات کی کھچڑی آج ہے کل نہیں

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں حالات جلد جلد بدل جاتے

ھوں - یا کسی ناپائدار شے کے متعلق اشارہ کرنا ھو - چند روزہ خوش حالی اور عیش کسی کو نصیب ہو جائے اور وہ اس کا اہل نہ ھو تو اس کے متعلق بھی کہا کرتے ھیں کہ میاں اُس کے پاس تو دولت بارہ وفات کی کھچڑی ھے - اس مثل کی اصل یہ بیان کی جاتی ھے کہ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ھوا تھا - عوام لوگ اسے بارہ وفات کہتے ھیں اور اُس دن کھانا وغیرہ پکا کر غربا میں تقسیم کرتے ھیں - دھلی میں "قدم شریف" ایک بہت مشہور درگاہ ھے - وھاں اس موقع پر بہت دور دور سے ھزاروں ملنگ اور فقیر آ آ کر جمع ھوتے ھیں اور اھل دھلی کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر کھچڑی وغیرہ پکوا کر انھیں کھلائی جاتی ھے اور سب ایک دن میں ختم ' اگلے دن کے لئے بچتی ھی نہیں - بارہ دن تک یہی سلسلہ جاری رھتا ھے - جب سے قدم شریف میں اس بارہ روز کی کھچڑی کا سلسلہ شروع ھوا اُس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی -

---

بالوں کے مونڈنے سے مردہ ھلکا نہیں ھوتا

یہ مثل کسی ایسے موقع پر بولتے ھیں جہاں کسی پر کوئی مصیبت پڑی ھو اور کوئی آدمی آ کر بہت معمولی طور پر تسکین آمیز کلمات کہہ کر امید رکھے کہ بس اس کو صبر آگیا - یا ایسے موقع پر بولتے ھیں جہاں مثلاً کسی شخص کے ماھانہ اخراجات بہت زیادہ ھوں اور اُس کا کوئی دوست اُسے اخراجات کے کم کرنے کی نصیحت کرے ' مگر بہت ھی معمولی اور خفیف خرچ کے متعلق کہے کہ اس خرچ کو بند کردو - تو وہ شخص کہے کہ " اس معمولی خرچ کے گھٹا دینے سے خرچ میں کیا تخفیف ھو سکتی ھے - کہیں بالوں کے مونڈنے سے بھی مردہ ھلکا ھوا ھے" - اس مثل کے متعلق

یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص مرگیا۔ لاش تھی بھاری، چار آدمیوں کو اُسے اُٹھانا مشکل ہوگیا۔ ایک " عقلمند " نے مشورہ دیا کہ " بھائیو! چار سے زیادہ آدمی تو جنازہ کہیں بھی اور کسی قوم میں بھی نہیں اُٹھاتے، بہتر یہ ہے کہ اُس کے سر پر جو بالوں کا بھاری بوجھ ہے اُنہیں مونڈ دو تاکہ مردہ کچھہ تو ہلکا ہو"۔ ایسی تقریب غم پر ایسی مضحکہ خیزبات کا ہونا اس مثل کے بننے کا موجب ہوا —

بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا

یہ مثل ایسے موقع پر بولا کرتے ہیں جب کوئی شخص اپنی پرفریب باتوں سے کسی کو دھوکا دینا چاہے اور وہ شخص اُس کی چال کو سمجھہ کر اُس کے دھوکے میں نہ آے۔ اس مثل کے متعلق یہ کہانی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کوئی بلی نہایت فریب اور مسکین شکل بنائے ایک جگہہ کھڑی تھی اتفاقاً ایک چوہا ادھر آنکلا۔ بلی نے نہایت پھرتی کے ساتھہ فوراً اس پر حملہ کیا۔ مگر چوہا معاً ایک بل میں گھس گیا مگر اپنی دم بلی کے منہ میں چھوڑ گیا - بلی کو شکار کے نکل جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ نہایت متانت سے کہنے لگی "واہ میاں چوہے ڈر گئے۔ میں تو تمہارے ساتھہ دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتی ہوں اور تم سے محض مذاق کرتی تھی - تم نے شاید کچھہ اور سمجھہ لیا۔ آؤ، باہر آؤ ' میں تمہاری دم کو جوڑ دوں - لنڈورے بہت برے معلوم ہوگے "۔ چوہا ایک جہاندیدہ تھا۔ اُس نے سمجھہ لیا مکاری کی باتیں کرتی ہے۔ میں باہر نکلا اور مارا گیا - اس لئے اُس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے کہا " بخشو بی بلی! چوہا لنڈورا ہی بھلا "۔ اس پر بلی مایوس ہوکر چلی گئی —

بڑھیا کے مرنے کا رنج نہیں مگر فرشتوں نے گھر دیکھہ لیا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی خفیف نقصان ہونے کے بعد کسی بڑے نقصان کا احتمال ہو۔ اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی بنیے کی بوڑھی خادمہ مر گئی۔ خیر کریا کرم کے بعد اُس نے بے تحاشا رونا اور واے ویلا کرنا شروع کیا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ بھائی آخر اس قدر آٹھہ آٹھہ آنسو کیوں روتے ہو؟ پرماتما کی مرضی آخر بڑھیا تھی کب تک جیتی؟ بنیا کہنے لگا۔" یارو! بڑھیا کے مرنے کا تو رنج نہیں، اچھا ہوا مرگئی، اب اس سے کام بھی نہیں ہو سکتا تھا مگر مجھے فکر تو اس بات کا ہورہا ہے کہ اب فرشتوں نے گھر دیکھہ لیا ہے۔ ہمیشہ آئیں گے اور ایک نہ ایک کو مار جایا کریں گے "۔ اُس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی —

بلی کی میاؤں کو کون پکڑے گا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں بعض لوگ بیٹھے ہوئے یہ شیخی مار رہے ہوں کہ " ہم اپنے دشمن اور مخالف کی اصل ہی کیا سمجھتے ہیں "؟ " وہ ہے کیا چیز "؟ "اُس کی حقیقت ہی کیا ہے "؟ " ہمارے سامنے آئے تو ہم اُسے یوں نیچا دکھائیں " " یوں ذلیل کریں " " یوں شکست دیں " " یہ کریں اور وہ کریں" اور عین اُس وقت کوئی شخص پاس سے بول اُٹھے کہ یہ تو سب کچھہ سچ ہے کہ آپ سب کچھہ کرلیں گے مگر یہ تو بتاؤ کہ " بلی کی میاؤں کو کون پکڑے گا "۔ مطلب یہ ہے کہ ظالم اور دشمن جس وقت سامنے آگیا تو کمزور آدمی کے لئے محض اُس کا خوف اور دہشت ہی ہوش و حواس کھونے کے لئے کافی ہیں۔ اور اُس وقت سواے

بھاگنے اور فرار ہونے کے اور کچھہ نہیں سوجھتا - اس مثل کے متعلق آپ نے یہ کہانی غالباً پڑھا سنی ہوگی کہ ایک بلی تھی - اُس نے چوہوں کو بے حد پریشان کر رکھا تھا - روزانہ آٹھہ سات کو شکار کرتی اور نوش جان کر جاتی - سخت مجبور اور لاچار ہوکر اس بلاے بے درمان سے نجات حاصل کرنے کے ذرائع پر غور کرنے کے لئے چوہوں کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا - اور اس میں متفقہ طور پر یہ تجویز ہوئی کہ بلی کو ہلاک کر دیا جائے تاکہ اس مصیبت سے نجات مل جائے - اس جہاد عظیم کے لئے چند دلیر اور من چلے چوہے تیار ہوے - ان میں سے ایک بولا ' میں لپک کر بلی کے ہاتھہ کو چمٹ جاؤنگا اور ناخن کتر ڈالوں گا تاکہ وہ پنجوں سے پکڑنے کے ناقابل ہو جائے - دوسرے نے کہا ' میں ناک پکڑ کر لٹک جاؤں گا - تیسرے نے کہا میں کان پکڑ کر گھسیٹ لونگا - چوتھے نے کہا ' میں گردن پر جا بیٹھوں گا اور کلہ پکڑ کر کتر ڈالوں گا - دو تین تیار ہوئے کہ ہم دم پکڑے رہیں گے تاکہ وہ بھاگ نہ جائے -

جب تمام چوہے اس طرح سر گرم سخن تھے اور ہر ایک بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا تو ایک بوڑھا چوہا الگ خاموش بیٹھا تھا - چوہوں نے اُسے چپ دیکھہ کر کہا کہ جناب آپ بھی اپنی راے کا اظہار فرمائیں - اُس نے کہا تم سب نے خوشی خوشی یہ تجویز تو کرلی اور اس پر اظہار مسرت و شادمانی بھی کر رہے ہو اور اپنے اپنے خیال میں ہر ایک نے بلی کا ایک ایک عضو بانٹ بھی لیا کہ مقابلہ کے وقت وہ اُسے پکڑلے گا - مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میں سے "بلی کی میاؤں کو کون پکڑے گا ' اور اُس کے لئے کونسا بہادر چوہا تیار ہوا ہے " - اتفاقاً اُسی وقت کسی کونے میں سے بلی کی میاؤں کی آواز آئی جسے سنتے ہی تمام چوہے نہایت بد حواسی

نے ساتھہ اپنے اپنے بلوں میں جا چھپے - نہ کسی نے بلی کے سر کو پکڑا نہ ٹانگوں کو - تمام منصوبے اور تجویزیں دھری کی دھری رہ گئیں - اور اتنا بڑا جلسہ ایک آن کی آن میں ختم ہوگیا —

بنیے کا بہکایا اور جوگی کا پھٹکارا خراب ہوتا ہے

اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ جس بے وقوف اور سادہ لوح آدمی کو کوئی بنیا بہکا دے یا جوگی اور فقیر لوگ کسی شخص کو بد دعا دے دیں تو پھر ان دونوں قسموں کے آدمیوں کی مٹی پلید ہوتی ہے اور وہ بڑی تکلیف اور مصیبت اٹھاتے ہیں - لہذا بنیے کی ہوشیاری سے اور جوگی کی بد دعا سے جہاں تک ممکن ہو بچنے کی کوشش کرنی چاہئے - اس مثل کی اصل اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی کو کہیں سے ایک اشرفی پڑی ہوئی مل گئی - اس غریب نے کبھی اشرفی کاہے کو دیکھی تھی - کچھہ نہ سمجھا کہ یہ پیتل ہے یا سونا - خیر بیچارہ اسے لے کر پاس کے قصبے میں آیا - اتفاقاً پہلے ہی ایک بنیے کی دوکان نظر پڑی - اس کے پاس گیا - اشرفی نکال کر اُسے دکھائی اور کہنے لگا میں اسے بیچنا چاہتا ہوں بولو کیا دوگے ؟ بنیے نے اشرفی دیکھی اور پھر دیہاتی کی شکل ' خیال کیا کہ یہ دیہاتی اس اشرفی کی قدر و قیمت سے بظاہر نا واقف معلوم ہوتا ہے - اگر ہوسکے تو لوٹ لو - یہ سمجھہ کر اُس نے جواب دیا کہ " بھائی ! یہ تو معمولی سکہ ہے - میں تمہیں زیادہ سے زیادہ اس کے پانچ روپے دے سکتا ہوں یا پانچ روپے کی اچھی اور سستی جنس " - پانچ روپے کا نام سنا تو دیہاتی کے کان کھڑے ہوئے - سوچنے لگا ضرور یہ کوئی قیمتی سکہ ہوگا ' جبھی تو بنیے جیسا ہوشیار اس کے پانچ روپے دے رہا ہے - یہ خیال کرکے کہنے لگا "سیٹھہ جی ! ہمارا آپ کا سودا ہوتا نظر نہیں

آتا - لائیے کسی اور جگہ دکھاؤں" - بنیے نے سوچا ' شکار ہاتھ سے چلا- کہنے لگا - "اچھا بھئی چھہ روپے لے لینا - یہ ایک روپیہ تمہاری خاطر سے دے رہا ہوں - ورنہ مال پانچ روپے سے زیادہ کا نہیں" - اب تو دیہاتی اور بھی چوکنا ہوا - اور کہنے لگا "نہیں صاحب! ابھی بہت کسر ہے" - بنیے نے کہا - "اچھا بس آخری بات یہ ہے کہ آٹھہ روپے کو اگر تمہاری مرضی ہو تو دے جاؤ ورنہ خیر" - دیہاتی اب اور بھی پھیل گیا - اور کہنے لگا "واہ صاحب! آپ مجھے گاؤں والا سمجھہ کر لوٹنا چاہتے ہیں ' میں اس قیمت پر اس قدر قیمتی چیز ہرگز نہیں بیچونگا" - آخر بنیے نے چودہ روپے تک اس پندرہ روپے کی اشرفی کے لگا دیے - مگر دیہاتی برابر یہی کہے گیا کہ "سیٹھہ جی! ابھی بہت کسر ہے" - جب بنیا تنگ آگیا اور اُس نے دیکھا کہ یہ کسی طرح جمتا ہی نہیں تو اُس نے سوچا لاؤ اس کو بھی خوب پریشان کرو - یہ بھی کیا یاد کریگا کہ کسی بنیے سے واسطہ پڑا تھا - یہ سوچ کر کہنے لگا - "بھائی! سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سکہ پورے تیس روپے قیمت کا ہے لیکن میرے پاس اس وقت روپیہ نہیں جو تجھے دیدوں - جا اِسے بازار میں لے جا - تیس روپے کو ہر شخص آسانی سے خرید لےگا مگر خبردار کسی کو تیس سے کم پر نہ دینا ورنہ سخت نقصان اُٹھائےگا" - بیچارہ دیہاتی بنیے کے چکمے میں آگیا اور سارے شہر میں پھرتے پھراتے تھک کر چور ہوگیا ' مگر پندرہ روپے کے مال کے تیس اُسے کون دیدیتا؟ مجبور ہوکر اور تھک کر پھر بنیے کی دوکان پر آیا اور کہنے لگا - "سیٹھہ جی! میں تو بڑا خراب ہوا - کوئی اِس کے تیس روپے نہیں دیتا - لاؤ تم چودہ ہی دو" - اب بنیے کی باری تھی - اُس نے بڑی ہوشیاری سے جواب دیا کہ "ہاں بھائی سچ کہتے ہو ' آج کل

کاروبار کا مندا ہے' کون اسے لے کر بیکار ڈالے رکھے- تمہارے جانے کے بعد میرے پاس سے بھی اتفاقاً نو روپے خرچ ہوگئے' اب صرف پانچ روپے باقی ہیں اور وہ بھی شام کو تیلی کے دینے ہیں' اس نے تین چار روز سے تقاضے کے مارے ناک میں دم کر رکھا ہے' مگر خیر صرف تمہاری خاطر سے یہ پانچ روپے تمہیں دے سکتا ہوں' اگر تم منظور کرو' زیادہ تو اس وقت میرے پاس ہیں نہیں اور شام کو یہ بھی نہیں رہنے کے- اگر لینے ہوں تو لیتے جاؤ"- دیہاتی بیچارہ سارا دن کا تھکا ماندہ تھا' غریب کو روٹی بھی اس مصیبت میں دن بھر نصیب نہیں ہوئی تھی' سخت حیران اور پریشان ہوا کہ کیا کروں' لیتا ہوں تو نقصان ہے' نہیں لیتا تو یہ بھی ہاتھ سے جاتے ہیں' بہت سوچ سوچ کر آخر مصیبت کے مارے دیہاتی نے یہی فیصلہ کیا چلو مفت میں رقم ملتی ہے' لے ہی لو' یہ خیال کر کے کہنے لگا' لائیے سیٹھ جی! میری تقدیر! خیر پانچ روپے ہی دے دیجیے' یہ کہہ کر بے دلی سے اشرفی بنیے کے آگے پھینک دی' سیٹھ جی کا چہرہ اس پر منفعت تجارت سے مارے خوشی کے چمک اٹھا' جھٹ اشرفی اٹھا ہمیانی میں داخل کی اور پانچ روپے نکال کر دیہاتی کے حوالے کیے' لوگوں نے جو بنیے کی اس عجیب و غریب چالاکی کا حال سنا تو کسی شخص نے یہ فقرہ کہا' اور یہ اس قدر مشہور ہوا کہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔

بنیے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے

یعنی عقل مند اور سمجھدار آدمی کا کوئی کام بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتا' یا چالاک اور ہوشیار آدمی ہر کام میں اپنا ہی نفع سوچتا ہے - کہتے ہیں کہ ایک بنیے کا لڑکا تیل کی بھری ہوئی ہنڈیا سر پر اٹھائے

لئے چلا جا رہا تھا ' اتفاقاً تھوکر لگی ' گر پڑا ' تیل بہہ گیا اور ہلڈیا ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ' لوگوں نے اس نقصان کی خبر بلیے کو کی اور افسوس کا اظہار کیا ' وہ سن کر کہنے لگا ' "افسوس کی کیا بات ہے ' آخر بلیے کا بیٹا ہے ' کچھ دیکھ کر ہی گرا ہوگا " - بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو راستے میں چلتے چلتے زمین پر ایک اشرفی پڑی نظر آئی ' اس نے اِس خیال سے کہ برتن سمیت بیٹھ کر اٹھاؤں گا تو ممکن ہے کوئی راہ رو دیکھ کر کہے کہ "یہ اشرفی تو میری ہے جو ابھی میری جیب سے گر گئی تھی" - دل میں کہا کہ گر پڑو ' تاکہ اس بہانے سے کہہ سکو کہ ٹھوکر لگنے سے گر پڑا اور یہ اشرفی میری جیب سے گری ہے ' تیل کی ہلڈیا گرنے سے نقصان ہوگا تو زیادہ سے زیادہ ایک روپے کا ' اور اس طرح ملتے ہیں پلدرہ ' چودہ روپے کا نفع ہے ' اس وقت سے یہ مثل زبان زد ہوگئی —

بور کے لڈو کھاؤ تو پچھتاؤ نہ کھاؤ تو پچھتاؤ

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی ایسے فضول اور لا یعنی کام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو ' جس کا کوئی نتیجہ نکلتا دکھائی نہ دیتا ہو ' اور اگر اسے نہ کیا جائے تو یہ بھی خیال ہو کہ شاید فائدہ ہوجائے اور کام بن جائے ' لیکن زیادہ احتمال نقصان کا ہو - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ دھلی میں ایک حلوائی تھا ' جو بور یعنی بھوسی کے لڈو ایسے خوشنما ' دل پسند اور خوبصورت بنایا کرتا تھا کہ ان کی ظاہری شکل دیکھ کر بے اختیار ان کے کھانے کو جی چاہتا ' حلوائی مندرجۂ بالا صدا کے ساتھ انہیں بیچا کرتا تھا ' جو شخص خرید کر کھا لیتا وہ تو پچھتاتا کہ میں نے ناحق دام ضائع کئے ' اور جو نہ

لیتا وہ بھی پوچھتا تا ، اور کہتا نہ معلوم یہ لڈو کتنے عمدہ اور لذیذ ہوں گے ۔ جب سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

بھیگی بلی بتانا

کام چور ملازم کے متعلق بولتے ہیں یا ایسے موقع پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کام کے کرنے میں عذرات لنگ پیش کرے۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں ایک شخص نے رات کے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ "باہر نکل کر دیکھ۔ بارش ہورہی ہے یا تھم گئی"۔ اس نے جواب دیا۔ "حضور! خوب ہورہی ہے"۔ آقا نے کہا "نمک حرام یہیں سے بیٹھے بیٹھے تونے کس طرح جان لیا کہ بارش ہورہی ہے"۔ نوکر نے کہا "حضور ابھی باہر سے بلی آئی تھی جو بھیگی ہوئی تھی ، اس وجہ سے میں نے خیال کیا کہ بارش ابھی ہورہی ہے"۔ اس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا —

بی بکری! ناؤ میں خاک اڑاتی ہو؟

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی شخص لڑنے اور جھگڑنے کے لیے فضول اور لایعنی عذرات تلاش کرکے لڑنا شروع کردے اور بات دراصل کچھ بھی نہ ہو۔ اس مثل کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بکری اور ایک بھیڑیا ایک کشتی پر پار جانے کے لیے ایک ساتھ سوار ہوے۔ بکری جیسے آسان شکار کو دیکھ کر بھیڑیے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے سوچا کہ کسی بہانے سے بکری کو چٹ کرنا چاہیے۔ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ جب کوئی بہانہ سمجھ میں نہ

آیا تو آخر کہنے لگا " بی بکری! ناؤ میں خاک کیوں اڑاتی ہو؟" مسکین بکری یہ سنتے ہی سہم گئی - کہنے لگی - " حضور! ناؤ میں خاک کہاں ؟ اور میں تو چپ چاپ کھڑی ہوں " - اس پر بھیڑیا غضبناک ہوکر اور گرج کر بولا " تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تو ہمیں جھوٹا بناتی ہے اور ہمارا مقابلہ کرتی ہے ' تو خاک نہیں اڑا رہی تو اور یہ کیا آسمان سے برس رہی ہے ؟ " اور جھٹ بکری پر حملہ آور ہو اس کے ٹکڑے کر کھا گیا -



بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

یہ فقرہ ایک مشہور و معروف شعر کا دوسرا مصرع ہے - پورا شعر یہ ہے -

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

آخری مصرع کثرت استعمال سے بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا - اور ایسے لوگوں کے متعلق بولا جاتا ہے ' جو اپنے نہایت ہی عزیز اور قریب ہونے کے باوجود ہر وقت دشمنی اور مخالفت کی فکر میں رہیں اور کوئی موقع پیش آے تو حد سے زیادہ دشمنی کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھیں - اس مصرع میں " یوسف سا برادر " ایک قصہ طلب لفظ ہے اور اتنا مشہور ہے کہ قریباً ہر شخص اس سے واقف ہے - ہم مختصراً اسے یہاں لکھتے ہیں :-

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے - ان میں سے حضرت یوسف سے باپ کو بڑی محبت تھی - دوسرے بھائیوں نے ان پر حسد کیا اور سیر کے بہانے جنگل میں لے جاکر ایک خشک کوئیں میں دھکا دے کر اور یہ سمجھ کر کہ یہاں اسے نکالنے کون آے گا اور دو چار روز میں یاسی کوئیں میں مر جاے گا

چھوڑ کر چلے آے - اور باپ سے آکر کہ دیا کہہ "یوسف کو تو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا" - دو تین روز کے بعد بھائیوں کو خبر لگی کہ ایک قافلے نے جو اتفاقاً اس جنگل میں سفر کر رہا تھا یوسف کو زندہ کوئیں میں سے نکل لیا ہے - وہ فوراً قافلے والوں کے پاس پہنچے اور کہا : یہ غلام تمہیں کہاں سے ملا؟ ہم تو اس کی تلاش میں تھے - یہ ہمارا غلام ہے ہمارے حوالے کرو- بہت کچھہ رد و قدح کے بعد بھائیوں نے یوسف کو قافلے کے سردار کے ہاتھہ چند درم پر بیچ دیا - اور قافلے کے سردار سے یہ شرط کرلی کہ اسے کسی بہت دور ملک میں لیجاکر فروخت کرنا تاکہ یہ بھاگ نہ آے - اندیشہ یہ تھا کہ چھوٹ کر آگیا تو باپ سے چھوٹنا بڑنا پڑےگا - چنانچہ قافلہ والے یوسف کولے کر روانہ ہوگئے - مگر اس تمام عرصہ میں یوسف نے اپنے بھائیوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا نہ غلام ہونے سے انکار کیا - بلکہ خاموش رہے۔ قصہ طویل ہے - قافلے والوں نے یوسف کو مصر لے جاکر "عزیز مصر" کے ہاتھہ معقول قیمت پر فروخت کردیا - تھوڑے دنوں کے بعد عزیز مصر کی بیوی "زلیخا" نے آپ پر ایک ناپاک اتہام لگا کر آپ کو قید کروا دیا - عرصہ تک قید خانہ میں رہنے کے بعد آپ رہا ہوے اور اپنی عقلمندی اور اصابت راے کے باعث وزیر سلطنت بن گئے - اب آپ نے اپنے ضعیف العمر باپ اور سارے بھائیوں کو وطن سے بلوایا - باپ کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور بھائیوں کے سارے پچھلے قصور معاف کردیے اور تمام کنبہ عیش و مسرت کے ساتھہ مصر میں رہنے لگا —

بھائیوں نے یوسف کے ساتھہ ایسی سخت دشمنی کی تھی کہ لفظ "برادران یوسف" ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوگیا ہے —



پانی پی کر کیا ذات پوچھنی

یہ مثل ایسے آدمی کے متعلق بولتے ہیں جس کو اپنی بھولوں کا احساس کام کرنے کے بعد ہو۔ اس مثل کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک برہمن کہیں دور سے چلا آرہا تھا۔ راستہ میں جو پیاس بہت لگی تو ایک کنوئیں پر گیا۔ جہاں ایک عورت کھڑی پانی بھر رہی تھی۔ اس سے برہمن نے پانی پلانے کی درخواست کی اور اس نے خوب اچھی طرح برہمن دیوتا کو پانی پلایا۔ جب پانی پی چکے تو برہمن صاحب کو کچھہ خیال آیا۔ آپ جھٹ اس عورت سے پوچھنے لگے۔ مائی! تیری ذات کیا ہے؟ اس نے کہا مہاراج! میں چماری ہوں اور یہ چماروں کا کنواں ہے۔ برہمن صاحب یہ سن کر حد درجہ غضبناک ہوئے اور کہنے لگے۔ کمبخت عورت تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ میں چماری ہوں؟ چماری نے ہاتھہ جوڑ کر عرض کیا۔ "مہاراج! آپ نے مجھہ سے میری ذات نہیں پوچھی تھی۔ بلکہ پانی مانگا تھا وہ میں نے آپ کو پلا دیا۔ مجھے ایسے سوال کا جواب دینے کی کیا ضرورت تھی جو مجھہ سے پوچھا نہیں گیا تھا۔ اور مہاراج! اب پانی پی کر کیا ذات پوچھنی؟ چپکے سے گھر کو چلے جائیے"۔ یہ مدلل جواب سن کر برہمن صاحب نہایت خفیف اور شرمندہ ہوئے اور بہت پچھتائے کہ ناحق میں نے پانی پی کر اپنے دھرم کو بھرشٹ کیا —

پھیم جاؤ یا دکھن وہی کرم کے لچھن

بھلے آدمی خواہ کتنی ہی کوشش اور سعی کرے مگر جو کچھہ اور جس قدر تقدیر میں ہوتا ہے اس سے زیادہ نہیں ملتا۔ اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے اپنے

ایک دوست سے جو بے روزگار اور تنگدست تھا کہا کہ میاں یہاں کب تک بیکار بیٹھے رہو گے - کہیں کھانے کمانے کے لئے نکلو - پچھم کی راہ لو یا دکھن کا راستہ پکڑو - کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی - جواب میں اُس نے مندرجۂ بالا جملہ کہا - یعنی پچھم یا دکھن جانے سے کیا ہوگا - جو کچھہ تقدیر میں ہے اُس سے زیادہ ملتا نہیں - فقرہ ایسا موزوں تھا کہ لوگوں کی زبانوں پر چڑہ گیا اور بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

پنچ کہیں بلی تو بلی ہی سہی

یعنی ایک جماعت کے فیصلہ پر اُس کے افراد کو عمل کرنا پڑتا ہے - بیان کرتے ہیں کہ اس مثل کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک دفعہ ایک بنیا حسب معمول اپنی دوکان کے آگے رات کو چارپائی بچھا کر سو گیا - موقع پاکر ایک چور دوکان میں داخل ہوا - کچھہ کھڑ بڑ کی آواز جو ہوئی تو بنیے کی آنکھہ کھل گئی - بنیا فوراً سمجھہ گیا کہ کیا واقعہ ہے - جھٹ پھرتی کے ساتھہ باہر کی کنڈی لگا دی - چور جو اندر بند ہو گیا تھا اُس نے سوچا کہ برے پھنسے - آخر رہائی کی یہ تدبیر سوچی کہ بلی کی بولی بولنی شروع کردی کہ شاید بنیا یہ خیال کرکے کہ بلی دوکان میں گھس گئی ہوگی - کواڑ کھولدے - مگر بنیا بڑا ہوشیار تھا - کہنے لگا " بھیا! اب تو بند رہو - صبح کو اس معاملہ کو پنچوں کے سامنے پیش کروں گا - اگر وہ کہیں گے بلی تو بلی ہی سہی" اُس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا -

---

یعنی عورت کے مکر اور فریب سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا۔

تریا چلتر نہ جانے کو، خصم کو مار کے ستی ہو

یہ تو ایسی چال باز واقع ہوئی ہے کہ خود ہی اپنے شوہر کو مارے اور پھر خود ہی اس کے ہمراہ زندہ جل مرے - یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں - جہاں یہ دکھلانا مقصود ہو کہ عورتیں نہایت چالباز اور فریبی ہوتی ہیں - اور ان کے فریب کو کوئی نہیں پہنچ سکتا - اس ضرب المثل کا ماخذ ایک مشہور و معروف پرانا قصہ ہے - جس کو ڈاکٹر برنیر نے جو ایک فرانسیسی سیاح تھا اور جس نے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاحت کی ہے اپنے سفر نامہ میں مفصل لکھا ہے - وہ قصہ سفر نامہ برنیر سے لے کر یہاں درج کیا جاتا ہے :-

کسی شریف گھرانے کی ایک ہندو عورت کا ایک شخص سے ناجائز تعلق تھا - یہ شخص اس ہی عورت کے محلہ میں رہتا تھا اور تقریبات کے موقعوں پر ڈھول اور طنبورہ وغیرہ بجا کر اس کی مزدوری سے اپنی گذر اوقات کیا کرتا تھا - ایک دن اُس شخص نے عورت سے کہا کہ " اگر تو زہر دے کر اپنے شوہر کو مار ڈالے تو پھر ہم دونوں اطمینان سے کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں - اور وہاں ساری عمر آرام و راحت سے بسر کریں "- عورت راضی ہوگئی اور موقع پاکر اپنے شوہر کو کھانے میں زہر دے دیا اور خود فوراً بھاگ کر اس شخص کے پاس پہنچی اور کہنے لگی " میں نے تیرے حکم کی تعمیل کردی - اُسے زہر دیدیا - وہ غالباً تھوڑی دیر میں مر جائے گا - اب فوراً یہاں سے بھاگ چلنا چاہیے - ورنہ میں اگر یہاں رہ گئی تو دنیا کی رسم کے موافق مجھے بھی مجبوراً شوہر کے ساتھ ستی ہونا پڑے گا " - اس پر اس شخص نے کہا " یہ تو نے کیا غضب کیا - میں نے تو ایک سرسری بات تجھ سے کہی تھی - اب میں تیرے ساتھ کسی طرح نہیں چل سکتا - اول تو اپنے متعلقین کو کس پر چھوڑوں - دوسرے اگر سرکار کو

خبر ہو گئی - یا صوبہ دار کو میرے فرار ہو جانے سے کچھ شبہ ہو گیا تو پھر پکڑا آوں گا - اور جان سے مارا جاوں گا - اس لئے میرا تیرے ساتھ چلنا ناممکن ہے - تو واپس جا اور اپنے اعمال کی سزا بھگت "- جب عورت نے دیکھا کہ یہاں تو سارا بنا بنایا کھیل ہی بگڑ گیا - تو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ کہنے لگی - " اچھا تجھے پروا نہیں - میں کل شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جاؤں گی - مگر ایک آخری درخواست تجھ سے ہے - اگر تو اسے قبول کرے تو بڑا احسان ہوگا " - اس نے پوچھا " وہ کیا ہے "؟ عورت نے کہا - کل جس وقت میں ستی ہونے لگوں تو تو بھی اپنا ڈھول وغیرہ لے کر شمشان بھومی میں آجائیو - تا کہ آخری وقت تجھے دیکھ کر کچھ تسکین رہے - اس شخص نے بڑی آمادگی سے جواب دیا - " یہ کیا مشکل کام ہے - میں ضرور آجاؤں گا "- عورت یہ سنتے ہی اُلٹے پاؤں واپس مڑی اور شوہر جو اس وقت تک مر چکا تھا، اس کی لاش پر آہ و بکا اور نالہ و فریاد کرنی شروع کی - اور ایسی پھوٹ پھوٹ کر روئی جس کی انتہا نہیں - اور کہا - " لوگو! صوبہ دار سے اجازت لے لو - میں تو اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہوں گی " (مسلمانوں کے زمانہ میں صرف وہ عورت ستی ہو سکتی تھی جو اپنی خوشی سے ستی ہو رہی ہو اور جس کے متعلق صوبہ دار سے باقاعدہ تحریری اجازت لے لی گئی ہو) - چنانچہ دوسرے دن جس وقت عورت ستی ہونے کے لیے مرگھٹ میں پہنچی اور چتا کو آگ لگا دی گئی تو عورت نے چتا کے گرد پھرنا اور اپنے عزیز و اقارب سے ملنا شروع کیا - پاس ہی وہ طنبورہ نواز بھی حسب وعدہ کھڑا ڈھول بجا رہا تھا - جونہی عورت اس کے قریب پہنچی - غصہ سے بے تاب ہو کر اس نے شیرنی کی مانند اُس پر حملہ کیا - اور اُس کا گریبان پکڑ کر کھینچتی ہوئی چتا کے اندر داخل

ہوگئی جہاں دم بھر میں دونوں کا خاتمہ ہوگیا- جب لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوا تو اُنہیں عورت کے فریب پر سخت حیرت ہوئی- اور جب سے عورت کے فریب کے اظہار کے لیے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا—

تو کو نہ بھناؤں تیرا بھیا اور ملاؤں

وہ آدمی جو نہایت بخیل ہو- اور پیسہ جوڑ جوڑ کر رکھے اور جب اس کے پاس کچھہ دام ہوں تو خیال کرے کہ بجاے خرچ کرنے کے اُس میں کچھہ اور ملاؤں- اور اس طرح ہمیشہ نہایت تنگی اور تکلیف سے گزارا کرے- جب ایسے آدمی کی مثال دینی ہو تو مندرجہ بالا کہاوت کہا کرتے ہیں- اُس کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک سادہ لوح اور بیوقوف پوربئے کو اتفاقاً روپیہ بھنانے کی ضرورت ہوئی- مگر چونکہ کنجوس بہت زیادہ تھا ڈرتا تھا کہ روپیہ بھنایا اور سارا خرچ ہوا- غرض تمام شہر میں اُس کو لئے لئے پھرا- مگر بھنایا نہیں- چونکہ گرمی کے دن تھے روپیہ کو مٹھی میں بند رہنے کے باعث کچھہ پسینہ لگ گیا- آپ نے جو روپے کو کھول کر دیکھا تو اپنی "عقلمندی" سے سمجھا کہ روپے بیچارے کو میری جدائی گوارا نہیں ہے- اسی واسطے روتا ہے- یہ سوچ کر آپ کو روپیہ پر بڑا رحم آیا- اور اُس کو مخاطب کرکے کہنے لگے کہ "تو کو نہ بھناؤں- تیرا بھیا اور ملاؤں" - یعنی خاطر جمع رکھہ تجھہ کو نہیں بھناؤں گا- بلکہ کوشش کروں گا کہ ایک دوسرا روپیہ بھی حاصل کرکے تیرے پاس رکھوں—

ترکو نہ مو کو - لے کے چولھے میں جھونکو

جب کوئی شخص کسی چیز کو اس طرح برباد کردے کہ وہ کسی کے کام کی نہ ہو اُس وقت یہ مثل کہا کرتے ہیں - کہتے ہیں کہ اس مثل کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اتفاقاً ایک آدمی کی بیوی کا چال چلن اچھا نہیں تھا - ایک دفعہ اُس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی - بیٹے نے باپ کو جاکر خبر دی کہ "ابا! بہن پیدا ہوئی ہے" - باپ جو پہلے ہی جلا بیٹھا تھا اُس نے اُس وقت مندرجۂ بالا فقرہ کہا جو بعد میں بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا - یعنی بیٹا! اگر لڑکی ہوئی ہے تو کیا ہے - نہ تیری بہن ہے نہ میری بیٹی - گلا گھونٹ کر چولھے میں دبا دینے کے قابل ہے —

تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو

یعنی ابھی کیا ہے - آخری نتیجہ کا صبر سے انتظار کرو - دیکھو کیا ظہور میں آتا ہے - کہتے ہیں کہ ایک شہزادے کا بچپنے میں ایک تیلی کے لڑکے سے دوستانہ ہوگیا - جب بادشاہ کے مرنے کے بعد شہزادہ باپ کے تخت پر بیٹھا تو اس تیلی کو اپنا مصاحب بنا لیا - ایک ہمسایہ سلطنت نے جو شہزادہ کی مملکت کی حالت کم زور اور خراب دیکھی تو جھٹ اُس پر حملہ کردیا - بادشاہ نے اُمرا اور وزراء کو جمع کرکے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے - اور کس طرح دشمن کو شکست دینی چاہیے - مجلس میں تیلی صاحب مصاحب بھی موجود تھے - اُن سے جو بادشاہ نے صلاح پوچھی تو آپ کیا جواب دیتے ہیں کہ "جہاں پناہ! آپ نے ناحق افواہوں پر اعتبار کرکے اپنی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے - بھلا حضور سے کوئی آنکھ ملا سکتا

ہے - اور کسی کی مجال ہے کہ یوں آپ کی سلطنت پر دھاوا بول دے۔ میرے خیال میں تو یہ سب خبریں جھوٹی ہیں اور آپ کے دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہیں- اور اگر حملہ ہوا بھی تو ابھی سے گھبرانے اور پریشان ہونے کی کیا بات ہے - تیل دیکھئے- تیل کی دھار دیکھئے" - یعنی جب دشمن بالکل ہی پاس آجاے گا اُس وقت دیکھی جاے گی- جو تدبیر کرنی ہوگی کرلیں گے - بادشاہ کا تو خبر نہیں کیا انجام ہوا مگر اُس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر ضرور استعمال ہونے لگا —

تیلی خصم کیا اور پھر روکھا کھایا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی آدمی کوئی برا کام کرکے پچھتائے - یا وہاں بولتے ہیں جہاں ایک شخص اپنے درجہ سے گرکر کوئی کام کرے اور پھر بھی نتیجہ صفر رہے - اور کچھہ فائدہ نہ ہو - یا کوئی شخص کسی اچھی امید پر ایک کام کو سر انجام دے - لیکن آخر میں مطلب کچھہ بھی حاصل نہ ہو - اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک عورت نے جس کا شوہر بہت غریب اور مفلس تھا اپنے شوہر سے طلاق لیکر اس امید اور خوشی میں ایک تیلی سے نکاح کیا کہ یہاں خوب چکنے چپڑے مال کھانے میں آئیں گے - تقدیر کی مار - تیلی کی بھی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور یہاں بھی اُس بدقسمت عورت کے حصہ میں وہی سوکھے ٹکڑے اور روکھی روٹی آئی - تب ایک روز جل کر اور اپنی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے عورت نے یہ فقرہ کہا —

ٹکے کی نہاری میں ٹاٹ کا ٹکڑا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص بہت تھوڑا خرچ کرکے بہت زیادہ فائدہ کا خواہش مند ہو - اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک آدمی روز مرہ اپنے کھانے کے لئے صبح کے وقت نوکر سے نہاری بازار سے منگوایا کرتا تھا - ایک روز وہ جو نہاری کھانے بیٹھا تو اس میں سے ایک قیمتی زیبنت کا ٹکڑا نکلا - جو دھوکر کار آمد بنا لیا گیا - اس واقعہ کا ذکر اس شخص نے اپنے ایک دوست سے بھی کیا - اسے جو لالچ سوجھا تو جھٹ دوسرے دن اُسی دوکان سے دو پیسے کی نہاری اپنے ملازم کے ہاتھہ منگائی - اتفاق دیکھئے کہ اُس میں سے ایک ٹاٹ کا ٹکڑا برآمد ہوا - اُسے دیکھہ کر یہ حضرت بڑے چراغ پا ہوئے - اور نوکر سے ناراض ہوکر کہنے لگے: اب اس نہاری میں سے یہ ٹاٹ کا ٹکڑا کیسا نکلا ؟ نوکر تھا حاضر جواب - اُس نے ہاتھہ باندھ کر ادب سے عرض کیا: حضور! ٹکے کی نہاری میں سے تو ٹاٹ ہی کا ٹکڑا نکلیگا ــ

جاٹ مرا جب جانیے جب تراونی لے ہو

یعنی جاٹ کے مرنے کا یقین اُس وقت کرنا چاہئے جب اُس کا تیجا ہوچکے - اس سے پہلے نہیں - یہ مثل دغاباز اور فریبی انسان کے متعلق بولتے ہیں - اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ کوئی جاٹ تھا اُس نے کسی ضرورت سے مجبور ہوکر ساہوکار سے کچھہ روپیہ قرض لیا - لیکن نہ تو سود ہی ادا کرسکا نہ اصل ہی دے سکا - کچھہ عرصہ گزر چکنے کے بعد ساہوکار نے تقاضہ شروع کیا - جاٹ اس روز روز کے تقاضوں سے تنگ آگیا - ایک روز اس نے ایک تدبیر سوچی اور اُس پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ

کرلیا - چنانچہ دوسرے ہی دن سارے گاؤں میں مشہور ہوگیا کہ فلاں جاٹ مرگیا - ساہوکار کو خبر ہوئی - بیچارہ پیٹ پکڑے ہوئے جاٹ کے جنازے پر آیا - اور پوچھنے لگا کہ اس کا کوئی وارث بھی ہے - معلوم ہوا کہ وارث کوئی نہیں - کفن کا انتظام بھی دوستوں نے کیا ہے - ساہوکار اپنے قرضے کے لئے کس سے کہتا ؟ ناچار چپ ہو رہا - مگر اس امید پر کہ شاید کوئی ایسا دوست نکل آئے جو ادائگی قرضہ کی حامی بھرے قبر تک ساتھ گیا - مگر کسی نے قرض کی حامی نہ بھری - خیر جب لوگ اسے دفن کرکے واپس ہوئے تو یہ بھی مجبوراً واپس چلا آیا - لوگوں کے واپس آتے ہی دوستوں نے جو سب جمع تھے فوراً قبر در کھود کر جاٹ کو نکال لیا - کہیں سے ساہوکار کو بھی خبر لگ گئی - اُس وقت اُس نے مذکورۂ بالا جملہ کہا —

جاکارن موند ـ لڈایا وہی دکھہ آگے آیا

یعنی جس آفت اور تواٹی سے پہلوتہی کرنی چاہی تھی وہی خطرہ اور مصیبت سامنے آئی - کہتے ہیں اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ کہانی مشہور ہے کہ ایک شخص نہایت احدی اور کام چور تھا - اُس سے سوائے سارا دن بیٹھے رہنے اور ادھر اُدھر کی گپیں مارتے رہنے کے اور کچھہ نہ ہوسکتا تھا - لیکن آخر پیٹ کو تو چاہیے تھا - وہ کہاں سے آتا - اور مشقت مزدوری اُس سے ہو نہ سکتی تھی - بہت کچھہ سوچنے اور مہینوں غور کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ بہ نسبت ٹوکری ڈھونے اور مزدوری کرنے کے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھر لینا زیادہ آسان اور کم مشقت کا کام ہے - چنانچہ آپ نے یہ خیال آتے ہی اُس کو عملی جامہ

پھنایا اور مانگنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے - سارا دن کبھی کھوں پھرے تھے - پہلے ہی دن پاؤں شل ہوکر رہ گئے - اور سارا بدن پھوڑے کی مانند درد کرنے لگا - اب حضرت کو حقیقت معلوم ہوئی کہ بھیک بھی آسانی سے ساتھ نہیں ملتی - اُس وقت آپ نے لاچار ہوکر اور آسمان کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مندرجۂ بالا فقرہ کہا - جو بعد میں بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

جاگتے کی کٹڑی سوتے کا کٹڑا

یہ مثل ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جہاں ایک شخص اپنی غفلت اور سستی کی وجہ سے نقصان اُٹھائے اور اس کا دوسرا ساتھی اپنی چالاکی اور ہوشیاری کے باعث فائدہ میں رہے - کہتے ہیں کہ کسی جگہ دو بھائی رہتے تھے - اور دونوں کے پاس ایک ایک بھینس تھی - دونوں بھینسیں ایک ہی جگہ بندھتی تھیں - اِتفاقاً دونوں بیائیں - جس وقت موقع آیا اور دونوں کے بچے ہونے کو ہوئے تو اس وقت ایک بھائی سو رہا تھا اور دوسرا جاگ رہا تھا - جوبھائی جاگ رہا تھا - اس کی بھینس نے کٹڑا دیا اور جو سو رہا تھا اُس کی بھینس کے ہاں کٹڑی ہوئی - چونکہ کٹڑی دودھ دیتی ہے اور فائدہ کی چیز ہے اور کٹڑے سے اتنا زیادہ فایدہ نہیں ہوتا - اس چالاک آدمی نے کیا کام کیا کہ جھٹ اپنا کٹڑا لے دوسری بھینس کے آگے ڈالدیا - اور اس کی کٹڑی جھٹ اٹھا اپنی بھینس کے آگے لا ڈالی اور چپکا ہوکر بیٹھ گیا - تھوڑی سی دیر کے بعد دوسرا بھائی بھی اٹھا - اور اٹھتے ہی اس نے پوچھا: کہو بھائی کیا ہوا ؟ چالاک بھائی نے

سمجھداری سے جواب دیا - بھائی! تمہاری بھینس کے ہاں تو کٹڑا ہوا ہے اور میری بھینس نے کٹڑی دی ہے - سونے والے بھائی نے صورت حال بھانپ لی تھی کہنے لگا " ہاں تو یوں کہو کہ جاگنے کی کٹڑی اور سوتے کا کٹڑا ہوا ہے - خیر کیا نقصان ہے - ایسا بھی سہی " - اور یہ کہہ کر بچارا صبر شکر کر کے بیٹھ رہا - اُس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی -

جتنی چادر دیکھو اُتنے پاؤں پھیلاؤ

جہاں کوئی آدمی اپنی بساط اور مقدرت سے زیادہ کوئی کام کرتا ہے وہاں یہ مثل بولتے ہیں - مثلاً ایک آدمی کے پاس ہیں تو سو روپے مگر وہ چاہتا ہے کہ بیٹے کے بیاہ میں ایک ہزار روپے خرچ کروں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کر رہا ہے - اور آخر میں نقصان اُٹھائیگا - اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک بادشاہ نے شہر کے غریب اور اپاہج لوگوں کے اوڑھنے کے لئے بہت سی چادریں بنوائیں - جس وقت تیار ہوگئیں تو وزیر نے حضور میں عرض کیا کہ جناب چادریں تیار ہیں بادشاہ نے کہا لاؤ پہلے ہمیں دکھاؤ - چنانچہ چادریں آئیں تو بادشاہ نے اس خیال سے کہ دیکھوں یہ چھوٹی تو نہ رہیں گی - خود لیٹ کر ایک چادر اوڑھ لی - بادشاہ کا قد لمبا تھا - اتفاق سے وہ چھوٹی رہی اور بادشاہ کے پاؤں اس سے باہر نکلے رہے - بادشاہ نے وزیر کی طرف دیکھا - اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ " حضور! جتنی چادر دیکھئے اتنے ہی پاؤں پھیلائیے " - بادشاہ نے پاؤں سکیڑ لئے تو چادر کے اندر آگئے - جب سے یہ مثل بولی جانے لگی —

جس کے پیشے میں بان وہ بڑا شیطان

یہ مثل ایک بڑے پر لطف لطیفہ سے شروع ہوتی ہے - نواب آصف الدولہ بہادر والی اودھ ایک روز اپنے ندیموں اور اُمراء میں بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے - باتیں کرتے کرتے فرمانے لگے - میرا تجربہ ہے کہ جس آدمی کے پیشہ کے آخر میں لفظ بان آتا ہے وہ بڑا شیطان ہوتا ہے - اور لوگوں کو نہایت دق اور پریشان کرتا ہے - جیسے گاڑی بان اور سار بان وغیرہ - اس پر اور سب لوگ کہنے لگے جی حضور! واہ کیا بات نکالی ہے - واللہ بالکل سچ ہے جس کے پیشے میں بان وہ بڑا شیطان - حضور ایسی بات سوچنی آپ ہی کا حصہ تھا - ایک حضرت جو ذرا زیادہ بے باک اور منہ پھٹ تھے - جھٹ بول اُٹھے " سچ ہے مہربان" - اس پر تمام درباری چونک پڑے اور ان حضرت کی طرف دیکھنے لگے - بادشاہ نے بھی سنا - مگر چونکہ نہایت باموقع اور لطیف پیرایے میں ندیم نے یہ فقرہ استعمال کیا تھا بادشاہ چپ ہو رہے اور اسے کچھ سزا نہ دی - ندیم نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر یہ بات صحیح ہو کہ ہر پیشہ ور جس کے نام کے آخر میں لفظ بان آئے مکار و دغا باز اور شیطان ہوتا ہے تو پھر مہربان کے آخر میں بھی بان کا لفظ موجود ہے - لہذا یہ لفظ بھی جس کسی شخص کے متعلق استعمال کیا جائے تو اس کو بھی بڑا شیطان سمجھنا چاہیے - ندیم ایوان شاہی سے باہر نکلے تو شہر میں ہر شخص کی زبان پر یہی لطیفہ تھا - اور بعد میں ضرب المثل بن گیا —

جو جاٹ بانٹ کھائے اور گیہوں کھائے دوم

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب مصیبت اور تکلیف تو کوئی

اور اٹھائے اور آرام و راحت کوئی دوسرا پائے - اس کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک جاٹ اور ایک قوم نے شراکت میں ایک کھیت مول لیا اور اُس میں گیہوں اور جو بوے - مگر کاٹنے بونے اور پانی وغیرہ دینے میں قوم نے اپنے ساجھی کی بالکل مدد نہ کی - حالانکہ اس کو قاعدہ کی روسے سارا کام مل کر کرنا چاہئے تھا - جب جاٹ اس کو کام کرنے کے لئے بلاتا تو قوم کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا - خیر جب کھیتی پک کر تیار ہوئی اس وقت جاٹ نے قوم سے کہا " بھئی! اب تک تو تونے کچھہ نہیں کیا - مگر اب کھیتی کٹوا تو لے - مگر اب بھی قوم قابو میں نہ آیا - اور اُدھر اُدھر کی باتیں بنا چلدیا - خیر جاٹ بےچارے نے سارا کام خود ھی کیا - جب دوسرے کسانوں نے قوم کی یہ حرکت دیکھی تو اس کو مشورہ دیا کہ چونکہ قوم نے کچھہ بھی کام نہیں کیا اس لئے تو بھی گیہوں اپنے آپ لوجو اور جتنے جو ھوں وہ قوم کو دیدو یہ اس کے کام نہ کرنے کی سزا ہے - جاٹ راضی ھوگیا - مگر قوم صاحب کو بھی کسی طرح اس خفیہ سازش کی اطلاع مل گئی اور آپ جھٹ کھیت پر آموجود ھوے اور فرمانے لگے کہ بھائی میرا حصہ بانٹ دے - جاٹ کو تو لوگوں نے پہلے ھی سکھا رکھا تھا - اس نے کہا : سن بھئی! میں نے تجھے کام کرنے کے لئے اتنا اتنا بلایا مگر تو نہ آیا - اور اب جب کھیتی تیار ھوگئی تو جھٹ سے آموجود ھوا - چونکہ تونے کام بالکل نہیں کرایا لہذا تجھے اس میں سے صرف جو ملیں گے - گیہوں کے پانے کا تو بالکل حق دار نہیں - قوم کہنے لگا - بھئی یوں نہیں آسان فیصلہ یہ ہے کہ میرا ڈھول جسے میں لے جاکر بجایا کرتا ھوں وہ بڑا عجیب و غریب ہے - میرے گاؤں میں جب دو آدمیوں میں جھگڑا ھوتا ہے تو دونوں

فریق میرے پاس آتے ہیں ۔ ڈھول میں سے جو بہت بڑا ہے آواز آتی ہے نہ فلاں آدمی حق پر ہے ۔ فلاں ناحق پر ۔ بس جھٹ فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور دونوں فریق چپ چاپ واپس چلے جاتے ہیں ۔ اب جب کہ ہم دونوں میں جھگڑا ہوگیا ہے بہتر یہ ہے کہ میں اپنے ڈھول کو لاؤں ۔ وہ ڈھول جس آدمی کے حق میں فیصلہ کردے وہی گیہوں لے جائے ۔ جاٹ بیچارہ سیدھا سادھا آدمی تھا ۔ یہ عجیب و غریب کہانی سن کر بڑا حیران ہوا ۔ اور کہنے لگا بھائی مجھے یہ بات بخوشی منظور ہے ۔ اگر تیرے پاس ایسا ڈھول ہے تو اسے لے آ ۔ جیسا ڈھول کہیگا ویسا ہی سہی ۔ ڈوم صاحب فوراً گھر پہنچے اور اپنی چھوٹی بیٹی کو جو پانچ برس کی تھی خوب پڑھا سکھا کر ڈھول میں بند کردیا اور اسے سر پر اٹھا کر کھیت میں پہنچے اور جاٹ کے سامنے رکھ دیا ۔ اور بڑی شان سے جاٹ سے فرمانے لگے ہاں بھئی اب سارا قصہ اس ڈھول کے آگے بیان کرو ۔ اور بیان سننے کے بعد جو فیصلہ یہ ڈھول دے اسے منظور کرو ۔ جاٹ نے ساری کتھا ڈھول کے آگے دھرائی ۔ ڈھول میں تو سکھایا ہوا جن بیٹھا ہی تھا ۔ اس نے جھٹ فیصلہ دیا کہ "جو جٹ بانٹ کھائے اور گیہوں کھائے ڈوم" یعنی جو تو جاٹ کے حصہ میں آئیں اور گیہوں ڈوم لیجائے ۔ بیچارہ جاٹ اس عجیب و غریب آواز سے جو ڈھول میں سے نکلی بڑا ہی حیران اور متعجب ہوا ۔ اور بے وقوف نے ڈھول کے فیصلہ کے مطابق گیہوں ڈوم کے حوالے کیے ۔ جب سے یہ مثل بولی جانے لگی —

جو سحری کھائے وہی روزہ رکھے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب یہ دکھانا منظور ہو کہ جو

شخص فائدہ حاصل کرے وہی کام کے کرنے میں محنت اور تکلیف بھی اُٹھائے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق ایک بڑا مزے دار قصہ مشہور ہے- ایک صاحب نے ایک کتّا پال رکھی تھی - رمضان کا مہینہ جو آیا تو آپ نے رات کو سوتے ہوئے دودھ میں ڈبل روٹی بھگو کر رکھ دی کہ سحری کو اُٹھ کر کھالوں گا - جب آپ سو گئے تو کتیا نے اطمینان کے ساتھ تمام دودھ اور ڈبل روٹی کا صفایا کیا- سحری کو آپ اُٹھے - دیکھا تو برتن میں ایک قطرہ بھی نہ تھا - کتیا کا منہ جو روشنی میں دیکھا تو بالائی منہ پر لگی ہوئی تھی - بڑا غصہ آیا- مگر علاج کیا تھا- آپ نے یہ علاج کیا کہ اُسے پکڑ کر باندھ دیا - اور سارا دن کھانے کو نہ دیا- اور خود صبح کو روٹی پکوا کر کھانے بیٹھ گئے- لوگوں نے دیکھا تو کہا- "خاں صاحب رمضان میں کھاتے ہو" خاں صاحب کو طیش تو آ ہی رہا تھا- فرمانے لگے "یہ ہم سے مت پوچھو- اس خبیث کتیا سے پوچھو- اس نے ہمارا سارا سحری کا کھانا کھالیا - اب جب اس نے کھانا کھایا ہے تو روزہ بھی یہ خود ہی رکھے- نہ ہم نے سحری کھائی نہ ہم روزہ رکھیں- اسی لیے میں نے اسے پکڑ کر باندھ دیا ہے تاکہ سارا دن بھوکی پیاسی کھڑی رہے"- لوگ یہ قصہ سن کر بہت ہنسے اور جب سے یہ مثل مشہور ہو گئی —

جہاں نناوے گھڑے دودھ کے ہوں وہاں ایک گھڑا پانی کا کیا جانا جائے گا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی شخص اس خیال سے کوئی بے ایمانی کا کام کرے کہ دوسرے آدمیوں کے کاموں کے ساتھ مل کر میرا کام بھی ٹھیک سمجھ لیا جائے گا - اور میری بے ایمانی کسی پر ظاہر نہیں ہوگی - اس کے متعلق یہ نقل مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی بادشاہ

نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ دنیا میں ایمان دار زیادہ ہیں یا بے ایمان۔ وزیر نے عرض کیا۔ جہاں پناہ! میرے خیال میں تو دنیا بے ایمانوں سے بھری پڑی ہے۔ اور ایمان دار ہزار میں سے شاید ایک بھی نہ نکلے۔ بادشاہ نے کہا: اس کا ثبوت کیا ہے؟ وزیر نے جواب دیا: حضور امتحان فرمالیں۔ چنانچہ بادشاہ نے شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ ہر شخص ایک گھڑا دودھ کا بھر کر آج رات کو بارہ بجے فلاں تالاب میں ڈال آے۔ اس پر ہر شخص نے خیال کیا کہ تالاب میں ہزاروں گھڑے دودھ کے لوگ لاکر ڈالیں گے۔ اگر میں پانی کا گھڑا لے جاکر اس میں ڈال دوں گا تو کون پوچھے گا۔ اور ہزاروں دودھ کے گھڑوں میں ایک پانی کا گھڑا معلوم ہی کیا ہوگا۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنے اسی خیال کے مطابق پانی کا گھڑا بھرا اور تالاب میں رات کو ڈال دیا۔ اور چلا آیا۔ صبح کو بادشاہ نے جو جاکر تالاب دیکھا تو تالاب خالص پانی کا بھرا ہوا تھا۔ اور اس میں ایک قطرہ بھی دودھ کا نہ تھا۔ وزیر بھی ساتھ تھا۔ اس نے عرض کیا: حضور نے ملاحظہ فرمایا۔ میرا اندازہ کتنا صحیح نکلا۔ سارے شہر میں سے ایک آدمی بھی ایمان دار نہ نکلا۔

جیسا دے ویسا پائے۔ پوت بھرتار کے آگے آئے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں ایک شخص کو کسی کے ساتھ برائی کرکے اس کا بدلہ فوراً ہی مل گیا ہو۔ اس کہاوت کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک فقیر روزانہ پاس کے گاؤں میں مانگنے جایا کرتا تھا۔ گاؤں کے سرے پر ایک عورت کا مکان تھا۔ فقیر سب سے پہلے اُسی سے جاکر مانگتا۔ اور عورت کو مجبوراً کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ آخر عورت اس روز روز کی مصیبت سے تنگ آگئی۔ ایک روز جل

کو اس نے یہ کام کیا کہ کہیں سے تھوڑا سا زہر حاصل کیا - اور اس کو ملاکر تین چار روٹیاں تیار کیں - پھر مقررہ وقت پر جب فقیر مانگنے آیا تو عورت نے وہی روٹیاں اُٹھا فقیر کے حوالے کیں - اور فقیر اُنہیں لیکر واپس جنگل میں اپنی جھونپڑی میں چلا آیا —

اب سنئے کہ وہ عورت جس نے فقیر کو زہر آمیز روٹیاں دی تھیں اس کا شوہر اور بیٹا کہیں باہر پردیس گئے ہوئے تھے - وہ وہاں سے جو واپس ہوئے تو راستے میں انہیں سخت بھوک اور پیاس لگی - لیکن اتفاق تھا کہ کہیں انہیں کھانا نہ مل سکا - وہ دونوں بھوکے پیاسے فقیر کی جھونپڑی کے سامنے سے گذرے - اور اس خیال سے کہ یہاں کم از کم پانی ہی پینے کے لئے مل جائیگا فقیر کی جھونپڑی میں گھس گئے - فقیر بیٹھا تھا - روٹیاں اس کے سامنے رکھی تھیں اور وہ انہیں کھانے ہی والا تھا کہ یہ دونوں پہنچ گئے - اور کہنے لگے بابا ! بہت دور سے چلے آرہے ہیں - اور سخت بھوکے پیاسے ہیں - فقیر نے فوراً وہی روٹیاں دونوں کے سامنے رکھہ دیں - اور کہا - "لو بچہ کھاؤ - سامنے گھڑے میں پانی رکھا ہے - جتنا چاہو پیو" - باپ بیٹے دونوں بھوکے تو تھے ہی - جلدی سے ساری روٹیاں هضم کیں - اور خوب ڈٹ کر پانی پیا - اور فقیر کا شکریہ ادا کرکے گھر کو روانہ ہوگئے - گھر پہنچتے پہنچتے زہر کا اثر جسم میں سرایت کر چکا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں کا خاتمہ ہوگیا - مرتے وقت یہ انہوں نے ضرور کہا کہ ہم نے راستے میں فلاں فقیر سے روٹیاں لےکر کھائی تھیں - یہ سنتے ہی عورت کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا - اور وہ سمجھہ گئی کہ یہ وہی روٹیاں تھیں جو اس نے فقیر کو مارنے کے لیے اسے دی تھیں - لیکن قسمت کی کسے خبر تھی کہ ان روٹیوں سے خود اسی کے گھر

کا صفایا ہوگا- صورت خوب روئی پیٹی- مگر خود کردہ را علاج نیست والا مضمون تھا- اس کی کرنی اس کے آگے آئی—

جیسے کو تیسا ملے' سن لے راجہ بھیل
لوہے کو گھن کھا گیا' لونڈی کو لے گئی چیل

جب کوئی آدمی دوسرے سے نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے پیش آے مگر دوسرا اُس سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ثابت ہو اس وقت یہ مثل بولتے ہیں- اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص تلاش معاش میں سفر پر روانہ ہوا- اس کے پاس بیس من لوہا رکھا تھا- چلتے ہوے وہ لوہا اس نے اپنے ایک دوست کے پاس امانت رکھ دیا- اور کہا جب سفر سے واپس آوں گا تو لے لوں گا- اس کے جانے کے بعد اِن حضرت نے سارا لوہا بیچ کر دام کھرے کئے- آٹھ برس کے بعد وہ شخص وطن واپس آیا- اور آتے ہی دوست سے ملا اور کہا لاؤ بھئی میرا وہ لوہا دو- جومیں چلتے وقت تمہارے پاس امانت رکھوا گیا تھا- دوست صاحب نے کمال سلجھدگی کے ساتھ جواب دیا : کیا کہوں بھائی! آپ سے سخت شرمندگی ہے- مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کے پیچھے برسات میں ایک سال سخت بارش ہوئی- جس کوٹھری میں آپ کا لوہا رکھا تھا- اتفاقاً وہ بہت ٹپکی اور اتلی ٹپکی کہ اس میں تمام پانی ہی پانی ہوگیا- نتیجہ یہ ہوا کہ لوہے کو زنگ لگ گیا- اور سارا لوہا گھن کھا کر بیکار ہوگیا- اور دھیلے کی قیمت کا بھی نہ رہا- مجبور ہوکر میں نے اسے پھینک دیا اور کیا کرتا- دوست سمجھ گیا کہ یہ ساری مصنوعی باتیں ہیں- لوہا اس نے ہضم کیا اور بہانہ بنادیا- مگر اس کے منہ پر کچھ ظاہر نہیں کیا- اور

ہنس کر کہنے لگا: آپ نے بہت اچھا کیا کہ زنگ آلودہ لوہے کو پھینک دیا۔ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اور اس سے تپاک اور گرم جوشی سے ملتا رہا۔ اور بالکل اپنا ملال اس پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ دوست بھی بے فکر ہوگیا۔ اور اس نے سمجھ لیا کہ خوب اس کو الو بنایا۔ بہت دنوں کے بعد ایک روز ان صاحب نے اپنی ایک لونڈی کو لوہے کے مالک کے ہاں آگ لینے بھیجا۔ اب موقع تھا۔ اس نے جھٹ لونڈی کو پکڑ کوٹھڑی میں بند کر قفل لگا دیا۔ تھوڑی دیر تو اس نے انتظار کیا۔ اور جب لونڈی نہ آئی تو وہ خود اسے دیکھنے آیا۔ اور دوست سے کہنے لگا: میں نے لونڈی کو آگ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ کہاں گئی؟ دوست نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بھائی کیا کہوں۔ آپ سے بڑی شرمندگی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہوا کہ لونڈی آپ کی بے شک یہاں آئی تھی۔ اور آگ لے کر واپس چلی ہی تھی کہ ایک چیل اڑتی ہوئی آئی اور اسے پنجوں میں پکڑ اڑ گئی۔ میں ہر چند پیچھے دوڑا۔ مگر وہ اُسے لے کر ہوا ہوچکی تھی۔ اب میں کیا کرتا مجبور ہو کر چپکا ہو رہا"۔ دوست نے یہ عجیب و غریب قصہ سنا تو اُسے بڑا غصہ آیا اور کہنے لگا۔ میاں عقل کے ناخن لو۔ کہیں چیل بھی عورت کو اٹھا کر لے جاسکتی ہے؟ وہ بولا ہاں بھائی! جس طرح میرے لوہے کو گھن کھا گیا اسی طرح عورت کو چیل لے گئی۔ اب یہ حضرت سمجھے کہ مجھے اپنی کرتوت اور چالاکی کی سزا ملی ہے۔ مجبور ہوکر لوہے کی قیمت ادا کی اور لونڈی کو لے کرگھر آئے۔ اس واقعے سے یہ مثل بولی جانے لگی۔—

چراغ تلے اندھیرا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں لائق ماں باپ کے ہاں اولاد نالائق اٹھے - یا کسی شخص کے علم، کمال، هنر یا طاقت سے غیر لوگ تو فیض حاصل کریں - مگر اس کے اپنے عزیز اور قریب اس سے محروم رهیں اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مسافر کہیں سے چلا ہوا آرہا تھا - جب دارالسلطنت کے قریب پہنچا تو عین فصیل قلعہ کے نیچے اسے پانچ چھہ ڈاکو ملے اور بیچارے غریب مسافر کا سارا مال و متاع لوٹ لیا - مسافر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا اور کہنے لگا - دهائی ہے حضور کی! دارالخلافہ کے عین نیچے میں دن دهاڑے لوٹا گیا - بادشاہ نے کہا - "بھئی! بات تو افسوس کی ہے - مگر ہم کیا کرسکتے ہیں - جو کچھہ ہونا تھا ہولیا - اب صبر کرو" - مسافر کو اس جواب سے بڑی حیرت ہوئی - اس نے کہا "حضور! یہ تو بڑا اندھیر ہے کہ حضور کے سامنے اور حضور کے شہر کے عین نیچے مسافر لٹ جاتے ہیں - اور اس کا کچھہ تدارک نہیں ہوسکتا - اگر یہاں بھی امن نہیں تو پھر امن کہاں ملے گا ؟" بادشاہ نے هنس کر جواب دیا "میاں! تم نے دیکھا نہیں - چراغ جلا کر شمع دان پر رکھو تو اگرچہ وہ سارے گھر کو روشن کردے گا مگر اس کے خود کے نیچے همیشہ اندھیرا ہی رہے گا - بس یہی حال ہمارا بھی سمجھہ لو" - اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی —

چور کی ڈاڑھی میں تنکا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب محفل میں کسی برائی کا ذکر ہو رہا ہو اور کوئی شخص خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے کہ صاحب! یہ تو تم نے مجھے کہا - حالانکہ اس کا نام اس وقت بالکل نہ لیا گیا ہو - یہ مثل کس طرح

شروع ہوئی اس کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ کسی شادی کی محفل میں کسی کی کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی - ہر چند اس نے تلاش کی مگر نہیں ملی - مجبور ہوکر اس شخص نے یہ ترکیب کی کہ تمام حاضرین کو جمع کیا اور ان سے کہا :" سنو بھائیو ! میرا مال جس نے چرایا ہے مجھے تحقیق طور پر معلوم ہوگیا ہے کہ وہ کون ہے اور اتفاق سے وہ اس وقت اسی مجمع میں موجود بھی ہے - میں نام تو نہیں لیتا - مگر اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اس کی ڈاڑھی میں ایک تنکا لگا ہوا دکھائی دیتا ہے میری بتائی ہوئی یہ نشانی بالکل ٹھیک ہے - اور یقیناً وہی شخص چور ہے اب اس کی خیریت اسی میں ہے کہ چپکے سے مال لاکر مجھے دے دے - ورنہ پھر بدنامی اور فضیحت مفت میں ہوگی - اور ہاتھ کچھہ بھی نہیں آے گا " - اب سنئے کہ چور مجمع میں موجود تھا اس نے سوچا کہ کہیں مالک نے تھانے سے میری چوری کا حال معلوم کرلیا ہے - میری ڈاڑھی میں کہیں سے کوئی تنکا الگ گیا ہوگا - اس لئے وہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہے - جب لوگ میری ڈاڑھی میں تنکا لگا ہوا دیکھیں گے فوراً یقین کرلیں گے کہ بیشک اسی نے چوری کی ہے - لاؤ لوگوں کے دیکھنے سے پہلے جلدی سے ڈاڑھی میں سے تنکا نکال کر پھینکدوں تاکہ کوئی ثبوت ہی باقی نہ رہے - یہ سوچتے ہوئے اس نے ڈاڑھی کی طرف جلدی سے ہاتھہ بڑھایا تاکہ تنکا نکال کر فوراً نیچے پھینکدے - چیز کا مالک نہایت غور کے ساتھہ سب کو تاڑ رہا تھا - اُس نے دیکھا فلاں شخص نے ڈاڑھی کی طرف ہاتھہ بڑھایا ہے - وہ آگے بڑھا اور جھٹ چور کا ہاتھہ پکڑ لیا اور مجبوراً سارا مال اُسے دینا پڑا - یہ ہے اس مثل کی وجہ تسمیہ —

اثر کی تاریخ وفات

از

(جناب محمد اسد خاں صاحب بی اے)

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ع کے "اُردو" میں جناب سید وقار عظیم صاحب ایم اے نے "کلام اثر" کے عنوان سے جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس میں خواجہ میر اثر کی تاریخ پیدائش و وفات کی تحقیق کی کوشش نہایت قابل قدر ہے - چونکہ اس سے پیشتر کسی تذکرہ نویس نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی اس لئے صاحب موصوف کو "خارجی شواہد کی مدد سے صرف قیاسیات سے کام لینا پڑا" ہے —

انہوں نے مختلف دلائل کی بنا پر تاریخ پیدائش کا اندازہ سنہ ۱۱۵۴ھ سے ۱۱۵۵ھ کے درمیان لگایا ہے - اور ممکن ہے یہ صحیح ہو - لیکن تاریخ وفات کی تحقیق میں وہ صرف اِس نتیجے پر پہنچ سکے ہیں کہ اثر سنہ ۱۱۹۹ھ تک زندہ تھے اور سنہ ۱۲۲۱ھ سے پہلے مر چکے تھے - اگرچہ یہ اندازہ مؤلف گل رعنا کے اس سرسری اندازے سے کہ وہ سنہ ۱۲۵۰ھ سے پہلے مرے زمانہ وفات کو زیادہ محدود کر دیتا ہے لیکن پھر بھی بائیس برس کا عرصہ کافی طویل ہے اور یقیناً اہل تحقیق کی پوری تشفی کا موجب نہیں ہو سکتا —

خیال آیا کہ صرف قیاسی دلائل پر کیوں اکتفا کیا جائے - جب اثر

کا مزار دھلی میں موجود ھے تو کیوں نہ وھاں چل کر دیکھہ لیا جائے کہ لوح مزار پر تاریخ وفات کیا لکھی ھے - افسوس ھے کہ ھمارے اکثر مصنفین کی دوڑ زیادہ سے زیادہ کتب خانہ تک ھوتی ھے - وہ تحقیق کی بنیاد محض کتابوں پر رکھتے ھیں اور ان کے علاوہ کسی اور خارجی شہادت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کرتے —

اثر کا مزار ترکمان دروازے کے باھر ایک مسجد کی بغل میں نہایت اچھی حالت میں موجود ھے - گز بھر بلند دیوار کا ایک چھوٹا سا چوکور احاطہ ھے جس کے اندر پھر ایک چھوٹا سا دائرہ بنا ھوا ھے - دائرے کے وسط میں سب سے بڑی قبر خواجہ میر ناصر عندلیب رح کی ھے - ان کے دائیں پہلو میں ذرا چھوٹی قبر ان کے فرزند خواجہ میر درد رح کی ھے اور اس کے ساتھہ اس سے چھوٹی قبر خواجہ میر اثر کی ھے - ان کے علاوہ اسی خاندان کے چند اور افراد کی قبریں بھی ھیں - یہ مسجد اور احاطے پہلے ویران علاقے میں پڑے تھے مگر اب نئی دھلی کی آبادی کے سلسلے میں ان کے چاروں طرف مکان تعمیر ھوگئے ھیں اور مسجد کی رونق بڑھتی جارھی ھے —

مزار پر میر اثر کی تاریخ وفات سنہ ۱۲۰۹ھ درج ھے - تعجب ھے کہ آج تک کسی تذکرہ نویس نے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا —

مقالہ نگار نے اثر کی عمر کا اندازہ ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان لگایا ھے - اگر سنہ ۵۵ - ۱۱۵۳ھ کی پیدائش کو صحیح مان لیا جائے تو اب سنہ ۱۲۰۹ھ کی وفات تک عمر تقریباً ۵۵ برس ثابت ھوتی ھے —

جائزۂ زبان اردو

(از ایڈیٹر)

اردو ہندوستان کے ہر علاقے میں کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہے - ہر صوبے کے حالات مختلف ہیں اور اس لیے اُسی مناسبت سے ہماری زبان کی حالت بھی ہر جگہ یکساں نہیں ۔اب تک اس بارے میں ہماری تقریریں اور تحریریں زیادہ تر قیاس پر مبنی رہی ہیں ' صحیح واقعات اور اعداد و شمار کی تحقیق کی کوشش نہیں کی گئی - اس لیے انجمن ترقیء اردو نے یہ تہیہ کیا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے اور علاقے نیز دیسی ریاستوں میں اردو زبان کا جائزہ لیا جاے اور یہ دیکھا جاے کہ ہر مقام پر اس کی کیا حالت ہے اور اس کی ترقی اور اشاعت کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے - اس خیال کو سب سے پہلے میں نے دسمبر سنہ ۱۹۳۳ ع کی انڈین اور ینٹل کانفرنس میں ظاہر کیا تھا - اس کے بعد ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۳۴ ع کو بمقام علی گڈہ سر سید راس مسعود کی صدارت میں اس امر پر غور کرنے کے لیے ایک مختصر مجلس کا انعقاد کیا گیا جس میں اصحاب ذیل شریک تھے —

سر شیخ عبدالقادر ' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' سید محفوظ علی صاحب ' ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ' ڈاکٹر عابد حسین ' غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ

کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، پنڈت دتاتریہ کیفی صاحب، سید ہاشمی صاحب، مولوی مقصود مبین صاحب، مولوی بشیرالدین احمد صاحب، عبدالحق —

اس مجلس کے سامنے میں نے جائزۂ زبان اردو کا مقصد بیان کیا اور وہ استفسارات پیش کیے جو اس غرض کے لیے مرتب کیے گئے تھے - ان پر کچھ دیر گفتگو رہی اور مناسب ترمیم و اصلاح کے بعد منظور کیے گئے - یہ بھی طے ہوا کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے سارے ہندوستان میں متعدد حلقے قائم کیے جائیں اور ہر حلقے کا کام ایسے احباب کے سپرد کیا جائے جو اپنی زبان سے حقیقی ہمدردی اور دلچسپی رکھتے ہیں - اور اگر کہیں تھوڑے بہت مصارف کی ضرورت لاحق ہو تو وہ اسی حلقے سے بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے —

۲۹ مارچ کو میں مولوی سید ہاشمی صاحب کی معیت میں لاہور پہنچا جہاں سر شیخ عبدالقادر صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں خاص خاص اصحاب کو مدعو کیا گیا تھا - اس جلسے میں اس امر پر گفتگو رہی کہ پنجاب میں اس کام کو کس نہج سے انجام دیا جائے - چونکہ سر شیخ عبدالقادر صاحب وزیر ہند کی کونسل کی رکنیت کے لیے نامزد ہوگئے تھے اس لیے ان کی جگہ شمس العلما میر ممتاز علی صاحب کا انتخاب کیا گیا - اور ہر استفسار کے جواب مرتب کرنے کے لیے مختصر کمیٹیاں قائم کی گئیں —

۳۱ مارچ کو میرٹھ میں آل انڈیا ایجو کیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا - اس میں شرکت کے لیے میں ۳۰ مارچ کی شب کو لاہور سے روانہ ہوگیا - یکم اپریل کے اجلاس میں میں نے جائزۂ زبان اردو کے مقاصد کے متعلق ایک مختصر تقریر کی - ارکان کانفرنس نے اس تجویز کو بہت

پسند فرمایا اور نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی) نے اپنی عنایت سے وعدہ فرمایا کہ یوپی کے لیے کانفرنس اس کام کو انجام دے گی اور اگر کچھہ مصارف عائد ہوں گے تو کانفرنس اُسے ادا کرے گی - چنانچہ پراونشل ایجو کیشنل کانفرنس اس کام کو انجام دے رہی ہے —

کچھہ دنوں بعد میں مدراس گیا اور وہاں بعض صاحبوں سے اس کے متعلق گفتگو کی - افضل العلما مولوی عبدالحق صاحب ایم - اے پروفیسر محمدن کالج اردو زبان کے بڑے ہمدرد ہیں - انھوں نے بطیب خاطر اس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا —

اس کرسمس میں میں نے کلکتہ کا سفر کیا - وہاں بعض احباب نے جنہیں اُردو زبان کی اہمیت کا پورا احساس ہے مدد دینے کا وعدہ کیا اور آنریبل مولوی عزیزالحق صاحب وزیر تعلیمات احاطۂ بنگال نے متعدد اصحاب کو اپنے دولت کدے پر مدعو کیا اور اس مسئلہ پر گفتگو فرمای جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی وقت جائزۂ زبان کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے سکرٹری خلیفہ محمد اسداللہ صاحب ناظم امپیریل لائبریری کلکتہ قرار پائے —

ابتدا میں یہ کام بہت مشکل نظر آتا تھا اور بعض احباب اسے محال خیال کرتے تھے - لیکن اب جو کام شروع ہوگیا ہے تو کامیابی کی توقع قوی ہوتی جاتی ہے - بعض صاحبوں نے اپنے علاقوں کے اعداد و شمار اور مستفسرہ واقعات کے جوابات مکمل کرکے بھیج دیے ہیں - اس کی تفصیل یہ ہے —

۱ - مسٹر میکنزی ایم - اے ' سی آئی ای ' سی ایس آئی سابق ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن و حال پرو وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے جہاں تک کہ سررشتۂ تعلیم کا تعلق تھا تمام اعداد و شمار مکمل کرکے روانہ کیے —

۲ - مولوی احسان الحق صاحب ڈپٹی انسپکٹر اپر برما ' محمد یوسف صاحب رنگون اور جناب شاہد صاحب مالک آزاد برما پریس رنگون اور ایم - اے مانت صاحب نے برما کے متعلق جوابات ارسال کئے —

۳ - صاحبزادۂ محمد عمر صاحب سب جج جموں نے جموں کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائیں —

۴ - ملک محمد دین صاحب بی - اے دربار سکرٹری نے ریاست ٹونک کے متعلق تمام استفسارات کے جوابات لکھ کر بھیج دیے ہیں —

۵ - جناب شعیب قریشی صاحب مشیرالمہام نے ریاست بھوپال کے متعلق مکمل جوابات مرتب کرکے روانہ کردیے ہیں —

۶ - خان صاحب خواجہ لطیف احمد صاحب نے برار کے متعلق مفصل رپورٹ تیار کرکے بھیج دی ہے —

۷ - خان بہادر محمد اشرف صاحب (علیگ) نے لاسہ (تبت) کے متعلق دلچسپ حالات لکھ کر بھیجے ہیں -

۸ - ارشاد حسین صاحب زیدی (آرٹسٹ) سکرٹری شعبۂ ادب اردو نے بھرتپور کے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں —

میں ان تمام صاحبوں کی عنایت اور ہمدردی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں - بعض صاحبوں نے اپنے اپنے ضلع یا خاص مقامات کے حالات لکھ کر بھیجے ہیں مثلاً —

زیر احمد صاحب بی - اے متعلم جامعہ عثمانیہ نے عثمان آباد
ولوی عبدالشکور صاحب ایم - اے لکچرار بریلی کالج نے نین تال
د قمرالدین رسول میاں صاحب نے ڈبھوی کے اور علی محمد صاحب
نجمن ترقیء اردو ساگر نے ساگر کے حالات لکھہ کر بھیجے ھیں - میں
حبوں کی امداد کا شکریہ ادا کرتا ہوں —
ہور کی مجلس بڑی مستعدی سے کام کر رھی ہے اور امید ہے کہ عاقریب
ں مکمل رپورٹ وصول ہوجاے گی —
پی میں پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کے قابل سکرٹری
نظام الدین حسن صاحب اڈیٹر و مالک اخبار ذوالقرنین بدایون
ق اور محنت سے اس کام کو کر رہے ھیں اور بہت سا حصہ مکمل کرچکے
اس رپوٹ کی بھی جلد وصول ہونے کی توقع ہے —
دراس میں افضل العلما مولوی عبدالحق صاحب نے کام شروع کردیا
امید ہے کہ کچھہ دنوں کے بعد مکمل ہوجاے گا —
مبئی میں مولوی عبدالرحیم صاحب ت متمکر اور محمد یوسف صاحب
س کام کے انجام دینے کی کوشش کر رہے ھیں —
وبۂ بہار میں مولوی منظور عالم صاحب عاصی مدیر معاون فطرت
ام کا بیڑا اٹھایا ہے اور کام شروع کردیا ہے اور قاضی عبدالودود صاحب
یت لا پٹنہ نے بھی جن کو اردو ادب سے خاص دلچسپی ہے اس
انت کا وعدہ فرمایا ہے —
وسرے صوبوں اور علاقوں کے اصحاب سے بھی مراسلت ہورھی ہے
ید ہے کہ وہاں بھی جلد کام شروع ہوجاے گا —
، جائزے کے موجودہ کام کا مختصر خاکہ ہے - مکمل رپوٹ میں

تمام امور سے مفصل بحث کی جائے گی اور ان تمام اصحاب کا ذکر کیا جائے گا جنہوں نے اس کام میں اعانت فرمائی ہے - یہ رپورٹ انجمن کا ایک معیار کارنامہ ہوگا اور حامیان اردو کے لیے اور خاص کر اُن اصحاب کے لیے جو اردو کے بہی خواہ ہیں اور اس کی ترقی و اشاعت کے لیے کچھ کام کرنا چاہتے ہیں، رہنمائی کا کام دے گی - ذیل میں بغرض اطلاع عام استفسارات اور طریقۂ کار کی نقل دی جاتی ہے —

استفسارات دربارہ جائزۂ زبان اردو

آپ کے صوبے یا علاقے میں

۱ - ایسے اشخاص کی تعداد جو

(الف) اردو بولتے ہیں، یعنی جن کی مادری زبان اردو ہے -

(ب) اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو بول سکتے ہیں -

(ج) اردو لکھتے پڑھتے ہیں یا لکھ پڑھ سکتے ہیں —

(د) اردو سمجھ سکتے ہیں -

۲ - (الف) سرکاری اور امدادی مدارس کی تعداد جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے —

(ب) یہ تعلیم کس درجے تک ہوتی ہے -

(ج) اس کے درسی نصاب کی کیا حالت ہے -

(د) طلبہ کی تعداد -

۳ - غیر سرکاری مکاتب نیز قدیم طرز کے عربی فارسی کے مدارس کی تعداد جن میں اردو پڑھائی جاتی ہے یا اردو ذریعۂ تعلیم ہے - نیز تعداد طلبہ-

۴ - سرکاری اور نجی اردو کتاب خانوں کی تعداد - نیز ایسے کتب خانوں کی تعداد جن میں اردو کتابیں بھی موجود ہیں —

۵ - ایسی انجمنوں اور اداروں کی تعداد جو اردو کی خدمت کرتے ہیں (ان میں اردو کی مختلف قسم کی بزمیں ' دارالمطالعے ' مشاعرے وغیرہ سب شامل ہیں)—

۶ - اردو مطابع اور جرائد کی تعداد اور حالت -

۷ - سرکاری محکموں اور عدالتوں میں اردو زبان کے استعمال کی کیا حالت ہے —

۸ - جب سے انگریزی عملداری قائم ہوئی ہے سررشتۂ تعلیم نے اردو سیکھنے سکھانے کے متعلق کون کون سے احکام نافذ کیے ہیں - ان احکام کی نقل یا خلاصہ مع حوالۂ تاریخ و سنہ و نمبر —

۹ - آپ کی رائے میں کون سی ایسی تدابیر ہو سکتی ہیں جن سے آپ کے علاقے میں اردو کی اشاعت و ترقی میں مدد مل سکتی ہے —

مذکورۂ بالا استفسارات کے جواب اردو زبان کے جائزے کے لئے لازم ہیں - امید ہے کہ جہاں تک ممکن ہوگا احتیاط کے ساتھ ان معلومات کے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی - لیکن بعض علاقوں میں مقامی لحاظ سے اردو زبان کے متعلق بعض ایسے امور کا پایا جانا ممکن ہے جو ان استفسارات کے تحت میں نہیں آتے ' لہذا ایسے تمام امور خاص طور پر درج فرمادیے جائیں تاکہ رپوٹ کی ترتیب کے وقت وہ پیش نظر رہیں -

اس کے علاوہ ہر علاقے میں اردو زبان و ادب کی جو عام حالت ہے اس کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے - مثلاً (۱) وہاں اردو زبان ترقی پر ہے یا انحطاط پر، انحطاط ہے تو کیوں؟ - (۲) لوگوں کو اردو سیکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے یا نہیں اور وہ اردو زبان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں - (۳) وہاں کی اردو زبان میں اگر کچھ مقامی خصوصیات پائی جاتی ہوں تو انہیں قلم بند کر دیا جائے - (۴) اردو زبان کا وہاں کی مقامی اور قرب و جوار کی بولیوں پر اور ان بولیوں کا اردو پر کیا اثر ہوا ہے - (۵) وہاں اردو میں تالیف و تصنیف کا سلسلہ کب سے ہے اور کون کون سے ایسے نامی اور ممتاز مصنف یا شاعر گذرے ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان کو فروغ ہوا یا وہاں کے لوگوں میں شوق پیدا ہوا - (۶) وہاں کی سب سے قدیم اردو تصنیف یا نظم وغیرہ - (۷) ان لوگوں کے نام بھی لکھے جائیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں خاص طور پر کوشش کی -

ہر علاقے میں کوئی نہ کوئی صاحب ایسے ضرور ہوں گے جنھوں نے ان مسائل پر غور یا تحقیق کی ہوگی - اگر ان سے درخواست کی جائے گی تو امید ہے کہ وہ ضروری معلومات بہم پہنچا دیں گے —

ان تمام امور کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ رپوٹ میں ہر علاقے کے متعلق حتی الامکان مکمل اطلاعات مہیا کر دی جائیں —

طریقۂ کار

(۱) - جائزۂ زبان اردو کے استفسارات کے تحت میں سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اپنے صوبے یا علاقے یا حلقے میں ایسے حضرات کو ایک جا جمع ہونے کی زحمت دی جائے جو اردو زبان کے حقیقی بہی خواہ اور ہمدرد ہیں - جائزۂ زبان اردو کی غرض سے ان کی ایک مجلس (کمیٹی) قایم کی جائے جس کے رکن یہ سب صاحب ہوں اور انہیں میں سے صدر اور معتمد منتخب کرلئے جائیں بلکہ مناسب اور بہتر یہ ہوگا کہ مستقل طور سے وہاں انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ قایم کردی جائے جیسا کہ لاہور میں سر عبدالقادر و دیگر بہی خواہان اردو نے کیا ہے- فی‌الحال یہ مجلس جائزے کا کام کرے اور آیندہ اپنے علاقے میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے متعلق اپنی کوشش جاری رکھے —

(۲) - مجلس کے باقاعدہ قیام کے بعد ارکان کے سامنے استفسارات پیش کئے جائیں اور ہر استفسار کے ہر پہلو پر کامل غور اور بحث کی جائے اور یہ‌بھی دیکھا جائے کہ کون کون سے استفسارات آپ کے علاقے سے متعلق ہیں اور کون سے ایسے امور ہیں جو مزید وضاحت کے محتاج ہیں - ایسے امور کے متعلق معتمد انجمن ترقی اردو

اورنگ آباد سے مشورہ کیا جا سکتا ہے -

(۳) - کام کی تکمیل اور سہولت کے خیال سے یہ ہونا چاہئیے کہ ایک ایک استفسار الگ الگ ایک ایک صاحب کے تفویض کردیا جاے اور یہ جتادیا جاے کہ فلاں تاریخ تک اس کی تکمیل کردی جاے (مدت کا تعین کسی حال میں تین ماہ سے زیادہ نہ ہو) - اور وہ شخص اس استفسار کے متعلق تمام ضروری معلومات جمع کرکے مجلس میں پیش کرے - مجلس پیش کردہ اطلاعات پر کامل غور کرے اور دیکھے کہ کوئی امر تشنہ یا تکمیل طلب تو نہیں رہا - اگر ایسا ہو تو اس کی تکمیل کراے اور اس کے بعد یہ تمام کاغذات معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے پاس بھیج دیے جائیں —

(۴) - استفسارات کی تفویض میں یہ امر خاص طور پر ملحوظ خاطر رہے کہ جس کسی کو جو استفسار دیا جاے وہ اس کے حالات اور تجربہ کے مناسب ہو مثلاً اگر کوئی ایسے صاحب ہیں جن کی عمر کا بیشتر حصہ سررشتہ تعلیمات کی خدمت میں یا ملک کی تعلیمی جد و جہد میں گذرا ہے اور ان کی رسائی سررشتۂ تعلیمات اور اس کے عہدہ داروں تک بھی ہے تو ایسے صاحب کو وہ استفسار تفویض کرنا ہر حال میں مناسب ہوگا جس کا تعلق تعلیم اور مدارس سے ہے - اسی طرح اگر کسی صاحب کو اردو اخبارات اور مطابع سے زیادہ واقفیت ہے اور ذاتی تجربہ بھی رکھتے ہیں تو ان کو وہی استفسار دیا جاے جو اردو جرائد اور مطابع سے تعلق رکھتا ہے —

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر رکن الگ الگ کام کرے گا اور ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ مجلس مجموعی طور

پر نیز ارکان فرداً فرداً معلومات فراہم کرنے اور معلومات کے ذرائع دریافت کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے - بلکہ اگر ضرورت سمجھی جاے تو ہر ایسے رکن کو جس کے تفویض کوئی استفسار کیا گیا ہے اختیار ہوگا کہ وہ سہولت کے خیال سے اطلاعات و معلومات بہم پہنچانے کے لئیے اپنی ایک چھوتی سی کمیتی قایم کر لے -

(۵) - ہر امر کی تحقیق میں صحت کا خاص طور پر خیال رکھا جاے - اعداد و شمار اور واقعات وغیرہ اس وقت تک رپوٹ میں درج نہ کیے جائیں جب تک کامل تحقیق کرکے ان کی صحت کا اطمینان نہ کر لیا جاے - مقامی مجلس جو معلومات فراہم کر کے انجمن کو بھیجے گی وہ ان معلومات کی صحت کی ذمہ دار ہوگی اس لئیے اس کا فرض ہوگا کہ ارکان سے جو رپوتیں وصول ہوں وہ پوری جانچ پرتال کے بعد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کو بھیجی جائیں —

(۶) - مختلف اعداد و شمار سرکاری رپوتوں سے فراہم کئے جائیں گے - لیکن رپوتوں میں اکثر گذشتہ سال اور بعض اوقات اس سے بھی قبل کے اعداد مندرج ہوتے ہیں - لہذا یہ کوشش کی جاے کہ سررشتہ ہاے مختلفہ سے تازہ ترین اعداد و شمار حاصل کئے جائیں - مردم شماری کی رپوٹ میں زبان کے متعلق اعداد و شمار درج کئے گئے ہیں - لیکن زبانوں کی تقسیم کچھہ اس طرح کی گئی ہے کہ ان میں اردو یا هندوستانی کا نام نہیں آتا مثلاً مغربی هندی یا راجستانی وغیرہ میں اُسے چھپا دیا ہے - اس لئیے مردم شماری کی رپوٹ سے اعداد فراہم کرتے وقت اس کا خیال رکھا جاے —

اگرچہ مردم شماری کی رپوٹ میں اعداد و شمار بڑی احتیاط

اور محلت سے جمع کئے گئے هیں تا هم بعض وجوہ کی بنا پر وہ محتاج توثیق و تنقید هیں - یہ نا ممکن هے کہ هم تمام هندوستان کی زبان شماری کرسکیں اس لئے مناسب هوگا کہ سارے علاقے میں ایک دو مقام منتخب کر کے ان کی زبان شماری کی جاے اور اس کی مطابقت مردم شماری کے اعداد سے کی جاے - اس پر سے قیاس قائم هو سکے گا کہ مردم شماری کی رپوٹ میں کس حد تک اختلاف پایا جاتا هے - اگرچہ اس کے انجام دینے میں کسی قدر دشواری هوگی لیکن یہ کام همارے اغراض کے لیے بہت موثر اور مفید ثابت هوگا —

(۷) - اس کام کو انجام دینے میں کچھہ زیادہ خرچ نہ هوگا لیکن پھر بھی کچھہ نہ کچھہ ضرور خرچ هوگا - اس کے لئے مناسب یہ هوگا کہ مقامی طور پر اسی علاقے سے چندہ جمع کرلیا جاے جو اخراجات کے لئے مکتفی هو یا اس سے بڑی بہتر تدبیر یہ هوگی کہ انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ قائم کردی جاے جیسا کہ بعض مقامات پر اسی غرض کے لئے هوا هے اور ارکان کی اس قدر تعداد بہم پہنچائی جاے کہ ان کے چندے سے یہ کام انجام پا جاے -

یہ چند امور مشورے کے طور پر عرض کئے گئے هیں - هر علاقے کی مجلس مقامی حالات اور خصوصیات کے لحاظ سے ان میں مناسب رد و بدل کر سکتی هے - غرض یہ هے کہ کام بسہولت و بخوبی انجام پاے - باوجود امور مصرحۂ بالا کے اگر مزید مشورے کی ضرورت هو تو معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن اس خدمت کو بخوشی انجام دینے کے لئے آمادہ هے —

———•———

بادۂ کہن

غزلیات ایجاد

میرزا علی نقی نام، ایجاد تخلص - ان کے والد نقد علی خاں ہمدانی الاصل قوم قاچار سے تھے، اور شیخ علی خاں وزیر شاہ سلیمان صفوی سے قرابت قریبہ رکھتے تھے - نقد علی خاں اپنے وطن سے ہندوستان آئے اور آصف جاہی ملازمت حاصل کرلی اور مدت تک شہر حیدرآباد کی دیوانی پر جو اس زمانے میں بڑی اہم اور ذمہ داری کی خدمت تھی مامور رہے - ملازمت کے علاقے سے حیدرآباد میں توطن اختیار کرلیا تھا - سنہ ۱۲۱۴ھ میں وفات پائی* اور برہان پور میں مدفون ہوئے - برہان پور میں ان کے مزار کی ہم نے زیارت کی ہے، مزار کے سرہانے خوش خط کتبہ بھی ہے جو افسوس ہے کہ اکھڑ کر گر پڑا ہے -

ایجاد برہان پور میں پیدا ہوئے چنانچہ خود لکھا ہے :-

چو ایجاد سعادت مند از دارالسرور آمد

در اول حیدرآبادی شد و آخر کربلائی شد

ایجاد نے اپنی لیاقت و قابلیت سے نواب آصف جاہ بہادر کی مصاحبت حاصل کرلی تھی اور نواب موصوف کے مصاحبین میں خاص پایہ رکھتے تھے -

صاحبِ تحفۃ الشعراء نے لکھا ہے کہ کوتوالئی لشکر کی خدمت پر ممتاز تھے بعد کو فیل خانۂ سرکار صلابت جنگ بہادر کی داروغگی ملی اور جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو اپنے موروثی خطاب نقد علی خاں سے سرفراز

---

* سرو آزاد -

ہوے اور دیوانگی بلدہ کی خدمت پر مامور ہوگئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ان کا وہ اقتدار اور اثر و رسوخ باقی نہ رہا تھا اس لیے کہ شفیق نے (۱۱۷۵ - ۱۱۷۹ھ میں) لکھا ہے "اس وقت چرخ کج رفتار کی گردش سے اپنے اوقات نواب نظام علی خاں بہادر کے لشکر ظفر اثر میں بسر کرتے ہیں"۔

ایجاد مذہباً اثنا عشری تھے، دل میں مذہب کا احترام حد سے زیادہ تھا۔ اہل بیت کی مدح میں کثرت سے قصیدے وغیرہ اردو اور فارسی میں لکھے ہیں —

صاحب محبوب الزمن نے لکھا ہے کہ تخمیناً ۱۱۸۵ کے قریب حیدرآباد میں فوت ہوے ان کے قرابت داروں نے ان کی لاش کو کربلاے معلی لے جاکر سپرد خاک کیا، ان کے تین فرزند تھے علی نقی خاں 'انصاف' مہدی علی خاں 'نہو' اور باقر علی خاں افسر۔ تینوں صاحب ذوق شاعر تھے۔ ان کے حالات اور کلام کے نمونے تذکروں میں موجود ہیں —

ایجاد فارسی اور اُردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں صاحب دیوان ہیں، انجمن ترقی اردو کے کتاب خانے میں ان کے تین دیوان محفوظ ہیں۔ ایک جلد میں اردو اور فارسی کے دو ضخیم دیوان ہیں جن میں تمامتر قصاید ہیں، دوسری اصناف سخن بھی ہیں لیکن وہ بھی بیشتر اہل بیت کی مدح ہی پر مشتمل ہیں۔ ایک علحدہ دیوان اردو غزلوں کا ہے جس سے ذیل کی غزلیں نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں (چ)۔

مجلس وہ بیٹھیے کہ جہاں امتیاز ہو — اخلاص اُس سے رکھیے جو مخلص نواز ہو

تیزوں سے تیز ہو کے ملاقات کیجیے — سید ہے ہو ملیے اس سے جو کوئی راست باز ہو

شعر اس کے آگے پڑھیے جو فہم سخن کرے — معنی اُس سے کہیے جو معنی طراز ہو

ہم دل جلوں کی بات وو سمجھے جو شمع سا — روشن بیانِ محفلِ سوز و گداز ہو

پہلو اُسی کے بیٹھے جو دلبری کرے باتیں اسی سے کیجے جو همدرد راز هو
پہنچا سکے جوں شانہ مری زلف کو وو هات جو دست بیع حضرت گیسو دراز هو

ایجاد کے جو هات کا طرّہ کرے قبول
وو اپنے همسروں میں نپٹ سرفراز هو

کیا هوا مجکو تخت و تاج نہیں تاج داروں سے احتیاج نہیں
عشق کیا میرے دل سے لے وے گا مُلک ویران پر خراج نہیں
میں بدوں سے بہی خوب ملتا هوں بد مزاجی طرف مزاج نہیں
یار میرا علاج اگر نہ کرے لا علاجی کا کچھہ علاج نہیں
آج کی قدر کل کو جانوگے جو خوشی کل کے دن تہی آج نہیں
دل کے کہوتے خراب پہرتے هیں کہیں زرِ قلب کا رواج نہیں
اهل معنی کی بزم میں ایجاد
روشنی نیں اگر سراج * نہیں

تجہہ در گوش کی تعریف کیا جا تا هوں
تو سنے یا نہ سنے میں تو کہا جا تا هوں
تک بہی تلووں کے تلے مل دِل خونی کو میرے
نہیں تو میں هات سیں جوں رنگ حنا جا تا هوں
آ صراحی کی طرح راتوں کو میخانے سے
پانوں پڑ پڑ کے شراب اس کو پلا جاتا هوں

---

* شاہ سراج اورنگ آبادی۔

گلشنِ عیش میں ان غنچہ لبوں کو اپجاد

صبح مانند نسیم آکے ہنسا جاتا ہوں

شام دیکھہ ابرو تیری آنکھوں نے کیں ہیں شادیاں
چاند کی ہنس ہنس مجھے دی ہیں مبارک بادیاں

میری آنکھوں میں لہو تیرا ہے ظالم کیا کروں
دیکھہ نہیں سکتا ہوں ان نینوں کی میں جلّادیاں

ہاے میرے دیکھتے کیسے سخنور اُٹھہ گئے
اس دل ویران میں بستی ہیں وو آبادیاں

بے سخن ' تحریر میری حسن کی تصویر ہے
عشق کی خوبی سیں ہات آئی ہیں یہ بہزادیاں

اہل معنی چاہیں جو ایجاد نے شاگرد ہویں

پڑ کے دیکھو اس غزل میں کی ہے کیا استادیاں

دور ہوں اب پھر وطن سیں دشتِ غربت کی قسم
میں بیاباں گرد ہوں مجنوں کی تربت کی قسم

رام ہوتا نہیں کسی کا میں غزالوں کی طرح
دل بچکتا ہے میرا عالم سے وحشت کی قسم

میکدہ میں کون رکھتا عزت پیر مُغاں
گر نہ دیتی دخترِ رز اپنی حُرمت کی قسم

میں گلِ بوستانِ معنی ہوں	بلبلِ گلستانِ معنی ہوں
مجھ سے ہے گلشن سخن سیراب	بے سخن، باغبانِ معنی ہوں
یہ قلمرو مجھی سے ہے آباد	بادشاہ جہانِ معنی ہوں
ہے سخن پر قلم میرا جاری	ناظم حکمرانِ معنی ہوں
میرے مطلعے ہیں آفتابِ سخن	مشرقِ آسمانِ معنی ہوں
میری بیتیں دلوں میں گھر کی ہیں	زبدۂ خاندانِ معنی ہوں
مت زبانی کہو مجھے معنی	میں سخن میں زبانِ معنی ہوں
قابلیت کے نو نہالوں میں	سروِ موزوں بیانِ معنی ہوں

صورت ایجاد ہوں مضامیں کا
جسمِ الفاظ و جانِ معنی ہوں

کسے دریا سا دل اپنا ہم اے دلدار دیتے ہیں
ہر یک کو ہم کہاں یہ گوہرِ شہوار دیتے ہیں

فرشتہ بھی اگر آوے تو بھار اُس کو تنہا چھوڑیں
ہم اپنے دل کی خلوت میں کسے کب بار دیتے ہیں

ازل سے ہے ہمارا دل خدا کے شہر کا بوشہ
خیالِ غیر اگر آوے اُسے دُتکار دیتے ہیں

نجانوں حکمتیں کیا ہیں چمن پیرائے قدرت کی
کہ دنیا میں بُروں کو گل بھلوں کو خار دیتے ہیں

دیکھایا یار نے ہم کو رباعی چار ابرو کی
ہم اپنا دل اُسے ایجاد اب ناچار دیتے ہیں

تبصرے

ادب

دیوان مومن مع شرح ۱۵۹

اردو کا پہلا ناول نگار ۱۶۱

قربانی ۱۶۲

بچوں کا تحفہ حصہ اول و دوم ۱۶۲

سہل اردو آموز کا پہلا حصہ ۱۶۲

ہندوستانی (اردو اور ہندی) ۱۶۴

تاریخ مثنویات اردو ۱۶۵

گلدستۂ جعفری ۱۶۹

سیپارۂ دل ۱۷۰

معاشقۂ نپولین ۱۷۱

سمن پوش ۱۷۱

تاریخ و سیر

عرب کی موجودہ حکومتیں ۱۷۳

مذہب و اخلاق

حقیقت حج ۱۷۴

علم اور اسلام ۱۷۵

اُردو کے جدید رسالے

طارق ۱۷۷

عارف ۱۷۸

تبصرہ ۱۷۹

تنویر ۱۷۹

البرق ۱۷۹

الضیا ۱۸۰

جوہر نسواں ۱۸۰

سالنامے

سالنامۂ ساقی ۱۸۱

سالنامۂ ادبی دنیا ۱۸۳

تبصرے

دیوان مومن مع شرح

(مرتبہ جناب ضیاء احمد ضیا ایم - اے، لکچرار مسلم
یونیورسٹی علی گڈھ - مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے)

قابل مرتب نے کلام مومن کو بالاستیعاب نہایت غور و فکر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس سے قبل وہ قصائد مومن شرح کے ساتھ شایع کر چکے ہیں - اور کئی سال ہوے ان کا ایک جامع مضمون مومن کی شاعری پر 'اردو' میں شایع ہوا تھا - اگرچہ مومن کا کلام متعدد بار طبع ہو چکا ہے لیکن طبع میں بہت بے احتیاطی کی گئی اور جا بجا غلطیاں رہ گئیں - چونکہ مومن کا کلام بہت دقیق ہے اس لیے اس کی صحت ہر شخص کا کام نہیں - مولوی ضیاء احمد صاحب نے بڑی محنت اور جانکاہی سے یہ صحیح نسخہ مرتب کیا ہے جس کے لیے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہئے - اس پر

بھی ہمارے مطابع کا یہ حال ہے کہ ۳۱ صفحہ کا غلط نامہ شامل کرنا پڑا -

شروع میں انہوں نے مومن کے حالات اور شاعری پر ۲۴ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے اور مومن کے کلام کے حسن و قبح پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے - ذوق ندرت اور شوق ہمہ دانی نے مومن کے اشعار میں تعقید اور اشکال پیدا کردیا ہے اور اس لیے وہ محتاج شرح ہیں - شرح نہایت مناسب لی ہے یعنی اسی قدر جتنی کہ شعر کے بخوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے ' کہیں بیجا طوالت سے کام نہیں لیا —

اگرچہ فاضل مرتب نے بعض مقامات پر محاسن بیان کرنے میں غلو سے کام لیا ہے لیکن انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ' جو عیوب ہیں وہ بھی بتا دیے ہیں - یہ صحیح نہیں ہے کہ مومن کے کلام کو اس لیے مقبولیت نہیں ہوی کہ اسے آزاد سا فدائی یا حالی سا نقاد نہیں ملا - بلکہ خود مومن کے کلام میں بعض ایسے عنصر ہیں کہ اس کے مانع رہے - آزاد نے ذوق کے لیے کیا کچھہ زور نہیں مارا لیکن کیا ہوا ؟ بہت ہی کم ایسے صاحب ذوق ہوں گے جو اسے اعلیٰ درجے کا شاعر مانتے ہوں - مومن کے کلام میں ندرت اسلوب ہے ' معاملہ بندی ہے ' ترکیب میں جدت پائی جاتی ہے ' علمیت کی بھی شان ہے لیکن خیال معمولی ہے - دوسرے تعقید ' اغلاق اور پیچیدگی نے ان کے کلام کو بعید از فہم بنا دیا ہے - یہ چیزیں قبول عام کی دشمن ہیں -

مولوی ضیاء احمد کی محنت اور خلوص نہایت قابل تعریف ہے انہوں نے یہ ایک بڑی ادبی خدمت کی ہے اور امید ہے کہ اب لوگوں کو مومن کے کلام سے پہلی سی بے اعتنائی نہیں رہے گی —

اردو کا پہلا ناول نگار

(مولفہ اویس احمد صاحب ادیب بی - اے' آنرز- قیمت
ایک روپیہ چار آنے - ماڈرن بک ڈپو' ھیوٹ روڈ الہ آباد)

ھندوستانی اکیڈیمی ھر سال صوبۂ متحدہ کی یونیورسٹیوں کے طلبہ کو مضامین لکھنے کے لئے مدعو کرتی ھے اور جس طالب علم کا مضمون اکیڈیمی بہتر سمجھتی ھے اسے انعام دیتی ھے - سنہ ۱۹۳۲ ع کے مقابلے میں اکیڈیمی نے اویس احمد صاحب ادیب کو انعام کا مستحق قرار دیا - ان کا مقالہ شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کے ناولوں پر تھا - اب مولف نے بعد نظر ثانی یہ مقالہ طبع کر کے شایع کیا ھے -

اب تک عام خیال یہ تھا کہ اردو میں سب سے پہلے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے - اویس احمد صاحب نے تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ھے کہ جدید طرز پر سب سے پہلا ناول مولانا نذیر احمد مرحوم نے لکھا ھے - مولانا نے مرحوم کا پہلا ناول مراۃ العروس سنہ ۱۸۶۹ ع میں شایع ہوا اور سرشار کا فسانۂ آزاد سنہ ۱۸۸۰ ع میں - اس سے صاف ظاہر ھے کہ تقدیم مولوی نذیر احمد کو حاصل ھے —

مولف نے شروع میں مولانا نذیر احمد کے مختصر حالات لکھے ھیں اور اس کے بعد ان کے ناولوں پر مفصل تبصرہ لکھا ھے --

قربانی

[مصنفۂ پنڈت کشن پرشاد کول - ممبر سرونٹس
آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ - قیمت آٹھ آنے]

پنڈت کشن پرشاد کول صاحب بہت بڑے سوشل ریفارمر اور اردو کے ادیب ہیں - اس سے قبل بھی وہ متعدد فسانے اور ڈرامے لکھ چکے ہیں اور ان سب کا مقصد ہندوستان کی معاشرتی اصلاح ہے - اس ڈرامے میں انہوں نے ایک کمسن بیوہ کی بپتھا اور ایک مصلح معاشرت کی قربانی کو بہت دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ہے -

بچوں کا تحفہ حصۂ اول و دوم

(مصنفۂ محمد شفیع الدین صاحب نیر مدرس
موڈرن ہائی اسکول نئی دہلی - مصنف یا
مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ سے مل سکتی ہیں)

ہماری زبان میں بچوں کے لئے ایسی نظمیں بہت کم ہیں جنہیں بچے دلچسپی اور شوق سے پڑھیں - مولانا اسمعیل مرحوم اور ناظم صاحب کی نظموں کے بعد یہ مجموعہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی - نیر صاحب نے بچوں کی طبیعت کا خوب مطالعہ کیا ہے اور سادہ زبان میں مختلف مضامین پر ایسی اچھی نظمیں لکھی ہیں کہ بچے خوشی خوشی پڑھیں گے

اور ان کا لطف اٹھائیں گے۔ کتابیں بہت نفیس چھپی ہیں - تصویریں بھی کافی تعداد میں ہیں - درحقیقت جیسا کہ ان کا نام ہے یہ بچوں کے لئے بہترین تحفے ہیں —

سہل اردو آموز کا پہلا حصہ

مولفہ مولوی ابراہیم علی صاحب ہیڈ مولوی ایڈ ہائی اسکول سلہٹ و مولوی عبدالرشید صاحب ہیڈ مولوی پی - ایم - پی اکاڈیمی سلہٹ- شیخ غلام مصطفیٰ' نئی سڑک ' سلہٹ سے مل سکتی ہے

مولفین نے یہ کتاب طلبہ اور معلمین اور اردو سیکھنے والوں کے لئے لکھی ہے - اگرچہ ابتدائی کتاب ہے لیکن اسباق اس طریقے سے ترتیب دیے ہیں کہ اردو صرف کے تمام ضروری مسائل آ گئے ہیں - شروع کے چار صفحوں میں حروف اور ان کی ابتدائی ' وسطی اور آخری صورت کی پہچان کے لئے نقشے دیے ہیں - حروف کی تذکیر و تانیث بھی لکھ دی ہے - اس کے بعد الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سبق ہیں - اسی طرح تیسویں سبق تک صرف کے تمام ضروری مسائل آ گئے ہیں - وہ تعریفات اور قواعد وغیرہ سے بحث نہیں کرتے بلکہ مثالیں دے کر ایسے جملے اور عبارتیں نقل کرتے ہیں جن میں قواعد خود بخود آ جاتے ہیں - باقی دس صفحوں میں مختلف مضامین کے اسباق ہیں - حاشیے میں مشکل الفاظ کے معنی انگریزی میں لکھ دیے گئے ہیں - یہ کتاب خاص طور پر بنگال آسام وغیرہ مقامات کے لئے زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے -

هندستانی (اردو اور هندی)

مرتبہ آ - پے - بران نکوف - ناشر : مدرسۂ علوم
مشرقی ' لینن گراو - سنہ ۱۹۳۴ ع)

چار سال هوے اسی مدرسے کی طرف سے بران نکوف صاحب هی نے اردو کے قواعد صرف و نحو پر ایک کتاب ' اردو زبان کی ایک مختصر تاریخ ' مطالعے کے لئے مشہور مصنفوں کے مضامین کے اقتباسات اور ایک فرهنگ شائع کی تھی - اس نئی کتاب میں صرف و نحو کے قواعد زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے هیں - یہ کتاب کا پہلا حصہ هے - دوسرے حصے میں زبان سیکھنے والوں کے لئے مشق اور اصولی تعلیم کو دهرانے اور ذهن نشین کرنے کا سامان هے - آخر میں اردو اور هندی کے لئے الگ الگ فرهنگ هیں - تمہید میں هندستان کی نسلوں کی تقسیم اور یہاں کی زبانوں کے متعلق اعداد و شمار درج هیں —

سنہ ۱۹۳۰ میں جو سلسلہ شائع هوا تھا وہ اردو کے لئے وقف تھا ' موجودہ تصنیف میں اردو اور هندی کو بالکل ایک زبان فرض کر کے ان کے قواعد ایک ساتھہ بیان کئے گئے هیں - همارے خیال میں یہ طریقہ مناسب نہیں هے - اردو کا رسم الخط خاصا مشکل هے ' اگر اردو کے ساتھہ هندی عبارت بھی ملادی جاے تو غیر ملک کے لوگ ' چاهے وہ روسی نظام معاشرت اور فلسفۂ حیات کے مبلغ هی کیوں نہ هوں ' اردو سیکھنے کی مہم کو سر نہ کرسکیں گے - همیں یہ بھی معلوم هوتا هے کہ اردو هندی کو ملانے کی کوشش میں دونوں کے اختلافات بہت نظر انداز

کئے گئے ہیں ' اور ہندی گھاتے میں رہی ہے - اس کتاب کی مدد سے اردو سیکھنا ممکن ہے ' ہندی کی نسبت غالباً ہر پڑھنے والے کا یہ خیال ہوگا کہ اس نے بےجا دخل اندازی سے ایک پیچیدہ مسئلے کو اور بھی الجھا دیا ہے —

پچھلی کتابوں کے مقابلے میں اس نئی تصنیف پر روسی اشتراکیت کا زیادہ اثر معلوم ہوتا ہے - پڑھنے اور ترجمہ کی مشق کے لئے کامریڈ ستالن کی تقریروں سے کئی اقتباس دئے گئے ہیں اور جابجا سرمایہ داروں اور پروتساریہ کا ذکر آیا ہے - اس کتاب کا مقصد روسیوں کو اردو سیکھنے میں مدد دینا ہے ' اشتراکیت کی تعلیم دینے کی یہاں چنداں ضرورت نہ تھی - اگر پہلے کی طرح اس کتاب میں بھی مستند زبان دانوں کے مضامین کے اقتباس دئے گئے ہوتے تو بہتر ہوتا - لیکن کتاب بہت محنت سے تیار کی گئی ہے ' قواعد جیسا کہ چاہئے واضح کردیے گئے ہیں ' اور ہمیں محاورے کی غلطیاں بھی کہیں نہیں ملیں - براں نکوف صاحب نے اردو زبان پر بہت احسان کیا ہے اور تعریف کے مستحق ہیں — (م م)

تاریخ مثنویات اردو

مولفہ جناب مولوی حافظ جلال الد بن احمد جعفری زینبی - مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد - درمیانی تقطیع ' لکھائی ' چھپائی اور کاغذ عمدہ ' صفحات ۲۲۰ ' نفیس جلد - قیمت دو روپے

ہماری شاعری میں ہر صنف نظم کے چند مخصوص موضوعات ہیں

اور اس کی زبان اور بیان بھی مخصوص ہے - اس اعتبار سے ہر صنف کی ارتقائی منازل کا معلوم کرنا ادبیات کے متعلم کے لئے ضروری ہے - غالباً اِسی ضرورت کو محسوس کرکے فاضل مولف نے یہ کتاب لکھی ہے - اس کی ترتیب یہ ہے کہ شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں صنف مثنوی کی عام تاریخ ، موضوعات ، لوازم اور عروض وغیرہ پر تنقیدی و تحقیقی بحث کی ہے - اس کے بعد اردو مثنویات کی تاریخ لکھی ہے جو افسوس ہے کہ نا تمام اور ناقص ہے ' چند سطروں میں ابتدائی مثنویوں کی تاریخ لکھہ دی ہے جو نا تمام ہونے کے سوا اسقام سے بھی پاک نہیں - اس میں واقعات اور ترتیب کی بنیادی غلطیاں موجود ہیں —

لایق مولف کا یہ مقصد ہے کہ " اردو مثنویات کی ارتقائی تاریخ اہل ادب کے سامنے پیش کردی جائے جس کے متعلق امید ہے کہ یہ انتخاب ہر طرح مفید اور کافی سمجھا جائے گا " - جس مقصد سے مولف نے یہ کتاب لکھی ہے وہ کسی طرح پورا نہیں ہوتا - اس سے ہرگز اردو مثنویات کی ترقی کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا - انہوں نے کل سولہ مثنوی نگاروں کا ذکر کیا ہے یعنی سراج اورنگ آبادی سے لے کر داغ دہلوی تک - ظاہر ہے کہ سراج سے بہت قبل ایسے کئی شعرا گزرے ہیں جن کی مثنویات کثیر تعداد میں موجود ہیں اور جن پر آے دن مضامین نکلتے رہتے ہیں اور ادب کی تاریخی کتابوں میں بھی ان کے تذکرے موجود ہیں - اس کے سوا سراج سے لے کر داغ تک مولف کی نظر میں کل سولہ مثنوی نگار قابل ذکر و انتخاب ہیں حالانکہ ان کے زمانوں کے درمیان چند اہم اور لایق ذکر شعرا گزرے ہیں جن کو ترک کردیا گیا ہے - ایسی صورت میں بے شبہہ یہ کتاب باضابطہ اور مکمل تاریخ مثنویات کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے - سراج سے قبل کے بعض مثنوی

نگاروں کا تذکرہ لایق مولف نے اشارتاً چند سطروں میں اپنے دیباچے میں کیا ہے لیکن اس سے ہرگز مثنویوں کی تدریجی ترقی کا حال نہیں کھلتا —

مولف نے جو شاعر انتخاب کئے ہیں ' شروع میں ان کے مختصر حالات لکھے ہیں اور ان کی صرف ایک ایک مثنوی کو لے کر اس کے نمونے درج کئے ہیں اور ان پر سرسری تنقید کی ہے - ان کے اس انداز بحث سے موضوع تشنہ رہ گیا - نہ تو پورے مشہور شعرا کا اس میں تذکرہ ہے اور نہ ان کے کلام کے نمونے - اگر ابتداء سے لے کر موجودہ دور تک کے شاعروں کا تذکرہ کیا جاتا اور ان کے کلام پر علمی تنقید کی جاتی اور ان کے لسانی ' بیانی ' عروضی اور موضوعاتی تغیرات کو دکھایا جاتا تو یہ بڑی کار آمد خدمت ہوتی - اگر لایق مولف اس التزام کے ساتھ اپنی کتاب لکھتے تو تحقیق و تنقید کا بہت وسیع میدان تھا اور وہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھ سکتے تھے - جس طرح مشہور شعرا کے ترک کے لحاظ سے یہ کتاب تشنہ رہ گئی ہے اسی طرح مثنوی کے موضوعات کے اعتبار سے بھی نا تمام ہے - مثنوی کے موضوعات میں ہجو بھی داخل ہے - اردو کے مشہور اساتذہ کی بلند پایہ مثنویاں اس موضوع پر موجود ہیں - سودا ' قائم ' مصحفی ' اور انشا کی متعدد ہجویہ مثنویاں ہیں ' جو ہر اعتبار سے خاص پایہ رکھتی ہیں - مولف نے مثنوی کے اس موضوع کو نظر انداز کردیا ہے ' یہاں تک کہ مثنوی کے جو موضوعات گنائے ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا - مولف کم سے کم مثنوی نگاروں کی ایک فہرست بلحاظِ سنین مثنویوں کے نام اور مضامین و موضوعات کے ساتھ دے دیتے - موجودہ کتاب اپنے موضوع اور وسعتِ بحث کے لحاظ سے قطعاً ناکافی ہے اور ابھی ضرورت ہے کہ

اس پر تحقیق و تنقید کے اعتبار سے مزید محنت و کاوش سے کام کیا جائے -

مولف نے بعض شاعروں کے حالات وغیرہ اور اعلام و سنین کی بھی غلطیاں کی ہیں - نصرتی کی مثنوی گلشن عشق میں منوہر و مدمالتی کا افسانہ درج ہے مولف نے مل مانسی لکھا ہے - مجرمی کی کتاب گلشن حُسن دل کا نام گلشن حسن دل لکھا ہے حالانکہ سبرس کے دیباچے میں اول الذکر نام درج ہے - ملا وجہی کو مولف نے معاصر ابوالحسن تانا شاہ لکھا ہے حالانکہ ملا وجہی کا زیادہ زمانہ محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ ھ تا ۱۰۲۰) کے عہد میں گزرا ہے اسی کے آخیر زمانے (۱۰۱۸ھ) میں اس نے اپنی مثنوی قطب مشتری لکھی ہے - ابوالحسن تانا شاہ کا زمانہ ۱۰۸۳ تا ۱۰۹۸ ھ کا ہے - مولف کے اس بیان میں وہی غلطی پوشیدہ ہے جو جہانگیر اور عالم گیر کو ہم عصر سمجھنے میں ہے - اسی طرح معاصرینِ سراج میں ذوقی اور مجرمی کو لکھ دیا ہے حالانکہ ان کے سنین سے جو خود مولف نے درج کئے ہیں صاف روشن ہے کہ یہ ولی کے معاصرین ہیں، سراج کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے-

آج کل جب کہ تاریخ ادب پر بہت کچھ کام ہوچکا ہے اور اس موضوع پر بکثرت مضامین اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں اس قسم کی غلطیوں کا ہونا حیرت سے خالی نہیں - مولف سے ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ انہوں نے اپنے بعض بیانات کے حوالے نہیں دے مثلاً ذوقی اور مجرمی کے حالات اور تصانیف کے حوالے —

(چ)

گل ہائے جعفری

(صفحات مع دیباچہ ۴۰، چھوٹی تقطیع قیمت ۴ آنے -

ملنے کا پتا نگار بک ایجنسی لکھنؤ)

جناب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی موجودہ زمانے کے متعارف شعراء میں ہیں - ان کا کلام اکثر رسائل و جرائد میں شایع ہوتا رہتا ہے، حضرت نیاز فتح پوری نے ان کے تقریباً ڈیڑھ سو اشعار کا انتخاب اس التزام کے ساتھ کیا ہے کہ اس سے "شاعر کے ذوق کی ہمہ گیری ظاہر ہوجائے" - بے شبہ یہ انتخاب شاعر کی امتیازی خصوصیات کو ظاہر کرتا ہے - دو شعر ملاحظہ ہوں :-

اپنی وفا نہ ان کی جفاؤں کا ہوش تھا
کیا دن تھے جب کہ دل میں محبت کا جوش تھا
مجھ کو جواب صاف نہ دے التماس کا
آباد رہنے دے چمن امید و یاس کا

شروع میں حضرت نیاز نے ایک دیباچہ لکھا ہے، جس کی ابتدا میں دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے فرق کو زبان اور خیال کے اعتبار سے دکھایا ہے - اس میں کوئی نئی بات نہیں، بارہا اس پر مباحثے اور مجادلے ہوچکے ہیں، اب اس میں بہت کم تازگی اور جدت رہی ہے -

(ع)

سپارۂ دل

مصنفۂ حضرت اختر جوناگڑھی، صفحات مع دیباچہ ۴۸،
درمیانی تقطیع، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۲ آنے۔
مصنف کے پتے (جوناگڑھ کاٹھیاواڑ) سے مل سکتی ہے—

یہ جناب اختر کی تیس غزلوں کا انتخاب ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام سپارہ رکھا ہے۔ یہ انتخاب خود مصنف نے فرمایا ہے—

کاٹھیاواڑ کی سرزمین بقول جناب اختر "بلجر اور شور" ہے۔ اس پر نظر رکھتے ہوئے یہ انتخاب دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ حضرت اختر با مذاق شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ ان کا کلام، زبان، بیان اور عروض کی لغزشوں سے پاک ہے، خیالات اور مضامین بھی پاکیزہ ہیں۔ عامیانہ خیالات سے پرہیز کرتے ہیں اور صاف ستھری زبان اور دلچسپ اسلوبِ بیان میں اپنے خیالات نظم کرتے ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں:—

ایمن کی وادیوں میں ابھی ہے شرار برق آے تو کوئی شوق تماشا لیے ہوے
بربادِ التفات پہ کیجے نہ یوں کرم زخم دل و جگر کو نہیں حاجتِ رفو
دل خون ہو کے رہ گیا رنگ شباب سے ساغر کو میرے بھر دیا کس نے شراب سے

انتخاب کے شروع میں دلگیر مرحوم کی لکھی ہوئی تقریب ہے، جس میں جناب اختر کی غزل کے محاسن سرسری طور پر بتائے گئے ہیں۔ اس کے بعد مصنف کا دیباچہ چھ صفحوں پر "التماس" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے مسلکِ شاعری کا اظہار کیا ہے، اس نثری دیباچے کا اسلوب بھی پاک صاف اور پختہ ہے— (چ)

معاشقۂ نپولین

مترجمہ تمکین کاظمی صاحب وعبدالحلیم سعدی صاحب -

ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراھیمیہ حیدر آباد دکن -

کتابت و طباعت معمولی - کتاب مجلد ہے -

کسی فرانسیسی ناول کے فارسی ترجمے سے یہ کتاب اُردو میں ترجمہ کی گئی ہے - ناول کا پلاٹ معمولی اور ایک حد تک بازاری قسم کا ہے - ترجمے کی زبان بہت غلط ہے - مثال کے طور پر یہ جملہ ملاحظہ ہو - " پالو ایک 'ھوا پرست' عورت تھی - جب وہ نپولین کے قبضے میں آ گئی تو اُس نے اپنی زندگی کا 'بالکل نیا ورق اُلٹ دیا' " —

قصے سے نپولین کے کردار یا اُس کی سیرت و شخصیت کے کسی پہلو پر روشنی نہیں پڑتی - سیرت نگاری کا کہیں نام نہیں - طرز بیان بھی بڑی حد تک عامیانہ ہے اور ادبی لطف نام کو موجود نہیں (+ +)

سمن پوش

از مجنوں گورکھپوری - ملنے کا پتہ دفتر ایوان اشاعت گورکھپور -

قیمت ایک روپیہ 'کتابت طباعت اچھی' حجم ۱۹۹ صفحات -

یہ مجنوں گورکھپوری کے پانچ افسانوں ' ایک مضمون ' اور ایک دیباچے کا مجموعہ ہے - یہ افسانے "جن کا تعلق" بقول مصنف " روحانیات سے ہے" کوئی ایسی خصوصیت نہیں رکھتے جو ناظرین کو متاثر کر سکے - مصنف کے قلم میں ہیبت طاری کر دینے کی وہ صلاحیت نہیں جو ایسے قصوں کے لیے ضروری ہے - اس قسم کے افسانے مشرق اور مغرب کی ادبیات میں

یکساں موجود ہیں اور ان کا مقصد عموماً انسان میں خوف' دہشت' اور استعجاب کے اثرات پیدا کرنا ہوتا ہے —

ان افسانوں کے مصنف کے طرز بیان میں کہیں وہ ندرت اور جوش نہیں جو ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے - اسی وجہ سے یہ قصے بجائے دلچسپ ہونے کے جا بجا مضحکہ خیز ہوگئے ہیں - نقطۂ نظر بہت خام ہے - اس قسم کی کتابوں کا انہوں نے جو کچھہ مطالعہ کیا ہے اس کے خام اثرات ان کی تحریر میں پوری طرح موجود ہیں —

موضوع سے قطع نظر' فنی اعتبار سے بھی یہ قصے ادبی حسن اور دلکشی نہیں رکھتے - قصوں کے پلاٹ کی نشو و نما قدرتی طور پر نہیں ہوتی - واقعات میں ترتیب نہیں ہے - سیرت نگاری تو اس درجہ ناقص اور مہمل ہے کہ تعجب معلوم ہوتا ہے (مثال کے لیے "شاہد" کی سیرت ملاحظہ ہو صفحہ ۵۵ ' ۵۶) - قصوں کا کوئی فرد بھی سیرت اور افعال کے اعتبار سے زندۂ عام انسان نہیں معلوم ہوتا' - یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی مافوق العادت واقعے سے دو چار ہوتا ہے تو وہ اثر اور ہیبت پیدا نہیں ہونے پاتی' جو ایسے قصوں کی جان ہے - بے موقع اور بیجا طور پر مصنف صاحب قصے کے دوران میں "روحانی" مباحث چھیڑ دیتے ہیں - اور اس سلسلے میں انگریزی اصطلاحات کے عجیب و غریب ترجمے فرماتے ہیں (ملاحظۂ ہو صفحہ ۱۱) —

دیباچے میں جس کا نام مصنف نے "گریز" رکھا ہے ' یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں سے دو تین افسانے ماخوذ بھی ہیں - لیکن اس کی صراحت نہیں کہ ان میں سے کون سے افسانے ماخوذ ہیں اور کہاں سے اخذ کیے گئے ہیں - مصنف نے اردو لباس پہنا کر ان کو بھی اپنے رنگ میں کچھہ

اس طرح ڈھال لیا ہے ' اور پورے نقائص سب افسانوں میں اس طرح یکساں موجود ہیں کہ تمیز مشکل ہے —

ان افسانوں میں نہ خیالات میں ندرت ہے اور نہ اسلوب میں۔ پوری کتاب میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب آموختہ دہرا رہے ہیں جو انہیں اچھی طرح یاد نہیں (+ +)

تاریخ وسیر

عرب کی موجودہ حکومتیں

(مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑہ - قیمت ایک روپیہ چار آنے)

قابل مولف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جزیرۃالعرب سے ایک خاص شیفتگی ہے اور اب بھی " ارض مقدس کے زائروں میں سب سے بڑی تعداد ہندی مسلمانوں کے ہوتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس عقیدت اور شیفتگی کے باوجود عوام کا کیا ذکر بہت سے خواص کو بھی جزیرۃالعرب کے صحیح حالات سے واقفیت نہیں ... ... ایک حجاز سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے باقی عرب کے اور کسی حصے کے متعلق انہیں کوئی معلومات نہیں کہ آج جزیرۃالعرب میں کتنی حکومتیں ہیں ' کہاں کہاں ہیں ' ان کی اندرونی حالت کیا ہے '

بیرونی دنیا سے ان کے کیا تعلقات ہیں ' اقوام عالم میں ان کی سیاسی پوزیشن کیا ہے ؟" —

یہ کتاب ان تمام سوالات کے جواب میں ہے - اردو میں اس موضوع پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی - مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب نے مختلف تصانیف ' تعلیمی رپوٹوں اور عربی اخبارات وغیرہ سے استفادہ کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے —

مذہب و اخلاق

حقیقت حج

مرتبۂ مولوی منظور علی صاحب بن ثاقب شملہ

صفحات ۴۸۲ قیمت ایک روپیہ ' اعلیٰ کاغذ ' قیمت دو روپے

اس کتاب میں ارکان اسلام ' حج اور اس کی ضرورت ' احکام فرضیت حج ' سفر حج و مسائل حج ' تاریخ جدہ ' حرم بیت اللہ کے حالات ' حجر اسود کی تاریخی کیفیت ' حج کے ارکان ' زیارت مدینۂ منورہ اور اس کے احکام ' مدینہ کی مختصر تاریخ ' شہر مدینہ منورہ اور اس کے حالات اور ان کے علاوہ دیگر بہت سے معلومات بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں - اس سے قبل حج کے متعلق اس سے زیادہ مفصل کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری - علاوہ ان اصحاب کے جو حج کا شوق رکھتے ہیں دوسرے

لوگوں کے لئے بھی یہ کتاب بہت بڑا ذخیرہ معلومات ہے - چھوٹی سی چھوٹی بات بھی جو اثنائے سفر یا ادائے فریضۂ حج میں پیش آتی ہے بخوبی بیان کردی گئی ہے —

علم اور اسلام

(مترجمۂ جناب قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی - چھوٹی تقطیع، صفحات ۸۸ قیمت درج نہیں - مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ)

مشہور فرانسیسی فلسفی ارنسٹ رینان نے "علم اور اسلام" کے عنوان سے پیرس کی سربون یونیورسٹی میں ۱۸۸۲ع میں ایک لکچر دیا تھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام علوم و تمدن کا مخالف ہے - اس کے دو رد لکھے گئے تھے ایک علامہ شیخ جمال الدین افغانی نے لکھا تھا جو اس زمانے میں پیرس میں مقیم تھے - یہ رد ایک فرانسیسی رسالے دیبا میں شایع ہوچکا تھا - علامہ شیخ کے سوا رینان کے خطبے کا رد اس کے ایک ہم وطن موسیو مسمر نے بھی لکھا تھا- رینان کا طرز بیان نہایت فصیح و بلیغ ہے اور چونکہ اس کو ایک زبردست اور بنیادی موضوع پر بحث کرنی تھی اس لئے اس نے نہایت دلفریب اور سحر آمیز پیرایہ اختیار کیا تھا - اس کے متعلق موسیو مسمر نے بڑی سچی رائے دی ہے "رینان کی تقریر میں سوائے ایسی فصاحت کے اور کچھہ نہیں پایا جاتا جیسی دارالامرا یا دارالعوام کے مناظرین کی سحر آمیز اور دلفریب تقریروں میں مل جاتی ہے' مگر جب کوئی صاحب عقل اس کے معانی پر غور کرتا ہے تو کہدیگا کہ تف ایسی

فصاحت پر حس کی مدد سے باطل کو حق پر ترجیح دی جائے"۔
موسیو مسمر کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس نے کس جوش و خروش سے رینان کا رد لکھا ہے۔ اس میں ایک حد تک سیاسی اغراض بھی پوشیدہ ہیں کیوں کہ موسیو مسمر مصری سفارت کا صدر تھا' اس خیال کی تائید اس کی تحریر کے اختتامی جملوں سے ہوتی ہے:- ' پس ارباب سیاست اور حکام کو (جن کو امور اسلامی نے اس بات پر آمادہ کر دیا ہے کہ وہ اپنے تئیں تعصب سے علحدہ رکھیں) لازم ہے کہ وہ موسیو رینان کے اوہام پر عمل پیرا نہ ہوں بلکہ سلاطین عثمانیہ میں سے کسی فرماں روا کے اس مقولے پر عمل کریں کہ ' قوت حدود مملکت وسیع کرتی ہے اور عدل اس کی حفاظت کرتا ہے"۔ سیاسی مصلحت کے سوا موسیو مسمر کے پیش نظر ضرور حق اور صداقت بھی تھی اور یہ بات اس کے پیرایۂ بیان اور طرز استدلال سے ثابت ہوتی ہے۔

رینان نے علامہ شیخ کے اعتراضات کا جواب دوسرے ہی روز لکھ کر شایع کیا تھا لیکن غالباً موسیو مسمر کی تحریر کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان تحریروں کے ترجمے مدت ہوئی کہ عربی اور انگریزی میں ہو چکے ہیں۔ مضامین کی اہمیت پر نظر کر کے جناب اختر نے ان کو اردو میں پیش کیا ہے۔ اس میں صرف علامہ شیخ کے اعتراضات کا مکمل ترجمہ نہیں ہے لیکن اس کے اس اقتباس کا ترجمہ موجود ہے جو رینان نے اپنے جواب الجواب میں درج کیا تھا۔ اخیر میں جسٹس سید امیر علی مرحوم کے ان خیالات کو اردو میں منتقل کر کے پیش کیا گیا ہے جو مرحوم نے اپنی کتاب اسپرٹ آف اسلام کے ضمیمہ ۳ میں رینان کے لکچر کے بارے میں ظاہر کئے ہیں۔

سالنامے

سالناموں کی کچھہ ایسی ہوا چل گئی ہے کہ تقریباً تمام مشہور رسایل بالالتزام سالنامے شایع کرنے لگے ہیں۔ اس سے پڑھنے والوں کے ذوق میں ضرور انقلاب پیدا ہو رہا ہے وہ ہر سال بہتر نظمیں ' بہتر مضامین اور بہتر تصویریں دیکھنے کے آرزو مند رہتے ہیں ' لیکن ساتھہ ہی یہ خرابی پیدا ہوتی جاتی ہے کہ مضامین وغیرہ کا معیار برقرار نہیں رہتا۔ پختہ کار ادیب اور کہنہ مشق شاعر تقاضوں اور فرمائشوں سے مغلوب ہو کر لکھتے ہیں اور خام مشق اور نو آموز شوقِ تشہیر میں خامہ فرسای کرتے ہیں ' یہ دونوں صورتیں خطر ناک ہیں ' اس سے مضامین کا ظاہری و معنوی معیار پست ہوتا جاتا ہے۔ مضامین کم ہوں تو مضایقہ نہیں ' خواہ مخواہ ضخامت بڑھانے سے کیا حاصل لیکن مضامین زبان ' بیان اور خیال کی خوبیوں سے آراستہ ہونے چاہئیں۔ ہمارا روے سخن کسی خاص رسالے کی طرف نہیں ہے ' ہمارے ملک کے عام رسالوں کا یہی حال ہے۔ اس ماہ کے شروع میں ذیل کے سالنامے ہمارے پاس تبصرے کی غرض سے وصول ہوے ہیں —

سالنامۂ ساقی

ایڈیٹر جناب شاہد احمد صاحب بی۔ اے (آنرز) -

دہلی - صفحات ۲۷۱ ' قیمت سوا روپیہ -

ساقی اپنا سالنامہ ہر سال بہتر شکل میں شایع کرتا جاتا ہے۔ سنہ ۳۵ کا یہ سالنامہ مضامین اور نظموں کے تنوع کے اعتبار سے خوب

ہے - ملک کے بعض مشہور اہل قلم کے مضامین اور کلام سے آراستہ ہے' لیکن تصویروں کے لحاظ سے گزشتہ سال کے مقابلے میں کوئی خاص ترقی نظر نہیں آتی -

سالنامے کی محفل میں پنڈت کیفی دہلوی' خواجہ عشرت لکھنوی' جناب جوش ملیح آبادی' حضرت امجد حیدرآبادی' سید حسن برنی' وغیرہ جیسے مشاہیر شریک ہیں جن کے مضامین اور نظمیں یقیناً مطالعہ کے قابل ہیں' لیکن بعض نظمیں اور مضامین ایسے ہیں کہ اگر وہ شامل نہ کئے جاتے تو موجودہ سالنامے کے معیار میں کوئی فرق پیدا نہ ہوتا - ورڈس ورتھ کی مشہور نظم Ode on Intimations of Immortality کا ترجمہ "ابدیت کی کرنیں گہوارۂ طفلی میں" کے عنوان سے اس سال نامے میں درج ہے - ابتدائی دو ایک بند تو مترجم نے عمدگی سے نظم کئے ہیں لیکن بقیہ نظم کا ترجمہ ناکام رہ گیا ہے - اس میں اصل شاعر کا منشا پورے اور صحیح طور پر پیش نہ ہوسکا اور نہ ترجمے میں شعری خوبیاں ہیں - اس نظم کا ترجمہ مجلہ عثمانیہ حیدرآباد جلد ۹ شمارہ ۳ میں تقریباً دو سال قبل شایع ہوچکا ہے' جو ہمارے خیال میں بہت کامیاب اور پاکیزہ ترجمہ ہے' اگر مترجم کی نظر سے وہ گزر جاتا تو ان کو غالباً دوبارہ ترجمہ کی ہمت نہ ہوتی - اس ترجمہ کا تذکرہ ہم نے خاص طور سے اس لئے اس تبصرہ میں کیا ہے کہ یہ انگریزی نظم انگریزی ادب میں خاص حیثیت رکھتی ہے' اردو میں اس کی غلط ترجمانی کوئی گوارا نہیں کرے گا - "بیجاپور کے چلد اردو گو شعرا" نوشتۂ نصیرالدین ہاشمی صاحب اس سال نامے میں درج ہے' اس کے متعلق اب کچھ کہنا مناسب نہیں - اس سے قبل اس رسالے میں ان کی متاع تحقیق کی صحیح قیمت

یہ سب تحریریں پڑھنے کے قابل ہیں- اس میں مختلف الخیال مصنفوں کے خیالات و آرا کا نچوڑ ہے- ترجمہ بھی بہت پاک صاف ہے- شروع میں ریلان کے سوانح حیات اور اس کے خیالات وغیرہ کو بھی سلیقے سے یکجا جمع کردیا ہے-

(ز ج)

اُردُو کے جدید رسالے

طارق

[اڈیٹر محمد شریف صاحب - لاہور - سالانہ چندہ تین روپے]

ماہانہ رسالہ ہے - اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ لاہور سے شایع ہوا ہے- ہر نئے رسالے کا نام سن کو قیاس یہ ہوتا ہے کہ لاہور سے نکلا ہو- ادبی' علمی' اصلاحی رسالہ ہے- اس میں بلند آہنگ دعوے نہیں جو اکثر نوجوان اڈیٹر کر بیٹھتے ہیں اور جو بعض اوقات تو بولے معلوم ہوتے ہیں جیسے بچوں کی تتلی زبان میں گالیاں' لیکن جب وہ حد سے گزر جاتے ہیں تو ناگواری اور تلخی پیدا ہوجاتی ہے- بد تمیزی اور دعوے کے ساتھ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے- طارق نے اپنا کام انکسار اور اعتدال سے شروع کیا ہے- رسالہ کی ترتیب میں سلیقہ اور احتیاط پائی جاتی ہے —

مولانا ظفر علی خاں صاحب کی نظم اور جناب تاجور کی آپ بیتی جو "افتادۂ راہ ادب کے بست سالہ تجربات" کے نام سے لکھی ہے پڑھنے کے قابل ہیں- ایک حصہ واقعات کے نام سے رکھا ہے جس میں مہینے بھر کے

اہم واقعات خود اڈیٹر لکھتے ہیں اس میں کسی قدر اصلاح کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اختر شیرانی صاحب کی ایک غزل اور ایک نظم "یاد وطن" (جو شاید پہلے کہیں چھپ چکی ہے) بہت خوب ہے۔ وقار صاحب نے اگر اپنی نظم میں "جڑتی تھی" "میسر ہوتی تھی" کے معنوں میں لکھا ہے تو کیا برا کیا۔ اڈیٹر صاحب کا اس کے ترک پر اصرار کرنا ناواجب سا معلوم ہوتا ہے —

بہر حال رسالہ اچھا ہے، مطالعہ کے قابل ہے، دلچسپ ہے —

عارف

(مدیر سید محمد اسماعیل صاحب ذبیح، ہمایوں باغ کانپور - قیمت سالانہ اعلیٰ تین روپے، معمولی دو روپے)-

یہ ماہانہ علمی اور ادبی رسالہ اسی سال کانپور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے- شعر و شاعری اور ادب کے سوا علمی اور تاریخی مضامین بھی ہوتے ہیں- جناب ابوالعلا ناطق صاحب لکھنوی کی کتاب تاریخ ادب اردو کا ایک باب "ہند میں اسلامی آبادی کی ابتدا" باقساط چھپ رہا ہے جس کا تاریخ ادب سے اب تک کوی تعلق نہیں معلوم ہوا شاید آگے چل کر کوئی نتیجہ نکلے- قابل اڈیٹر نے عُمدہ مضامین اور خصوصاً عُمدہ نظموں کے مہیا کرنے میں کوشش کی ہے اور رسالے کے معاونین میں بعض نامور اہل قلم ہیں - اس قیمت میں رسالہ قابل قدر ہے —

تبصرہ

(اڈیٹر محمد یعسوب حسن صاحب - لاہور - سالانہ چندہ ایک روپیہ)

یہ ماہانہ رسالہ حال ہی میں لاہور سے شایع ہوا ہے - بظاہر اس کے نکالنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن قابل اڈیٹر نے جو دلچسپی کا سامان اس میں جمع کیا ہے' اس کے دیکھنے کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک روپے میں سال بھر ہر مہینے ایسا رسالہ مل جانا حیرت خیز ہے اور اڈیٹر کی ہمت قابل تعریف —

تنویر

(مدیر فائق کرنپوری - کراچی - قیمت سالانہ سوا روپیہ) —

گزشتہ سال کی پیداوار ہے - اس کا مقصد ارض سندھ میں اردو کی اشاعت اور ترقی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہاں اردو رسالوں اور اخبارات کی ضرورت بھی ہے - معمولی دلچسپی کے مضامین نثر اور غزلیں اور نظمیں درج ہیں - البتہ سندھ کی تاریخ ادب کا جو سلسلہ اس میں شروع ہوا ہے وہ قابل قدر ہے لیکن افسوس کہ اس کا صرف ایک ہی ورق ہے - اگر یہ تحقیق اور محنت سے لکھی جاے تو بہت کام کی چیز ہو سکتی ہے -

---

البرق

(مدیر محمد علی صاحب - پنجاب انجینیرنگ انسٹیٹیوٹ جالندھر شہر - سالانہ چندہ تین روپے) —

علاوہ علمی ادبی مضامین کے برق نیز سائنس کی معلومات کے متعلق مضامین ہوتے ہیں - اردو زبان میں اس قسم کی معلومات کی شدید ضرورت ہے بشرطیکہ ان مضامین کو سہل اور اچھی زبان میں ادا کیا جائے - رسالہ بہت صاف اور ستھرا چھپتا ہے —

الضیا

(اڈیٹر مولوی مسعود عالم صاحب ندوی- سالانہ چندہ ساڑھے تین روپے- لکھنو)

یہ ماہانہ رسالہ عربی زبان میں ہے - اس میں دینی اور ادبی مضامین ہوتے ہیں - آخر میں ایک حصہ اخبار و واقعات کے لیے بھی ہے -

---

جوہر نسواں

(اڈیٹر عذیر فاطمہ ، آمنہ نازلی ، خدیجہ بائی ،
چندہ سالانہ ڈھائی روپے - دہلی) —

یہ ماہانہ رسالہ خاتون اکرم مرحومہ کی یادگار میں نکالا گیا ہے - تینوں اڈیٹر تالیف و تحریر کے کام میں نام پا چکی ہیں - اس رسالے میں خاص بات یہ ہے کہ دستکاری ، کشیدہ کاری ، خیاطی ، سلمہ ستارے کے کام ، جالی وغیرہ کے کام کے لئے الگ الگ حصے کردیے ہیں - اور نقشے اور نمونے دے کر بڑی خوبی سے ان کاموں کو سمجھایا گیا ہے - نسواں کے جتنے رسالے اس وقت شایع ہوتے ہیں اسے اس امر میں خاص امتیاز حاصل ہے - لڑکیوں کے لیے اس سے بہتر رسالہ نہیں ہوسکتا —

اردو

جلد ۱۵	اپریل سنہ ۱۹۳۵ ع	حصہ ۵۸

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار *

از

(جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی)

انگریزی میں پریس یعنی اخباروں کو حکومت کا چوتھا رکن کہا کہا ہے - عہد حاضر کے عوارض کو نظر میں رکھتے ہوئے پریس کا یہ القاب حقیقت میں درست ہے - پریس ہی وہ معیاری آلہ ہے جس سے ایک عہد میں عامۃ الخلائق کے مزاج اور مذاق کی کیفیت معاشرت کی وضع قطع اور حاکم و محکوم کے تعلقات کی رفتار دریافت ہوسکتی ہے - یہ تو ہوئی ایک بات - میں یہ کہتا ہوں کہ ایک زبان کے ادب کی تاریخ نا مکمل رہتی ہے جب تک اس کی صحافت کے نقطۂ نظر سے بھی تنقید نہ کی جائے -

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اخباروں سے پہلے اس ملک میں خبر رسانی کے ذرایع کیا تھے - قافلوں - تجارت پیشہ لوگوں اور عام مسافروں کو چھوڑ کر جو اکثر شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ سفر کیا کرتے تھے خبروں کا سب سے بڑا زود رساں ذریعہ بنجارہ تھا - یہی لوگوں کے خطوط اور پارسل ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا تھا جس

* حق تصنیف بحق مصنف محفوظ ہے اس لیے اس مضمون کی نقل یا اس کے اقتباسات بغیر اجازت مصنف نہ لیے جائیں —

کے لیے وہ کچھ اجرت پاتا تھا - اس کے علاوہ ہر جگہ کی خبریں بھی اس سے تشہیر پاتی تھیں - حکومت کی طرف سے ہر صوبہ کے صدر مقام اور دوسرے بڑے شہروں اور قصبوں میں پرچہ نویس مقرر تھے جو سرکاری ڈاک کے ذریعہ اپنی رپوٹیں روزانہ دارالخلافہ کو روانہ کرتے تھے - ڈاک سے میرا مطلب آج کل کا پوسٹ آفس نہیں ہے - بلکہ دس دس پانچ پانچ کوس پر حکومت کی طرف سے ہر کارے تعینات تھے جو پرچہ نویسوں کی رپوٹیں اور دوسرے سرکاری کاغذ دست بہ دست صدر کو پہنچاتے تھے - پرچہ نویس یا اخبار نویس کا ادارہ بہادر شاہ تک زندہ رہا - قلعہ کا آخری اخبار نویس غالباً ایک ہندو 'ماسراج' تھا - دربار دہلی کے تتبع میں بہت سی ریاستوں میں پرچہ نویس مقرر تھے اور حال تک ان کی خدمات سے استفادہ ہوتا رہا - ان کوایف سے واضح ہوگا کہ حکومت وقت اور پبلک کسی نہ کسی طرح واقفیت فراہم کرلیتی تھی تھی لیکن پبلک پریس کا وجود نہ تھا - اور نہ ڈاک خانہ نے ابھی جنم لیا تھا —

دریافت سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان میں کسی زبان کا سب سے پہلا اخبار کلکتہ سے شایع ہوا - اس کا نام "ہکی کا گزٹ" (Hickey 's gazette) تھا - یہ اخبار انگریزی میں تھا اور ۲۹ جنوری سنہ ۱۷۸۱ ع سے اس کی اشاعت شروع ہوئی - اس کو بلا لحاظ زبان کے پہلا اخبار سمجھنا چاہئے جو ہندوستان میں جاری ہوا - اس کے بعد کئی اخبار انگریزی کے شروع ہوئے - مثلاً اوریئنٹل ایڈور ٹائیزر ' سنہ ۱۷۸۴ میں اور ' کلکتہ ہرکارہ سنہ ۱۷۹۵ میں - یہ سب انگریزی میں تھے اور یورپین لوگوں کے نکالے ہوئے تھے -

جاننا چاہئے کہ بادشاہ دہلی نے جب بنگال کی دیوانی کی سند

ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کی تو اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ کورٹ لینگوئج یعنی دفتری زبان فارسی رہے گی - اور یہ آپ جانتے ہیں کہ دفتری زبان کا اثر اور رسوخ پبلک پریس پر کس قدر ہوتا ہے - چنانچہ اولین دور میں جو اخبار اہل وطن نے نکالے وہ فارسی زبان میں تھے - سب سے قدیم فارسی اخبار جس کے پرچے اس وقت محفوظ ہیں 'جام جہاں نما' ہے - یہ اخبار غالباً مئی سنہ ۱۸۲۲ ع میں کلکتہ سے شایع ہونا شروع ہوا - ایک سال بعد یعنی سنہ ۱۸۲۳ ع میں اس کے ساتھ ایک اردو ضمیمہ بھی نکلنے لگا - لیکن یہ اردو ضمیمہ پسند عام سے محروم رہا اور آخر کار ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۲۴ (۱۸۲۳ء غلط ہے) کو بند ہو گیا - اس کے بعد کئی فارسی اخبار جیسے آئینہ سکندر سنہ ۱۸۳۱ ع میں - سلطان الاخبار سنہ ۱۸۳۵ ع میں نکلے- یہ سن کر آپ خوش ہوں گے کہ موقت الشیوع لٹریچر کے اس دور میں پنجاب خاموش نہیں رہا - چنانچہ سنہ ۱۸۳۵ ع میں لدھیانہ سے ایک فارسی اخبار بہ نام 'اخبار لدھیانہ' نکلنا شروع ہوا * —

اس سے پہلے کہ میں اپنے اصل موضوع یعنی اردو اخباروں کی طرف رجوع کروں ایک اور فارسی اخبار کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے - اس کا نام 'سراج الاخبار' ہے - یہ اخبار اس وقت کے مغل دربار کا کورٹ گزٹ تھا جو ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ آخری مغل بادشاہ کے زیر ہدایت دہلی کے قلعۂ معلیٰ سے فارسی میں شایع ہوا کرتا تھا - سنہ ۱۸۴۱ ع سے اس کی اشاعت شروع ہوئی - میرے پاس اس کی تین جلدیں موجود

---

* ان قدیم انگریزی اور فارسی اخباروں کی واقفیت کے لیے میں نواب زادہ ابوالفیض محمد عبدالعلی کے ایک مضمون کا ممنون ہوں جو دسمبر سنہ ۱۹۳۳ کے خیاباں- لکھنؤ میں شایع ہوا ہے —

ہیں جن میں سے جستہ جستہ اقتباس مناسب جگہ پر دی جائیں گے —

پیشتر اس سے کہ ہم فارسی اخباروں سے رخصت لیں دو اور اخباروں کا تذکرہ بر محل معلوم ہوتا ہے - پہلا اخبار 'مفرح القلوب' ہے جو سنہ ۱۸۵۹ع میں کراچی بندر سے نکلنا شروع ہوا - مرزا محمد شفیع خلف مرزا مخلص علی اسے نکالتے تھے - کم سے کم سنہ ۱۸۷۵ع تک یہ اخبار جاری رہا کیونکہ اس سال کے کچھ پرچے میرے کتب خانے میں موجود ہیں - انیسویں صدی کے اواخر میں ایک فارسی اخبار قسطنطنیہ سے بھی نکلتا تھا اس کا پورا نام تھا 'اخبار دارالخلافت استانبول' یہ فارسی زبان اور ٹائپ میں چھپتا تھا - غالباً ہندوستان اور ایران وغیرہ کی اسلامی پبلک اُپی نین کی تلقین اس کا ایک مقصد تھی - اس زمانے کے دہلی کے اردو اخباروں مثلاً نصرت الاخبار وغیرہ میں اس کے حوالے اور اقتباس ہوا کرتے تھے اور کبھی کبھی یہ اخبار فارسی میں مضامین اور ضمیمے بھی نکالا کرتے تھے —

اردو صحافت کی عمر تھوڑی ہے یعنی ایک صدی سے چند سال اوپر باوجود اس کے وہ امید بخش نظارہ پیش کرتی ہے - سیاسی اور جماعتی نیم سیاسی امور میں اردو پریس نے اپنی عمر کے اول پچاس برس میں اپنے تئیں ہونہار ثابت کیا - اہل وطن کے جائز اور مناسب حقوق کی جد و جہد میں بھی اس نے پیٹھ نہیں دکھائی - ادبی پہلو سے بھی وہ اس وقت کے مذاق اور کلچر کی پوری نمایندگی کرتا ہے - سنسنی خیزی اور باہمی نزاع اس کے لایحۂ عمل سے خارج تھیں —

اب سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھہ کو اپنی تحقیق اور تلاش کے متعلق تکمیل کا دعوی نہیں - بعض نامی اخباروں کی جلدیں مجھے ملیں جو میرے کتب خانہ میں موجود ہیں - بعض اخباروں کی جلدیں

مستعار لے کر اُن سے استفادہ کیا گیا - بعض اخباروں کے صرف متفرق پرچے ھی ھاتھ آسکے ' میں سمجھوں گا میری محنت سپھل ہوئی اور میری کوشش مقبول ہوئی اگر کسی بھکر و سایل اور قابلیت کے اھل وطن کو اس سے اس موضوع کو آگے لے جانے کا شوق پیدا ہوجاے - ھمارے ملک میں کوئی کتب خانہ اردو کے صحایف و جراید یعنی موقت الشیوع للٹریچر کا نہیں - کیا اچھا ہو کہ کوئی صاحب یا منظم جماعت ایک ایسا کتب خانہ قایم کرنے کا عزم بالجزم کریں —

آج کل سنه ۱۹۳۴ ع ھے - میں نے جو نصف صدی کی قید لگائی ھے اس میں سنه ۱۸۸۴ع تک کے اخبار آتے ھیں - اس لئے میرا دل بہت کڑھا جب مجھے سنه ۱۸۸۵ ع اور اُس کے بعد کے اخباروں کو اس مضمون سے خارج کرنا پڑا - یہ زمانہ نسبتاً حال کا ھے اس کے تاریخی کوایف فراھم کرنے میں اتنی دقتوں کا سامنا نہیں - ممکن ھے کہ کوئی اھل ھمت یا یہ ناچیز ھی کبھی یہ خدمت بھی انجام دے سکے - اب اردو صحافت کی مختصر اور اجمالی تاریخ کے ساتھ اکثر اخباروں سے اقتباس مع اُن کی تاریخ اجرا وغیرہ کے پیش کئے جاتے ھیں - امید کہ ھماری صحافت کے باغ کے رنگا رنگ گل بوٹوں کی سیر سے آپ محظوظ ہوں گے - اور معترف ہوں گے کہ اس دور دراز کے زمانے میں اور اُس کم مایگی اور بے سروسامانی کے باوجود اسلاف نے واقعی صحافت کی داد دی —

اب تک کی تحقیقات سے یہ پایا جاتا ھے کہ سنه ۱۸۳۵ ع میں شمالی ھند کی دفتری زبان فارسی سے اردو ہوئی اور سنه ۱۸۴۲ ع سے دھلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے لگیں - اردو کا پہلا اخبار جیسا کہ اب تک دریافت ہوا ھے سنه ۱۸۳۶ ع میں

دھلی سے جاری ہوا - اس کا نام تھا 'اردو اخبار' یہ اخبار شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے نکالا اور سنہ ۱۸۵۷ ع تک خوب چلتا رہا - اس اخبار نے پرچے اب بہت ہی کمیاب ہیں - عملی نقطۂ نظر سے اردو اخبار اور اس کے مطبع کو اشاعت خیالات تربیت رائے عامہ اور طباعت کتب میں اولیت کا امتیاز حاصل ہے - ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۴۳ ع کے 'سراج الاخبار' سے ظاھر ھوتا ہے کہ اُن دنوں یعنی سنہ ۱۸۴۳ ع میں مولوی محمد باقر نے ایک اور اخبار بھی نکالا تھا جس کا نام 'مظہر حق' تھا - اس کا ذکر سراج الاخبار کی مذکورہ اشاعت میں "خبر اخبار جدید" کے عنوان کے نیچے آیا ہے - یہ اخبار 'مظہر حق' اردو میں تھا - اس کی عمر کی مُدت معلوم نہ ہو سکی —

اردو کے دوسرے اخبار کا نام 'سید الاخبار' ہے - یہ اخبار سر سید احمد خاں مرحوم کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے سنہ ۱۸۳۷ ع میں دھلی سے نکالا تھا - لیکن عین شباب میں ان کا انتقال ہوگیا - یہ اخبار کچھہ دن سر سید احمد خاں نے چلایا لیکن پھر وہ اور کاموں میں مصروف ہوگئے اور اخبار بند کر دیا گیا - ۱۴ اگست سنہ ۱۸۴۳ ع کے 'سراج الاخبار' سے پایا جاتا ہے کہ کم سے کم اس تاریخ تک یہ اخبار زندہ تھا - 'سراج الاخبار' آپ کو معلوم ہے قلعہ کا فارسی اخبار اور بادشاہ دھلی کا ایک قسم کا روزنامچہ تھا - اس کی اشاعت مذکورہ میں ایک خط ابوالقاسم کی طرف سے شایع ہوتا ہے جو اس نے سراج الاخبار کے مہتمم یعنی اڈیٹر سید اولاد علی کو بھیجا تھا - یہ اس تلقیم پر روشنی ڈالتا ہے - (ترجمہ ملاحظہ ہو) :-

" بندہ گنہگار ابوالقاسم کا التماس سید اولاد علی صاحب کی خدمت میں یہ ہے کہ میر سید محمد خاں بہادر جو مطبع

'سیدالاخبار' کے مالک اور بزرگ اور بزرگ زادہ ہیں آپ کی تحریر دیکھ کر غریب خانہ پر تشریف لائے - اور فرمانے لگے کہ میں نہیں جانتا کہ عبدالغفار خاں نے کس اخبار میں خدام مہتمم 'گیتی نما' کی شان میں بے ادبی سے لکھا ہے - یہ اسی سے دریافت کیا جائے - اور اگر اخباروں کے لکھنے پر ایسا گمان کیا جائے تو اس میں سید عبدالغفور کا قصور نہیں کیونکہ 'سیدالاخبار' کا طرز ایسا نہیں ہے " —

اس سے یہ صاف ثابت ہوگیا کہ سنہ ۱۸۴۳ ع کے اگست تک سید محمد خاں اور ان کا 'سید اخبار' زندہ تھے - دوسری بات یہ پائی جاتی ہے کہ اسی زمانے میں کوئی اخبار 'آئینہ گیتی نما' کے نام سے بھی نکلتا تھا اور غالباً اس کا مالک یا سرپرست شاہی خاندان کا کوئی ممبر تھا جس کی شان میں کچھ گستاخانہ کلمے لکھے گئے تھے - کیونکہ اس خط میں یہ الفاظ آئے ہیں :- " در کدام اخبار نسبت بہ خدام مہتمم آئینہ گیتی نما کلمۂ سوء ادبی نوشتہ اند " - اس سے واضح ہوتا ہے کہ آئینہ گیتی نما کا مہتمم خاص ممتاز حیثیت رکھتا تھا —

سمجھنے اور سمجھانے کی آسانی کی غرض سے زمانۂ زیر سلوک کو میں نے تین حصوں پر تقسیم کیا ہے :—

۱ - ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک

۲ - سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک

۳ - سنہ ۱۸۷۰ سے سنہ ۱۸۸۴ ع تک

کوشش ہوگی کہ ہر عہد کے بعض نامی اخباروں سے جستہ جستہ اقتباس پیش کیے جائیں - جو نوعیت اور موضوع کی قید سے آزاد ہوں گے - ہر

دور کے آخر میں تبصرے کی طور پر مختصر نوٹ دئے جائیں گے تاکہ آپ کو رائے قایم کرنے میں آسانی ہو —

تاکہ مغالطہ کا محل باقی نہ رہے یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ کئی اخبار اپنے ماسبق کے ہمنام بھی ہیں - قدیم 'اردو اخبار' کی نسبت آپ ابھی سن چکے ہیں کہ سنہ ۱۸۵۷ ع میں بند ہوا - اسی نام کا ایک اخبار دہلی ہی سے ۱۸۷۱ ع میں نکلنا شروع ہوا - اس کا نام بھی 'اردو اخبار' ہی تھا دہلی کے اضافہ کے ساتھہ - یعنی "اردو اخبار دہلی" - یہی حال 'سفیر ہند' وغیرہ ناموں کا ہے —

اردو کا تیسرا اخبار 'فواید الناظرین' ہے - یہ اخبار ریاضی کے مشہور عالم اور محقق و موجد ماسٹر رام چندر نے سنہ ۱۸۴۲ ع میں دہلی سے نکالا - اس میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مقامات وغیرہ کے نقشے بھی ہوتے تھے جو اب تک اور کہیں معدوم تھے - اس کی ایک جلد میرے کتب خانے میں موجود ہے - یہ اخبار ماسٹر صاحب کے مطبع دارالعلوم دہلی میں چھپتا تھا - یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس میں نقشہ اور سائنٹیفک مضامین کے علاوہ بعض علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی دستی تصویریں بھی ہوا کرتی تھیں' اور ان امور کے لحاظ سے اس اخبار کو اولیت کا امتیاز حاصل ہے —

اسی سنہ ۱۸۴۲ ع میں ایک اور اخبار دہلی سے جاری ہوا اس کا نام 'قران السعدین' تھا - گوالیار کے معزز و مشہور کرنل سر کیلاس نراین ہاکسر کے دادا پنڈت دھرم نراین (بعد میں رائے بہادر سی - ایس - آئی) مولاناً صہبائی کے تلمیذ رشید نے یہ اخبار نکالا تھا جو بارہ برس تک چلتا رہا —

موجودہ وسایل تحقیق کی رو سے اردو کا پانچواں اخبار 'اسعد الاخبار' ہے - اس کی اشاعت ۷ مئی سنہ ۱۸۴۷ع سے شروع ہوئی - آگرہ سے ہفتہ وار نکلتا تھا - کوئی صاحب نورالدین پھلتی بازار آگرہ سے نکالتے تھے - تقطیع ۱۲ × ۹ تھی اور قیمت آٹھ آنہ مہینا بلا محصول ڈاک - پتا چلتا ہے کہ ۱۱ اگست سنہ ۱۸۵۱ع تک یہ اخبار ضرور جاری تھا - دیوان تلتہ کی جلد اول اسی اخبار کے مطبع سے نومبر ۱۸۴۹ع میں شایع ہوئی تھی —

۲۰ نومبر ۱۸۴۸ع کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہر کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے جو انہوں نے لارڈ ڈلہوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا :—

لارڈ ڈلہوز است رونق بخش ہند   اے صبا در شہر جہت این مژدہ گو
مصرع تاریخ مقدم گفت 'مہر'   افتخار ہند بادا نجم تو
۱۸   ع   ۴۸

۲ مارچ سنہ ۱۸۴۹ کی اشاعت میں مرزا غالب کی پنج آہنگ کا اشتہار ایک لمبی نظم میں درج ہے - یہ کتاب شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خاں کے توسل سے قلعہ دہلی کے مطبع سلطانی میں چھپی تھی —

اس اخبار سے ایک اقتباس اور لیا جائے گا - یہ غالب کے خطاب سے متعلق ہے جو انہیں حضرت بہادر شاہ کے دربار سے عطا ہوا - ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۵۰ع کے اسعدالاخبار میں یہ خبر درج ہے :—

" ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسداللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے آیندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب

دے کر چھہ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین * رقم جواہر عطا فرمائیے
یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متعین عبارت میں
لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہوگا"۔

دہلی میں ایک شاہی مہر کن تھے - شہر میں ان کا نام بدرالدین مشہور تھا-لیکن ۶ دسمبر ۱۸۵۰ع کا اسعدالاخبار انہیں بدرالدین علی خاں لکھتا ہے - ملکہ وکٹوریہ کی فرمایش پر انہوں نے دو مہریں کندہ کیں ایک ملکہ معظمہ کے نام کی اور دوسری ان کے رفیق زندگی پرنس البرٹ کے نام کی - اخبار مذکور سے وہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو ان مہروں پر کھودے گئے - دیکھئے انگریزی اور لاطینی الفاظ کا ترجمہ کس خوبی سے کیا ہے :—

۱ - "شہنشاہ سلیماں جاہ کیواں بارگاہ خاقان ادھر سلطان العصر
مورد الطاف ایزد رحمان بادشاہ انگلستان وایر للد
و فرمانفرمائے ملک ہند ناصردین مسیحا ملکہ وکٹوریہ

۲ - "المؤید بتائید الٰہی فخر خاندان شہنشاہی برنسوک
انیس معزز ملکہ معظمہ رفیع القدر والا شان سر آمد بارگاہ
انگلستان البرٹ فرانسس اکسس چارلس ایمان دل "-

سنہ ۱۸۵۰ع میں کوہ نور کا ظہور ہوا - یہ پنجاب کا اولین اخبار ہے - اس کو نئے طرز کا پہلا اخبار کہا گیا ہے - منشی ہر سکھہ راے سکندر آباد (مضامات دہلی کے رہنے والے تھے - انہوں نے ۱۸۵۰ع کے شروع سے لاہور میں یہ اخبار جاری کیا - اس سال کے اختتام پر اس کے خریداروں کی تعداد دو سو ستاون تھی - خریداروں اور چندے کی

* جیغہ - سرپیچ - مالائے مروارید

وصولی کی فہرستیں وقتاً فوقتاً اخبار میں چھپا کرتی تھیں - چنانچہ سر جان لارنس ، لفٹننٹ اِنس ، مسٹر میکلوڈ ، مسٹر سلیمن اور مسٹر میگریگر وغیرہ اعلیٰ انگریز افسروں کے نام ایسی فہرستوں میں ملتے ہیں پایا جاتا ہے کہ اس اخبار کی خریداری مدراس ، بمبئی اور کلکتہ تک پھیلی ہوئی تھی - سنہ ۱۸۸۳ ع میں یہ اخبار ہفتہ وار سے روزانہ ہوگیا لیکن پھر ہفتہ وار ہوگیا - یہ واقعہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ سنہ ۱۸۵۸ ع میں یا اُس تک مشہور ہند منشی نول کشور ' کوہ نور ' کے عملے میں کام کرتے تھے - لاہور کے تین اخباروں کی ادارت سے جتنے علما اور ادیبوں کو وابستگی رہ چکی ہے اُتنی لکھنؤ کے ' اودھ اخبار ' کے سوا شاید کسی اخبار کو نصیب ہوئی ہو - یعنی ' کوہ نور ' ' پیسہ اخبار ' اور ' زمیندار ' کوہ نور کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہندو مسلمان اور عیسائی اڈیٹروں کے ہاتھوں میں رہا - (چنانچہ نادر علی شاہ تاج الدین ، منشی نول کشور ، مرزا موحد منشی نثار علی شہرت ، مولوی سیف الحق ادیب ، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی وغیرہم اصحاب اس کی ادارت کے کنبل رہ چکے ہیں —

خدا معلوم کوہ نور کے نام میں کیا جادو تھا کہ اس کی پیدائش کے بعد بہت سے اخبار ایسے نکلنے لگے جن کے نام نور سے ترکیب دے گئے تھے مثلاً دریائے نور لاہور سے ، نور الاخبار اور نور افشاں لدھیانہ سے ، نورالانوار اور مطلع نور وغیرہ —

آخر یہ نامی گرامی اخبار بہت سے انقلابات جھیلتا ہوا سنہ ۱۹۰۴ ع میں بند ہوگیا —

سنہ ۱۸۵۳ ع میں راے دیوان چند رئیس سہال کوٹ نے ایک اخبار ' پساپے بہا مطبع چشمۂ فیض سے جاری کیا - یہ اخبار وکٹوریا پیپر کے نام سے اب تک جوں توں زندگی کے دن بھر رہا ہے —

' اخبار عام ' سنہ ۱۸۷۱ ع میں لاہور سے جاری ہوا ' ہفتہ وار نکلتا تھا اور ایک پیسہ میں بکتا تھا ' پنڈت مکند رام متر ولاس پریس سے نکالتے تھے ' رفتہ رفتہ روزانہ ہوگیا یہ اخبار اب بھی جاری ہے اور اس وقت پنجاب میں سب سے پرانا اخبار ہے —

' اودہ اخبار ' سنہ ۱۸۵۸ ع میں لکھنو سے جاری ہوا - لاہور میں کوہ نور کے دفتر میں بیٹھہ کر پریس اور اخبار کے چلانے کے رموز پر حاوی ہوکر منشی نول کشور (پھر سی ' آئی ' ای) نے یہ اخبار نکالا جو سنہ ۱۸۷۴ ع میں روزانہ ہوا اور اس وقت تک آب و تاب سے روزانہ چل رہا ہے - کسی نہ کسی جذبے سے متحرک ہوکر حاسد لوگ کہتے تھے کہ اودہ اخبار پایونیر کا ترجمہ ہوتا ہے - یہ کچھہ ہی ہو ' محض یہ واقعہ کہ وہ اپنے صوبہ کا یا غالباً کل اردو دنیا کا پہلا روزنامہ ہے اور یہ کہ مشہور عالم فسانۂ آزاد اول اول اسی اخبار کے ضمیمہ کی طور پر اشاعت پذیر ہوا کرتا تھا اس کے لئے طرۂ امتیاز نہیں - ملک کے بعض نہایت قابل اور نامی اصحاب اس اخبار کی ادارت کو فخر بخشتے یا شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے ہیں مثلاً مولوی غلام محمد تپش تلمیذ غالب - مولانا سید امجد علی اشہری - پنڈت رتن ناتھہ سر شار - منشی نوبت راے نظر مرزا حیرت دہلوی - حضرت جالب دہلوی - مرزا یاس عظیم آبادی (اب مرزا یگانہ لکھنوی) - مسٹر شوک تھانوی - مرزا محمد عسکری اور مسٹر پیارے لال شاکر وغیرہم - اس اخبار کو

عہد حاضر کے صحیفوں میں سب سے پرانا کہنا چاہئے —

لکھنو میں 'اودھ پنچ' کے اجراء نے جو سنہ ۱۸۷۷ ع کا واقعہ ھے - اردو ادب میں ایک نئے ادارہ کا دروازہ کھولا - یعنی مزاح حسنہ اور مطائبات کو رواج دیا - اب تک لوگوں کا علم مطائبات سعدی اور ھزلیات جعفر زٹلی تک محدود تھا جن کو وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے پڑھتے اور بد مذاقی کے مزے لوٹتے تھے - یا احباب کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی تاویل و تعبیر کرتے - لیکن 'اودھ پنچ' نے واقعات حاضر اور سوشل اور سیاسی معاملات کے کھلے مدارج کو ظرافت کی بر چک دی - نہ صرف یہ کہ جس طرح اکبر مرحوم کو کانگرس اور لیگ سامنے کے موضوع مل گئے - منشی سجاد حسین کو سر سید احمد خاں اور علی گڑھ کی تحریک جدید ھاتھ آگئے - بلکہ منشی صاحب مرحوم کی غایر نظر سے کوئی واقعہ یا شخصیت جو مزاح کا عنصر رکھتی ھو یا جس کی کوئی کل ڈھیلی ھو بچ نہیں سکتی تھی ان کے وار کو کوئی خالی نہ دے سکا - کارٹوں کی ابتدا بھی اودھ پنچ ھی کی ذات سے ھوئی - اودھ پنچ کی ھر دلعزیزی اور قبولیت عام کا موازنہ اس سے ھو سکتا ھے کہ اس کے مندرجات کے انتخاب کے دو خاصے ضخیم مجموعے اب تک شایع ھو چکے ھیں - ایک گلدستۂ پنچ اور دوسرا انتخاب اودھ پنچ —

ذیل کی جدول سے وہ اردو کے قریباً ساتھ اخباروں کے کوایف معہ سنہ ابتدا وغیرہ کے معلوم ھوں گے' جس کے بعد بعض اخباروں سے اقتباس پیش کئے جائیں گے' اور اپنے قایم کئے ھوے ھر دور کی صحافت پر مختصر تبصرہ بھی ھوگا —

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	اڈیٹر
دور اول ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک	۱	اردو اخبار	دہلی	سنہ ۱۸۳۶ ع	مولوی محمد باقر
	۲	سید الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۳۷	سید محمد خاں
	۳	سراج الاخبار (فارسی)	قلعۂ دہلی	سنہ ۱۸۴۱	
	۴	فوائد الناظرین	دہلی	سنہ ۱۸۴۶	ماسٹر رام چندر
	۵	قران السعدین	دہلی	سنہ ۱۸۴۶	پنڈت دھرم نارائن بھاسکر
	۶	ضیاء الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۴۹	شیخ محمد ضیاءالدین دہلوی
	۷	کوہ نور	لاہور	سنہ ۱۸۵۰	منشی ہرسکھ راے
	۸	ہما بے بہا	لاہور	سنہ ۱۸۵۳	منشی دیوان چند
	۹	کشف الاخبار کاشف الاسرار	بمبئی	سنہ ۱۸۵۵	منشی امان علی لکھنوی
	۱۰	صادق الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۵۶	
	۱۱	مفرح القلوب (فارسی)	کراچی بندر	سنہ ۱۸۵۶	مرزا محمد شفیع خلف مرزا مخلص علی
	۱۲	اردو گائڈ	کلکتہ	۱۸۵۸ (؟)	
	۱۳	اودھ اخبار	لکھنؤ	سنہ ۱۸۵۸	منشی نول کشور
دور دوم سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک	۱۴	اخبار عالم	میرٹھ	سنہ ۱۸۶۱	محمد وجاہت علی خاں
	۱۵	اخبار انجمن اودھ موسوم بہ - بھارت پتر کا	لکھنؤ	سنہ ۱۸۶۲	
	۱۶	نجم الاخبار	میرٹھ	سنہ ۱۸۶۳	مولوی محمد حیات
	۱۷	لارنس گزٹ	میرٹھ	سنہ ۱۸۶۴	سید جمیل الدین
	۱۸	آگرہ اخبار	آگرہ	سنہ ۱۸۶۵	مولوی خواجہ یوسف علی
	۱۹	پنجابی اخبار	لاہور	سنہ ۱۸۶۵	

تقسیم دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	اڈیٹر
	۲۰	اکمل الاخبار	دهلی	سنه ۱۸۶۶	منشی بہاری لال 'مشتاق'
	۲۱	علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	علی گڈھ	سنه ۱۸۶۶	
	۲۲	رهیلکھنڈ گزٹ	مراد آباد	سنه ۱۸۶۶	منشی بشن سروپ
	۲۳	بدیا بلاس	جموں	سنه ۱۸۶۷	بخشی کرشن دیال مالک غلام محی الدین اڈیٹر
	۲۴	مقصود الاخبار	گور کاپو	سنه ۱۸۶۸	قاضی قطب الدین احمد
	۲۵	ریاض الاخبار	خیر آباد	سنه ۱۸۶۹	حضرت ریاض
	۲۶	مطلع نور	کانپور	سنه ۱۸۶۹	منشی بہاری لال
دور سوم سنه ۱۸۷۰ ع سے سنه ۱۸۷۹ ع تک	۲۷	اخبار انجمن پنجاب	لاهور	سنه ۱۸۷۰	
	۲۸	اخبار عام	لاهور	سنه ۱۸۷۱	
	۲۹	نور الانوار	کانپور	سنه ۱۸۷۱	
	۳۰	کوکب هند	لکھنؤ	سنه ۱۸۷۱	
	۳۱	نور افشاں	لدهیانه	سنه ۱۸۷۳	
	۳۲	ناصر الاخبار	دهلی	سنه ۱۸۷۳	
	۳۳	آفتاب پنجاب	لاهور	سنه ۱۸۷۳	دیوان بوٹا سنگه مالک منشی فقیر محمد اڈیٹر
	۳۴	نصرت الاخبار	دهلی	سنه ۱۸۷۳	مولوی نصرت علی
	۳۵	نصرت الاسلام	دهلی		مولوی نصرت علی
	۳۶	مرقع تهذیب	لکھنؤ	سنه ۱۸۷۴	
	۳۷	مفید هند	دهلی	سنه ۱۸۷۵	منشی مہا نراین
	۳۸	خیر خواہ هند	دهلی	سنه ۱۸۷۵	منشی مہا نراین

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	اڈیٹر
	۴۰	مہر درخشاں	دہلی	سنہ ۱۸۷۵	
	۴۰	اخبار تمنائی	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۵	منشی پورن چند
	۴۱	جریدۂ روزگار	حیدرآباد دکن	سنہ ۱۸۷۵	
	۴۲	جام جمشید و بلند اختر	مراد آباد	سنہ ۱۸۷۶	سید جمشید علی
	۴۳	سفیر ہند	دہلی	سنہ ۱۸۷۶	منشی بلاقی داس
	۴۴	انوار الاخبار	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۶	محمد تیغ بہادر
	۴۵	اودھ پنچ	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۷	منشی سجاد حسین
	۴۶	قیصر الاخبار	الہ آباد	سنہ ۱۸۷۷	سراج الدین احمد خاں
	۴۷	نسیم آگرہ	آگرہ	سنہ ۱۸۷۸	بابو جمناداس بسواس وکیل
	۴۸	نیر اعظم	مراد آباد	سنہ ۱۸۷۸	امجد علی نیر
	۴۹	مہر نیم روز	بجنور	سنہ ۱۸۷۹	
	۵۰	مشیر قیصر	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۹	منشی غلام محمد تپش
	۵۱	مظہر العجائب	مدراس	سنہ ۱۸۷۹	
	۵۲	ترجمان شرق	استنبول	سنہ ۱۸۷۸	
دور چہارم سنہ ۱۸۸۰ ع سے سنہ ۱۸۸۴ ع تک	۵۳	دہلی پنچ	لاہور	سنہ ۱۸۸۰	منشی نثار علی شہرت دہلوی
	۵۴	تجارت الاخبار	کلکتہ	سنہ ۱۸۸۰	
	۵۵	سفیر ہند	امرتسر	سنہ ۱۸۸۰	
	۵۶	خیر خواہ عالم		سنہ ۱۸۸۱	
	۵۷	ریختی اخبار	دہلی	سنہ ۱۸۸۱	منشی مہا نراین
	۵۸	بنارس گزٹ	بنارس	سنہ ۱۸۸۲	محمد حنیف منیجر
	۵۹	ریفارمر	لاہور	سنہ ۱۸۸۲	تتہو رام آنند

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	ایڈیٹر
	۹۰	دہلۂ ہند	میرٹھ	سنہ ۱۸۸۳	مولانا شوکت حسین شوکت
	۹۱	اخبار النساء	دہلی	سنہ ۱۸۸۴	مولوی سید احمد
	۹۲	رفیق ہند	لاہور	سنہ ۱۸۸۴	منشی محرم علی چشتی

اردو اخباروں سے اقتباس پیش کرنے سے پہلے سراج الاخبار کو نہ لکھا دینا بہتر ہوگا کیونکہ پھر اردو مضمون کا سلسلہ پورا اور بلا مداخلت رہے گا' میں نے اس اخبار سے چند ایسے اقتباس چنے ہیں جو حضرت بہادر کی روزانہ زندگی اور شاہی اقتدار پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ادب میں قلعہ کی کلچر اور زبان سے متعلق خبر دیتے ہیں - یہ اخبار اصل میں بادشاہ کا روز نامچہ تھا آخر میں خاص خاص خبریں بھی ہوتی تھیں جو عموماً دوسری سلطنتوں یا ریاستوں سے متعلق ہوتی تھیں' یا کبھی دہلی کی لوکل خبر موسم وغیرہ کی' یہ اخبار مطبع سلطانی میں "بہ اہتمام مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں وقایع نگار و امداد علی بیگ خاں" ہفتہ وار چھپکر شایع ہوتا تھا' اس کی تین جلدیں سنہ ۱۸۴۱ ع اور سنہ ۴۳ ع اور سنہ ۴۴ ع کی میرے کتب خانے میں موجود ہیں - اس وقت میرے سامنے سراج الاخبار کی جلد اول نمبر ۳ کھلی ہے' عنوان ہے' "سراج الاخبار' "روز جمعہ بست و چہارم جمادی الثانی سنہ ۱۲۵۷ ھ موافق سنہ ۴ جلوس معلی مطابق ۱۳ اگست سنہ ۱۸۴۱ ع" --

بہادر شاہ بغیر ملک کے بادشاہ تھے لیکن لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور اقتدار وہی تھا جو اُن کے بزرگوں کا رہ چکا تھا - اگرچہ

صرف قلعه کی چار دیواری اور مختصر سے علاقه خالصه میں بادشاه کی حکومت تھی شہر دہلی پرایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط اور حکومت تھی - لیکن اس پر بھی شہر والے اپنی شکایتیں جو کمپنی کے افسروں کے خلاف ہوتیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے - چنانچہ چوکیداره اور پولس کے خلاف شہر کی رعایا کی ایک عرضداشت گزرتی ہے —

''اشاعت متذکرہ صدر کی اصل عبارت یہ ہے پس از ادائے صلوۃ عصر از ڈیوڑھی خاص رونق افروز شدند ' راجہ جیسکھہ رائے و فخر الدولہ و احترام الدولہ و حکیم الممالک ' و رائے شادی رام و میر اشرف علی خاں خلف نجیب الدولہ و فوجدار خاں و مرزا راجہ بھولاناتھہ ' و موتمن الدولہ مرزا علی خاں عرض بیگی وغیرہ بہ تلثم عتبۂ فلک رتبہ پرداختند ' | سواری مبارک در صحن دیوان خاص رسیدہ بود کہ انبوہ کثیر از رعایاء شہر و سکنائے صاحب باغ و دیگر املاک شاہی استغاثہ تعدی عملہ پولس در اخذ وجوہ چوکیدارہ مجوزہ حال کہ دو چند وسہ چند از روے تعداد و نسبت معمول سابق بودہ نمودند و عرضداشتند کہ اکنوں رتبہ شدت بایں درجہ رسیدہ کہ اجناس و اثاث البیت بے اجازت مالکان خانہ گرفتہ می برند ؛ حضرت خدیو کیہاں از سماعت معروضات فریاں بہ سیف الدولہ مخاطب شدہ ارشاد فرمودند کہ از استبداد و اصرار مجسٹریٹ بہادر بر تضعیف وجوہ چوکیدارہ و اعتزاز معظم الدولہ فرزند ارجمند اجلت بہادر باوصف ادراک تکالیف رعایا ازیں تجویز ثابت می گردد کہ قانون نے تازہ دریں باب از صدر رسیدہ باشد '

زیرا کہ مجسٹریٹ بہادر بہ تعمیل احکام قانونی مامور است و اجلس بہادر بحکم عدم مداخلت در امثال این امور مجبور والحق بواسطہ بے اختیاری در اصلاح این مقدمہ ہر دو معذور و بے قصور اند دریں صورت شکایت گذاری ایشاں ناروا بلکہ رجوع باعالیان صدر کے مخترع قوانین جامع النفع و ناسخ آئین عامۃ الضرر اند مناسب و بجاست .. لازم کہ بدو سہ کس ازایں مستغیثاں کہ بحلیہ فہم و فراست محلی باشند بہ تشفی و دلاسا فہمانند کہ مرافعہ این مقدمہ بصدر نمایند و از پیشگاہ والا ہم دریں باب شقہ خاص تنفل اختصاص اسمی زبدۃ الامراء عالیشان عالیجاہ رفیع المکان متعہد سرانجام مہمات سلطانی متکفل انصرام امورات جہانبانی ہلری طامس کہل رابرٹ سنہ لفتنٹ گورنر بہادر مستقرالخلافت اکبر آباد صادر خواہد گردید ... ")

لفظ بہ لفظ ترجمہ محض طوالت ہے - اس اقتباس کا ملخص یہ ہے کہ شہر وغیرہ کی رعایا کے نمایندوں نے یہ عرضداشت پیش کی کہ رسوم چوکیدارہ پہلے سے دگنا تگنا کردی گئی ہیں - جو یہ رسوم ادا نہیں کرسکتا پولس والے اس کے گھر کا مال اسباب زبردستی اٹھالے جاتے ہیں ایسا جبر اور ظلم جب سے شہر بسا ہے کبھی نہیں ہوا - اس عرضداشت پر حضرت بہادر شاہ کا حکم نہایت مہتم بالشان ہے - فرمایا اس بارے میں شہر کے مجسٹریٹ یا دھلی کے انگریزی رزیڈنٹ کو لکھنا فضول ہے کیونکہ وہ صرف احکام صدر کی تعمیل کرنے والے ہیں ان لوگوں میں جو سمجھہ بوجھہ والے ہیں ان کو سمجھادو کہ آگرہ جاکر محکمہ صدر میں

اپنی شکایت پیش کریں کیونکہ قانون اور حکم وہیں سے جاری ہوتے ہیں ان لوگوں کی اچھی تسلی کی جائے اور بتایا جائے کہ اس بارے میں قلعہ سے بھی لفٹنٹ گورنر کو لکھا جائے گا۔ کوئی اس حکم کو لطایف الحیل کہے یا مصلحت وقت پر مبنی۔ بہ ہر حال خودداری کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ اس کے سوا بہادر شاہ کچھ اور کر ہی نہ سکتے تھے —

یہ بھی اشاعت مظہر ہے کہ :-

"روز شنبہ ہیجدہم شش گھڑی روز بر آمدہ حضرت شاہنشاہ در دیوان خاص بکرسی طلا کار رونق افزا شدند و امرائے عظام و دیگر خدام ناصیہ سائی آستاں سپہر نشاں گشتند کپتان انجلو بہادر قلعدار معہ مصور سحر کار جادو نگار کہ شفٹ نام دارد بشرف مجرا رسید و مصور مذکور بہ تیاری شبیہہ اقدس مشغول گشت")۔

۱۹ ستمبر سنہ ۱۸۴۱ کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ مرزا غالب نے نو زائیدہ شہزادہ کا زایچہ ایک فارسی قطعہ میں نظم کرکے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ جس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :-

" عرضداشت اسداللہ خاں غالب تخلص کہ زایچہ طالع نونہال حدیقہ اقبال را بہ نظم در آوردہ معرفت نوروز علی خاں فرستادہ و در آں داد سخنوری دادہ بود بہ نظر کرامت اثر گذشت و مورد تحسین گشت " —

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک غالب قلعہ کے دربار میں باریاب نہیں ہوئے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ 'ذوق' کا خطاب 'سلطان الشعرا' تھا نہ کہ ملک الشعرا۔ اور یہ کہ وہ ابھی تک 'خاقانی ہند' نہیں ہوئے تھے۔

قطعہ میں جس کا ابھی ذکر ہوا چودہ شعر تھے - پہلا شعر یہ ہے :-

سپہر بارگہا فرقدال سریر شہا

طلوع کوکب مجد و علا مبارکباد   (ردیف مبارکباد)

ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کبھی کبھی انگریزی دوائیں بھی استعمال کرتے تھے - ۱۹ شعبان سنہ ۱۲۵۷ھ کے اخبار میں ہے کہ :-

" بعد ازاں راجی سوہن بہادر کہ در زمانہ سابق سکرتر ایجنٹی خاص دارالخلافہ بودند و حالا بہ عہدہ کلکٹری و مجسٹریٹی علاقہ بہاول پور مامور اند بہ سعادت ملازمت رسیدہ اشرفی نذر گذرانیدند عرض حالات آب و ہوائے آں فلم نمودند و بندگان اقدس برائے کدام دوائے انگریزی کہ مہیج اشتہا و مقوی اعضا باشد بہ موجب عرض سابق شاں ارشاد نمودند - معروض داشت کہ فردا از راس بہادر ڈاکٹر گرفتہ ابلاغ حضور فیض گنجور خواہم ساخت " -

اخبار نمبر ۱۲ جلد اول میں ہفتہ کے روزنامچہ میں درج ہے کہ بادشاہ نے اپنی غزل (بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی) پر مصرع لگائے تھے - اسے " سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم المتخلص بہ ذوق " نے پڑھ کر سنایا - اس سے اگلی اشاعت میں درج ہے کہ " شیخ محمد مشتاق حسین تخلص نے رباعی مرسلہ اسداللہ خاں غالب تخلص کہ شاعر نازک خیال است در شکریہ عطاے ' دال ' کہ از پیشگاہ حضور انور شدہ بود بہ وسیلہ احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر بہ سمع ہمایوں رسانید " - یہ وہی رباعی ہے (بھیجی ہے جو مجھکو شاہ جمجاہ نے دال) جو دیوان میں شامل ہے - یہاں بھی غالب کا نام بغیر کسی اعزازی لقب کے ہے -

مولوی ھی لکھہ دیا جاتا - ظاھر یہ ھوتا ھے کہ لفظ 'مرزا' قلعہ کی اصطلاح میں شہزادوں کے لئے خاص ھو چکا تھا اور مرزا غالب کا رسوخ قلعہ کے دربار میں ابھی بہت کم تھا —

۲ شوال سنہ ۱۲۵۷ھ کے سراج الاخبار میں ھے :-

" روز دو شنبہ بست و ھشتم رمضان المبارک چوں ھمگی ھمت والا نہمت حضرت قدر قدرت بہ خیرات مبرات مبذول است موافق معمول تقریب دیوالی براے وزن جسم معظم و پیکر مطہر در تسبیح خانہ کہ میزان برپا کردہ بودند تشریف فرما شدہ بہ زر و نقرہ و دیگر فلذات وغلات ھفتگانہ وزن فرمودہ بہ ارباب استحقاق عنایت فرمودند و لباس ملبوس بہ خاص تراشاں مرحمت گشت " —

خاص اشخاص کو بادشاہ خط نسخ کی تعلیم بھی دیتے اور اس فن میں شاگرد بناتے تھے اور شاعری میں بھی بادشاہ کے دربار میں غالب کی حاضری کم سے کم تین ھجری سالوں یعنی سنہ ۴۴-۴۳-۴۱ میں تو پائی نہیں جاتی لیکن رسل رسائل کی سبیل کا پتا چلتا ھے - ۵۱ال کی رباعی کا ذکر ابھی ھوا زائچہ والا قطعہ اس سے پہلے آ چکا تھا - اب غرہ ذیقعد سنہ ۱۲۵۷ کے اخبار میں لکھتے ھیں " اسداللہ خاں غالب تخلص عبارت نثر را کہ حضرت نزدشاں ابلاغ داشتہ بودندد درسلک نظم بطور مثنوی کشیدہ بنابر ملاحظہ اقدس فرستادہ براے خواندن بہ احتوام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر فرماں شد حسب الحکم بہ سمع اقدس رسانید و مطبوع خاطر والا افتاد " —

اسی اشاعت میں بادشاہ کی ایک غزل مستزاد بہت نفیس درج

ہے جس کا مطلع ہے :-

جو عرش سے ہے فرش تلک آدمی میں ہے　　دیکھو آنکھ کھول کر
کیا کیا نہیں ہے اس میں کہ سب کچھ اسی میں ہے　　پر چاہئے نظر

۲۴ ذیقعد سنہ ۱۲۵۷ کے سراج الاخبار سے واضح ہے کہ اس وقت سعد الاخبار زندہ اور جاری تھا- بادشاہ برہمنوں کو بھی دان دیا کرتے تھے - چنانچہ ۱۰ محرم سنہ ۵۸ کے سراج الاخبار میں ہے کہ :

"عرضداشت برہمنے کہ بہ عطایے زنجیر فیل کامیاب گردیدہ بود مشعر طلب حصص دیگر برہمناں کہ ملازم سلطانی اند بہ نظر انور گزشت ، حکم شد کہ ایں تصدق مختص بہ ذات تو تعلق دارد دیگراں را دعوے شراکت نمی رسد" —

جون سنہ ۱۸۴۳ کے سراج الاخبار میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو پنشن آتی تھی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

" بہ گوش حق نیوش رسید کہ پیشکش زر معمولی از خزانہ انگریزی بہ خزانہ عامرہ و نیز زر آمدنی کلید خانہ همدست تاج محمد خاں سرچوکی دیوان خاص داخل شد " —

۵ جولائی سنہ ۱۸۴۳ کے اخبار میں " خبر لاہور " کے تحت درج ہے :-

" ... راجہ دھیان سنگھہ آزردہ خاطر گشتہ معہ اسباب و فوج خود بہ صوب جموں رخصت کشید ، و مہاراجہ شیر سنگھہ بہادر از رفتن او بسیار کشیدہ خاطر گشت و بر سر محفل گفت کہ راجہ دھیان سنگھہ راتکبر بر فوج آراستہ وتہ بیر خود است مگر آں چناں سزاے ایں سرکشی بہ کنا رش خوا هم نهاد کہ جملہ متمرداں بر سر حساب خواهند آمد و جلول و نکورہ زا

طلب نمودہ گفت کہ باچہار رجمنٹ کارآزمودہ پیادگاں ودو
رجمنٹ سواران جنگ دیدہ بر سرش شتافت ... "

سراج الاخبار کی ان جلدوں سے جو میرے پاس ہیں یہ تو واضح ہوتا ہے کہ ریذیڈنسی وغیرہ سے بادشاہ کی خدمت میں کبھی کبھی انگریزی میں بھی مراسلے جاتے تھے اور قلعہ سے ان کے جواب بھی انگریزی میں دیے جاتے تھے اور یہ کہ ایک انگریزی کا سکریٹری محض اس کام کے لئے تعین تھا جس کا نام بابو دلاور سنگھ تھا لیکن کہیں یہ ذکر نہیں آیا کہ بادشاہ کو انگریزی کی شد بود تھی - مگر ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۴۴ کے پرچے میں ہے :—

" شقہ خاص ... کہ در خط و عبارت انگریزی بود بہ نظر قدسی آوردند "

غالباً اس کی غرض دستخط کرنے یا مہر لگانے سے ہوگی —

۲ اگست کے اخبار میں " مادرزن ایشان آیا ہے - خوشدامن چونکہ مہذب تھا استعمال نہ کیا - ریذیڈنسی اور قلعہ کے درمیان بعض معاملے ایسے الجھے تھے کہ سلجھنے میں نہ آتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ تو اس سے بہت آزردہ رہتے تھے چنانچہ سنہ ۴۴-۴۳ ع میں مدتوں تک دربار موقوف رہا اور قلعہ سے باہر بھی شاذ ہی تشریف لے جاتے - اسی زمانے میں بادشاہ نے ایک انگریز سفیر الدولہ مشیر الملک مسٹر جارج طامس بہادر مصلح جنگ کو نوکر رکھا - اس نے انگریزی خواں سکرٹری کی امداد سے تمام ضروری کاغذات اور عہد نامے وغیرہ انگریزی میں تیار کئے تجویز یہ تھی کہ وہ معہ مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر وغیرہ انگلستان جاکر ملکہ معظمہ کے دربار میں بادشاہ کے معاملات کی چارہ جوئی کریں - لیکن آخری خبر جو ہم تک پہنچی یہ ہے کہ واسداے نے اس جوش وخروش

پر ٹھنڈا پانی ڈالدیا کہ مسٹر طامس انگریزی قوم اور رعایا سے ہے اس کا بادشاہ کی سفارت پر مامور ہو کر جانا نہیں ہو سکتا اور دوسرے یہ کہ سفت کی زیر باری ہوگی- سفیرالدولہ کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تھی -

سراج الاخبار کی ان تینوں جلدوں میں جن کا ذکر ابھی آیا ہے فارسی بہت پختہ اور ٹھیٹ ملشیانہ ہوتی تھی- لفاظی جو دربار کی شان تھی اس کے علاوہ اسلوب فصیح اور عبارت بلیغ ہوتی تھی - زبان کے قاعدے اور آیئن کی پابندی سخت تھی - یہ الفاظ اور مرکبات جو ان جلدوں میں سے اخذ کر کے ذیل میں لکھے جاتے ہیں غالباً دلچسپ ثابت ہونگے :-

ڈیوڑی معلے ' نوازاہ ہاے ' ٹھیکہ داران ' دو گھڑی ' عملہ سرشتہ اپھلٹی چھٹی کمپ انگریزی ' یک ڈالی میوہ ہا ' برآمدۂ پیٹھک کلاں' نیلام ' کمشنری ' ایپلانتان ' اسپانڈنت ' چٹھی ' چٹھیات ' گن کمپ تورا دار ' برسبیلی ڈاک ' رجسٹر ' رپورٹ ' کمیٹی ' مشاہیخان ' کانھی نویس ' زرپلی ' حوری لقا ' مادر زن ' (لباس) بہ حلق کھیدند (پھانسی دی) اہاے گورمینٹ ' چھاپہ خانہ ' فلات ھنتکانہ (سی‌نجا) وغیرہ وغیرہ —

یہ کہیں سے معلوم نہ ہوسکا کہ اس اخبار کی کیا قیمت تھی اور آیا یہ اور اخباروں کی طرح فروخت ہوتا تھا —

اردو اخباروں سے اقتباس

ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک

اردو اخبار | جلد ۱۹ - نمبر ۱۵ - مورخہ ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۵۷ ع کی اشاعت میں درج ہے :—

" دهلی گزٹ کا ایک نامه نگار کابل سے ۲۹ مارچ کو لکھتا ھے
که مختصر فوج جسے امیر دوست محمد خاں نے پیش بولاک
اور سر جیو خیل قبیلوں کی سر کوبی کے لئے روانه کیا تھا
محمد شاہ خاں سے مقابله کے بعد ' جلال آباد واپس ھوگئی
ھے کثیر مال غنیمت امیر کے سپاھیوں کے هاتھ لگا ھے اور
خاندان مذکور کو اپنی جان بچا کر پہاڑی قلعوں میں جو لمغان
میں ھے جا چھپا ھے ... برادر میر داد خاں نے یه بھی بیان
کیا که چند انگریزی اخبارات هندوستان کے شایع شدہ امیر
کے سامنے پڑھے گئے جن میں گورنمنٹ کی بد نظمی پر تنقید
کی گئی تھی که وہ امیر کو خواہ مخواہ روپیه دیتی ھے
حالانکه وہ دو طرفه تعلقات رکھتے ھیں - امیر نے یه سن کر
کہا که جب گورنمنٹ پر کوئی مشکل آپڑتی ھے تو وہ لوگ لاکھوں
پونڈ صرف کر دیتے ھیں اور اب جب که ایرانی روسیوں کی
تحریک پر افغانستان پر چڑھائی کی تیاریاں کر رھے ھیں اور
محض گورنمنٹ هند کو دق کرنے کی نیت رکھتے ھیں تو گورنر
جنرل نے عقلمندی اور دور اندیشی سے کام لے کر امیر کے عہد
و پیماں پر غور کیا ھے که وہ قائم رکھنے کے قابل ھے ... اور معتبر
خبر ملی ھے که سلطان جان نے کمانڈر انچیف افواج ایران
متعینه هرات سے گرشک پر فوج کشی کرنے کی درخواست کی
ھے اور کہا ھے که اهل گرشک نے اس شرط پر مدد دینی منظور
کی ھے که تین سال تک کا خراج معاف کردیا جائے " —

صادق الاخبار | جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخه ۱۹ مارچ سنه ۱۸۵۷ ع کی اشاعت
میں یه اخبار لکھتا ھے :—

" اعلان شاہ ایران "

" اعلان شاہ ایران کی کئی کاپیاں گلیوں اور سڑکوں کے نکڑ پر چسپاں ہیں، میرے ایک دوست نے اس اعلان کی بعینہ ایک نقل کرلی ہے جو جامع مسجد کی پشت پر چسپاں ہے اس اعلان کو متعدد آدمیوں نے دیکھا ہے، مختصراً اس کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ مذہب حق کا دعوے کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ عیسائیوں کو مدد نہ دیں اور حق و راست پر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی میں اپنی تمام طاقت صرف کردیں اور وہ وقت قریب آرہا ہے کہ جب کہ ما بدولت (شاہ ایران) تخت ہند پر متمکن ہوں گے اور رعایا کو اتنا ہی خوش حال بنادیں گے جتنا کہ انگریزوں نے مفلوک الحال کرکے ذریعہ معاش سے محروم کردیا ہے، ہم کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیا کرتے ہیں اور نہ وہاں دیں گے —

" یہ ہے اس اعلان کی رویداد، ایک شخص محمد صادق نامی جس کے ذریعہ سے یہ اعلان کیا گیا کہتا ہے کہ ۱۹ تاریخ تک ۹۰۰ ایرانی سپاہی مع چند معزز افسران کے ہندوستان میں داخل ہوچکے ہیں اور خاص دہلی میں ۵۰۰ سپاہی تبدیلی لباس میں مختلف صورتوں میں موجود ہیں، وہ اپنی نسبت کہتا ہے کہ ۱۳ مارچ کو میں دہلی پہونچا، جہاں اعلان چسپاں کردے گئے ہیں "

اخبار مذکور کا حاشیہ اس اعلان اور محمد صادق کے بیان پر عجیب لیکن معنی خیز ہے، شروع میں یہ کہہ کر کہ " لوگ کہتے

میں یہ اعلان چند بے فکروں کا گھڑا ہوا ہے " صاحب صادق الاخبار اس طرح رقمطراز ہے :—

" ہندوستانی تو صرف اسی وقت خوش ہوں گے کہ اگر شاہ ایران عباس شاہ صفی کی طرح ہمارے خاص بادشاہ کو سلطنت دیدے اور تعجب بھی نہیں جو وہ ایسا کریں کیونکہ خود تیمور نے ایرانیوں کو سلطنت بخشی تھی اور نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی احسان کے بدلے عباس شاہ صفی نے ہمارے ہمایوں کو مدد دی تھی " —

اگلی اشاعت مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۸۵۷ میں بھی اخبار محمد صادق کو جعلساز بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اگر گورنمنٹ کے ہاتھ لگ جائے تو ایک دو تلے کا جوتہ سرکہ میں تر کیا ہوا اس کی ٹانٹ پر پڑے گا " - مگر صادق الاخبار کا یہ فرمانا اور سرکہ میں جوتا تر کرنے کا نسخہ تجویز کرنا اس مشورہ کے مقابلہ میں جو انہوں نے شاہ ایران کو حضرت بہادر شاہ کے ہاتھوں میں ہندوستان کی سلطنت بخشنے کے بارے میں دیا ہے کوئی وقعت نہیں رکھتا - ' غدر ' کو ابھی تقریباً تین مہینے ہیں اور دھلی میں یہ اشغلے اٹھائے جا رہے ہیں - پھر اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہالیان بست و کشاد کو یہ شک ہوا کہ بہادر شاہ کمپنی کے خلاف ایران کے ساتھ سازش کر رہے تھے تو ذرا بھی تعجب کی بات نہیں - پہلے سنہ ۱۸۴۰ ع میں دھلی کا رزیڈنٹ بادشاہ سے شکایت کر چکا تھا کہ وہ امیر دوست محمد خاں سے براہ راست خط کتابت کرتے ہیں جو نہیں ہونا چاہئے اب غدر سے دو تین مہینے پہلے یہ ایران کا قضیہ اٹھایا گیا - چنانچہ ایک شاہزادہ بنارس میں گرفتار بھی کیا گیا جس پر یہ الزام تھا کہ بادشاہ کا

مراسلہ لے کر ایران جارہا تھا۔ اشتہار مذکور خواہ کسی کا طبعزاد ہو اخبار کی پہلی اشاعت کا نوٹ یقیناً نامناسب اور فتنہ انگیز ہے —

'دھلی گزٹ' پہلے انگریزی میں نکلتا تھا پھر اردو میں بھی ہوگیا کابل کے متعلق اس کے حوالے سے اردو اخبار کا اقتباس جو سب سے پہلے پیش ہوا ہے وہ بھی سادگی سے خالی ہے - شکایت ہوئی ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں ان انگریزی اخباروں کی تقلید جو یورپین ہی نکالتے تھے اور معاملات خارجیہ میں جارحانہ نکتہ چینی پریس کے ان قوانین کا باعث ہوئی جو سرکار وقت کو اس زمانے میں نافذ کرنے پڑے —

فوائد الناظرین | جلد چہارم - نمبر ۲ - مورخہ ۲۲ جنوری سنہ ۱۸۴۹ ع سے یہ اقتباس لیے جاتے ہیں —

" خبر ملتان "

" ۱۱ تاریخ تک کے خطوط صاحب دھلی گزٹ پاس آئے ان سے کوئی بات تازہ نہ معلوم ہوئی فوج سرکاری شہر ملتان کا قبضہ اور محاصرہ قلعہ کا کئے پڑی ہوی ہے شب و روز توپخانہ آتش بار جاری رکھتا ہے اور صاحبان حرب و پیکار تجویز واسطے قبضہ کرلینے قلعہ کے کر رہے ہیں " —

" خبر خاص دھلی "

" گیارھویں تاریخ جنوری سنہ ۱۸۴۹ ع کو شاھزادہ دارا بخت بہادر ولیعہد سلطنت ھند نے اس جہان ناپایدار سے طرف عالم بقا کے نقارہ کوچ بجایا اور چراغ دھلی میں دفن کیے گئے -

۵ فروری سنہ ۱۸۴۹ ع کی اشاعت میں یہ اخبار پچھلے سال یعنی ۱۸۴۸ ع کے واقعات دینا ہر مہینے کے عنوان کے تحت یہ قید تاریخ دیتا

ہے جن میں سے چند واقعات یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں :—

"مارچ"

" پانچویں تاریخ کو بابو بھولا ناتھ اور گوپال چندر شہر لندن سے بعد حصول علم طب کے ہندوستان میں داخل ہوئے" -

" ۱۸ تاریخ تمام ولایت فرنگ میں شورش واسطے ریاست جمہوری کے اٹھی اور چند شاہان اس دیار کے اپنی اپنی سلطنت کو استعفا دے کر بھاگ گئے" —

" مئی "

" ۲۵ تاریخ کو جنرل دنچورا صاحب کو جو کہ مہاراجہ لاہور کا نوکر تھا حکم ہوا کہ یہاں سے ولایت کو چلا جائے " —

" اکتوبر "

" ۹ تاریخ کو دنیا کے باشندوں اور طالب علموں نے سرکشی کی اور وہاں کا شہنشاہ معہ اپنے خاندان کے فراری ہوا " —

اسی اشاعت میں فراسو صاحب کی ایک اردو غزل بھی درج ہے جس کا مطلع ہے —

جو معرکہ الفت میں تری ہم سے نہ ہوگا
ہے ہم کو یقیں وہ کبھی عالم سے نہ ہوگا

یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ پنڈت دھرم نارائن جنھوں نے 'قران السعدین' نکالا تھا 'مالوہ اخبار' نکالنے والے ہیں جس میں ایک طرف اردو اور ایک طرف ناگری ہوا کرے گی ۔—

" ۲ اپریل کے اخبار میں قلعہ معلی کی خبر لکھتے ہیں کہ " حضور

والا نے "زبدۃ الاخبار آگرہ اور "اردو اخبار" دھلی کو ملاحظہ کیا اور اس میں جو شرایط درباب اضافہ کی تھیں اُن کو پسند فرمایا اور اصلی شرایط کو اپنے "سراج الاخبار" میں چھپوا دیا"۔

یہ شرایط بادشاہ کے مالی معاملات کی اصلاح کی تجویزیں تھیں -

۹ جولائی کی اشاعت دھلی سے ایک اور اخبار مسمی "ضیاء الاخبار" کے جاری ہونے کا اعلان کرتی ہے- جس کے مہتمم شیخ محمد ضیاء الدین دھلوی تھے-

۳ ستمبر کے اخبار میں یہ مندرجات اہم ہیں: —

۱ - شبیہ و حالات ولیم شیکسپیر -

۲ - پنج آهنگ یعنی مجموعہ نثر غالب کا اشتہار- یہ کتاب کلیم غلام نجف خاں نے اپنی نگرانی میں قلعہ کے مطبع سلطانی میں چھپوائی تھی- ۳۹۴ صفحے تھے اور قیمت چار روپیہ مقرر تھی —

ایک اور بات نوٹ کے قابل یہ ہے کہ فواید الناظرین کی اس جلد (سنہ ۱۸۴۹ ع) میں اردو- فارسی اور انگریزی کے تیئیس اخباروں کے حوالے موقع بہ موقع آئے ہیں: —

تعلیم الخلایق[۱] - آفتاب عالمتاب[۲] مدراس - دھلی گزٹ[۳] - مجمع الاخبار[۴] مالوہ اخبار اندور[۵] - الحقایق[۶] - نزھت الاخبار[۷] - زبدۃ الاخبار آگرہ[۸] - قران السعدین دھلی[۹] - اردو اخبار[۱۰] - نزھت الارواح[۱۱] - انگلش مین[۱۲] - دھلی اخبار[۱۳] - ضیاء الاخبار دھلی[۱۴] - لٹریری گزٹ[۱۵] - پبلک جرنل[۱۶] - خیر خواہ ھند[۱۷] - اخبار ہرکارہ[۱۸] - جام جمشید[۱۹] - اعظم الاخبار[۲۰] فواید الشایقین[۲۱] - اور- سعد الاخبار[۲۲] —

کوہ نور | اب تاریخی ترتیب کی رو سے کوہ نور ھمارے سامنے آتا ھے- اس کا ضروری تذکرہ آگے ھو چکا ھے — ۲۱ ستمبر سنہ ۱۸۵۷ ع کو کوہ نور کی معمولی اشاعت کا دن نہ تھا اس لئے اس تاریخ کو اس کا

ایک " پرچہ زاید " شائع ہوا جس پر ضمیمہ نمبر ۳۹ درج ہے اور عنوان جلی ہے: "مژدۂ فتح دھلی " - یہ ایک نہایت اہم تاریخی مقالہ ہے جس سے طویل اقتباس بیجا نہ ہوگا- یہ اصل پرچہ زاید منجملہ دوسرے اخباروں کی اہم اشاعتوں کے میں ساتھہ لیتا آیا ہوں جو بعد میں ملاحظہ کرائی جائیں گی اب یہ اقتباس ملاحظہ ہو: —

"...... صاحب ایجوٹنٹ جنرل فوج ظفر موج مقام دھلی نے کل کی تاریخ ۹ بجے صبح کے بذریعہ تار برقی اول مرتبہ تو یہ تحریر فرمایا کہ مورچہ بری پر دلیران انگریزی نے کل شام کو حملہ کرکے ۹ ضرب توپ اور ایک توپ بم بلا کسی نقصان کے اپنے قبضہ میں کرلیں اور آج صبح کو لاھوری دروازہ قبضہ میں آگیا- اجمیری دروازہ اور مورچال بیرونی سے اب گولہ نہیں چلتا مفسدین ان جملہ مقامات کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور سپاہ گان سرکاری قبضہ کرنے کے واسطے چلے جاتے ھیں ...... اور مفسدین نے آج صبح کو اپنے کمپ کا میگزین بھی اُڑا دیا آمد و رفت ہماری آج چاندنی چوک تک جاری ہو جاے گی ...... اور شاہ دھلی اور اس کے خاندان کا کچھہ پتہ نہیں —

"پھر ۱۰ بجے صبح کے صاحب موصوف نے یہ خبر بھیجی کہ اجمیری دروازہ اور دیگر مورچال پر قبضہ سرکار کا ہوگیا...... اور لال محل [لال قلعہ] میں داخل ہونے کی تیاری ہے- پھر دوپہر کے وقت صاحب موصوف نے یہ مژدہ دیا کہ لال محل جامع مسجد و اجمیری دروازہ پر سرکار کا تسلط ہوگیا- بعد

اُس کے دو بجے دن کے یہ خبر آئی کہ سلیم گڈھ و پل پر
سرکار کا قبضہ ہوگیا تھوڑے عرصہ میں دروازہ ترکمان تک کل
شہر دہلی و دیگر مور چال پر تسلط کامل ہوجاے گا —
" پھر ۵ بجے شام کے یہ خوش خبری آئی کہ معرکہ دہلی کا
تمام ہوا تمام شہر دہلی اور محل بادشاہی اور سلیم گڈھ
اور پل وغیرہ پر شجاعان سرکار کا بالکل تسلط ہوگیا ... .. سنا
جاتا ہے کہ شاہ دہلی معہ عیال و اطفال ایک گانو میں جو
شہر سے قطب صاحب کی سمت چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے
چلے گئے ہیں " —
" مطبع کوہ نور لاہور محلہ یکی دروازہ حویلی منشی ہرسکھہ راے
پروپرایٹر میں باہتمام منشی نول کشور مینیجر و غلام محمد پرنٹر
و علی بخش پبلشر کے چھپا " —

اس سے یہ واضح ہوا کہ منشی نول کشور چندوں نے بعد میں لکھنؤ میں اپنا نامی گرامی مطبع اوراودھ اخبار جاری کیا سنہ ۱۸۵۷ میں یہاں لاہور میں مطبع کوہ نور کے مینیجر تھے - کوہ نور کی ابتدائی جلدیں میرے قبضے میں نہ آسکیں - سنا کہ منشی محبوب عالم صاحب مرحوم کے ہاں کچھہ پرانی جلدیں ہیں ان کے کتب خانہ کی آتش زدگی کا حادثہ ہوچکا تھا اور وہ کوہ نور کی سنہ ۱۸۵۱ ع کی جلد میرے معزز دوست راے بہادر پنڈت شیو نراین صاحب کو مستعار دے چکے مگر مجھہ کو ان سے یہ استفادہ میسر نہ آیا - راے صاحب موصوف نے اس جلد سے مستفید ہوکر ایک مہتم بالشان لکچر لاہور کی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی میں "کوہ نورآف سنہ ۱۸۵۱ ع " کے عنوان سے دیا جو اس کے جرنل جلد ۴ نمبر ۱ - سنہ ۱۹۱۶ع

میں طبع ہوا ہے - (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ نور کی جلد سنه ۱۸۵۱ع میں مندرجہ ذیل اخباروں کے نام حوالہ کی طور پر آے ہیں : —

کلکتہ
۱ - اخبار هرکارہ
۲ - مراۃ الاخبار
۳ - مراۃ الاحوال
۴ - انجمن آرا

بمبئی - ۵ - مجمع الاخبار

دهلی
۶ - أردو اخبار
۷ - قران السعدین
۸ - عمدۃ الاخبار
۹ - دهلی گزٹ

آگرہ -
۱۰ - اخبار الحقایق
۱۱ - زبدۃ الاخبار

میرٹھ - ۱۲ - جام جہاں نما

بنارس -
۱۳ - باغ و بہار
۱۴ - بنارس گزٹ

بریلی — ۱۵ - عمدۃ الاخبار

سیال کوٹ — ۱۶ - ریاض الاخبار

لاهور - — ۱۷ - دریاے نور

شملہ - ۱۸ - شملہ اخبار -

۱۲ - جنوری سنه ۱۸۵۸ ع کا کوہ نور غدر کے بعد شاہ دهلی کے معاملہ پر بہت روشنی ڈالتا ہے - وہ لکھتا ہے : —

"اب ہم انتخاب ایک چٹھی کا جو دہلی سے ہمارے پاس پہنچی ہے اور اس میں مفصل حال شاہ دہلی کا کسی صاحب نے بہ چشم خود دیکھہ کر لکھا ہے درج ذیل کرتے ہیں ہم کو راقم چٹھی کی تحریر پر اعتماد کامل ہے- صاحب چٹھی لکھتے ہیں کہ چند دن گزرے کہ میں ہمراہ چند دوستوں کے شاہ دہلی اور ان کی بیگم صاحبہ کی ملاقات کو گیا تھا - شاہزادہ نے دیکھتے ہی مجھہ کو پہچان لیا اور اپنی والدہ کے پاس اطلاع کرنے کو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد پیغام لایا کہ بیگم صاحبہ میرے دیکھنے کی مشتاق ہے- میں نے اپنے دوستوں اور ہمراہیوں سے اجازت اندر جانے کی لی اور ان سے میں نے کہہ دیا کہ بیگم صاحبہ مجھہ کو آگے ہی سے جانتی ہے اس واسطے مجھہ کو بلایا ہے - پہلے کمرہ میں بادشاہ سلامت سوتے تھے - پہلے کمرہ سے گزر کر دوسرے میں جہاں بیگم صاحبہ ایک کھڑکی کے متصل جس پر پردہ پڑا تھا پلنگ پر پروں کا تکیہ رکھے ہوئے بیٹھی تھی چوں اس کمرہ میں ادھر ادھر گروہ کثیر عورات حرم کا موجود تھا میں نے بیگم صاحبہ کو نہیں پہچانا پر انہوں نے دیکھتے ہی مجھہ کو بلا لیا اور اپنے پاس بٹھلایا" —

اوپر کی تحریر ترجمہ ہے جو کوہ نور نے لاہور کے انگریزی اخبار پنجاب کرانیکل مطبوعہ ۹ - جنوری سنہ ۱۸۵۸ سے کیا- جو کوایف اس تحریر سے معلوم ہوے وہ کچھہ عجیب ہیں- یہ بیگم صاحبہ ملکہ زمانی زینت محل ہی ہوسکتی ہیں کیونکہ وہی بادشاہ کی خدمت میں زنگون میں آخر دم تک رہیں. ملاقات کرنے والے کون صاحب ہیں اس کا پتا نہیں چلتا - یہ ملاقات اس

طرح کی ٹھرتی ہے جس طرح ایک یوروپین جنٹلمین ایک یوروپین خاتون سے کرتا ہے۔ اس پر زیادہ وقت دینا فضول ہے —

معلوم ہوتا ہے کہ منشی نول کشور غدر کے خاتمہ کے بعد کوہ نور اور لاہور سے چلے گئے کیونکہ اشاعت مذکورہ کے اختتام پر پنڈت سورج بھان کا نام منیجر کی جگہ درج ہے اور یہ نام آیندہ مدت تک اسی حیثیت میں چلتا رہا —

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع کا کوہ نور امرتسر کی یہ خبر لکھتا ہے :-

" ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ بحصول اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوٹ کے چند دولت مند امرتسر سے دھلی گئے ہیں "۔

۲۶ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع کا اخبار مظہر ہے :-

" دھلی - خط مورخہ ۱۷ جنوری سے مفہوم ہوا کہ مسٹر سی تی لیاس صاحب نے دھلی میں پہنچ کر چارج عہدہ جج کا لے لیا دوکانداروں وغیرہ کے نام پروانہ جاری کئے جاتے ہیں کہ وے شہر میں آکر سکونت اختیار کریں جس شخص کو شہر میں رہنے کی اجازت ملے گی بعوض کچھہ روپیہ کے ایک ٹکٹ ملے گا اور اگر کسی شخص کے پاس سے چار دن کے بعد ٹکٹ نہ نکلے گا تو وہ شہر سے خارج کیا جاے گا "۔

اسی اشاعت میں یہ بھی خبر درج ہے :-

" اخبار لاہور کرانکل مطبوعہ ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع سے دریافت ہوا کہ شاہ دھلی بہ نسبت سابق صحت رکھتے ہیں اور منگل گذشتہ یعنی ۱۹ تاریخ کوان کی تحقیقات شروع ہوگئی ہوگی "۔

(۲۳ فروری سنہ ۵۸ کی اشاعت سے ایک خط اور ایک غزل نقل کی جاتی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں - خط فارسی میں ہے اور غزل اردو کی - جو اس زمانے کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے - لکھتے ہیں :-

" جناب مخدوم و مکرم قدردان والا شان جناب منشی صاحب دام اقبالہم بعد از جبیں سائی بزمین ارادت و ناصیہ فرسائی بلوح افادت مشہود ضمیر نوازش تخمیر آں کہ امروز حسب عادت قلم بر داشتہ یا دہ درائی نمودہ ام و بتقریب میلہ چراغاں اکثر احبا از نواح قدم پر چشم خواھند نہاد اگر مہربانی کردہ آں خزف ریزہ چند را ار اندراج اخبار پر بہار رشک در شاھوار فرمایند بعید از بندہ نوازی نخواھد بود - زیادہ تا زندگی بندگی) -

" نور احمد چشتی لاھوری عفی عنہ "-

" غزل "

وہ جو پہلو سے اٹھے درد دل ایسا اٹھا
ضبط کی تاب نہ باقی رھی چلا اٹھا
حالت عشق مری دیکھ کے وہ ھنستا تھا
کیوں رے ھاں اب تو بتا شور یہ کیسا اٹھا
ساقیو میکشی کا دور کرو جلد شروع
ماہ نو دیکھا جو ابرو سے اشارہ اٹھا
موسا لاغر تھا میں اور لوگ مجھے ھنستے تھے
لن ترانی ھوئی موقوف جو پردا اٹھا
جس گھڑی یار کے کوچے سے نکالا مجھکو

راہ میں ضعف سے سو بار میں بیٹھا اٹھا
اس کی الفت سے بھلا فایدہ کیا نکلا ہے
نام بد نام ہوا منت میں پیسا اٹھا
عشق کے رمز و کنایہ کی سمجھہ میں یارو
مجنوں مشہور تھا پر 'چشتی' بھی ویسا اٹھا"

۹ مارچ سنہ ۱۸۵۸ع کی اشاعت میں دھلی کے پھر آباد ہونے کی خبر اس طرح دی گئی ہے :-

" کارسپانڈنٹ دھلی نے خط مورخہ یکم مارچ میں یہ لکھا کہ شہر دھلی میں اھل ھنود بستے جاتے ھیں اور خال خال مسلمان بھی آباد ہوے ھیں جن کی نسبت احکام خاص ہوے ھیں - چاندنی چوک اور دریبہ میں کچھہ رونق ہوگئی ہے شہر میں تھانجات بھی بجز کوتوالی ابھی قایم نہیں ہوے بلکہ تمام شہر میں ابھی چوکیدار بھی مقرر نہیں ہوے مگر تھانجات بیرونی قایم ہوگئے ھیں باغ شاھی واقعہ چاندنی چوک کی تیاری بنام نہاد باغ کمپنی ہوتی ہے ... بادشاہ کی نسبت ابھی حکم اخیر نہیں ہوا مقدمہ زیر تجویز ہے شہر کے اندر آمد و رفت ساکنان دھلی کی بلا حصول پاس حاکم کے نہیں ہوتی ... کہتے ھیں شہر کے اندر باون سڑکیں نکلیں گی اور فصیل شہر منہدم ہوتی :-

اس سال خطوط علم اور ذکر علم و ھنر ان عنوانوں پر مضامین نکلتے رہے —

۱۳ اپریل ۵۸ع کا اخبار یہ خبر دیتا ہے لکھنؤ میں یہ اشتہار جاری ہوا

ہے کہ جولوگ باہر چلے گئے ہیں تین دن کے اندر واپس آکر اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں اور دکانیں کھول لیں ورنہ باغی تصور کئے جائیں گے اور ان کے گھر اور دکانیں لوٹ لی جائیں گی —

ہما پہما چشمۂ فیض لاہور سے نکلتا تھا - یہ پندرہ روزہ تھا - مندرجات کے اعتبار سے اس کو رسالہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا 'فوایدالناظرین' کی طرح اس میں علم و ہنر سے متعلق ہی مضامین اور ترجمے ہوتے تھے - ان کے سوا سرکاری سرکلروں اور حکموں کے اعلان وغیرہ - نمونہ ملاحظہ ہو —

" کیفیت مقناطیس "

" ہزار شکر واحسان خالق ہے کہ جلے اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کو نعمائے گوناگوں سے ہم لوگوں کی پرورش وآسایش کے واسطے مرتب کیا یہ زمین اندر باہر سے بے انتہا نعموں سے معمور ہے جتنا ہم غور کریں اتنا ہی کرشمہ نظر آتا ہے دیکھئے اس مٹی کو جسے ایک ادنیٰ ترین سمجھتے ہیں کیا کیا جوہر ملے ہوئے ہیں ہر ایک ذرہ سے اسی نور کا ظہور ہے چشم بینا چاہئے ورنہ جاہل کی نظر میں جوہر و کنکر ایک برابر ہے "-

(اشاعت ۲۸ فروری سنہ ۱۸۵۸ع) پھر مقناطیس کی کہانی شروع ہوتی ہے - اسی اشاعت میں ڈاک بجلی یعنی ٹیلگراف - سیر کرۂ زمین - وسعت عالم - سمندر میں لوہے اور پتھر کا ترنا - 'باکو کا آتش فشاں پہاڑ وغیرہ مضامین ہیں - (مژدہ فتح راحت کدہ بہ تفصیل تمام " جو اسی اشاعت کو رونق دے رہا ہے زبان کے لحاظ سے دلچسپ ہے - فرماتے ہیں :-

" واضح ہو کہ فاضل محمد خاں نامی جاگیردار ریاست بھوپال

نے راہ بغاوت اختیار کیا تھا اور بہ تلبیس ابلیس خبیث باتفاق اور اخوان الشیاطین کے قلعہ راحت گڈہ کو ملجا و ماوا بنایا تھا - ۲۵ تاریخ ماہ حال کو فوج ہندوستان قلعی زیر حکم میجر جنرل سر هیوروز صاحب بہادر کے راحت گڈہ پر پہنچی کنارۂ جو یر جر محاذی قلعہ مذکور واقع ہے کچھہ مفسد نظر آئے فوج سرکاری نے تاخت کی باقی پیٹھہ دکھا کر قلعہ میں گھس گئے افسران فوج انگریزی تدابیر محاصرہ میں مصروف ہوئے اور اتواپ قلعہ شکن نصب کرکر قلعہ پر گولہ اندازی شروع کی ۲۸ ویں تاریخ کو دیوار توڑ ڈالی اور حملہ کی تیاری ہوئی مفسد خوف جان سے سیاہی شب میں فرار کر گئے بہت سے ماخوذ بھی ہوئے - فاضل محمد خاں موجد فساد اور کامدار خاں پنڈارہ بھی گرفتاریں سے تھے دروازہ قلعہ پر براہ پھانسی رہ سپر فنا ہوئے کار بد کردہ را جزا ایں است") -

اس کے ساتھہ اردو اخباروں کا پہلا دور ختم ہوتا ہے - اس دور کے خصوصیات حسب ذیل قرار دیے جاسکتے ہیں :-

۱ - سنہ ۱۸۵۷ ع کے ہنگامہ سے قبل سیاسی اور امور خارجیہ میں اردو پریس نسبتاً بہت دلچسپی لیتا تھا لیکن اس شورش کے بعد اس کا لب و لہجہ بہت نرم اور مصلحت وقت کے تابع ہوگیا —

۲ - فوایدالناظرین ابتدا سے مگر دوسرے اخبار سنہ ۱۸۵۸ سے مغربی علوم و فنون کی اشاعت میں سر گرم ہوگئے —

۳ - اردو کی غزلیں کبھی کبھی ہر اخبار میں شایع ہوا کرتیں اور شعرا اخبار میں اپنے کلام کی اشاعت پر ناز کرتے —

۴ - اب تک اردو اخباروں میں اشتہاروں کا وجود نہ تھا - اخبار یا مطبع والے جو کتاب نکالتے اس کا اشتہار چھپتا - جیسے گوہ نور کی جلتری-

۵ - اس عہد کی زبان اگرچہ باغ و بہار کی زبان نہ تھی لیکن قدامت کے نقش سے معرا نہ تھی - فارسی انشا کا تتبع جاری تھا مثلاً صفت اور مضاف کو موصوف اور مضاف الیہ سے پہلے لانا - یہ جوڑ کبھی دونوں فارسی ہوتے اور کبھی ایک فارسی اور ایک اردو یعنی ہندی - یہی مسلوک واو عطف کے ساتھہ ہوتا - علم معانی کی کتابیں جو اس زمانے کے بہت پہلے سے متداول تھیں ان انشاپردازوں کے ذہن پر حاوی نہ تھیں - ایسی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آتیں مثلاً : راقم چٹھی - صاحب چٹھی - انتخاب ایک چٹھی کا - اجازت اندر جانے کی لی - بحکم صاحبہ بیٹھی رہی - چوں (بجاے چونکہ) - بہ حصول اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوٹ کے - چارج عہدۂ جج کا تھا - وے (وہ کی جمع) - بہ نسبت سابق صحت رکھتے ہیں - کارسپانڈنٹ (بجاے نامہ نگار) - بلا حصول پاس حاکم کے - جج و کلکٹر - وغیرہ وغیرہ —

۶ - املا کی بابت یہ باتیں نوٹ کے قابل ہیں :-

(۱) فقروں اور جملوں کو کسی قسم کے وقفوں کے نشانات سے جدا نہیں کرتے تھے - عبارت کو پیراگرافوں میں ضرور تقسیم کردیتے تھے —

(۲) الف مضموم کے بعد واو لکھنے کا رواج عام تھا جو بعد میں مدت تک جاری رہا —

(۳) ' چھوڑ کر ' اور ' چوڑہ آے ' جیسے الفاظ میں وہ 'ڑ' کی جگہ 'ڈ' لکھتے تھے —

(۴) 'مجھکو' بغیر ھاے ھوز کے 'مجکو' لکھتے اور مسٹر میں 'ٹ' کی جگہ 'ت' استعمال کرتے —

(۵) انگریزی املا کی صحت اس قدر مد نظر تھی کہ سپٹمبر اور ڈسمبر ھی لکھتے - اب کی طرح ستمبر اور دسمبر نہیں -

(۶) بمبئی میں 'م' کی جگہ 'ن' لکھتے جیسے ھم اب تک 'سلیمان اللہ' میں لکھتے ھیں —

(۷) 'جس' 'پر' 'کہہ کر' وغیرہ ملاکر لکھتے ' یہی سلوک فارسی کے لواحق و روابط سے ھوتا —

(۸) 'میں نے' کو صرف ایک 'نون' کے ساتھہ ملاکر لکھہ دیتے —

(۹) الف ممدودہ پر علامت مد ضرور ھوا کرتی لیکن ھاے ھوز کو اگر کبھی دو چشمی شکل دیتے تو اس مقام پر جہاں وہ مخلوط التلفظ نہ ھوتی - یاے معروف و مجہول کے امتیاز کا تو ذکر ھی کیا —

املا کے بارے میں زیادہ کہنا بے سود ھے کیونکہ صوبہ آگرہ اور پنجاب دونوں صوبوں میں املا کے قاعدے بہت بعد میں مدون ھوے - لاھور کے گورنمنٹ بک ڈپو کے ابتدائی زمانے کی کتابوں میں املا کا طریق خاص مدت تک وھی رھا جو قدیم سے چلا آرھا تھا - انشا میں آج کل کی طرح عربیت حاوی نہ تھی بلکہ فارسی کی آمیزش زیادہ تھی لیکن ایسی کہ اس کو گلستاں بوستاں پڑھا ھوا اچھی طرح سمجھہ سکتا تھا - مدعا نگاری اس زمانے کی صحافت کی بہر حال تعریف کے قابل ھے - وہ لوگ اپنا مطلب خوبی سے ادا کر سکتے تھے —

سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک

اب ھم اس زمانے میں پہنچتے ھیں جو اردو صحافت کی ترقی

جوبلی کا زمانہ ہے یعنی اس کی عمر کم و بیش پچیس برس کی ہو چکی ہے - اب سنہ ۱۸۵۸ کی افراتفری اور بے اطمینانی دور ہو چکی ہے - انگریزی حکومت ملکہ وکٹوریہ کے زیر نگیں مستقل اور برقرار ہو چکی ہے - اب حاکم و محکوم میں وہ مغایرانہ انداز اور معاندانہ ادا نہیں رہی جو سنہ ۵۷ سے پہلے تھی —

کوہ نور

۳ جنوری سنہ ۱۸۹۰ ع کے پرچہ میں ایک قطعہ تاریخ کا عنوان نہایت دلچسپ ہے لکھتے ہیں :-

" قطعات تاریخ شوالہ و سرائے و تالاب تعمیر کردہ لالہ رتن چند 'ریش دراز واقعہ بیرون شاہ عالم دروازہ شہر لاہور ' —

یہ چیزیں اب بھی موجود ہیں اور ان کے موجودہ قابض دیوان کشن کشور صاحب ' ڈاڑھیوالا لکھے جاتے ہیں جس طرح ان کے مورث اعلیٰ دیوان کرم چند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار سے ' ڈاڑھیوالا ' کے لقب سے ممتاز تھے - لیکن کوہ نور کے صاحب تحریر نے اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا —

یہی اشاعت صفحہ ۱۴ پر خبر دیتی ہے :-

" کمر شل گزٹ الہ آباد سے دریافت ہوا کہ دفتر صدر دیوانی آگرہ کی نسبت حکم ہوا ہے کہ ۱۵ جنوری سنہ ۶۰ کو الہ آباد میں جاری ہو مدت ہوئی تین سپاہی رجمنٹ ۵۳ شاہی کے بیچ علت نکالنے چار ہزار روپیہ کے خزانہ الہ آباد سے گرفتار ہوئے تھے ان کا مقدمہ سوپریم کورٹ کلکتہ میں پیش تھا اب حکم آیا ہے کہ ایک سپاہی ۲ برس اور دو سپاہی چار چار برس کو قید کئے جائیں " —

۱۰ جنوری کا اخبار خبر دیتا ہے :-

" تیاری جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے استقبال جناب نواب معلی القاب نامور کمپنی گورنر جنرل کے واسطے ہو رہی ہے یہاں تک تشریف لے جانے کی خبر ہے ' شعلہ مار ' باغ کی آراستگی خوب ہو رہی ہے ' —

۲۱ جنوری کا پرچہ ایک عجیب خبر دیتا ہے :-

" اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ صاحب والا شان چیف کمشنر اودھ کو علاقہ اودھ میں رواج زبان انگریزی کا عموماً بہت جلد منظور ہے ' اور باجراء حکم محکم تحصیلداران و سر شتہ داران کو مجبور کیا ہے کہ در صورت نہ دینے امتحان زبان انگریزی کے شروع سنہ ۱۸۶۱ سے وے لوگ بر خاست ہو جائیں گے ... ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ عنقریب یہ حکم پنجاب بھی میں بھی نافذ ہونے والا ہے اور غالب ہے کہ یہاں نیچے کے عہدہ داروں کو تاکید سیکھنے تحریر زبان اردو کی حروف انگریزی میں ہوگی اور عرایض مستغیثان بھی اسی تحریر میں داخل ہوا کریں گی " —

۲۵ فروری سنہ ۶۰ کے پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کراچی سے سکندریہ تک بحری تار برقی کا اجرا ہوا —

۳ مارچ کا اخبار مظہر ہے کہ :-

" دہلی ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تیاری سڑک آہنی کی دہلی سے آگرہ کو بڑی دھوم دھام سے ہو رہی ہے - اگلے سال گاڑی چل نکلے گی کہتے ہیں کہ اس کے کارخانہ کے مکانات کی عمارت دریاے جمن سے اس طرف شہر کے اندر

ٹھہری ہے اور سنا ہے کہ دریبہ کلاں واقعہ چاندنی چوک کی عمارات قدیم مسمار کی جاوینگی اور وہاں عمارات کارخانہ ریلوے تیار ہوں گی چنانچہ پیمود بھی ہوگئی ہے اور حکم انہدام مکانات مذکورین کا سنایا گیا ہے مگر لوگوں نے عرضی اپنی بہ حضور جناب گورنر جنرل صاحب بہادر ارسال کی ہے" —

معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں پہلا سرکاری مدرسہ اس مہینے (مارچ سنہ ۶۰) میں جاری ہوا :-

۷ اپریل کا پرچہ ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے - صفحہ ۲۸۴ میں درج ہے :-

"تتمہ تقریر مسٹر جیمس ولسن مشہور مالی گورنمنٹ ہند درخصوص تقرر ٹکس ہائے جدید در انجمن قانونی منعقدہ ۱۸ فروری سنہ ۶۰ روزشنبہ اکنوں پوشیدہ نماند کہ این ہمہ اسباب و وجوہ اختلاف حساب ہارا کہ بمعرض تبیان درآوردم فرض من ازاں چنیں نمی باشد کہ ہیچگونہ معذرتے درخصوص آں نوع طریقہ ترقیم ... "

اصل اخبار کے دیکھنے سے بھی پایا جاتا ہے کہ اصل تقریر فارسی ہی میں ہوئی تھی - اگر سنہ ۱۸۶۰ع میں گورنمنٹ انڈیا کا ایک کابینہ کا وزیر فارسی زبان سے رجوع لاتا ہے تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں - کابینہ یعنی کیبنیٹ کے منسٹروں کا نرالا پن اب بھی وہی ہے جو ساٹھ ستر برس پہلے تھا چنانچہ ۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ کو رائٹر لندن سے تار دیتا ہے کہ رائٹ آنریبل مسٹر والٹر الیٹ منسٹر ایگریکلچر نے اپیوڈیپی کی برٹش ایسوسی ایشن میں ریلیگیٹی یعنی نظریہ

اضافہ پر نظم میں تقریر کی۔ فلسفہ اور سائنس کے مسئلوں پر نظم میں بحث کرنا ایسے ہی بڑے آدمیوں کا کام ہے جس طرح کہ مالی امور پر فارسی میں تقریر کرنا —

یہ پرچہ آگے چل کر صفحہ ۲/۸ پر خبر دیتا ہے :-

"بمبئی میں لڑکیوں کی تعلیم بھی بہت ترقی پر ہے - خاص قوم پارسیوں میں لڑکیوں کے چار مکتب ہیں - اور قریب چار سو لڑکیوں کے ان میں تعلیم پاتی ہیں۔ سوائے پارسیوں کے دو مرہٹوں کے اور دو گجراتیوں کے اسکول اور ہیں اور ان میں ۳۵۱ لڑکیاں پڑھتی ہیں " —

سوشل اصلاح کے حامیوں کے لئے یہ خبر دلچسپ ثابت ہوگی :-

"معلوم ہوا کہ شادی بیوگان ہنود کا پونا میں بڑا چرچا پھیل رہا ہے اور بہت لوگ اس بات کے رواج دینے پر مستعد ہیں برہمنوں کے کئی افضل خاندانوں میں کئی بیوہ عورتوں کی شادی کی گفتگو ہو رہی ہے اور تین سو برہمنوں اور پنڈتوں کے قریب اس رائے پر متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ پنرواہ مناسب اور دھرم شاستر کے موافق ہے یہ رواج کئی برس سے جاری ہو گیا ہے " —

ایک اور خبر یہ ہے کہ :-

" ۲۵ اپریل کو شام کے وقت جناب مہاراجہ صاحب بہادر والی پٹیالہ لاہور سے بہ سبیل ڈاک سیج گاڑی لالہ کدارناتھ معہ چند اکابر ریاست پٹیالہ کو تشریف لے گئے " —

۵ مئی سنہ ۹۰ ع کی اشاعت میں دہلی کی یہ خوش خبری درج ہے :-

"سنتے ہیں کہ جناب نائب السلطنت امیر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر نے براہ الطاف خسروانہ ارشاد کیا ہے کہ جامع مسجد دہلی مسلمانان دہلی کو واپس مل جاے" —

یہی اشاعت مدرسہ سرکاری لاہور کی بابت چند دلچسپ امور کا ذکر کرتی ہے - اس مدرسہ کے کھلنے کا ذکر پہلے آچکا ہے - لکھا ہے :-

مسٹر مہدی صاحب بریلی سے طلب ہوکر مدرس مقرر ہوے ... ایک مدرس فارسی بھی مقرر ہوگا - ایک پنڈت شاستری بھی مقرر ہوگا - درجہ اول میں فرزندان راجگان و رئیسان وسرداران کمرہ علاحدہ میں پڑھاے جاتے ہیں - درجہ دوم میں اکثر فرزندان عہدیداران سرکاری و مہاجنان وغیرہ عزت داران کمرہ جداگانہ میں تعلیم پاتے ہیں - درجہ سیوم میں عام بھلے مانسوں کے لڑکے درس پاتے ہیں - طلبا درجہ اول کی فیس تین روپے ماہوار ہے ایک روپیہ تک باقیوں سے ۸ آنے حق التعلیم - مکان تعلیم حویلی راجہ دھیان سنگھہ صاحب سر گہاسی تجویز ہوئی ہے" —

کہتے ہیں انسانوں کی طرح مکانوں کی بھی قسمت ہوتی ہے - یہ حویلی راجہ دھیان سنگھہ کی ضرور ایسی ساعت میں بنی ہوگی کہ اکثر و بیشتر تعلیمی اور ادبی کاموں کے لئے استعمال میں آیا کرے - یہ پنجاب کا پہلا سرکاری سکول اس مکان میں قایم ہوا - اور لاہور کا گورنمنٹ کالج بھی اسی مکان میں شروع ہوا - اخبار عام کا دفتر اردو مطبع بھی برسوں یہاں رہا - ڈاکٹر اینی بسنت جب تھیو سوفیکل میں شامل ہوکر پہلے پہل لاہور آئیں تو ان کے لکچر اسی مکان میں ہوے - سوامی وویکانند کی فلسفیانہ آواز بھی اسی مکان میں گونجی اوراب دیال سنگھہ ہائی سکول ابتدا سے

اسی کے زیر سایہ چل رہا ہے - اب اس ابتدائی مدرسہ کا حال سنیے درجہ اول میں جس کا ذکر آگے آیا انتیس طلبا داخل ہوے - درجہ دویم میں ۲۰ مئی سنہ ۶۰ کو اٹھارہ سے سینتالیس ہو گئے - درجہ سوم میں صرف چھہ لڑکے پڑھتے تو - لڑکوں سے داخلہ کے وقت 'زر شگون' لیا جاتا تھا - چنانچہ اول دن یعنی ۱۲ مارچ کو تین سو تیس روپیہ شگون کی مد میں رئیسوں نے شعبہ میں وصول ہوا - لیکن بعد میں اس 'زر شگون' کی رقم معین ہو گئی - یعنی صنف اول کے لئے چار روپے سے سات روپے تک صنف دوم کے لئے دو روپے سے چار روپے تک —

اٹک کے کنارے پل بنانے کے لئے سخت دقت پیش کرتے تھے اس لئے ابتدا میں یہ تجویز قرار پائی تھی کہ اٹک کا پل زمین دوز بنایا جاے ' یعنی اس کے نیچے سرنگ نکالی جاے - ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۶۲ کا کوہ نور اس کی بابت یہ لکھتا ہے :—

"تیاری پل زمین دوز اٹک اب بدستور دونوں جانب میں جاری ہے - سابق جو پانی آ گیا تھا اب سب خشک ہو گیا ہے - ایک صاحب لکھتے ہیں کہ کل طول اس پل کا اس پار سے اُس پار تک پندرہ سو فٹ ہے جس میں سے ۳۸۰ فٹ ایک جانب سے اور ۲۹۸ فٹ دوسری جانب سے کھد چکا ہے :-

۱۸ جنوری سنہ ۱۸۶۲ ع کا اخبار لاہور میں پہلے پہل آنریری مجسٹریٹوں کی خبر دیتا ہے جو کئی وجوہ سے نہایت دلچسپ ہے ملاحظہ ہو :-

"سوموار کے دن ۱۳ جنوری کو خاص کوتوالی شہر لاہور میں حسب منظوری جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دام اقبالہ ایک جلسہ شایان تفویض اختیارات آنریری مجسٹریٹ ہوا" -

" ھدایت آنریری مجسٹریٹ لاہور —

" اجلاس کوتوالی میں ہو - آپس کے مشورہ سے باریاں باندھ لیں گے"

"دفعہ ۵ - ان کے پاس ایک منشی مشاہرہ دار تیس روپے کا بمنظوری صاحب کمشنر بہادر مقرر کیا جائے گا "—

دفعہ ۶ کسی طرح مثل فارسی و اردو میں مرتب نہ کی جائے گی کل تحقیقات زبانی ہوگی - مستغیث خود حاضر ہو کے زبانی اکتفانہ کریں گے - عرضی دینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے "—

" دفعہ ۷ - تعمیل زبانی احکام آنریری مجسٹریٹوں کی ذمہ سپرنٹنڈنٹ پولیس شہر کے ہے - اور ایک سپاہی خواندہ پولیس کا آنریری مجسٹریٹوں کے پاس واسطے تحریر نام گواہان ... حاضر رہے گا —

اختیارات پچاس روپیہ جرمانہ - تین ماہ قید یہ عدالت بھی خاصی نوشیروانی ہوگی - بیکنسفیلڈ نے ایک ناول میں کاغذ قلم دوات کو بہت دکھ ہے - اس نے تو صرف ایک دلی خواہش کا اظہار کیا تھا - یہاں عملاً ع - کاغذ بدریدند و قلم بشکستند - کا مضمون ہے —

اسی اشاعت میں " جناب معلے القاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب " معہ " جناب ڈیوس صاحب سکرٹری اعظم لاہور " کی " بہ سبیل سبج گاری کلکتہ کی روانگی کی خبر درج ہے اور لکھا ہے یقین ہے کہ عرصہ ایک مہینے تک واپس آجائیں گے - اس سے اگلی اشاعت میں درج ہے " خبر معتبر ہے کہ ۲۳ یا ۲۴ ماہ حال تک نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب رونق افروز کلکتہ ہو جائیں گے " - صاحب موصوف ۳۰ جنوری کو کلکتہ سے واپس روانہ ہوکر ۹ کو لاہور پہنچے گویا اس زمانے میں لاہور سے کلکتہ

کا سفر دس یا گیارہ دن میں طے ہوتا تھا - اس سے عام لوگوں کی مدت سفر کا اندازہ ہو سکتا ہے - ان کو ضرور لفٹنٹ گورنر سے زیادہ ہی مدت سفر میں گزرتی ہوگی - اب یہ زمانہ ہے کہ پبلک ریلوں کی سست رفتاری کی شکایت کرتی ہے اور اگر کوئی ٹرین دس پانچ منٹ لیٹ ہو جاے تو مسافروں کو نا گوار گزرتا ہے -

۸ فروری کے اخبار میں ایک نامہ نگار ڈیرہ اسمعیل خاں سے فارسی میں ایک خبر لکھتا ہے - یہی اخبار معتبر ہے :-

" نیلام پشمینہ جو لندن میں ہر ششماہی کو ہوتا ہے اب کی دفعہ ۹ تاریخ دسمبر سے ۱۲ تاریخ ماہ مذکور تک ہوا اشتہارات نیلام تجاران شال امرتسر کے پاس آ گئے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ اب کے نیلام میں مال پشمینہ تحفہ و اعلی کشمیری و پنجابی برابر قیمت کو فروخت ہوا تجاروں کو نفع ہوا نہ نقصان اور مال پشمینہ جلال پوری و لدھیانہ و نور پوری وغیرہ جس میں اون کرمانی دروتی مستعمل ہوتی ہے نہایت ناپسند ہوا اور قیمت بھی کم وصول ہوئی ... ہم شالبافوں کو بہ تاکید تمام آگاہ کرتے ہیں کہ اگر وے اس کھوٹ سے باز نہ آویں گے اور پشمینہ اصیل میں خراب اون ملا دیں گے تو پشمینہ کی بکری ممالک یورپ میں ہرگز نہ ہوا کرے گی " -

" لاہور میں حکام کی مہربانی سے سب طرح خیریت ہے " - یہ لکھہ کر پھر باغ شعلہ مار کا ذکر آتا ہے -

لاہور میں ابھی تک ریل تو نہیں آئی لیکن ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۶۲ کو اس کا کچھہ سامان لاہور میں آتا ہے - اس کے استقبال کی کیفیت

کوہنور اس طرح لکھتا ہے —

" ۱۲ تاریخ کو سامان ریل بڑے تجمل اور شان سے یہاں پہنچ گیا جمله صاحبان عالیشان اور میم صاحبان اور رئوسان لاہور اس کے لانے کے واسطے تین کوس کے فاصله پر تشریف لے گئے تھے ہزارہا باشندگان شہر کا ہجوم تھا - سپاہ گورہ و پولس کی چاروں طرف ریل کی حفاظت تھی - کئی سو بیل بامداد پانچ ہاتھیوں کے اوس کو نہایت آہستگی سے کھینچتے لاتے تھے قریب شام سب سامان بیرون دروازہ دہلی متصل کارخانه ریلوے آکر ٹھہرا - اب ہر روز وہاں میله لگا رہتا ہے - اسی دن رات کو صاحبان عالیشان نے بتقریب ورود ریل جلسه عیش و طرب کا ترتیب فرماکر باہم شغل اکل و شرب فرمایا - خبر ہے ۳ مارچ کو لاہور سے امرتسر تک ریلوے جاری ہو جاوے گی "-

(یہی اخبار ہندوستان میں " آہنی سڑکوں " کی کیفیت یوں لکھتا ہے :-

" آخر سنه ۱۸۹۱ع میں منجمله کل ۲۹۰۳ میل کے جو که تمام ہندوستان میں زیر تیاری ہیں ۱۳۶۰ میل پر ریل جاری ہو گئی مشرقی ریل [ایسٹ انڈین ریلوے سے مراد ہے] چند روز میں چار سو میل تا مقام ملکھیر رواں ہوگی اور دریاے سون پر عالیشان پل جون تک تیار ہو جاوے گا ایک سڑک آہنی دہلی سے آگرہ تک بنےگی اور اس کی پیمایش ہو چکی ہے مہتمم ٹریفک اف انڈیا کو امید ہے که سنه ۱۸۹۳ کے موسم برسات تک کلکته سے تا دہلی برابر سلسله آمد و رفت کا بسواری ریل جاری ہوگا - مدراس میں ناگپور کی لین بھی اختتام کو پہنچی لیکن

بالفعل جاری نہیں ہے اور کلکتہ سے جانب جنوب و شرق والی
ریل ۲۹ میل مقام متلا تک تمام ہو چکی ہے صرف ایک پل
باقی ہے وہ بھی چند ہفتوں میں کھل جائے گی اور ہوڑا میں
کارخانہ تجارت کی ترقی پکڑنے سے گورنمنٹ کی تجویز یہ ہے کہ
ایک پل بنا دیا جاوے [ہگلی پر] کہ وہاں سے مال کی آمد و رفت
کلکتہ میں ہونے لگے اس پل کا صرف پندرہ لاکھ روپیہ ہوگا
اور بطرز عجیب ہینگا " —

آخر بہ قول کوہ نور مورخہ ۸ مارچ سنہ ۱۸۶۲ء "یکم تاریخ مارچ
سنیچر کے دن لاہور سے امرتسر تک ریل بڑی دھوم دھام سے جاری ہوئی
یہ وہ دن مبارک تھا کہ تواریخ پنجاب میں ہمیشہ کے لئے یادگار رہے
گا" - قطعہ تاریخ اجراء ریل از لاہور تا امرتسر من تصنیف دیوان امر
ناتھ صاحب رئیس لاہور" بھی لطف سے خالی نہیں - فرمایا ہے :-

ریل گردید رواں از لاہور سوے امرتسر و دلہا شد شاد
مغز نمرود ز دودش ہمہ خوں گلخلش آتش جان شداد
بروش تیز چو عقل صانع بدوش تیز چو فکر استاد
صرف گردید بسے آھن و سنگ رہ متیں گشت چو سطح فولاد
شہ انگلینڈ طلسمے عجبے کرد در مملکت خویش ایجاد
نقش بر بال پری بست چنیں
می پرد تخت سلیماں برباد
سنہ ۱۸۶۲ع

(" لاہور سے امرتسر تک درجۂ اول کی گاڑی کا کرایہ تین روپے' اور
درجۂ دویم کا دو روپے' اور درجۂ سوم کا ۳ آنے ہوگا - ایک گھنٹہ

چالیس منٹ میں یہ ۳۲ میل کا فاصلہ طے ہوگا ") —

اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۹۰ ع کو خزانجات سرکاری ممالک ہند میں ۱۷ کروڑ ۷ لاکھہ ۳۸ ہزار ایک سو چودہ روپیہ موجود تھا بمقابلہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ ع کے جب کہ یہ میزان ۱۴ کروڑ ۷۳ لاکھہ ۵۵ ہزار چار سو سینتیس تھی —

بریلی کے ایک نئے مطبع 'جلوہ ظہور' کا اشتہار جو ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۹۲ ع کے کوہ نور میں مالک مطبع مذکور نے جاری کیا قابل دید ہے - لکھتے ہیں :-

" رائے جہاں آرائے صاحبان دانش اور دانش پسندان ہمت بلند پر مخفی نہ ہے کہ خالق کائنات اور آفرینندہ موجودات نے انتظام سلسلہ جہان و جہانیاں کا ساتھہ علم اور عقل کے وابستہ فرمایا ہے ... " —

۳ مئی سنہ ۱۸۹۲ کے اخبار میں لوکل اس طرح لکھتے ہیں :-

" لاہور میں سب طرح خیریت ہے ہر چند مئی شروع ہوگیا چنداں گرمی نہیں ہے بلکہ رات کو کبھی کبھی ایسی سردی پڑتی ہے کہ رضائی کی حاجت ہوتی ہے " —

یہاں موسم کا اب بھی یہی حال ہے جو اب سے بہتر برس پہلے تھا -

پہلے قانون ایسا تھا کہ جس مقدمہ میں کوئی یوروپین ایک فریق ہو وہ صرف کلکتہ ہی میں سماعت ہوتا تھا - خود یوروپین لوگوں کو اس میں بڑی زحمت ہوتی تھی ذرا ذرا سے معاملے کے لئے ہندوستان بھر کے کونے کونے سے کلکتہ جانا پڑتا تھا - اس لئے انہیں نے واویلا کرکے اس قانون کو ترمیم کرایا - ابھی یہ ترمیم نہیں ہوئی تھی کہ ۵ جولائی سنہ ۱۸۹۲ کے کوہ نور نے یہ خبر شایع کی :-

" پھانسی- اسی اخبار [دھلی گزٹ] میں لکھا دیکھا کہ کلکتہ میں ۲۳ تاریخ جون کو صبح کیوقت مسٹر 'رڈ' نام ایک صاحب پھانسی دئے گئے جنھوں نے راولپنڈی میں ایک هندوستانی کو بندوق سے هلاک کیا تھا اور مقدمہ ان کا حسب آئین سرکار تفویض سوپریم کورٹ کلکتہ هوا تھا - قریب تین هزار صاحبان و پانسو رئیسان کلکتہ نے جناب لارڈ الجن صاحب بہادر گورنر جنرل کی خدمت والا میں التجا کی تھی کہ ازراہ ترحم رڈ صاحب ممدوح کی نسبت عوض سزا قصاص حکم حبس دوام بعبور دریاء شور هو جاے لیکن جناب معتشم الیہ نے اس کو نا منظور کیا " ـــ

لاهور کے لارنس گارڈن کی تاریخ جسے کوہ نور " تاریخ یادگار باغ سر جان لارنس صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر سابق پنجاب " کہتا ہے جو " محمد مردان علی خاں صاحب المتخلص بہ رعنا کی تصنیف سے ہے قابل ملاحظہ ہے - لکھتے هیں :—

لفٹننٹ پنجاب تھے سر جان لارنس | تھے نیکنام بسکہ وہ صاحب دل و دماغ
لاهور میں یہ اونکا بنا یادگار باغ | باغ جہاں میں نام رهے تاکہ تابہ حشر
روشن سن مسیح هوا صورت چراغ | 'رعنا نے' نام باغ سے ڈیوڑے لئے عدد

۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ لنکا شایر (جسےکوہ نور لین 'کشائر' لکھتا ہے) پر اس سال کوئی مصیبت آئی تھی کہ وهاں کے باشندوں کی امداد کے لئے هندوستان میں جگہ جگہ چندے هوے چنانچہ دهلی میں چار سواکھانوے اور امبالہ میں پیک الن سوداگر کی کوشش سے "معتنا جان لین کشایر" کی امداد کے لئے ایک هزار تین سو سولہ روپیہ چندہ هوا -

اسی اخبار سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ خطوط وغیرہ پر ٹکٹ اسٹامپ نصف آنہ لگانے کا دستور سنہ ۱۸۵۷ میں جاری ہوا تھا - ۱۱ اکتوبر کی اشاعت دہلی میں تعلیم نسوان کی ترقی پر اطمینان کی روشنی ڈالتی ہے - جزیرۂ سراندیپ میں "آمد سرکار" کی نوکری کا ذکر کرتے ہوے اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"یہ خوبی حسن انتظام سرکار کی ہے ورنہ ہندوستانی ریاستوں میں اگر اس قدر بچت ہوا کرے تو یہ ریاستیں مالا مال ہو جائیں اور عمدہ طریق پر روپیہ صرف ہونے کے واسطے سرمایہ کثیر جمع ہو مگر یہ بات نہ اہلکار ریاستوں کے چاہتے ہیں اور نہ خود رئیس پرواہ کرتے ہیں اور رعایا بھی چنداں خوش نہیں رہتی اکثر جگہ لوگ تنگ ہو کر انگریزی عملداری کی تمنا رکھتے ہیں اور اپنی سرکار کے شاکی ہیں" -

(یکم نومبر سنہ ۱۸۶۲ع کا اخبار راوی ہے کہ :-

"لاہور کرانیکل سے معلوم ہوا کہ لاہور میں جو یادگار سرجان لارنس صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر اول پنجاب کے واسطے ایک مکان 'جان لارنس ہال' زر چندہ سے تعمیر ہو رہا ہے اس کی امداد کے واسطے راجہ صاحب بہادر فرید کوٹ نے پانسو روپیہ عطا فرمایا ہے" -)

"لین کشایر" کے "محتاجوں" کی امداد کے لئے ہندوستان میں جگہہ جگہہ سے چندوں کی خبریں اس مہینے میں چھپتی رہیں :-

۲۹ نومبر کا اخبار یہ لوکل خبر دیتا ہے :-

" فرش کنکر دہلی دروازہ سے کوتوالی تک تیار ہوگیا ہے اب

وہاں سے ہورا مندی تک شروع ہوا ہے پھر بہاٹی دروازہ تک جاے گا شہر کے گردا گرد نہر بھی خوب سرگرمی سے جاری ہے"۔

" عماد اسکول مشن کو اب خوب رونق ہے قریب ایک سو طالب علموں کے تعلیم پاتے ہیں اور کمال خوشی کی بات ہے کہ ابتدائی مئی سنہ حال سے ۲۵ ماہوار کی امداد کا حکم اس سکول کے واسطے لفٹنٹ گورنر نے بھی منظور فرمایا ہے - ۲۱ نومبر کو دو گاڑی ریل ملتان سے لاہور میں پہنچ گئی "-

۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ کو یہ خبر دیتا ہے :-

" شاہ دہلی - اخبار لاہور کرانیکل میں از روے تحریر معتبر دیکھا کہ ۷ تاریخ ماہ گذشتہ کو رنگون ملک برھما میں مغلوں کا آخر بادشاہ ' ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی ' اس دار ناپایدار سے رحلت کرگیا اب اس خبر میں کچھہ شک نہیں"۔

(ان دو برسوں یعنی سنہ ۱۸۶۰ع اور سنہ ۱۸۶۲ ع کی کوہ نور کی جلدوں میں حسب ذیل معاصرین کے حوالہ آے ہیں :-

۱ لاہور کرانیکل - ۲ دہلی گزٹ - ۳ انگلشمین - ۴ کمرشل گزٹ الہ آباد - ۵ فینکس - ۶ ہرکارہ - ۷ لکھنؤ ہرلڈ - ۸ اخبار اودہ گزٹ - ۹ اخبار بمبئی گزٹ - ۱۰ اخبار سندھن - ۱۱ نورالابصار آگرہ - ۱۲ منید خلایق - ۱۳ بمبئی ٹایمس - ۱۴ مجمع البحرین لدھیانہ - ۱۵ اودہ اخبار - ۱۶ شعلہ طور - ۱۷ فرینڈ اف انڈیا - ۱۸ اخبار انجمن ہند لکھنو - ۱۹ دہلی جرنل - ۲۰ پونا ابزرور) -

کشف الاخبار

اس اخبار کے نام کا تکملہ تھا " کاشف الاسرار " - بمبئی سے باہتمام منشی امانعلی لکھنوی نکلتا تھا - ایک عجیب بات جو اب

تک اور کسی اخبار میں نہیں دیکھی وہ اس میں یہ تھی کہ اس کا اشتہار نظم میں اول صفحہ پر ہوتا۔ سارا صفحہ اسی سے پر ہوتا تھا۔ ملاحظہ ۱۶ مئی سنہ ۱۸۹۱ع کی جلد سے :-

" گرچہ پہلے جب بحکم خبر حمد خالق و نعت پیغمبر
تب بہت دل مرا بحال ہوا مدح اخبار کا خیال ہوا
نام اخبار اب کروں اظہار کشف الاخبار کاشف الاسرار
... ...
ہے یہ امید اہل دولت سے دستگیری کریں عنایت سے
... ...

شرح قیمت ملاحظہ ہو :-

سوا سکہ یہ ماہوار جو لے وہ سوا تیرہ سال پیشگی دے
... ...
بندہ کو اخبار چھاپ لیتا ہوں پنجشنبہ کو بانٹ دیتا ہوں

چند مہینوں کے بعد ان بیالیس شعروں کی جگہہ صرف چار مصرع رہ گئے۔ خبر اقلیم چین ملاحظہ ہو جو اشاعت مذکورہ سے نقل کی جاتی ہے۔ عبارت آرائی فسانۂ عجائب کو مات کرتی ہے :-

" مخبروں کا اظہار ہے کہ ایک تازہ آشکار ہے کہ بالفعل دیار چین سے آگبوٹ آیا اس طرح کی خبر لایا کہ اب اُدھر کا ملکی کاروبار بسہولیت و آرام تمام جاری ہے ایام فساد کا گزر گیا چین و امنیت کی باری ہے۔ فغفور چین اپنی دارالسلطنت کی طرف مراجعت فرما ہوا ......"

(ایک اور خبر یہ ہے :-

"خبر - صاحب انگلشمین ظاہر کرتے ہیں حال آمدنی پٹش سے ہر ایک کو ماہر کرتے ہیں کہ شہر کلکتہ کے محکمہ سلطانی شیشن کورٹ میں جو کارپرداز قاعدۂ دین محمدی کے واقف کار اور مذہب ہنود کے پنڈت شاستر داں ملازم سرکار ہیں ان کو موقوف کریں گے ' —

۳ اپریل سنہ ۱۸۶۲ ع کا پرچہ نئے وایسرائے کے تقرر کی خبر اس طرح لکھتا ہے : —

" خبر تشریف آوری گورنر جنرل جدید منشیاں شہریں بیان فرخندہ تحریر و دبیران فال زباں ہمایوں تقریر اس خبر بشاشت اثر دلپذیر کو یوں تسطیر کرتے ہیں کہ ملک ہندوستان گلشن نشاں کے نئے گورنر جنرل " —

آج کل کے اخباروں کے اڈیٹروں اور پڑھنے والوں کو ان پرانے بزرگوں کی فرصتوں پر ضرور رشک آتا ہوگا —

اخبار عالم یہ اخبار میرٹھ سے نکلتا تھا - منشی وجاہت علی خاں اس کے مہتمم تھے اس زمانے میں مہتمم اڈیٹر کو کہا کرتے تھے اور اکثر وہی مالک بھی ہوا کرتا تھا - اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع پر جلد ۵ نمبر ۱۰ درج ہے - یہ اخبار ہفتہ وار تھا اسی اشاعت میں میرٹھ کی لوکل خبریں نظم میں درج ہیں - فرماتے ہیں : —

" سردی اب کی برس ہے اتنی شدید کانپتا نکلے ہر سحر خورشید "

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ کا اخبار کار خیر کی ایک خبر اس طرح سناتا ہے : —

"کارخیر- اخبار انڈین ڈیلی نیوز میں لکھا ہے کہ مسٹر پریم چند اور رائی چند روسائی بمبئی نے سرکار گورنمنٹ کو اس بات سے خبردار کیا ہے کہ ہم چھہ لاکھ روپیہ سرکار گورنمنٹ کو بندوبست کرنے پانی سکناء سورت کے واسطے کہ ان کو بہت تکلیف ہے دیتے ہیں - عبارت کا الجھاؤ اور ضعف تالیف طبیعت کو بد مزا کرنے والا ہے" —

اگلی اشاعت میں دو کالم کا ایک مضمون "تعلیم عورات" پر ہے - جو اس طرح شروع ہوتا ہے :—

" ازروی شرع شریف و دھرم شاستر کے پڑھنا لکھنا عورتوں کا جایز ہے بلکہ مذہب اسلام میں جیسا پڑھنا لکھنا مردوں پر فرض ہے اسی قدر عورتوں کو ہے" -

اکمل الاخبار | یہ اپنے وقت کے نہایت ثقہ اخباروں میں سے تھا - دہلی سے نکلتا تھا مشہور و معروف حکیم محمود خاں اس کے مالک تھے - یکم جنوری سنہ ۱۸۶۰ ع جلد ۳ نمبر ۱ سے یہ دو اقتباس لیے جاتے ہیں جو جدید قانون ریلوے سے تعلق رکھتے ہیں - پایا جاتا ہے کہ زنانہ درجے میں مرد کے سفر کرنے کی سزا ایک سو روپیہ جرمانہ تھی - اور

" اگر کوئی افسر ریلوے جب کہ اپنی کام پر نشہ میں مخمور ہوجائے تو وہ ایک سال تک قید ہوسکتا ہے اور اس پر جرمانہ بھی ہوسکتا ہے" -

اسی اشاعت میں درج ہے :—

"قوانین جدید در باب اجرت خبر تار برقی"

" نیا طریقہ جو خبر تار برقی کے بھیجنے کے لیے مقرر ہوا ہے

ناظرین اخبار کے ملاحظہ کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اگر سو میل سے زیادہ فاصلہ پر نہ ہو - آٹھ آنے - اگر سو میل سے فاصلہ زیادہ ہو اور ۲۰۰ میل سے کم ہو - ایک روپیہ "

... ...

اسی طرح اگر ۱۵۰۰ میل سے فاصلہ زیادہ ہو مگر ۲۰۰۰ سے کم - پانچ روپیہ ماسوائے اس کے آٹھ آنے فی پیغام بطور رسوم بابت رجسٹری کتاب لیا جاوے گا اور محصلانہ چپراسی نہ لیا جاوے گا"

پایا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کا جوتا بھی مدت تک ایک اہم سیاسی مسئلے کی طور پر رہ چکا ہے - ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع کا اکمل الاخبار لکھتا ہے :-

" عرصہ چند روز کا گذرا کہ نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند نے ایک حکم معرفت گورنمنٹ ماتحت کے صاحبان جج ہائی کورٹ اضلاع ممالک بنگال اور ممالک مغربی کے پاس درباب دریافت رائے اس امر کے بھیجا تھا کہ جن ہندوستانیوں نے انگریزی وضع اور لباس کا پہننا اختیار کرلیا ہے جب وہ کچہری میں آویں اور اس جگہ فرش ہو یا نہ ہو ان کا جوتا اوتارنا مناسب ہے یا نہیں - بجواب اس کے صاحبان ہائی کورٹ نے اپنی رائے مختلف لکھی ہے اب یہ امر ہائی کورٹ مدراس سے دریافت کیا گیا ہے -

۲۸ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع کی اشاعت میں مرزا غالب کی تصویر کا اعلان ہے - یہ تصویر مرزا کی آخری تصویر ہوگی کیونکہ سنہ ۱۸۶۹ ع میں تو ان کا انتقال ہوگیا :-

" شبیہ مبارک جناب معلی القاب نجم الدولہ دبیرالملک

اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب مدظلہ العالی - ناظرین والا تمکین اور نیز شاگرداں ارادت آئین حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ درینولا حضرت ممدوح کی تصویریں فوٹوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کروای ہیں - پس جس صاحب کو شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپیہ کے ٹکٹ بلف عنایت نامہ بپتہ لالہ بہاری لال کے نام اکمل المطابع دھلی میں بھیجدیں بصیغہ بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ہو گی " -

۲۹ جولائی سنہ ۸۶۸ کا اخبار ایک واقعی دلچسپ مضمون پیش کرتا ہے - لکھا ہے :-

" غلط فہمی حاکم و محکوم کو عملداری انگریزی کے نامطبوع کرنے میں بڑا دخل ہے - حکام اوایل عمر سے عموماً ولایت میں تعلیم پاتے ہیں - وہاں کی رسم وراہ و قواعد و ضوابط و عادات اور طریقوں سے واقف ہوتے ہیں اور انہیں کو اچھا جانتے ہیں - ہندوستانیوں کی عادات اور اون کے عقاید سے اون کو بخوبی علم نہیں ہوتا اون کی ساری کارروائی انہیں اصول اور خیالات پر مبنی ہوتی ہے جو اونہوں نے اوایل عمر سے اپنے وطن میں کسب کئے ہوتے ہیں ... اور وہ اس امر کے خواہاں ہوتے ہیں کہ ہندوستانی بھی اونہیں اصول پر چلیں .... " -

۵ اگست سنہ ۶۸ کے اخبار میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے انتقال کے دو قطعہ تاریخ درج ہیں ایک میر مہدی 'مجروح' کا طبعزاد اور دوسرا سید امراو مرزا 'انور' کا - مگر وفات کی خبر لوکل کالم میں درج نہیں جو اسی ہفتہ میں واقع ہوئی تھی -

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۸ کا اخبار اردو کے مشہور محسن ماسٹر پیارے لال ھیڈ ماسٹر نارمل سکول دھلی کی لاھور کے سرکاری بک ڈپو میں تبدیلی کی خبر مشتہر کرتا ھے اور صاحب موصوف کے حسن لیاقت کا اعتراف کرتا ھے —

۱۸ نومبر سنہ ۱۸۶۸ ع کا اخبار خبر دیتا ھے کہ :-

" قبل ازیں جناب وایسرائے گورنر جنرل بہادر کی مہربانی سے جو یہ قرار پایا تھا کہ نو شخص نیٹو یعنی ھندوستانی طالب علم سرکاری خرچ سے تحصیل علم کے لئے ولایت بھیجے جاویں گے بموجب اس قرار داد کے گورنمنٹ بنگالہ کی طرف سے دو شخص کا بھیجا جانا ٹھہرا ھے اور اس میں جناب لفٹنٹ گورنر بنگالہ نے یہ ٹھہرایا ھے ... "

۲۰ جنوری سنہ ۱۸۶۹ کی اشاعت میں ' سرکاری اخبار ' کے عنوان کے تحت لکھا ھے :-

" اس اخبار کے اھتمام میں جناب ڈایرکٹر صاحب بہادر پنجاب کی توجہ خاص ھوئی ھے اور صاحب ممدوح نے جناب ماسٹر پیارے لال صاحب اور مولوی محمد حسین صاحب کے اھتمام سے جاری کیا ھے خاص اسی کام کے واسطے ماسٹر صاحب موصوف کو بترقی مدارج دلی سے لاھور بلایا ھے ماسٹر صاحب کی لیاقت علمی اظھر من الشمس ھے مولوی صاحب کی بھی شہرت فارسی و اردو میں ابین من الامس ھے ... "

یہ اخبار غالباً ' اتالیق پنجاب ' ھے - مگر وہ رسالہ تھا —

۱۷ فروری سنہ ۱۸۶۹ کا اکمل الاخبار مرزا غالب کی رحلت کی

خبر شایع کرتا ہے یہ ایک مراسلہ میر مہدی مجروح کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا انتقال "۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ع مطابق ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ روز دو شنبہ کو دو پہر ڈھلے" ہوا۔ میر مجروح کے قطعہ تاریخ کے ساتھ یہ ماتم اور رنج و غم کا مقالہ ختم ہوتا ہے۔

کل مرقد استاد پہ افراط الم میں   ہاتف نے جو بیٹھے ہوے دیکھا مجھے غمناک
بولا ہے اگر فکر میں تاریخ کی مجروح   کہدے نہ بہی گنج معانی ہے تہ خاک

اس کے بعد مہینوں تک مرزا کے شاگردوں اور مداحوں کے قطعات تاریخ نکلتے رہے جن میں منشی ہرگوپال 'تفتہ' مرزا قربان علی بیگ 'سالک' سجاد مرزا سجاد۔ یوسف علی خاں عزیز۔ ماسٹر وزیر سنگھہ۔ مولوی شمس الدین شمس۔ منشی جواہر سنگھہ جوہر۔ نواب امین الدین احمد۔ خواجہ حالی منشی بہاری لال مشتاق۔ نساخ۔ مولوی امو جان 'ولی' نواب مصطفی خاں شیفتہ وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ میر مہدی مجروح کا ترکیب باد مرثیہ غالب بہی اسی سلسلے میں شایع ہوا ہے۔ اخبار نے نوٹ کیا کہ مادہ تاریخ میں اکثر شاعروں کو 'آہ غالب بہ مرد' میں توارد ہوا ــــ

۲۸ جولائی سنہ ۱۸۶۹ ع کے اخبار میں انکم ٹیکس پر ایک مضمون ہے۔ لکھتے ہیں :ــــ

" ۳۱ مئی کے اجلاس میں کلکتہ کی برٹش انڈین اسوسی ایشن نے انکم ٹیکس کی نسبت یا اس کے ایکسال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہنے کی نسبت اہل فرنگ کی مانند گرفت کی ہے پس ہم بہی بایں لحاظ انگریزوں کی مثل ہیں کہ جو محصول اپنے ذمہ ہم خود تجویز نہ کریں اس کو ہم اپنے ذمہ

قاہم رکھنا پسند نہیں کرتے —"

۲۰ اکتوبر سنه ۱۸۹۹ ع کے اخبار میں "فضیلت ہندوستان" کے عنوان سے ایک مضمون میں جو عبارت آرائی کی گئی ہے اس کا نمونہ لطف سے خالی نہیں۔ یہ مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے :—

"مور خاں صداقت نگار و راویاں واقف اسرار نے سمند مشکیں خامہ کو میدان بیان میں جولاں دیا ہے حال عظمت ہندوستان جنت نشان کا اس عنوان سے بیان کیا ہے ..."

۱۵ دسمبر سنه ۹۹ کا اخبار ایسٹ انڈیا ریلوے سے متعلق یہ خبر دیتا ہے کہ اس کمپنی کا "ایجنسی بورڈ" اس قسم کی گاڑیاں بنوا رہا ہے جن میں بیچ میں گلی ہوگی جس کے ایک طرف زنانہ کمرے اور دوسری طرف ان مردوں کے مردانہ کمرے ہوں گے جن کی عورتیں زنانہ کمرے میں سفر کر رہی ہوں۔ اخبار اس نئے انتظام کو نہایت پسند کرتا ہے —

تبصرہ

عام کیفیت اس قرن کے اواخر میں سنه ۵۷-۵۸ کی افراتفری کے بالتہات اور ملکی پریس کی پریشانی دور ہونے لگی۔ اور اخبار ملکی معاملوں میں دبی زبان سے رائے زنی کرنے لگے۔ وایسرائے اب امیر کبیر وغیرہ وغیرہ سے صرف جناب وایسرائے بہادر رہ گئے انگریزوں کے لئے صاحبان عالیشان مقرر ہوگیا —

انشا اور اسلوب انشا میں کوئی ترقی نہیں۔ اسلوب وہی فارسی کی بھدی نقل رہا۔ بھونڈی قدامت پرستی کی مثالیں بھی کم نہیں۔ قلعہ دہلی کے سراج الاخبار کی طرح جو خوش دامن چھوڑ کر

ساہو زوجہ لکھا کرتا تھا گویا لوگوں نے 'ڈاڑھی والہ' کو الٹ کر کے جو ایک لقب تھا 'ریش دراز' اس کا ترجمہ گھڑ کر فارسی کی ٹانگ توڑی۔ اعلام کو بھی ان لوگوں نے نہ چھوڑا چنانچہ 'شالامار' کو شعلہ مار بنادیا۔ اور کیمبل پور کو فارسیت کے بحران میں 'کامل پور' کردیا۔ ایسی ترکیبیں اکثر آتی ہیں جو مخالفت قواعد لغوی کی بھدی مثالیں ہیں۔ مثلاً:- سپاہی بھیج نکالنے چار ہزار روپیہ کے خزانہ الہ آباد سے گرفتار ہوئے تھے۔ رواج زبان انگریزی کا۔ (بجائے انگریزی زبان کا رواج)۔ عرصہ ایک مہینے تک۔ یہ الفاظ کا مجموعہ مہمل ہے عرصہ ایک ماہ تک لکھتے یا ایک مہینے کے عرصے تک تحصیل داراں و سرشتہ داراں کو بہبود ہوگئی۔ دریائے جملا کے بدلے دریائے جمن لفٹنٹ گورنر سابق۔ چمن و املیت۔ کمیٹی کی جمع 'کمیٹیات' گھڑی گئی۔ فارسیت چھوڑتے تو ایسی بولیاں بولنے لگتے۔ گورنمنٹ بنگالہ نے یہ ٹھہرایا ہے —

املا | املا نے کچھ بہتر صورت اختیار کی کم سے کم اکمل الاخبار چھوٹے ڈ یھی کو ونقہ کی طور پر استعمال کرنے لگا۔ گاڑی میں اب ڑ۔ ڈ کے ساتھ بھاری باری سے سوار ہونے لگی۔ 'کو نہیں' کو کوائی نہیں لکھا گیا۔ ماہ کی ہاءہوز حال کے ساتھ ملا کر لکھتے۔ پہنچے کو پہونچے لکھتے۔ ط کے ساتھ سین۔ ب مل کر سب طرح لکھتے۔ اُس ان میں الف کے بعد واؤ آنا ہی تھا۔ ملشیانہ اغلاط مثل سہولیت وغیرہ اور واقعہ بجائے واقع بھی موجود ہے۔

سنہ ۱۸۷۰ ع سے سنہ ۱۸۷۹ ع تک

اخبار انجمن پنجاب | یہ اخبار ۱۴ اپریل سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک عنوان دیتا ہے۔ یعنی معلومات جدید مقام

نقطہ بانی واقع سرحد پنجاب میں - اس کے نیچے یہ تحریر ہے —

" ہمیشہ برلب فوارہ ایں سخن جاریست

" کہ اوج منصب دنیاے دوں نگونساریست

" سچ ہے کہ زندگی نقش برآب ہے اور دنیا خواب و خیال کیا کیا عجائبات پروردگار عالم نے اس صفحۂ عالم پر پیدا کیے ہیں جو اوس کی قدرت کاملہ کا نمونہ ہیں اور اس خاک کے پتلے یعنی انسان کو کیسی طاقت بخشی ہے کہ وہ بھی دنیا میں کیسے کیسے کام کرتا ہے اور کیسی کیسی نشانیاں اور یادگاریں اپنی عقل و ادراک کی چھوڑ جاتا ہے ... "

اُن پلوں وغیرہ کی دستی تصویریں بھی دی ہیں جو نہایت عمدہ اور صاف ہیں - اسی اشاعت میں اودھ کے چیف کمشنر کی بیماری کی خبر ان الفاظ میں لکھی گئی ہے :-

" صاحب پانیر لکھتے ہیں کہ دشمنان جنرل بیرو صاحب بہادر چیف کمشنر اودہ کی طبع مبارک جادۂ اعتدال سے سخت منحرف ہوگئی ہے " —

۱۹ جولائی سنہ ۱۸۷۴ کا انجمن پنجاب میں " گارسن دی تاسی صاحب کی تصویر دے کر لکھا ہے :-

" صاحب موصوف عربی و فارسی و ہندوستانی میں ملکہ کامل رکھتے ہیں اور پیرس میں پروفیسر زبانہاے مشرقی ہیں - انجمن پنجاب کے ممبر اور اُوس کے دلی معاون اور مددگار ہیں"

" ضمیمۂ اخبار انجمن پنجاب بابت اپریل سنہ ۱۸۷۷ ع " میں انجمن پنجاب کے ایک جلسہ کی روداد درج اس کی قرارداد (۲) دلچسپی

سے خالی نہیں اس وقت تک اہل ہنود میں سمندر کے سفر اور یورپ میں جاکر کچھ مدت رہنے کے متعلق چھوت چھات اور پرہیز و اجتناب کے بہت سے وسوسے تھے - وہ تجویز یہ ہے :-

"(۶) صاحب پریسیڈنٹ بہادر کی تحریک پر تجویز ہوئی کہ ایک درخواست واسطے امداد چندہ راجگان و مہاراجگان و رؤساء پنجاب کی خدمت میں بھیجی جائے کہ لندن میں ایک انگلش انسٹیٹیوٹ بنایا جاویگا جس میں مذہبی رعایت اہل ہنود کی ہر ایک امر میں رکھی جاویگی اور ایسی تجویزیں کی جاوینگی جن سے مسافت [مطلب سفر سے ہے] جہاز میں بھی سہولت مذہبی اہل ہنود کو حاصل ہو" —

اسی سال میں لاہور کی بادشاہی مسجد کی مرمت کی تجویز ہوئی جو خستہ حالت میں تھی - اس کام کے لئے گورنمنٹ نے پانچ ہزار روپیہ اس شرط کے ساتھ مرحمت فرمانا منظور کیا کہ اُوس کا دو چند اس ملک کے لوگوں سے بطریق چندہ جمع کیا جائے - چندہ دینے والوں کی فہرست میں یہ نام بھی درج ہیں راجہ ہربنس سنگھ (ان کے چندے سے بڑھکر کسی شخص واحد کا چندہ اس فہرست میں نہیں) - پنڈت موتی لعل - پنڈت بدری ناتھ - منشی ہر سکھ رائے مالک کوہ نور - لالہ نہال چند وغیرہ - اس زمانے کے ملی علم برداروں کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے —

۱۸ اگست ۱۸۷۱ کا اخبار انجمن پنجاب راوی ہے :-

"ریاست جیند میں ایک انگریز کا قید ہونا - پبلک اوپینین سے خبر ہے کہ مہاراجہ صاحب بہادر جیند نے مسٹر ڈیوس نامی

ایک انگریز کو جو اون کی ریاست میں باجا سکھا نے پر ملازم تھا مع اوس کی جورو بچوں کے مقید کر لیا ہے - وجہ مقید کرنے کی یہ بیان کی گئی ہیں کہ ایک پلٹن کے گورہ نے ڈیوس صاحب کو لکھا تھا کہ میں اپنی جنگی نوکری سے دست بردار ہونا اور ریاست جیند میں ملازمی کرنا چاہتا ہوں آپ مجھے مشورہ دیں کہ کس طرح عمل کروں ڈیوس صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ انگریزی نوکری چھوڑ کر بڑے پچتائینگے ریاستوں کا کچھ حال نہیں ہے اور نیٹو بے ایمان ہوتے ہیں - یہ چٹھی پکڑی گئی''

کوہ نور | کوہ نور اپنے ضمیمہ مطبوعہ ۱۹ مئی سنہ ۱۸۷۴ع میں ایک نہایت اہم اور تاریخی جلسہ کی روداد شایع کرتا ہے - انجمن پنجاب کا یہ جلسہ ۹ اپریل سنہ ۷۴ کو انجمن کے مکان سکھا سبھا واقع لاہور میں ہوا - چیف کورٹ کے چیف جج مسٹر بولنواء (Boulnoise) اسکے صدر تھے - مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ - کرنل مکلاگن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ - مسٹر ینگ کمشنر لاہور - مسٹر ہالرایڈ ڈایرکٹر سرشتہ تعلیم - مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور - نواب عبدالمجید خاں - راجہ ہربنس سنگھ فقیر سید قمرالدین وغیرہ وغیرہ اور بہت سے علماء فضلا اصحاب شریک جلسہ تھے - اس جلسہ کی غرض تھی اردو نظم کی اصلاح کی تجاویز سوچنا - اس جلسہ میں ذکر کے قابل دو باتیں ہیں ایک مولوی محمد حسین آزاد کی تقریر شاعری کی اصلاح سے متعلق اور دوسری انہیں کی ایک نظم مسمی "بہ شب قدر" - یہ مثنوی اردو شاعری کی سب سے پہلی نظم نئے طرز کی ہے - یہ دونوں چیزیں آزاد مرحوم کے کلیات میں موجود ہیں - اس دن سے دنیا میں اردو کی باضابطہ نئی یا نیچرل شاعری

کی بنیاد پڑی - اسی جلسہ میں یہ بھی قرار پایا کہ ہر مہینے جلسہ ہوا کرے جس میں شاعر مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھا کریں —

ضمیمہ اخبار انجمن پنجاب بابت جون سنہ ۱۸۷۴ ع کی تاریخی حیثیت ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں نہایت اعلیٰ ہے کیونکہ اس میں ادارۂ انجمن پنجاب کے اس مشاعرہ یا مناظمہ کی مفصل روداد درج ہے جو ۳۰ جون سنہ ۱۸۷۴ ع کو انجمن مذکور کی سرپرستی میں ہوا تھا - مقررہ موضوع "زمستان" تھا - شاہ انور حسین "ھما" - مرزا اشرف بیگ خاں 'اشرف' مولوی علاءالدین 'محمد' کاشمیری - مولوی الٰہی بخش 'رفیق' - مولوی محمد حسین 'آزاد' - مولوی محمد مقرب علی 'زاہر' - مولوی امو جان 'ولی' - مولوی قادر بخش اور مولوی عطاءاللہ نے مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھیں - اس مناظمہ پر میرا ایک مفصل لکچر ہے (جو میرے مجموعہ نثر میں داخل اور زیر طبع ہے) - اس لئے یہاں زیادہ کہنا طول کلام ہے - اگلے مناظمہ کے لئے 'امید' موضوع مقرر ہوا —

۱۳ اگست سنہ ۷۵ ع کا اخبار شہزادگان جاپان کی نسبت ایک خبر درج کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان اپنی حیرت انگیز ترقی پر کس طرح فایز ہوا - لکھا ہے :—

"شہزادہ 'خیوا' کا - عموی شہنشاہ جاپان اور فلاتنا کا اجوٹنٹ شہنشاہ موصوف سنہ پرشیا میں داخل ہوگئے اور اولہیں برلن کی رجمنٹ پیدل میں لفٹنٹ کا عہدہ ملا - 'تنا کا' نے لفٹنٹی کا امتحان دیا اور خیوا کا وا ایک اعلیٰ افسر کے ماتحت کام سیکھ رہا ہے - اس سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ

پرشیا کو اسبات کا تعصب نہیں کہ اُنکی سپاہ میں غیر ملک کے لوگ جنگی عہدوں پر ممتاز نہ ہوں"—

اخبار مذکور اس خبر کی توجیہ یوں کرتا ہے:—

"لیکن اس کی وجہ یہ ھے کہ یہ عہدے اونہوں نے غیر ملک والوں کو اپنے ھی ملک میں دئے ھیں جہاں غیر ملک والوں کی بغاوت کا اندیشہ نہیں۔ گورنمنٹ انگریزی ملک ھندوستان میں ایسا کرنا نہیں چاھتی کیونکہ یہ غیر ملک ھے اُنکا اپنا ملک نہیں"—

۱۰ ستمبر سنہ ۷۵ ع کا اخبار پبلک اُپی نین سے ایک مضمون اخذ اور ترجمہ کرتا ھے جس کا عنوان ھے انگریزی راج - اس مضمون کا ذیل کا اقتباس اوس زمانے کے پبلک کے سیاسی خیالات پر روشنی ڈالتا ھے - لکھا ھے:—

"انگریز دیسی لوگوں کو مراتب اعلیٰ شاید اسوجہ سے نہیں دیتے کہ مبادا وہ سرکار سے سرکش ہو جاویں لیکن یاد رکھنا چاھئے کہ جبتک حق تلفی رفع ہوتی رھیگی اور انصاف ہوتا رہے گا تب تک ھندوستان میں سرکشی کا ویسا ھی کم خطرہ ھے جیسا کہ سکاٹ لینڈ میں - ہم پوچھتے ھیں کہ کیا اندیشۂ بغاوت اس بات سے کم ہوجاویگا اگر باشندگان کے اُسامے اوتار لئے جاوینگے اور اونکے ساتھ سلوک بد کیا جاویگا؟... اگر یہی صورت رھی تو ھندوستان کے لئے ایک زمانہ وہ ہوگا کہ اوس کی جنگی حرارت بالکل سرد ہو جاویگی اور یہاں کے لوگ اپنے ملک کے بچاؤ کے لئے اپنا کلی حصر دوسرے ملک والوں پر رکھینگے - کیا یہ بات حکمرانوں کے فائدے کی

ہے کہ محکوم اس طرح ضعیف کر دئے جائیں؟ ... یہ بزدلی کی مصلحت ہندوستانیوں کو جنگی طاقتوں سے محروم کرنے کی اون کی ساری خوشی کو خاک میں ملا دیتی ہے .. " --

۱۷ ستمبر سنہ ۷۵ کے اخبار میں مضامین علمی کی سرخی کے نیچے ایک لمبا مضمون ہے جس کا عنوان ہے " مجموعہ ہیولے - قانون کشش و حرکت کا بیان " --

۱۵ اکتوبر سنہ ۷۵ کا اخبار مخبر ہے کہ :--

" سر رچرڈ تمپل صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بنگال نے ایک تجویز اسباب میں پیش کی تھی کہ دیسی معزز لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرنے کے لئے ایک صیغہ گورنمنٹ کی جانب قایم کیا جاوے " --

۸ اکتوبر سنہ ۷۵ کا اخبار 'منقولات کی مد میں ایک مضمون دیتا ہے جس کا عنوان ہے 'اردوے معلّٰی --

۱۰ دسمبر سنہ ۷۵ کے پرچے میں مضمون " دربیان فواید صبر مولفہ امیرالامرا نواب محمد اسمعیل خاں صاحب بہادر فیروز جنگ والی ریاست جاورہ " درج کیا گیا ہے - اس سے ظاہر ہوگا کہ اس وقت اردو پریس کی کیا قدر و منزلت تھی --

۱۲ جنوری سنہ ۱۸۷۷ ع کے اخبار میں " دربار قیصری میں انجمن پنجاب اور یونیورسٹی کی قدر افزائی " کے عنوان سے افتتاحیہ درج ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں دربار قیصری کے موقع پر انجمن پنجاب کے ایک معزز ڈیپوٹیشن نے وایسرائے لارڈ لٹن کی خدمت میں ایک ایڈرس پیش کیا - اس کے جواب میں بقول اخبار انجمن پنجاب " حضور معزی

الیہ نے یہ بشارت جانفزا اہالیان ڈیپوٹیشن کو دی کہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو منصب کامل یونیورسٹی کا عطا کیا جاوے گا"۔ مطلب یہ کہ یہ منصب اس موقع پر عطا ہو گیا۔ اسی اشاعت میں قیصری دربار دھلی کی بڑی تقریبوں اور عطائے خطابات وغیرہ کا ذکر ہے —

اسی پرچے سے یہ خبر آج کل کے تعلیمی اداروں کے لئے دلچسپ ثابت ہوگی - لکھا ہے —

"امتحان فرسٹ آرٹس میں کالجہائے پنجاب نے نمایاں کامیابی اختیار کی" —

آپ یہ معلوم کرنے کو بیتاب ہوں گے کہ یہ "نمایاں کامیابی" کیا تھی سنئے صوبۂ پنجاب میں اس وقت دو کالج تھے ایک لاہور کا گورنمنٹ کالج جہاں سے آٹھ طلبا اس امتحان میں پاس ہوئے۔ دوسرا دھلی کالج جہاں سے چار پاس ہوئے۔ یہ بارہ کی میزان کل اس وقت نمایاں کامیابی سمجھی جاتی تھی —

یہی پرچہ ایک خبر "نظام دکن کی فیاضی" کی سناتا ہے کہ :-
"نظام دکن نے جاتے وقت پونا میں قیام کیا تھا [دھلی جاتے وقت] ایک مندر کی تعمیر کے واسطے ڈیڑھ ہزار روپیہ مرحمت فرمایا یہ امر بے تعصبی پر دال ہے" - لاهور کی شاہی مسجد کی مرمت سے متعلق چندے کی فہرست آپ دیکھ چکے ہیں یہ خبر اس کا کتنا موزوں متقابل ہے -

ھندوستانیوں کا 'جوتا' بھی معلوم ہوتا ہے گزشتہ زمانہ میں ایک وقیع اور اہم سیاسی اور قومی مسئلہ تھا - اس سے پہلے دور میں اس کا ذکر آیا ہے اب نو فروری سنہ ۷۷ کے پرچے میں اخبار انجمن پنجاب "پھر وہی جوتا" کے عنوان کے نیچے ایک واقعہ کا ذکر کر کے ایک لمبا

اور کرارا مضمون پیش کرتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ یکم جنوری سنہ ۷۷ کو دھلی میں وایسرائے نے دربار قیصری کیا تھا - اسی سلسلے میں جگہ جگہ لوکل افسروں نے دربار یا جلسے کئے - چنانچہ مرادآباد میں بھی ایسا ہوا جب میر ظہور حسین وکیل ھائی کورٹ دربار میں جانے لگے تو اُن سے کہا گیا کہ جوتا اُتار کر جائیں - انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کس کا حکم ہے - کئی مرحلے طے کرنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ یہ حکم " صاحب اسسٹنٹ کلکٹر بہادر " کا ہے - چنانچہ میر صاحب نے ان سے دو بدو ہو کر کہا کہ " اگر ایسا حکم ہے تو ہم دربار میں شریک نہ ہوں گے - صاحب نے کہا کہ اچھا ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں پس میر صاحب جوتا پہن کر دربار میں شریک ہوئے " —

اس پر اخبار کا نوٹ ہے کہ :- " اس موقع پر اگر میر صاحب کو یہ خیال ہوتا کہ کون حجت کرے کہیں ہم کو دربار میں شریک ہونے سے ممانعت نہ ہو جائے تو ہرگز اس وقت یہ مرحلہ طے نہ ہوتا اور ذلت کے ساتھ میر صاحب کو جوتا اتارنا پڑتا - حال کے ایک واقعہ سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو ہندوستان کا جوتا ابھی تک نوک پان سے درست ہے یا یہ کہ تاریخ اپنے تئیں دھراتی ہے - کیونکہ ابھی ۱۹ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ ع کا تار جو 'مدراس' سے آیا خبر دیتا ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ کو جب کرپان کی علت میں عدالت میں پیش کیا گیا تو پولس نے زبردستی ان کے جوتے اُتار ڈالے - (تریبیون ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴)

۲۳ فروری سنہ ۷۷ کا اخبار انگلشمین کے حوالے سے آریہ سماج کے قایم ہونے کی خبر دیتا ہے - لکھتا ہے :-

" کل صاحبان ہنود کے لئے آریہ سماج کے قایم ہونے کی خبر نہایت

فرحت انگیز ہوگی - اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ علم شریف
بید کو اس کی اصلی حالت پر لانے کی کوشش کرے - اور
اس مطلب کے حصول کے لئے مراتب مندرجہ ذیل عمل میں
لائے اول ایک سماج ہر ایک احاطہ میں قایم ہوگی اور
اوس کے ماتحت بڑے بڑے شہروں میں کمیٹیاں قایم ہوں گی -
دوم مدارس اس غرض سے کھولے جائیں گے کہ مردوں اور
عورتوں کو بید کی تعلیم دی جاوے - سوم کتابیں چھاپی
جاویں گی چہارم رسالجات اس غرض سے - پنجم فاضل پنڈت
ملک کے مختلف مقامات میں اس غرض سے بھیجے جاویں گے
کہ لوگوں میں شاستر کا اچھی طرح سے وعظ کریں " —

اس پر اخبار انجمن پنجاب کا ہمدردانہ اور معرفانہ نوٹ ہے —

یہی اشاعت قدیم دہلی کالج کے ٹوٹنے کی خبر اس طرح دیتی ہے : —

" دہلی کالج کی موقوفی آخر گورنمنٹ نے منظور کرلی اور
سرکاری کارروائی اس باب میں پنجاب گورنمنٹ گزٹ
میں چھاپی گئی " —

۶ اپریل سنہ ۷۷ کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رسالہ
' ہندو باندھو ' تین سال سے پنڈت شونراین اگنی ہوتری ڈرائنگ ماسٹر
لاہور گورنمنٹ سکول نے اہل ہنود کے لیے جاری کیا تھا - اخبار اس کی
افادت کے اعلان کے ساتھ اس کی اعانت کے لیے اپیل کرتا ہے —

۱۳ اپریل سنہ ۷۷ کا اخبار " انڈین انسٹی چیوٹ بغرض تعلیم
روسازادگان ہندوستان در یونی ورسٹی ہائے انگلینڈ و تعلیم دیگر علوم مفیدۃ
یعنی تعلیم سول سروس و انجینیری و زاعت وغیرہ وغیرہ " کی خبر دیتا

ہے - تعلیم سروس مفید تو تھی اور اب بھی ہے لیکن اسے علوم میں شامل کرنا لکھنے والے کی ایجاد بندہ ہے - یہ تحریک ڈاکٹر لائٹز کی تھی جو چلی ہی نہیں —

۱۱ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار " پنجاب یونیورسٹی " کا عنوان دے کر " رپوٹ بابتہ از سر نو مرتب ہونے علم مشرقی کالج اور سکول کے " درج کرتا ہے - عربی کے استادوں کی ذیل میں پہلا نام مولوی فیض الحسن کا ہے اور اخیر نام مولوی محمد حسین کا ہے - ان کے نام کے آگے " مولوی شیعہ " لکھا ہوا ہے - اس اعتقادی اعلان کی نہ معلوم کیا ضرورت لاحق ہوی -

۱۸ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار - اب روس اور روم کی خونریز جنگ چھڑ گئی - یہ اخبار 'مدراس میل کے حوالے مخالفین کی باقاعدہ فوج اور متعلقین کی یہ تعداد لکھتا ہے :- روسی فوج علاوہ سپاہ واقع پولینڈ و بالٹک و گارڈز ایک لاکھ اور ترکی کی فوج چار لاکھ تیس ہزار شمار کرتا ہے - یہ اشاعت تقریباً سب کی سب اس جنگ کے مضامین کی نذر ہے - سول ملٹری گزٹ کے ایک مضمون یا نوٹ کا ترجمہ اس طرح شروع ہوتا ہے :—

" بحالیکہ روسی ترکی واقع ایشیا کو اپنے ملک میں شامل کرنا چاہتے ہیں لندن کے وزرائے کنسرویٹو کی یہ رائے ہے کہ مغایرت اختیار کی جاوے - اس صورت سے ہم نہیں سمجھہ سکتے کہ انگریزی حقوق کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں کیا جماعت وزرائے انگلینڈ میں نہ کوئی سپاہی رہ گیا ہے نہ کوئی مدبر کہ بتاوے روس جو اس ملک کو فتح کرنا چاہتا ہے تو اوس کی نسبت انگلینڈ کی نسبت کیا ہے " —

۴ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار لاہور میں سوامی دیانند سرستی کے وروود کی خبر ان الفاظ میں مشتہر کرتا ہے :—

"لاہور میں ویدوں کے ایک مشہور عالم و فاضل سوامی دیانند سرستی صاحب تشریف لائے ہیں اور ویدوں پر لکچر دیتے ہیں ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات کا یہ حال ہے کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے ... ... پنڈت صاحب باغ دیوان رتن چند مرحوم میں مقیم تھے- اب خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں صاحب نے کہ بڑے عام دوست ہیں اپنی کوٹھی اون کو فروکش ہونے کے لیے دی ہے —

جنگ روم و روس کے معاملہ میں ایشیا تک ترکی اور سب سے بڑھ کر افغانستان نہایت مشکل قضیہ تھا معلوم ہوتا ہے قسطنطنیہ کے اخبار دارالخلافۃ استنبول اور کراچی کے مفرح القلوب نے اس قضیہ کو اور پیچیدہ کردیا- یہ دونوں اخبار فارسی زبان کے تھے جس کا ذکر آگے آچکا ہے- اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۸ جون سنہ ۷۷ کا افتتاحیہ "امیر کابل - گورنمنٹ انگلشیہ اور روس" کے عنوان سے اس قضیہ پر طویل اور مفصل بحث کرتا ہے —

اسی تاریخ یعنی ۸ جون سنہ ۷۷ کا لوکل تاریخی اہمیت رکھتا ہے - لکھا ہے کہ " یکشنبہ گزشتہ کو ہال انجمن پنجاب میں بابو سریندر ناتھہ صاحب بنرجی سابق متعلق سول سروس ہندو ممبر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے ایک نہایت پرتاثیر و فصیح لکچر زبان انگریزی میں قومی اتفاق پر دیا- اس لکچر کے سننے کے لیے ایک گروہ کثیر تعلیم یافتہ نوجوانان پنجاب و دیگر معززین شہر کا جمع تھا- لکچر درحقیقت نہایت

زور وشور کی تھی" —

اس کے اگلے دن یعنی ۴ جون سنہ ۷۷ ع کو مقام سکشا سبھا میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کو اہل پنجاب کا پہلا سیاسی مجمع کہنا چاہئے - رائے بہادر مول سنگھ صاحب وئیس و آنریری مجسٹریٹ لاہور اس جلسہ کے صدر تھے - محب وطن سردار دیال سنگھ ،مجیٹھیہ نے اول تجویز یہ پیش کی :—

"برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے سول سروس کے معاملہ میں جو کارروائی کی ہے اوس کو اس جلسہ کے ممبر بہ کم وکاست منظور کرتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ انڈین سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے جو قواعد امیدواروں کی عمر سے متعلق تھے حال میں اون میں تغیر و تبدل کیا گیا - اس جلسہ کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ جو اشخاص سول سروس کے امتحان میں شریک ہوں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس سال کی قرار پائے اور انیس سال کی حد جواب مقرر کی گئی ہے وہ منسوخ ہوجائے" —

خان بہادر محمد برکت علی خاں اور خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں نے اس تجویز کی تائید کی دوسری تجویز اس جلسے نے یہ منظور کی :—

"اس غرض سے کہ ہندوستانی امیدواروں کا سول سروس میں داخل ہونا آسان ہوجائے اس جلسہ کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ کل عہدوں میں سے کسیقدر عہدوں کے لئے جنکی تعداد معین ہوجائے امیدواروں کا امتحان ہرسال ہندوستان کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ وسطی مقاموں میں ہوا کرے"—

اس تجویز کے محرک ڈاکٹر سورج مل اور تائید کرنے والے ماسٹر پیارے لال اور سید نادر علی شاہ سیفی تھے - اسی جلسے میں ایک میموریل بھی منظور اور اختیار کیا گیا جو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے تھا - اس میموریل پر پبلک کے دستخط کرانے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں سردار دیال سنگھ مجیتھیہ اور منشی هرسکھ رائے کے علاوہ سرکاری عہدے دار بھی شامل تھے —

۲۴ اگست سنہ ۷۷ ع کے اخبار میں ایک صاحب جہلم سے علی گڑھ کے مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ھیں :-

"جس قدر دل سوزیاں عرق ریزیاں اسکے راقموں سے اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ظہور میں آئیں وہ سارا جہاں جانتا ہے - سید احمد خاں صاحب نجم الہند کو جنہوں نے اپنی جان مال عمر اسی قومی بھلائی اور اسلام کی سچی خیر خواھی میں صرف کی ہے اگر حجت اسلام کہا جاوے تو بجا ہے" —

۱۲ اکتوبر سنہ ۷۷ ع کا لوکل ان اشعار سے شروع ہوتا ہے :—

شکر ہے لاہور میں بھی ابر باراں ہو گیا
آجکل پنجاب بارش سے گلستاں ہو گیا

بلبلیں فرحت سے گاتی ھیں یہ مصرع بے بدل
غنچۂ پژمردہ تھا اے لو آج خنداں ہو گیا

ایسی بارش ہوگئی جو کھیتوں کو ہے مفید
زندگی کا اے فریبو اب تو ساماں ہو گیا

۲ نومبر سنہ ۷۷ ع کے اخبار میں ایک لمبی مراسلت درج ہے جس کا عنوان ہے " فاحشہ عورتوں کے متفرق جگہ شہر میں رہنے سے بہت

بڑے نقصان ھیں" - پایا جاتا ھے کہ یہ تحریک زمانۂ حال کی نہیں بلکہ پرانی ھے —

۲۴ نومبر سنہ ۷۹ ع کا اخبار ھند کے مطالبات پر ایک اھم مضمون پیش کرتا ھے جو نظام الدولہ نواب حاجی محمد مردان علی خاں بہادر کا لکھا ہوا اور دربار دھلی کی نسبت تھا - اخبار کا اڈیٹر ان مراعات و مطالبات کو بہ حیثیت مجموعی پسند کرتا ھے - مضمون طویل ھے صرف مطالبات ملاحظہ ھیں :—

"سرکار کمپنی تاجر تھی مگر اب دور شاھنشاھی ھے اسلئے برتاؤ بھی شہنشاھی چاھئے - یہ دربار کھیل تماشے کے واسطے نہیں ھے - رؤساء کی رضامندی پر نصف ھند بلکہ کل ھند کی رضامندی منحصر ھے" ان الفاظ کے ساتھ نواب صاحب مطالبات کی یہ فہرست پیش کرتے ھیں :—

(۱) جھپور کو نصف سانبھر - واپس ملے —

(۲) ماروا‌ڑ کو نصف سانبھر - علاقہ تالاب عمر کوٹ مگھرامیر وازہ واپس ملے —

(۳) گوالیار کو قلعہ گوالیار —

(۴) اودے پور کو علاقہ گنگا پور وغیرہ سوائے نیمچ کے —

(۵) نظام دکن کو برار واپس ملنا چاھئے —

اس مضمون کے یہ الفاظ بھی قابل غور ھیں :—

"بعہد سابق دیسی ارکان کے کام اور انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ سرحدیں مستحکم تھیں رعایا خوش حال تھی اور صرف تیس کروڑ آمدنی ملک میں تھی - دس لاکھ فوج تھی اور اس پر شاھی خزانہ اور کارخانہ معمور رھتے تھے - عجب ھے کہ اب

تریپن کروڑ [آمدنی میں] صرف دو لاکھ ساٹھہ ہزار فوج
اور سرکار پر باوجود اجرائے نوٹ کے از حد قرض - ع - ببین
تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا - سالانہ بجٹ خوب بنتا ھے
مگر جب بچت نہیں تو محض لفافہ ھے - بارک ماسٹری اور
کمسریٹ اور مہم وغیرہ میں کروڑوں پر پانی پھر جاتا ھے
جس کا حال سنکر حیرت ہوتی ھے - سرکار ایسی لکھہ لٹ
ھے کہ پنڈارہ کی لوٹ بھی اس صیغہ نے مات کردی " ـــ

۱۳ جون سنہ ۱۸۷۹ ع کی اشاعت میں ایک نہایت مفید اور دلچسپ
مضمون ھے جس کا عنوان ھے " ھند میں سب کچھ ھے لیکن صنعت
و حرفت نہیں " - ابتدا میں یہ شعر درج ھیں اور آگے چلکر موقع
بہ موقع اسی زمین کے اشعار نثر میں ملے ہوئے ھیں - ان اشعار کی
ایک خاصی نظم بن جاتی ھے ملاحظہ ہو -

دل ساکنان ھند سے کیونکر خفا نہ ہو
افسوس یاں تو صنعت و حرفت ذرا نہ ہو
ہر شخص کو وہاں کے یہی دھن ھے رات دن
ممکن ھے کوئی بات نئی ڈھونڈھتا نہ ہو
طاقت ھے یورپینوں کی شے ہو نہیں لطیف
ممکن ھے ھند کی کوئی شے بدنما نہ ہو
تشبیہ ان کی دیتا ہوں اس جانور سے میں
آنکھیں تو کھل رہی ہوں ولے دیکھتا نہ ہو
اعضا ترے درست ہوں پھر لوموی بنے
اے بے حجاب تجھہ کو ذرا بھی حیا نہ ہو

گو یہ ہی حالتیں دل وحشی تری رہیں
کیا جانے کیا ہو دیکھیئے کیا جانے کیا نہ ہو
مشکل وہ کونسی ہے جو آساں نہ ہو کبھی
افسوس دل سے چاہو اگر تم تو کیا نہ ہو
بلبل بھی نالہ سنتے ہی بیدار ہو گئی
اے بے خبر خبر تجھے مطلق ذرا نہ ہو

تجدید شاعری کا یہ دل کش ثمر آپ نے ملاحظہ کیا- اسی کے لئے آزاد مرحوم برسوں سے تردد کر رہے تھے —

۲۰ جون سنہ ۷۹ کا پرچہ "انڈین ٹریبیوں" سے ماخوذ ایک خبر درج کرتا ہے جس میں ایک اہل فرنگ کے ہاتھہ سے ایک ہندوستانی مارا گیا تھا اور چیف کورٹ سے ملزم بری ہوگیا- یہ خبر اس عنوان کے تحت درج کی گئی ہے:-

"ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

سررشتہ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر کرنل ہالرایڈ اور پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر لائیٹنر کی کبھی نہ بنی- اور دو مضبوط پارٹیاں قایم ہوگئیں ایک سررشتہ تعلیم اور بک ڈپو کی اور دوسری پنجاب یونیورسٹی کی- جب آزاد نے جو سررشتہ تعلیم سے متعلق تھے نئی شاعری کی بنیاد ڈالی اور مقررہ موضوع کے ساتھہ مناظمہ کا ڈھنگ نکالا تو یونیورسٹی کی پارٹی نے پرانی چال کا طرحی مشاعرہ شروع کردیا- مگر اس سے مناظمہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا ۲۰ جون سنہ ۷۹ کا اخبار انجمن پنجاب ایک "اشتہار انجمن مشاعرہ بیت العلوم پنجاب لاہور" شایع کرتا ہے- اس کے مشاعرے رسالہ کی شکل میں چھپا بھی کرتے تھے اور لوگوں کی غزلیں

اردو فارسی - عربی - سنسکرت - هندی - پنجابی اور پشتو میں هوا کرتی تھیں یعنی جن جن زبانوں کے امتحان یونیورسٹی کی اورینٹل فیکلٹی کے تحت هوا کرتے تھے —

۲۷ جون سنہ ۷۹ کے اخبار میں صنعت و حرفت کا پھر تذکرہ آتا ہے جس میں بہت سے ہمعصروں کو خطاب کر کے اس بارے میں اتحاد عمل کی دعوت دی گئی ہے —

۱۱ جولائی سنہ ۷۹ کا اخبار پوسٹ کارڈ کا خیر مقدم اس قطعہ کے ساتھہ کرتا ہے —

ہے لفافہ بھی اور زر محصول اور فضولی کو تمام دیکھا ہے
خط بھی ہے اور نامہ بر بھی ہے یہ ٹکٹ پانچ کام دیکھا ہے

اکمل الاخبار دھلی

۱۳ اپریل سنہ ۷۰ کا اکمل الاخبار یہ خبر دیتا ہے "گورنمنٹ انڈیا کا مجوزہ بل متعلق یو- سی- ایس ہوس اف کا مکرر میں دوسری دفعہ سماعت هوا- اس کے پاس هونے پر لایق اشخاص بغیر امتحان کے سول سروس میں لیے جائیں گے" -

۲۰ اپریل سنہ ۷۰ کا اخبار "سالانہ حساب سلطنت هند" پر بحث کرتے هوے لکھتا ہے :-

"بے شک جو لوگ گورنمنٹ کے خیر خواہ اور رعایا کے طالب فلاح هیں وہ هرگز اس بجٹ کو پسند نہیں کریں گے کیونکہ ایسا نظام کس کام کا کہ بے جنگ و جدال کے سال میں بھی خزانہ شاهی پر اختلال اور پے در پے انکم ٹکسی دیکھے دیکھے رعایاء شکستہ بال کا برا حال ہے- جب سال گزشتہ کا بجٹ نکلا تھا اس وقت تمام لوگ اس سبب سے ناخوش هوئے

ہے کہ باوجودیکہ سرکار دولت مدار کی طرف سے ولسن صاحب نے بڑے شد و مد کے ساتھہ اقرار کیا تھا کہ پانچ برس کے بعد یہ انکم ٹکس نہیں لیا جاے گا پھر سر رچرڈ ٹمپل صاحب نے ایک روپیہ انکم ٹکس مقرر کیا اوس کے بعد اوسی سال کے اندر اس کو دونا کیا گیا لیکن اس کے ساتھہ بھی لوگوں نے طوعاً و کرھاً اس کو مان لیا اور رو پیٹ کر چھہ مہینے ایک روپیہ کے حساب سے جملہ ڈیوڑہ روپیہ کے ادا کیا اور یہ سمجھا کہ اب کوئی لڑائی بھڑائی جدال قتال نہیں ہے سو آئندہ سال جیسا کہ جناب گورنر جنرل وایسراے بہادر نے وعدہ فرمایا ہے اور انکم ٹکس دینا نہیں پڑے گا۔ سو جناب سر رچرڈ ٹمپل صاحب بہادر مشیر مال کے حسن تدبیر کے سبب یہ ہوا کہ ایک روپیہ کے بدلے تین روپیہ دو آنہ سیکڑہ دینا پڑا - سر رچرڈ ٹمپل صاحب بہادر نے اپنے حساب کتاب اور منصوبے کو ایسا چھپا رکھا کہ گویا اس کے فاش ہونے میں بالکل نظام بگڑ جاوے گا حالانکہ اگر اس قدر نہ چھپاتے اور خرچ کی تفصیل شرح و بسط کے ساتھہ لوگوں کو سنا دیتے تو غالب تھا کہ لوگ اتنے برہم نہ ہوتے اور اس ٹکس کے ادا کرنے کو اتنا ناگوار نہ سمجھتے ... " —

اگلی اشاعت یعنی ۲۰ اپریل کے اخبار میں ایک بڑے مزے کا واقعہ درج ہے جسے لطیفہ کہا گیا ہے - سنئے :—

کلکتہ کے ایک اخبار میں لکھا ہے کہ کل کے دن ایک عجیب اور دلچسپ ماجرا یہاں کونسل میں واقع ہوا - تفصیل اس

یا سفریجت تحریک بیسویں صدی کے دوسرے قرن کے اوایل میں شروع ہوئی تھی وہ زوروں پر تھی کہ جنگ عظیم کے بادلوں نے دنیا کی فضا کو گھیر لیا - جنگ کے بعد آپ نے دیکھا کہ اس قسم کی کسی تحریک کی ضرورت ہی باقی نہ رہی - غرض کہ حال کی تاریخ میں عورتوں کے سیاسی حقوق کے مطالبہ سے متعلق یہ پہلی باضابطہ کوشش تھی - "بی بی صاحبہ" وغیرہ الفاظ جو اکمل الاخبار کے اڈیٹر نے استعمال کئے ان سے پایا جاتا ہے کہ اسے عورتوں کے معاملہ میں بہت ہی جھجک اور شرم عارض حال تھی -

۲۲ جون سنہ ۷۰ کا اخبار آگرہ کی خبر لکھتا ہے کہ ۱۴ جون کو "کمشنران آراستگی شہر (اس سے مطلب ہے میونسپل کمشنر) غیر ملازم صاحبان انگریز اور ایک انبوہ رئیسان و ساکنان ہندوستانی کا انکم ٹکس کی بابت دلایل پیش کرنے کے لئے مجتمع ہوا" --

ریل اور گھوڑے کا مقابلہ

اب سے چونسٹھ برس پہلے آپ کی ریلوں کی رفتار کیا تھی اور یہ کہ سادات بارہ جو شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد برسوں بادشاہ گر رہے انگریزی عہد میں بادشاہ گری تو نہ کرسکے لیکن ان کے راج کے بڑے معجزے یعنی ریلوے انجن کو شکست دئے بغیر نہ رہے - اس کی کیفیت ۲۰ جولائی کے اخبار میں اس طرح درج ہے :-

"سادات بارہ میں سے ایک صاحب کے پاس عجیب گھوڑا حرحرنگ ہے چنانچہ ایک صاحب جلیل القدر ملازم ریل سے یہ شرط ٹھہری کہ اسٹیشن کھتولی سے اسٹیشن مظفر نگر تک جو چودہ میل کا فاصلہ ہے گھوڑا ہمراہ ریل دوڑایا جاوے اور گھوڑا پیچھے رہا تو مالک اسپ ہزار روپیہ دیوے - اگر گھوڑا

ہوگیا تو ہزار روپیہ صاحب ملازم ریل سے لیا جاوے اس شلمہ کو گھوڑا ہمراہ ریل کے دوڑا - ریل سے گھوڑا $\frac{1}{4}$ میل آگے تھا - صاحب ملازم ریل نے شرط ہار کر ہزار روپیہ مہر صاحب کی نذر کئے مہر صاحب نے ازروے دریا دلی وہ روپیہ صاحب کو پھیر دیا " —

۲۷ جولائی سنه ۷۰ کا اخبار فرانس اور پروشیا کی جنگ کے باعث کے متعلق بحث کرتا ہے - لکھا ہے :-

"شاہ فرانس نے شاہ پروشیا سے یہ درخواست کی تھی کہ پروشیا کے شاہزادہ ہومن زولرن کو تخت سلطنت ہسپانیہ پر بیٹھنے سے باز رکھا جاوے ورنہ تمام ملکی معاملات باہمی ہمارے تمہارے قطع ہو جائیں گے - اب بذریعہ تار برقی معلوم ہوا کہ پروشیا والوں نے درخواست مذکور شاہ فرانس کی قبول کرلی مگر شاہ فرانس کے جوبادنخوت نے زور کیا یہ جی میں سمائی کہ اب پروشیا والوں سے یہ درخواست کیجئے کہ شاہ پروشیا یہ ضمانت دے کہ آئندہ کبھی ہسپانیہ میں شاہزادہ پروشیا کے بادشاہ ہونے کی درخواست نہ کی جاوے گی - واضح ہو کہ یہ اخیر درخواست شاہ فرانس کی طرف سے ایسی ہوئی کہ طبقۂ یورپ کی چھوٹی چھوٹی قوم کو بھی غضبناک کردے - جب یہ پیغام شاہ فرانس کا قاصد لے کر پروشیا میں گیا شاہ پروشیا اوس وقت ایک ایڈ جو ٹینٹ (افسر فوج) کے ہمراہ باغ میں سیر کر رہا تھا قاصد پیغام سنا کر جواب کا ملتجی ہوا بادشاہ پروشیا نے پیٹھ پھیر کر جواب دیا کہ اس کا کچھ جواب نہیں - جب قاصد بضد ہوا ایڈ جو ٹینٹ نے اوس کو جھڑک کر نکال باہر کیا - اتنی بات

کے ہوتے ہی شاہ فرانس کا مدعا حاصل ہوا - مدتوں کا رخنہ
جو شاہ پروشیا کی طرف سے اوس کے دل میں تھا اب نکل آیا
یعنی اسیوقت پیرس دارالسلطنت فرانس کو بذریعہ تار برقی
خبر گئی وہاں اور خبر کے پہنچتے ہی لڑائی کی تیاریاں
شروع ہوگئیں - اودھر شاہ پروشیا بھی غافل نہیں تھا ... " -

اس لمبی عبارت کے نقل کرنے سے میرا یہ منشا ہے کہ چونکہ اس میں وہ واقعات تفصیل کے ساتھہ معاصرانہ حیثیت سے بیان کئے گئے ہیں جو فرانس اور پرشیا کی جنگ سے عین ماقبل پیش آے اور تاریخی طریق پر ایک بڑی لڑائی کا فوری سبب قرار دیے جا سکتے ہیں حالانکہ قریب کے زمانے کے مورخ ہم کو یہ بتاتے ہیں کہ 'فرینکو پرشین وار' کا اصلی سبب ابھی تک نا معلوم ہے - میں نہیں جانتا اصلی اور کیا ہوتا ہے اور کسے کہتے ہیں - کل کو کوئی یہ کہدے گا کہ اس جنگ عظیم جرمن کا اصلی سبب نا معلوم ہے - چنانچہ لارڈ ایکٹن نے عہد حاضر کی تواریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے جو لکچر ۱۱ جون سنہ ۱۸۹۵ ع کو کیمبرج یونورسٹی میں دیا اس کا ایک حصہ اس کا ثبوت ہے - انہوں نے کہا :-

" Even of a thing so memorable as the War of 1870, the true cause is still obscure; much that we believed has been scattered to the winds in the last six months, and further revelations by important witnesses are about to appear."

ان کا ظہور آج تک نہ ہونا تھا نہ ہوا - بات یہ ہے کہ پالسی کے ساتھہ تواریخی علت اور سبب بھی بدلتے رہتے ہیں --

انکم ٹیکس معلوم ہوتا ہے پبلک کو بہت ہی نا پسند تھا - ۳ اگست

کے اخبار کا یہ لطیفہ بھی خوب دلچسپ ہے :-

"پاینیر الہ آباد ناقل ہے کہ ممالک مغربی و شمالی [صوبہ متحدہ آگرہ] میں یہ مشہور ہے کہ یہ نیا ٹکس بسبب تشریف آوری ڈیوک آف ایڈنبرا کے لگا ہے اور دعا کرتے ہیں کہ ملکہ معظمہ کو خدا اپنے لڑکوں سے اتنی محبت دے کہ آیندہ اپنے بچوں کو ہندوستان میں نہ بھیجیں " —

یہی اشاعت ایک اور عجیب و غریب ٹیکس کی خبر دیتی ہے جو الہ آباد کی میونسپل کمیٹی نے ہندوؤں کے مردوں پر لگایا تھا - یعنی جتنی لاشیں گنگا اور جمنا کے کنارے پر جلائی جائیں اُن کے لئے فی لاش ڈھائی روپیہ لیا جاتا تھا - اس کے خلاف بہت زور سے صدائے احتجاج بلند کی گئی —

۱۰ اگست سنہ ۷۰ کا اخبار آج کل کے سیاس اور بجٹ کے مبصروں کے لئے سرمۂ بصیرت کا حکم رکھتا ہے - نیم جوشی اور گوکھلے مرحوم نے اگر یہ تحریر دیکھی ہوتی تو ضرور تسلیم کرتے کہ بجٹ اور ہوم چارجز پر بیسیوں برس پیشتر غریب اردو اخباروں کی نظر تھی - یہ تحریر اخبار مذکور کے صفحہ ۲۵۰ پر ہے - عنوان ہی آج کل کے اعالی صحافت کو چونکانے والا ہے - ملاحظہ ہو :—

" ہندوستان کی کمائی انگلستان نے کھائی "

تحریر کیا ہے اعداد و شمار کی طویل فہرست ہے جسے چھوڑ دیا جاتا ہے - یہ جملہ ملاحظہ کے قابل ہے :-

" منجملہ ان اخراجات کے ایک یہ ہے کہ جناب ڈیوک آف ایڈنبرا نے ہندوستان کے روسا کو ہدیہ دینے کے لئے جن چیزوں ..

کو مول لیا تھا اور اون کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے
جتلے عہدہ دار سب لندن سے کلکتہ آئے تھے اون کے جہاز کے
کرایے میں مبلغ ایک لاکھہ آٹھہ سو اسی روپیہ خرچ ہوا تھا“ ۔

انکم ٹیکس لوگوں کو تو ناپسند تھا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے قواعد ضرور ناواجب طور پر سخت اور غیر معقول ہوں گے ۔ کیونکہ اخبار یہ خبر دیتا ہے کہ :—

" ۲۸ جولائی کو لندن سے تار برقی پر یہ خبر آئی کہ ۲۷ تاریخ کو چند ممبران پارلیمنٹ اور وہ صاحب لوگ جو ہندوستان سے کچھہ تعلق رکھتے ہیں جمع ہوئے ۔ مسٹر چارلس ٹریولین صاحب پریسیڈنٹ نے گورنمنٹ ہند کی دو باتوں پر اعتراض کیا اور کہا کہ اول تو فوج زیادہ ہے دویم رفاہ عام کے کاموں میں بیجا صرف کیا ۔ اس مجمع نے متفق اللفظ ٹکس کے قواعد کی مذمت کی اور یہ درخواست کی کہ ایک منتخب کمیٹی واسطے تحقیقات انتظام خصوصاً فنانشل ڈیپارٹمنٹ کے مقرر ہو“۔

۵ اکتوبر سنہ ۷۰ کا اخبار مخبر ہے کہ :-

" پٹھان کوٹ سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک انگریز ڈاکو ہو گیا ہے معہ چند ہندوستانی رفیقوں کے مسلح ہو کر ڈلہوزی کے رستہ میں مسافرین کو مارتا ہے ۔ اب تک یہ نہیں ثابت ہوا کہ کسی انگریز پر بھی کوئی حملہ کیا یا نہیں“ ۔

۱۲ اکتوبر سنہ ۷۰ کے اخبار میں ایک پروگرام درج ہوا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ سندھ پنجاب دہلی ریلوے کمپنی نے ستلج پر جو پل بنایا تھا مکمل ہوگیا اور اس کے کھولنے کا شگون ۱۵ اکتوبر کو مہاراجہ

پامال کریں گے - اس تقریب میں دھلی سے بھی چند رئیس بلائے گئے تھے -

اس مدت میں کوئی پرچہ فرانس اور پرشیا کی جنگ کی خبروں سے خالی نہیں نکلا - چنانچہ ۱۶ نومبر سنہ ۷۰ کا اخبار غباروں کی لڑائی کی خبر دیتا ہے - لکھا ہے :-

" فرانسیسیوں کی چالاکی میں شک نہیں جب غنیم نے انہیں زمین پر چین نہ دیا تو غباروں میں بیٹھہ کر آسمان کی طرف اڑنے لگے مگر پرشیا والے ان کو پورے استاد ملے آسمان پر بھی ان کا جا تعاقب کیا ... " -

یکم مارچ سنہ ۱۸۷۱ کا اخبار ' برھمو سماج ' کے ضابطہ پر ایک طویل مضمون درج کرتا ہے - ۱۹ اپریل سنہ ۱۸۷۱ کا پرچہ لکھتا ہے :-

" بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا - صاحب پاینونیر لکھتے ھیں کہ سر سالار جنگ مدارالمہام حیدرآباد اور ھمارے سر رچرڈ ٹمپل کے انتظام میں کس قدر تضاد ہے - ایک یہ ھیں کہ نئے نئے ٹیکس رعایا پر لگاتے ھیں ایک وہ ھیں کہ پہلے محصولوں کو موقوف کرتے جاتے ھیں - ھمارے تینوں احاطے ٹیکس کے ظلم سے نالاں ھیں اور قلمرو نظام اس بار گراں سے سبکدوش - اگرچہ حیدرآباد میں بھی میونسپلٹی ہے مگر وھاں مکانوں اور پیشوں پر ٹیکس نہیں بلکہ ایک محصول دو لاکھہ پچاس ہزار روپیہ سال کا جو عرصہ سے پیشہ وروں پر جاری تھا گورنمنٹ نظام نے تین سال تک یک قلم موقوف کردیا "-

معلوم یہ ھوتا ہے کہ انکم ٹیکس باقاعدہ ایجی ٹیشن کے علاوہ سواح کا بھی نشانہ بنا - چنانچہ ۱۰ مئی سنہ ۷۱ کا اخبار ایک مضمون درج کرتا

ہے جس کا عنوان ہے " ناک پر ٹیکس "۔ لکھا ہے یکم اپریل کو گورنر جنرل نے بہ اجلاس کونسل یہ ایکٹ پاس کیا کہ جو لوگ کسی قسم کا ٹیکس نہیں دیتے ان سے بھی ٹیکس لیا جائے گا اس ایکٹ کا نام ' ناک پر ٹیکس " ہوگا۔ جو لوگ نکٹے یا چپٹی ناک والے ہوں گے وہ اس ٹیکس سے مستثنیٰ رہیں گے۔ مگر جو ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنی ناک کٹا لیں گے یا بگاڑ دیں گے وہ بموجب دفعہ ۱۰۱ تعزیرات ہند سزا پائیں گے "۔ بڑے مزے کا اپریل فول ہے۔

۲۰ ستمبر سنہ ۷۱ کا اخبار مسٹر فور سایتھ کمشنر جالندھر کی مفصل رائے کا ترجمہ چھاپتا ہے جو انہوں نے اخبار ایشیا ٹک مطبوعہ ۱۳ جون سنہ ۷۱ میں چھپوائی تھی اس کا لب لباب یہ ہے کہ " ہندوستانیوں کو حکومت ہند میں بہرہ کافی دینا چاہئیے "۔

پھر جوتی کا جھگڑا

۱۱ اکتوبر سنہ ۷۱ کا اخبار راوی ہے کہ :-

" ایک سخت اور تند مزاج قایم مقام ڈپٹی کمشنر ملک اودھ نے بعض معزز اشخاص سے بہت سختی کے ساتھ گفتگو فرمائی کہ اگر تم انگریزی جوتا پہن کر ہمارے فرش پر آؤ گے تو ہم ہرگز نہ آنے دیں گے - اونہوں نے گورنر جنرل کے آرڈر کا حوالہ دیا مگر صاحب نے نہ مانا "۔

۲۵ اکتوبر سنہ ۷۱ کا اخبار گورنمنٹ کے اس نئے حکم کی مخالفت کرتا ہے جس کی رو سے سرکاری ملازم پچپن سال کی عمر کو پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش کر دئے جائیں گے۔ اس طویل افتتاحیہ میں سے صرف ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے :—

" شیخ شیراز کے مصرع -قدیمان خودرا بیفزاے قدر- پر کیا

خوب عمل ہوا علاوہ اس کے سرکار کو تنخواہ زاید محض بے سود
دینی پڑے گی یعنی جو لوگ برخاست ہوں گے انہیں نصف تنخواہ
بطور پنشن ملے گی اور ان کی جگہہ پر جو مامور ہوں گے ان کو
پوری تنخواہ دینی پڑے گی " —

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۱ ع میں لاہور سے ایک اخبار عربی زبان میں نکلتا تھا - اس پر ۲۰ دسمبر سنہ ۷۱ کے اخبار میں معرفانہ تبصرہ ہے - یہ پتا نہ چلا یہ جدت کس دماغ سے پیدا ہوئی —

۵ جنوری سنہ ۱۸۷۰ کے اکمل الاخبار میں ایک " انگریزی خواں کی فریاد " اس طرح شروع ہوتی ہے : —

" بھلا سرکار سے کوئی یہ تو پوچھے کہ اتنے ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھا کر کیا کرے گی - ان کو کہاں تک روزگار دے گی - جانے دو ہم آپ ہی دیکھیں کہ اتنے ہندوستانی انگریزی پڑھ کر کیا کریں گے - یہ بی - اے - ایم - اے یا کچھہ اور کھونکر جئیں گے - آپ ہی فرمائیے ہمارے لیے وجہ معاش کی کیسی قلت ہے - ہم تو الی سیکھہ نہیں سکتے جس سے شیکسپیر کی طرح نام اور معاش دونوں پیدا کرلیں ... کمر باندھ پورٹ ملتو ھاتھہ میں لیے ہم استریلیا بکریاں چرانے نہیں جا سکتے - کمانڈر انچیف کبھی ہونے سے رہے - جہازی فوج میں ہمیں کون پوچھتا ہے - فوج میں ہم گھسنے نہیں پاتے - دنیا میں جو معزز وسیلے معاش کے ہیں ان میں ہمارا دخل نہیں اب بتائیے رہا کیا - آپ کہیں گے سول کے عہدے - بجا - لیکن آپ نے دیکھا بھی کتنے ہندوستانی انگریزی خواں عہدوں پر ہیں - اتنے ہیں کہ انہیں

انگلیوں پر گن لیجئیے - ولایت جانے کی ایک پخ لگی ہے ...
مطبعوں میں اتنی گنجایش نہیں کہ مضمون نویسی یا نامہ نگاری
پے بسر اوقات کریں - کسی پیشے کی طرف (لہار - بڑھئی کے)
اگر رغبت کرتے ہیں تو گھر کی خواجہ زادگی جاتی ہے -
تجارت کے لیے سرمایہ اتنا اثاثہ کہاں - بہت ہوئے بہت ہوئے
کسی دفتر میں نوکر ہوگئے لیکن وہاں بھی نقل نویس ہی رہے -
پولس میں بہت بڑھے تو تھانہ دار - کچہری میں بہت دوڑے
تو سرشتہ دار - مال میں جا گھسے تو تحصیلدار - محکمہ افیون
و نمک میں جا پھنسے تو داروغہ ہوگئے اور عمر بھر رہے - ریل
پر بنگالی گھسنے نہیں دیتے - بنک گھروں اور بڑے بڑے سوداگروں
کے کارخانہ میں پارسی بھرے ہوئے ہیں - متعہد عہدوں کا نام
لیں یہ ہماری مجال نہیں - غیر متعہد عہدے یہ ہندوستان زا
صاحب لوگ نہیں چھوڑتے - رہے دو چار ہندوستانی جو
معزز عہدوں پر ہیں ان کا ذکر نہیں - عام سے کلام ہے -
فرمائیے یہ تھوڑی مصیبت ہے جیئیں تو کیونکر جیئیں - شکایت
نہ کریں تو کیا کریں " —

یہ تحریر اقتصادی پہلو سے اور آج کل کی تعلیم یافتہ بے روزگاری
کے لحاظ سے اتنی وقیع سمجھی گئی کہ یہاں بجنسہ نقل کردی گئی -
زیست کی یہ کشمکش جسے آپ آج رو رہے ہیں اب سے ساتھہ پینسٹھہ برس
پہلے شروع ہوگئی تھی - ملک کے صاحبان بست و کشاد کا فرض تھا کہ میکالے
کی فصاحت و بلاغت سے مسحور نہ ہوکر جبھی سوچتے کہ اس حالت کا انجام
کیا ہوگا - ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ کو بتایا گیا تھا کہ اس وقت تمام

صوبۂ پنجاب سے یعنی پنجاب خاص - سرحدی صوبے - دھلی اور پنجاب کی ریاستوں سے کل بارہ نوجوان ایف - اے میں پاس ہوئے تھے - آج صرف پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی ھی کی تعلیمی پیداوار پر نظر ڈالیے - زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں صورت حال سب پر ظاہر ہے —

ھندوستان کی صدائے احتجاج انکم ٹیکس کو آخر لے ھی مری - یہی اخبار انگلشمین کے حوالے سے راوی ھے کہ " یہ شبہہ انکم ٹیکس موقوف ہوگیا کیونکہ سنہ ۱۸۷۳ - ۷۴ کے تخمینوں میں کہیں انکم ٹیکس کا ذکر نہیں " —

ظاہر یہ ہوتا ھے کہ اسی سال یعنی سنہ ۱۸۷۳ ع سے پنجاب گورنمنٹ گزٹ اردو میں چھپنا شروع ہوا —

لارنس گزٹ میرٹھ ۵ جنوری سنہ ۱۸۷۲ کا لارنس گزٹ خبر دیتا ھے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرنس کے امتحان میں جو مختلف مقاموں اور صوبوں میں ہوا کل سات سو چھبیس امیدوار کامیاب ہوئے —

۱۶ فروری سنہ ۷۲ کا اخبار ارل میو گورنر جنرل کے قتل کی خبر اس شعر سے شروع کرتا ھے :—

رقم کس طرح ہو یہ حال تباہ
قلم کے نکلتے ھیں آنسو سیاہ

قانون داں حضرات یہ خبر نہایت دلچسپی سے سنیں گے جو ۱۳ فروری سنہ ۱۸۷۴ کے لارنس گزٹ میں چھپی ھے :—

" لارنس گزٹ کے ایک کارسپانڈنٹ صاحب جہند سے رقم فرماتے ہیں کہ چرخی دادری کے تھانہ دار نے چار ڈاین عورتوں کو جو بچوں کا کلیجہ نکال لیتی ھیں بذریعہ چالان ریاست جہند میں بھیجا ھے - یہ مقدمہ روبرو مہاراجہ صاحب بہادر کے پیش

ہوگا اگرچہ یہ بات بعید از قیاس ہے مگر ہم نے سنا ہے کہ جادو
کے زور سے ڈاین عورتوں کو یہ رتبہ حاصل ہو جاتا ہے کہ جس
کا چاہیں کلیجہ نکال لیں یعنی بدن سے غایب کردیں "—

لارنس گزٹ کے کارسپانڈنٹ صاحب یا اس کے اڈیٹر صاحب ڈاین اور جادو کی نسبت چاہے کچھ رائے رکھتے ہوں سنہ ۱۸۷۴ ع میں ملک میں مجموعہ تعزیرات عمل رایج تھا اور اُس وقت یورپ کے ملکوں میں بھی جادو گری مہمل چیز قرار پاکر قوانین متعلقہ سے خارج ہو چکی تھی - یہ کس طرح معلوم ہو کہ مہارجہ صاحب جیلد نے اس مقدمہ میں کیا فیصلہ دیا - یہ کچھ ہی ہو ہمیں یہ دیکھکر بہت تعجب ہوتا ہے کہ داین چڑیل - پچھلپائی وغیرہ صفات عورت کی ذات سے گزشتہ زمانے میں کیوں منسوب کی گئیں - مرد بھی اُس زمانے میں جادو گری کرتے تھے وہ بچوں کا کلیجہ کیوں نہیں نکالتے تھے اس کا جواب یہی سمجھہ میں آتا ہے کہ انہیں بیچاری عورتوں کا کلیجہ جلانے سے فرصت نہیں ملتی تھی —

کھدر اور لنکاشایر - دیسی ملیں اور مانچسٹر مختصر یہ کہ سودیشی اور بدیشی کا جھگڑا آج کا نہیں معلوم ہوتا - کم سے کم سنہ ۱۸۷۴ ع تک تو اس کا پتا چلتا ہے - اگرچہ وہ معاملہ خفیف تھا یعنی جلیکو کے تاگے کا جھگڑا تھا کہ وہ ولایتی سوت کا چل پڑا تھا - لارنس گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل سنہ ۷۴ ع راوی ہے کہ :—

"نوساری کی پارسی عورتوں میں دفعتاً شہرت ہوئی کہ بمبئی
سے کل کا کتا ہوا سوت آیا ہے جس سے پاک ڈورا جلیکو کا
پارسیوں کے لئے تیار ہوگا - یہ سنتے ہی تمام پارسی عورتیں غضبناک
ہوکر اول برجورجی نوروزجی سردار قوم پارسی کے پاس جاکر
فریادی ہوئیں کہ سوت جو کل سے تیار ہوکر آیا ہے اس سے ہماری

سوداگری کو نقصان پہنچیگا " —

لکھا ھے کہ جب سردار مذکور اور پارسی دستور سے حسب منشا جواب نہ ملا تو وہ عورتیں زنانہ سکول میں گھس آئیں جہاں انہوں نے استادوں اور شاگردوں کو ڈرایا - انجام کار رفع نزاع کی نظر سے وہ سوت جو آدھا پونڈ تھا ان بہادر عورتوں کے حوالہ کردیا گیا جسے انہوں نے وہیں تار تار کردیا اور سکول سے اپنی لڑکیوں کو جن کی تعداد تیس تھی اٹھا کر لے گئیں —

۲۲ مئی ۱۸۷۷ ع کے لارنس گزٹ میں ھے :—

"افسروں کالج کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۰ مئی سنہ ۱۸۷۷ ع کو اس امر کا فیصلہ کیا ھے کہ جس طرح مرد طالب علم امتحان یونیورسٹی کلکتہ کا دیتے ھیں اسی طرح عورات طلبہ بھی پردہ سے معرفت عورتوں کے امتحان یونیورسٹی کلکتہ دیا کریں " —

اسی اخبار سے معلوم ہوا کہ ڈاک کا کالکا سے تانگہ میں شملہ جانا اسی سال سے شروع ہوا —

نورالانوار - کانپور | ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۷۴ ع کی اشاعت اخبار کیا خاصا گلدستہ ھے - چوتھائی صفحہ اپنے اخبار کے منظوم اشتہار سے بھرا ھے - باقی مندرجات نظم و نثر یک مصرعی سرخی سے مزین ھیں -

۸ اگست سنہ ۷۴ ع کو یہ اخبار آبدوز کشتیوں کی نسبت یہ خبر دیتا ھے :—

"جرمنی کے میر بحری نے کئی کشتیاں پانی کے اندر چلنے والی واسطے تباہ کرنے جہاز دشمنوں کے بہ صنعت جدید ایجاد کی ھیں ... ... "

عام لوگوں کا خیال ھے کہ ایسی کشتیاں فرانس کی ایجاد ھیں -

جنگ جرمن میں ان کا زبردست استعمال جرمنی کی طرف سے ہوا
ایک مراسلت کا عنوان ہے - " نامۂ احباب کے ہیں یہ مضامین لطیف "

اخبار سین تھفک، سوسائٹی - علی گڑھ	انگریزی میں اس کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ لکھا ہے - یہ ہفتہ وار تھا - بعد میں ہفتہ میں دو بار ہوگیا تھا -

پہلے چند صفحے پہلو بہ پہلو اردو اور انگریزی میں ہوتے پھر صرف اردو - کل اخبار ٹائپ میں چھپتا - صفحوں کا شمار انگریزی کے مطابق بائیں طرف سے ہوتا - ۷ مارچ سنہ ۱۸۷۶ ع کی اشاعت پر جلد ۱۱ نمبر ۱۹ درج ہے - سالانہ قیمت اٹھارہ روپیہ اور ڈاک کا محصول ڈیڑھ روپیہ تھا —

مذکورہ بالا اشاعت میں ہندوستانی جوتے کے معاملہ پر اردو اور انگریزی میں ایک لمبا مضمون ہے - لارڈ نارتھ بروک کے استعفے پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" ہم لارڈ نارتھ بروک صاحب بہادر کے عہد حکومت کی نسبت عموماً نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں اور گو بہ نظر ظاہر بڑودہ کے مقدمہ میں صاحب ممدوح سے غالباً غلطی ہوئی اور ہمارے نزدیک بھی اس میں خلاف دور اندیشی طریقہ اختیار کیا گیا جیسا کہ قحط کے معاملہ میں غلطی ہوئی تھی اور اس میں چند امور خلاف دور اندیشی اختیار کئے تھے مگر ان دونوں صورتوں میں صاحب ممدوح کا اصل منشا نہایت عمدہ اور عالی تھا" —

یہ سر سید احمد خاں مرحوم کے قلم کی عشوہ گری ہے - اس کو کہتے ہیں مدبرانہ طرز تحریر - جو کہنا تھا وہ کہہ گئے اور اپنا دامن بھی بچا گئے —

۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۷۵ ع میں " تہذیب اور بد تہذیبی " کے عنوان کے نیچے ایک مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے :-

"جس طرح کل ہندوستانیوں کا سفید رنگ ہو جانا اور ہر ایک ہندوستانی کا کوٹ پتلون پہن لینا اور ہندوستانی عورتوں کو انگریزی لباس زیب بدن کرکے بے پردہ گلی در گلی پھرنا دشوار ہے اسی طرح ہندوستانیوں کی تہذیب اور شایستگی کا صاحبان یورپ کے دل نشین ہو جانا بھی محال ہے - ہندوستانی کتنے ہی علوم و فنون میں کمال حاصل کریں اور کتنے ہی دیانت دار اور خوش کردار ہو جائیں مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بے ایمان اور پھر مہذب ہی رہینگے اور انگریز چاہے جتنی بد افعالیاں کریں مگر وہ شریف کے شریف ہی ہیں ......" -

۱۰ مارچ سنہ ۱۸۷۶ ع کی اشاعت میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے :-

" انگریزی اخبار نویس ہندوستانی اخباروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں " —

۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۶ ع کا اخبار راوی ہے :-

"اخبارات ڈیلی ٹیلیگراف میں ایک دلچسپ تجویز پیش ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر دیسی سرداروں کو خطاب ڈیوک کا دیا جاوے ... ... ہوس آف لارڈ سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ ان ہندوستانی لارڈوں کو وہ اپنی جماعت میں داخل کر لیں" —

۳۱ مارچ سنہ ۱۸۷۶ ع کے اخبار میں ایک طویل اور مدلل مضمون اس موضوع پر ہے کہ :- " بیوہ عورتوں کا نکاح ثانی نہ کرنے میں کیا فساد ہے ؟ "-

اسی اخبار میں ایک اور مضمون ہے جس کا عنوان ہے :- " بعض سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں متنفر ہے " - اس مضمون کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

" اب یہاں تک تو ہم نے سرکاری تدابیر سے فائدہ حاصل نہ ہونے کے اُن اسباب کو بیان کیا جو خاص رعایا کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں - اب ہم اُن اسباب کو

بیان کرتے ہیں جو خاص انتظام ہی کے متعلق پیدا ہوتے ہیں- منجملہ ان کے ایک ان ملازموں کی کج اخلاقی اور ظلم اور زیادتی- اور اگر ہم سچ سچ کہیں تو بعض اوقات ان کی بد معاشی اس بات کی باعث ہے کہ ہندوستانی ان کی صورت دیکھنے اور ان کے پاس جانے سے اپنا مرنا بہتر جانتے ہیں .... "—

(۵ - مئی سنہ ۱۸۷۹ کے اخبار میں مختلف واقعات کی ذیل میں ایک نوٹ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں آتا ہے - انگریزی میں آیا ہے "Impressions or sentiments" اردو میں ان کے معنوں کو "خیالی باتوں" میں ادا کیا گیا ہے - یہ ترجمہ نہ جب درست تھا نہ اب ہے - اب تو ان دونوں کلموں کی جگہ اردو میں "ارتسام" اور "وجدانیات" استعمال ہوتا ہے) -

۱۱ - مئی سنہ ۱۸۷۹ کے اخبار میں ایک زبردست افتتاحیہ درج ہے جس کا موضوع ہے "شاہ جہاں پور کا واقعہ" - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ جہاں پور میں کسی انگریز نے تین ہندوستانیوں کو قتل کر دیا تھا اور اپنے بیان میں کہا تھا کہ جب سے اس نے کانپور میں اس یادگار کو دیکھا جو سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں مظلوم یورپین کے قتل کی بابت بنائی گئی ہے اس وقت سے اسے ہندوستانیوں سے سخت دشمنی ہو گئی - لکھا ہے :—

"نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس نادان یورپین نے ان بیچارے ناکردہ گناہ ہندوستانیوں کے قتل کو اس ظلم کی مکافات تصور کیا جو سنہ ۱۸۵۷ ع کے ہنگامہ میں کسی اور کے طرف سے ہوا تھا اور جس میں ان مقتول ہندوستانیوں کو کچھہ بھی دخل نہ تھا - ...."—

اسی مضمون میں آگے جاکر لکھتے ہیں :—

ہم کو یاد ہے کہ اس بارے میں ہم نے اپنی ایک رائے بھی دی تھی جس کا منشا یہ تھا کہ ایسی یادگاریں ہمیشہ کینہ کو تازہ کریں گی اور فساد کو بڑھاویں گی۔ پس اسی طرح ہم اب یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ پر بہ نظر بقاء امن و امان ضرور ہے کہ وہ ایسی جملہ یادگاروں کو نیست و نابود کردے۔..........." —

چند سال ہوئے لاہور میں لارنس کے بت کے کتبہ پر بہت جھگڑا ہوا۔ مدتوں گورنمنٹ اور پبلک میں کشمکش رہی۔ مگر اب گورنمنٹ کی مصلحت اندیشی نے سر سید کے مشورے پر عمل کرنا مناسب سمجھا —

ابھی کل کی بات ہے جب سارڈا ایکٹ اسمبلی کے زیر غور تھا تو ہمارے ارباب وطن کے ایک طبقے نے اس کی مخالفت کی تھی اور اپنی جماعت کو اس کے اثر سے مستثنیٰ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۲ - مئی سنہ ۱۸۷۹ کے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک صاحب "قانون میعاد نکاح" کی تجویز پیش کرتے ہیں —

۱۵ - ستمبر سنہ ۱۸۷۰ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مفصل افتتاحیہ درج ہے جس کا عنوان ہے "ہندوستانیوں کا خون"۔ یہ سرخی صنعت براعت استہلال کا حکم رکھتی ہے۔ یہ مضمون مسٹر فلر کے مقدمہ میں لارڈ لٹن کی تنبیہ کے حوالے سے شروع ہوتا ہے۔ پھر مختلف مقامات میں چھہ ہندوستانیوں کے قتل کا ذکر کیا ہے جو حال میں یورپینوں کے ہاتھہ سے ہوئے تھے۔ مضمون طویل ہے۔ سردست اس اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے :—

("قانون تعزیرات ہند کے اس حکم سے کہ اشتعال طبع کی

حالت میں قتل عمد نہیں رہتا اور اگر آلہ قتل سے قتل نہ کرے تو قتل عمد نہیں ہوتا یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ بے رحم لوگ نہایت جری ہوگئے تھے اور ہر شخص اپنے دل کے غبار نکالنے اور قتل میں کامیاب ہونے کے واسطے اشتعال طبع کا حیلہ پکڑنے لگا تھا مگر تاہم کچھہ اندیشہ تھا۔ اور جب سے کہ شاہ جہاں پور میں ایک گورے کے ہاتھہ سے تین ہندوستانی مقتول ہوے اس وقت سے آلۂ قتل کی بھی چنداں پروا نہ رہی اور لکھنؤ میں آج کل ایک چوکی دار کا شکار بندوق سے ہی ہوا۔ اور اگر آیندہ ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جوریوں کی نیت بہ خیر رہی تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے نشہ باز ہونے سے بڑی گنجایش ہوگی اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی " —

اسی اخبار سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۷ - اکتوبر سنہ ۱۸۷۶ کو سر ولیم میور کو جو ایڈریس علی گڈہ میں دیا گیا جس کے سکریٹری سر سید احمد خاں تھے وہ عربی زبان میں تھا —

اودہ اخبار نہ صرف دہلی والوں بلکہ تمام علم دوستوں کو اس کا بڑا قلق تھا کہ وہاں جو دربار قیصری کا انعقاد ہوا تو اس سے امید تھی کہ دہلی کی شان میں ایزادی ہوگی - الٹا یہ ہوا کہ قدیم دہلی کالج توڑ دیا گیا - ۱۷ - جولائی سنہ ۱۸۷۷ کا اودہ اخبار راوی ہے کہ :-

" مسٹر فاسٹ صاحب دہلی کالج کے ٹوٹ جانے کا قضیہ ہوس اف کامنس میں پیش کرنے والے ہیں - اور انڈیا آفس سے اس باب میں تار برقی بھی آئی ہے اور اس میں لکھا ہے کہ کیونکر اور

کیوں یہ کالج توڑ دیا گیا " —

اخبار عام | ٦ فروری سنہ ۱۸۷۱ کا اخبار عام کلکتہ یونیورسٹی کے سنہ ۱۸۷۱ کے بی۔اے کا نتیجہ شایع کرتا ہے - اس سے پایا جاتا ہے کہ اکیس تعلیمی اداروں نے دو سو بارہ امیدوار اس امتحان میں بھیجے جن میں سے کل چوراسی پاس ہوے - سب سے زیادہ طلبا پریسڈنسی کالج کلکتہ نے بھیجے یعنی ۷۹ - جن میں ۳۵ پاس ہوے - دھلی کالج تین میں سے ایک لاهور کالج سے صرف ایک امتحان میں بیٹھا جو فیل ہوگیا - ان اعداد کو یونیورسٹیوں کے آج کل کے نتائج سے کیا کوئی نسبت ہے —

۱٦ اگست سنہ ۷۱ کا اخبار سول سروس کے امتحان کا نتیجہ شایع کرتا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ کل ۴۸ پاس ہوے جن میں سے بابو رومیش چندر دت دوم نمبر پر رہے اور آٹھ سو کا انعام پایا ان کے سوا دو اور ہندوستانی امیدوار اس امتحان میں پاس ہوے۔ یعنی بابو بہاری لعل گوپت چوتھے نمبر پر اور بابو سراندرو ناتھ بنرجی بیسویں نمبر پر —

(۱۷ اپریل سنہ ۷۱ کا اخبار بتاتا ہے کہ:-

"لاهور گورنمنٹ کالج جو کہ پہلے هیرا منڈی میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں تھا اب انار کلی میں جہاں پہلے لاهور کرانیکل تھا چلا گیا ") —

یکم مئی سنہ ۷۱ کا اخبار انجمن پنجاب کے جلسہ منعقدہ ۲۷ اپریل کی کارروائی دیتا ہے جس کی یہ دو مدات دلچسپی سے خالی نہیں —

"تجویز دوم - گورنمنٹ میں ایک درخواست اس مضمون کی روانہ کی جاوے کہ کل جلسوں میں جہاں صاحبان

یورپین، دیسی دونوں شامل ہوں تقریر صرف بہ زبان اردو ہوا کرے" —

"تجویز سوم - نوکری بلا کسی وجہ خاص کے کسی شخص کو سوائے دینے کسی امتحان کے نہ ملا کرے" —

معلوم یہ ہوتا ہے کہ چٹا گونگ اور اس کے قرب و جوار کی آب وہوا نفسیاتی صحت پر خاص اثر رکھتی ہے - حال میں جو کچھہ اُس نواح میں ہوا اور ہورہا ہے بیان کا محتاج نہیں - ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں ہمیشہ ایسی ہی ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہی ہیں - چنانچہ ۸ مئی سنہ ۷۱ کے اخبار عام میں لکھا ہے :-

"چٹی گونگ - یہاں کے منصف سخت مصیبت میں ہیں - مستغیث لوگوں نے جن کے مقدمے کچہریوں سے خارج ہوجاتے ہیں کیا عادت سیکھی ہے کہ اس منصف کے گھر میں جس نے ان کے بر خلاف فیصلہ کیا آگ لگا دیتے ہیں —

۱۵ مئی ۱۸۷۱ کا اخبار یہ لوکل خبر معہ اپنے حاشیہ کے لکھتا ہے :-

"لاہور - ایک انگریزی اخبار سے منکشف ہوا کہ چیف کورٹ پنجاب نے ایک لڑکے کے واسطے جس کی عمر تیرہ سال کی تھی ایک اور لڑکے کو کوئیں میں دھکا دے کر گرادینے کے جرم پر حبس دوام کا حکم صادر فرمایا - تھوڑے دن ہوے کہ ایک گورے نے ایک لڑکے کو لاہور میں ایک خندق میں دھکا دے کر مار ڈالا اور صرف ایک ہی سال کی قید سخت کا حکم ہوا تھا - حقیقت میں انصاف کے یہی معنی ہیں" —

۱۳ مئی سنہ ۷۱ ع کے پرچے میں ایک نہایت اہم افتتاحیہ درج

ہے - صاحب اخبار نہایت دلسوزی سے شاکی ہیں کہ گورنمنٹ انگریز بہادر نے جو انگریزی اور فارسی کی تعلیم عام کردی تو اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ جس طرح ان کے وطن میں سب پیشہ ور تعلیم یافتہ ہیں اور وہ لوگ تعلیم پاکر اپنے اپنے پیشے کی ترقی اور ایجادیں کرتے ہیں ویسا یہاں بھی ہوگا - لیکن یہاں نتیجہ الٹا ہوا - پڑھ لکھ کر لوگوں نے اپنے پہلے کام کو بھی دھتا بتائی ایجاد و اختراع کا تو ذکر ہی کیا" -

۷ جون سنہ ۷۱ کا اخبار خبر دیتا ہے کہ پانچ روپیہ کا کرنسی نوٹ عنقریب جاری ہو جائے گا -

۱۹ جولائی سنہ ۷۱ کے اخبار میں دو دلچسپ خبریں درج ہیں :-

(۱) " حبشی غلاموں کا فروخت ہونا شہر بمبئی میں ۵۵ حبشی اطفال بسواری جہاز دخانی وارد ہوئے ہیں اور وہاں کے کمشنر پولیس کی نگرانی میں ہیں جو اشخاص ان کو نوکر رکھنا چاہیں اپنی درخواست پیش کریں " -

(۲) ' قصاص - ۷ جولائی کے انگلشمین میں درج ہے کہ ایک گورہ سپاہی رابلسن جس نے مقام اسیرگڈہ میں ایک شخص تھکرو نامی کو سڑک پر چلتے ہوئے مار ڈالا تھا اس کو چیف جسٹس بمبئی نے پھانسی کا حکم دیا -

۲۶ جولائی ۷۱ کے پرچے میں لکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی رائے میں لکڑی کاٹنے کا وقت اترتے چاند کے دنوں میں ہے - چڑھتے چاند میں کاٹی جائے گی تو ناقص اور ناپائدار ہوگی - انگلستان میں اس کی پابندی کرتے ہیں اور فرانس میں تو چڑھتے چاند لکڑی کاٹنے کی قانوناً ممانعت ہے - ایک صاحب لکھتے ہیں کہ برازیل میں فن فلاحت کے ایک بڑے ماہر نے اپنے تجربے سے یہ سمجھایا کہ جو لکڑی پورنماسی کے قریب کرائی گئی

تھی اس کو جلد دھن لگ گیا اور وہ خراب ہو گئی —

۴ اگست سنہ ۷۱ کے اخبار میں سر ڈانلڈ میکلیوڈ سابق لفٹنٹ گورنر پنجاب کے ایک خط کا ذکر ہے جو لندن ٹائمس میں چھپا تھا - اس کا یہ اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے :—

" جب تک معاملات سلطنت ہند میں ہم ہندوستانیوں کی صلاح نہ لینگے کبھی وہ معاملات بہتری کی طرف رجوع نہ کریں گے "

۹ اگست کے اخبار میں حضرت سلطان روم کی نئی کشتی 'کھک' کا تذکرہ اور تصویر بھی ہے ۲۳ اگست کے اخبار میں ناصرالدین شاہ ایران کی تصویر اور بوشہر کا نقشہ ہے - ۳۰ اگست کا اخبار 'روڈ ستیمر' کا حال اس طرح لکھتا ہے :—

" درحقیقت روڈ ستیمر یعنی اُس قسم کی ریل گاڑی جو کنکر کی کچی سڑک پر چلے بنی ہے ہندوستان میں یہ روڈ ستیمر راولپنڈی سے جہلم تک واسطے روانگی ڈاک اور مسافروں کے جاری ہوگی —

۲۹ نومبر سنہ ۷۱ کے اخبار میں ایک وحشت ناک خبر مثنوی کی صنف میں نظم کرکے لکھتے ہیں - عنوان ہے " ظلم ایک زنگی مردم خوار کا " ملاحظہ ہو :—

اخبار نسیم جونپور کا　　　ہے واقع ظلم یہ سناتا
جبرالٹر اک جگہ کا ہے نام　　　زنگی کوئی واں تھا بدسرانجام
اس نے لڑکا کسی کا پکڑا　　　شہ رگ سے سب اس کا خون چوسا
ہر چند وہ چیختا اور کیا غل　　　یہ پی گیا خون بے تامل
اس پر یہ نیا ستم دکھایا　　　اک ہونٹ بھی اس کا بھون کھایا
ہیں 'مہجر' جہاں میں ایسے بھی مرد　　　جن کو ہم جنس کا نہیں درد

بدیا بلاس

جموں کا اخبار بدیا بلاس اپنی دسمبر سنہ ۷۳ کی اشاعت میں سرکار انگریزی کی فوج کے مصارف کے سلسلہ میں یہ دلچسپ اعداد شایع کرتا ہے :—

" ایک ماہری توپ خانہ گھوڑے کا خرچ ایک لاکھ پانچ ہزار دو سو چالیس روپیہ سالانہ ہے ایک رجمنٹ سواران فوج گورہ کا خرچ تین لاکھ ساٹھہ ہزار پانسو تیس روپیہ سالانہ ہے - ایک ہندوستانی سواران رسالہ کا خرچ دو لاکھ انتالیس ہزار چھہ سو دس روپیہ سالانہ ہے "

اخبار انجمن پنجاب

۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۳ ع کا اخبار انجمن پنجاب راوی ہے کہ :—

" مسٹر کروم صاحب بہادر نے شیر کےشکار کےلئے ایک عجیب پوشاک ولایتی ٹاٹ کی بنائی ہے اس میں بہ وسیلہ چمڑے کے لوہے کی تین تین انچ لمبی میخیں نوکدار اور نہایت پائدار لگائی ہیں اور دوسری یہ خوبی ہے کہ جس جگہ شیر اپنا پنجہ یا منہہ مارے تو خود زخم شدید کھاوے اور شکاری کو کسی قسم کی ایذا نہ پہنچے - یہ پوشاک سر سے پانو تک اسی قسم کی بنائی گئی ہے "

ترجمان شرق

یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ استنبول سے ایک اخبار ' دارالخلافۃ ' فارسی زبان میں نکلتا تھا - سنہ ۱۸۷۸ میں وہیں سے ایک اخبار اردو زبان میں بھی نکلنا شروع ہوا - اس کا نام تھا اخبار ' ترجمان شرق ' اس اخبار کے نکالنے والے آیا ترک ہی تھے یا کوئی ہندوستان سے گیا ہوا شخص تھا ؟ یہ نہ معلوم ہوسکا - بہر حال

یہ اخبار پین ایشیاٹک تحریک کا علمبردار معلوم ہوتا ہے - یہ اخبار پندرہ روزہ تھا اور اخبار دارالخلافۃ والے ہی اس کے بھی سر براہ کار تھے - ایک اقتباس اس اخبار کا ملاحظہ ہو :—

" روس و ترکی، ضلع شملہ کے باب میں (نھواوفوس) نام اخبار لکھتا ہے کہ روسی شہر مذکور کے قریب ہوتے جاتے ہیں چنانچہ دو فرقہ ہوکر ایک پندرہ پلٹن اور دوسرا بھی پندرہ پلٹن اور ایک آلائی سواری سے مرکب ہونے کے لئے ہر دو فرقہ عسکر (قرۂ کو: کوئی) کو آیا ہے اور اسی ہر دو فرقہ عسکر کی پاس آٹھہ باتر یا توپ ہونے سے تیس ہزار نفر کے لئے یہ اس قدر توپیں بہت زیادہ خیال کی جاتی ہیں - ضلع شملہ میں جو خبریں شایع ہوئی ہیں اون کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شملہ اور وارنہ کی قلعوں میں عساکر دولت علیہ سے صرف دس پلٹن رہیں گی باقی سب عساکر شاھانہ وہاں سے نکل جائیگا "

یہ شملہ اُس وقت کی ترکی یا اس کے توابعات میں معلوم ہوتا ہے - اس تحریر کی زبان اور اسلوب سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہوئی نہیں - فوج کے حصہ کے لئے ' فرقہ ' اور 'عساکر' (جمع عسکر) کے لئے فعل صیغہ واحد استعمال ہوا ہے - اس کے علاوہ ساری عبارت کا اسلوب انوکھا ہے - اور اہل اردو کے قلم سے نہیں معلوم ہوتا —

نصرت الاخبار - دہلی

روس اور روم کی سنہ ۱۸۷۷ ع کی جنگ کے دوران میں سرکار برطانیہ کسی طرف نہ ہوئی -

اس لئے تمام رعایا کو غیر جانب داری کی تاکید کی گئی جو ہندوستان پر بھی عاید ہوئی - یہاں زخمی اور بیوں اور جنگ کے یتیموں کی امداد کے لئے چندے ہوے - سر سید احمد خاں شاید مزید احتیاط کی رو سے اس فنڈ میں چندہ دینے کے بھی خلاف تھے - نصرت الاخبار نے اس کے خلاف بہت کچھہ لکھا - ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۷ کے اخبار میں لکھا ہے :-

" واے بر حال ان مسلمان اشخاص کے جو خود تو سعی نہ کریں اور اگر کوئی کرے اس میں خارج ہوں ... ایسے اشخاص مسلمان کاھیکو ہیں برادر زادگان روس سمجھنے چاھئیں - اور بھی در بیش باعث حیرت و بوالعجبی یہ ہے کہ ہندو صاحبان صرف بوجہ محبت اہل اسلام ہند مساعی جمیلہ اعانت روم میں فرمادیں اور بعض اشخاص باوجود ادعاے اسلام مخالفت روم کا قشقہ اپنی پیشانی پر کھچوائیں ... کوہ کسولی میں منشی گنگا بشن صاحب نے ۱۰ ماہ جون سنہ رواں کو مسجد کسولی میں مسلمانان مقام مذکورہ کو جمع فرماکر ایک نہایت دلچسپ طولانی اسپیچ واسطے اجتماع چندہ امداد بیوگان و یتیمان عساکر سلطان روم خلداللہ ملکہ بڑی عمدگی سے ادا فرمائی جس کی پر تاثیر ہونے کے سبب سے اسی جلسہ میں دو سو روپیہ جمع ہوگئے اور اب ڈگسائی اور سباتھو و کسولی ہر سہ مقامات پر منشی صاحب کی جانب سے واسطے اجتماع چندہ کے اور کوشش جاری ہے "-

۱۱ جولائی سنہ ۷ ا ع کے اخبار میں ایک مضمون ہے جو ہندوستان کے اقتصادی بہی خواہوں کے لئے دلچسپ ثابت ہوگا - لکھتے ہیں :-

ہندوستانی بیچارے کوئی چیز بناویں تو اول کوئی قدر نہیں کرتا مثلاً نمونہ گجرات کی کہ روے زمین پر مثل اس کے نہیں ہوتی مگر راجپس کا ہی دم بھرتے ہیں - اور پارچہ زربن بنارس کا کہ پائدار عمدہ ہوتا ہے مگر ولایتی کی قدر ہے - خصوص عمارت کہ دو دو ہزار برس کی موجود ہیں ... "-

۱۱ نومبر سنہ ۷۷ کا پرچہ ایک خبر نہایت عجیب سناتا ہے :-

" نواب صاحب لوہارو کو اوس لیاقت کے صلہ میں جو انہوں نے انگریزی میں حاصل کی ہے گورنمنٹ نے دو توپیں معہ کل سامان کے انعام دی ہیں "-

۱۱ جنوری سنہ ۷۷ کا اخبار 'ہندوستانیوں کا قصاص' کے عنوان کے نیچے لکھتا ہے :-

" ٹائمز آف انڈیا کا لندن سے ایک کارسپانڈنٹ لکھتا ہے کہ ایمپرس آف انڈیا نے ویسرائے صاحب کو ایک خط اس مضمون کا لکھا ہے کہ جہاں تک ہوسکے انگریز جو ہندوستانیوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے خون کی کچھ بھی سزا نہیں پاتے اس کی بابت آپ کو چاہئے کہ انگریزوں کو ایسا کرنے سے جہاں تک آپ سے ہوسکے روکیں اور ان کو ایسا کام کرنے پر سزا لایقہ بغیر کسی لحاظ کے دیں "-

۷ آگرہ اخبار - آگرہ | آگرہ اخبار مطبوعہ ۷ جون سنہ ۱۸۷۷ میں سید امجد علی اشہری ایک مضمون بڑی تحقیق اور تلاش کا لکھتے ہیں اس کا عنوان ہے ہندوستان میں فارسی زبان- سنیے :-

" حالات و واقعات بادشاہان سلف و بعض رسایل و اذکار سے

جس قدر مستنبط ہوا عرض کرتا ہوں کہ پیشتر جب اس ملک ہندوستان میں صرف ہندو ہی ہندو راج کرتے تھے اور مسلمانوں کی سلطنت یا حکومت کہیں نہ تھی تب بھی راجگان ہند کی طرف سے جو تحریریں بادشاہان ایران و امراے افغانستان کو جاتی تھیں وہ پارسی میں ہوتی تھیں اور جیسے اب انگریزی لکھنے کو ریاست ہاے اسلام میں انگریزی داں مقرر ہیں اسی طرح اس زمانے میں پارسی لکھنے کے لئے راجاؤں کے پاس پارسی داں منشی رہتے تھے۔ چنانچہ رسالہ تحقیق اللسان تالیف منشی قمرالدین لاہوری میں لکھا ہے کہ پیش از سلطنت اسلام نیز رایان و راجگان ہند با سریر آرایان ایران و افغانستان نامہ ہا و مکاتیب بزبان پارسی می نوشتند و پیغامہا بہ زبان سفیر پارسی می گزاشتند "۔

اس سے پہلے کہ اس قرن کو ختم کیا جاے یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دہلی کے اکمل الاخبار کی سنہ ۱۸۷۳ ع کی جلد میں ان بیس معاصرین کے حوالے موقع بہ موقع آے ہیں :- ۱ اردو گائیڈ - ۲ اخبار انجمن پنجاب - ۳ پنجابی اخبار - ۴ کوہ نور - ۵ دہلی گزٹ - ۶ لارنس گزٹ - ۷ سون ٹیدک علی گڑہ - ۸ پاپونیر - ۹ اودہ اخبار - ۱۰ کارنامہ - ۱۱ نورالانوار - ۱۲ پٹیالہ اخبار - ۱۳ بدیا بلاس - ۱۴ نجم الاخبار - ۱۵ شعلہ طور - ۱۶ اندین مرر - ۱۷ دبدبۂ سکندری - ۱۸ احمد آباد سماچار - ۱۹ کبی بچن سدھا بنارس - ۲۰ نورالابصار -

تیسرے دور پر تبصرہ

۱ - سیاسی جذبات اور قومی احساسات اس قرن میں بیدار ہونے

لگے تھے - انکم ٹیکس کے خلاف زور سے صداے احتجاج بلند ہوئی - سول سروس کی عمر - انگلستان کے ساتھہ ہندوستان میں بھی سول سروس کا امتحان قایم کرنا - جوتے کا معاملہ - ہندوستانیوں کے خون کا قصاص - تعلیم یافتوں کی بے روز گاری - اور سالانہ بجٹ پر نقد و نظر - یہ باتیں اس دور کے خاص واقعات ہیں - آریہ سماج کا قایم ہونا سوامی دیانند اور سید احمد خاں کی اصلاحی تلقین کا پراپگنڈا ملک کی ذہنیت پر قبضہ کر رہا تھا - شمال مغربی سرحد کے معاملوں میں اب زیادہ دلچسپی لینے لگے - مختصر یہ کہ سیاسی دلچسپی حقوق کے مطالبات اور قومی غیرت و خود داری کا عنوان شروع ہو گیا تھا - اور مفید عام مضامین اب زیادہ نکلنے لگے ــــ

اردو ادب کی تاریخ میں بھی اسی دور نے عہد جدید قایم کیا یعنی سنہ ۱۸۷۴ ع میں نئی شاعری کی بنیاد پڑی اور فسانۂ آزاد اودھ اخبار کے ضمیمہ کی طور پر نکلنا شروع ہوا ــــ

انشا | انگریزی سے ترجمہ اب اردو انشا پر اثر ڈالنے لگا - فارسیت کی کمی کے ساتھہ انگریزی لفظ داخل ہو رہے تھے - مثلاً انسٹی ٹیوشن - لائف ممبر - کار سپانڈنس - ڈیپوٹیشن - آرٹکل وغیرہ وغیرہ - اگر چہ اخباری انشا میں فارسی کا وہ عمل دخل نہیں رہا تھا جو اس سے پہلے دور میں تھا لیکن وہ جو کچھہ بھی تھا بہت بد نما اثر ڈال رہا تھا - مثلاً "پنجاب کے کالجوں" کے بدلے " کالج ہاے پنجاب" یا اہالیان ڈیپوٹیشن - ممبران کمیٹی - ماسٹران کالج و مڈل سکول - وغیرہ وغیرہ - کون سا امر مانع تھا جو وہ کمیٹی کے ممبر اور کالج اور مڈل سکول کے ماسٹر' لکھتے - اس کے ساتھہ ہی بعض عجیب اختراعیں اور گھڑنتیں بھی اس عہد کی انشا میں پائی جاتی ہیں - مثلاً 'ہمعصایف' بہ معنی ہمعصر یا معاصر کے - یہ استعمال

لہجاً غلط تھا۔ ' طالب علم دفعہ چہارم ' معلوم نہیں ہوتا کہ یہ دفعہ کس تحریرات میں سے اخذ کی گئی ۔ ' کلاس ' کی جگہ دہلی اور پنجاب میں ' جماعت اور ۔ یو پی اور اودہ میں ' درجہ بولتے تھے اور یہ استعمال ان کا اول سے چلا آتا ہے ۔ مگر یہاں دفعہ استعمال کیا گیا ۔ ریکروٹ کو ہم رنگروٹ کہتے ہیں ۔ انہوں نے اصلی لہجہ کا پاس کرکے اسے ریکروٹ بنا دیا ۔ یہی حال ہتّتال کا ہے ۔ اگرچہ اب ثقل تلفظ کی وجہ سے اس کو ہوتال کہتے ہیں ۔ پھر ایسی ترکیبیں ان کے ذہن پر فارسی اسلوب کی غلامی کا ثبوت پیش کرتی ہیں ۔ مثلاً واسطے تباہ کرنے جہاز دشمنوں کے ۔ برف بھی پڑتا تھا ۔ شہر و بکری ۔ رونق افروزی شہزادہ ویلز الہ آباد ۔ بلٹیں مر رہی ہیں ۔ جو باتیں بیان کیں ہیں ۔ کامیابی اختیار کی ۔ ہال انجمن پنجاب ۔ لکچر کا لفظ ایک ہی تحریر میں مذکر بھی اور مونث بھی استعمال کرنا ۔ اس کے ساتھ بعض اچھی اختراعیں بھی ہوئیں جیسے ' سوشل ترین ' کو ' خاص ریل ' لکھنا اور ' مال ترین ' وغیرہ ۔ اور ایسے فقرے گاڑیاں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں ' نظم سے رغبت اب بھی ویسی ہی رہی چنانچہ ایک خبر کا عنوان ہے —

کرتی ہے اندھا ہوس انسان کو
نیک و بد کچھ بھی نظر آتا نہیں

" ٹیکس کے مادہ میں تحریک " اس میں انگریزی لفظ میٹر کا ترجمہ کر دیا گیا وہ بھی غلط اس لفظ کے بہت سے معنی ہیں اور تھے ۔ وہ معاملہ لکھ سکتے تھے ۔ ایک اور بات جو اس دور کے اکثر اخباروں سے متعلق ہے یہ ہے کہ وہ سرکاری گزٹ کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ عنوان دیا کرتے تھے :— تقرر ' ترقی ' ترخص ' تبدل تفعل کا وزن برابر چلتا تھا —

املا | املا میں اس دور نے کوئی ترقی نہیں کی سوائے اس کے کہ وقفہ یعنی ڈیش کا استعمال ہونے لگا - اور ہر خبر یا مضمون کے ختم پر لفظ ' فقط ' لکھہ دیا ' اس وقت اور ' اس ملک ' میں الف کے سوا باقی سب حروف کو ملاکر لکھنا اب تک جاری تھا - پہلے دور میں ' شالا مار ' کو ' شعلہ مار ' بنا دیا تھا - اب لال ٹین کے الف کو عین سے بدل دیا - شاید اس زمانے میں ساری لال ٹینیں سرخ شیشے کی ہوتی ہوں گی - ' انچ کے آخر میں دو چشمی ' ہ بڑھا دیئے تھے - وغیرہ وغیرہ —

سنہ ۱۸۸۰ ع سے سنہ ۱۸۸۴ ع تک

اردو اخبار | پہلے ہندوستان کے والیان ریاست کی نقل وحرکت اور آپس میں ملنے جلنے پر سرکار اور انگریز اخباروں کی خاص نظر رہتی تھی - ۲ جنوری سنہ ۱۸۸۰ ع کا اردو اخبار لکھتا ہے :-

" ناظرین اخبار کو یاد ہوگا کہ مہاراجہ سیندھیہ پچھلے دنوں واسطے عیادت مہاراجہ صاحب اندور کے رونق افروز ہوئے تھے اس پر اخبار ' بمبئی ریویو ' نے وہ باندھنو باندھا کہ الٰہی توبہ - انگریزی مہذب اخبار اور ایسے لاطایل ڈرپوک خیالات - کچھہ اسی اخبار پر منحصر نہیں بلکہ بمبئی ٹائمز بھی اخبار " بمبئی ریویو " کا اس خاص معاملے میں ساتھی ہے وہ لکھتا ہے :- ' مطلب اس سے (مہاراجہ سیندھیا کے اندور جانے سے) یہ ہے کہ اگر وسط ایشیا میں کچھہ بھی فتور پڑا تو مرہٹوں کی ریاستیں اور حیدرآباد کی ریاست بالکل بر خلاف ہوجائیگی - اس قسم کی بدگمانی اور بد باطنی انگریزی اخباروں کو شایاں نہیں ہے " -

بعض آدمیوں کا بھولا پن بھی کتنا مزے کا ہوتا ہے - فسانہ آزاد اودہ اخبار کے ضمیمہ کی شکل میں ابھی نکل رہا تھا کہ ایک صاحب کے خاتون فسانہ وغیرہ کے وطن اور مکان کا پتا پوچھ ہی تو لیا - اس کا جواب حضرت سرشار و ۹ جنوری کے اخبار میں اس طرح دیتے ہیں :-

" جی بتا چکے "

" بت طناز پیاری حسن آرا بیگم اور ان کی ہمشیرہ سراپا انداز سپہر آرا بیگم اور انکی دادی جان بڑی بیگم کے مکان اور وطن مالوف کا پتا مولوی کریم الدین صاحب المتخلص بہ مضطر ہم سے دریافت کرتے ہیں - ہم حضرت مضطر کی خدمت میں ملتمس ہیں کہ عنوان مضمون ہذا ملاحظہ فرمائیں - خوب اچھا سوال کیا - حضرت ہم نہ بتا ئینگے ... ... " —

۳۰ جنوری سنہ ۱۸۸۰ ع کے اودہ اخبار کا ایک اندراج اس وقت کے سیاسی جد و جہد پر روشنی ڈالتا ہے - لکھا ہے :—

" شاہی اعلان سنہ ۱۸۵۸ ع کی تصدیق خود لارڈ لٹن نے جلسۂ قیصری دہلی میں کی تھی گویہ وعدے مہربانی سے ہوئے ہیں کہ سول اور فوجی عہدے ہندوستانیوں کو دیے جائینگے مگر تب بھی انکو عہدے نہیں ملتے ہیں - امتحان متعہد سول سروس میں ایسی سخت قید لگائی گئی ہے کہ جس سے عمداً ایک ممانعت ہے - ہندو راجہ بموجب 'منو' کے قاعدے کے پیداوار کا آٹھواں حصہ وصول کرتے تھے - مسلمان بادشاہوں نے بڑھا کر چوتھائی قرار دیا لیکن حال کی اوسط

تو کسقدر نصف سے کم ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ ہندو راجہ اور مسلمان بادشاہ مال گزاری بٹائی سے لیتے تھے اس صورت میں پیدا وار اچھی ہوتی تو آمدنی بھی اچھی ہوتی اور کم ہوئی تو آمدنی بھی کم ہوئی - لہذا رعایا کو اس زمانے میں تکلیف نہ پہنچتی تھی اب رعایا کو مال گزاری کے لئے روپیہ تلاش کرنا پڑتا ہے خواہ وہ اپنے اہل و عیال کی پرورش کرسکے یا نہ کرسکے - اس کے بعد طرح طرح کی شکایت فوجی مصارف اور ایکٹ اسلحہ اور بہت بڑی فوج ہندوستانی رئیسوں کی اور دیسی اخبارات کے ایکٹ اور آخر میں انکم ٹیکس کی ہے" —

۱۹ فروری سنہ ۱۸۸۰ ع کے اخبار میں ہے :—

" پنجابی اخبار لاہور سے یگانۂ زمانہ خوشنویس یگانہ امام ویردی مرحوم و مغفور کے انتقال کی خبر سنکر ہمکو نہایت افسوس ہوا - امام ویردی مرحوم فن خوش نویسی میں اپنے وقت کے امام اور میر پنجہ کش مرحوم دہلوی کے قایم مقام تھے"-

دہلی کالج کے توڑ دئے جانے کا نہ صرف دہلی والوں بلکہ کل اہل وطن کو الم تھا - ۶ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کا اودہ اخبار لکھتا ہے :—

"نہایت خوشی کی بات ہے کہ دہلی کے چند روسا اور عمایدین اس غرض سے شملہ پر تشریف لے گئے ہیں کہ دہلی کالج کے ازسرنو قایم کرنے میں حضور لارڈ رپن وایسرائے و گورنر جنرل ہند سے اعانت کے خواستگار ہوں یہ کارروائی نہایت ہی مستحسن معلوم ہوتی ہے اور انہوں نے ایسے وقت میں خوب ہی سوچی ہے ... ..." —

۱۴ جولائی کے اخبار میں دیسی کتب خانے کے عنوان سے ایک مفید مضمون ہے - اس کا یہ ٹکڑا ان حضرات کی توجہ کے قابل ہے جن کے گھروں میں کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود ہے - لکھا ہے :-

" ہندوستان کے اکثر شہروں کے خاندانوں میں بظاہر عمدہ عمدہ کتب خانے موجود ہیں اور ایشیائی علوم و فنون کی مختلف کتابیں ان کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں لیکن ایسے شخصی کتب خانوں سے ملک کو مطلق فائدہ نہیں پہونچتا- کتب خانوں کے مالک طلبہ کو کتابیں نہیں دیسکتے .... " -

۲۷ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کے اخبار میں ایک خاص طویل مضمون ہے جس کا عنوان ہے "تیرھویں صدی کے جعفر زٹلیوں کی طرف گورنمنٹ اور قوم کو متوجہ ہونا چاہئیے" - یہ کھلی بات ہے کہ اودہ اخبار اور اودہ پنچ کی بہت چلتی تھی - حالانکہ حضرت سرشار اودہ پنچ کے اولین نمبر کے نامہ نگار تھے - لیکن آگے چلکر اخباروں کے نفسیے شخصیتوں پر غالب آگئے -

۲۸ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کی اشاعت میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے نئی روشنی - اُس وقت یہ روشنی شروع ہوئی تھی اِس وقت ڈھک رہی ہے - اور مغرب زدہ اور مغروب زدگی کی آوازیں کانوں میں آنے لگی ہیں - یہ معلوم کرنا نتیجہ خیز ہوگا کہ اُس وقت اس نئی روشنی کا استقبال کیسا ہوا تھا - لکھتے ہیں :-

" .... ہماری دانست میں بھی تہذیب مغربی دنیاوی اِمور میں بالخصوص وہ دنیاوی امور جن میں ذاتی انتفاع ہو اور اپنے عیش و آرام اور ترقی دنیاوی کے باعث ہوں جو

صرف مہذبین مغربی کو مد نظر ہے ... . بہت عمدہ ہے" -

۷ اگست سنہ ۱۸۸۰ ع نے اودہ اخبار میں شکایت کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ زنانہ درجوں کے لئے لیڈی ٹکٹ کلکٹر مقرر ہونی چاہئیں - اس پر عمل ہوا تو - مگر تجویز کے چوتھائی صدی بعد —

یکم دسمبر سنہ ۸۰ ع کے اودہ اخبار میں آزاد مرحوم کی آب حیات پر مفصل تبصرہ درج ہے - اسی ضمن میں - لکھتے ہیں :-

" نیرنگ خیال کے خیالات ابھی پیش نظر تھے کہ پروفیسر آزاد نے ایک اور تازہ طلسم باندھکر انجمن آراستہ کی - بیچ میں آزاد آب حیات کا پیالہ لئے کھڑے ہیں دور چل رہے ہیں - ایک جلسہ برخاست ہوتا ہے دوسرا جمتا ہے - شعرائے باکمال اردو کے اپنا اپنا کمال دکھاتے ہیں اور آب حیات کا جام پی کر رخصت ہوتے ہیں ... ..." -

" اول یہ کام برسوں کا نہیں ہے - عمروں کا ہے - بلکہ ایک آدمی کی تو عمر کا بھی کام نہیں - بہت سے سن رسیدہ اور صحبت یافتہ لوگوں کی کمائی اس میں شامل ہوئی ہوگی - ایسی باتوں کا بہم پہنچانا اور پریشان دانوں کا سمیٹنا کچھہ آسان کام نہیں " —

یہ ذکر کرکے کہ :- " تعجب ہے کہ مومن خاں صاحب کا حال نہیں لکھا جو کہ شعرائے مندرجہ سے کسی طرح درجے میں کم نہ تھے " - بتاتے ہیں کہ " باوجود ۵۲۰ صفحہ سے زیادہ ضخامت ہے اس کی قیمت ایک روپیہ ہے " - آج کل ۵۵۲ صفحے بن کر دو روپیہ قیمت ہے —

۱۶ دسمبر سنہ ۸۰ کے اخبار میں 'تعلیم نسواں' پر ایک مضمون ہے یہ اس طرح شروع ہوتا ہے :—

" ہندوستان کی حالت پر نظر کرکے بعض اخباروں کی رائے ہے کہ اہل ہند اپنی اپنی بی بیوں کو گھر ہی میں تعلیم دیں اور مشن اسکول کی مسوں کو اپنے یہاں آنے سے روکیں یہ رائے بیشک صحیح اور درست ہے لیکن اہل ہند کو اپنے خاندان کی تعلیم کے واسطے وہ علوم مخصوص کرنے چاہئیں جو فرقہ نسواں کے حق میں مفید ہوں' —

بنارس گزٹ

۱۲ جون سنہ ۱۸۸۲ کے بنارس گزٹ میں ایک مضمون کا عنوان ہے " کیا تہذیب اسی کو کہتے ہیں " - لکھتے ہیں : —

" ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کی قومیں جب کبھی مشرق کی طرف اپنا مقدس قدم بڑھاتی ہیں تو عموماً یہی حیلۂ شرعی پیش کرتے ہیں کہ ہم پیغمبر تہذیب ہیں - ہمارا مقصود توسیع سلطنت نہیں بلکہ ہم وحشی قوموں کو زیور شائستگی سے آراستہ کرنے کے لیے جاتے ہیں - یہ بیان ان کا جہاں تک صحیح ہو اس سے ہم کو بحث نہیں لیکن اس قدر ہم ضرور کہیں گے کہ بعض بد تہذیبیاں اس طرف کے ملکوں میں انہیں کے باعث پھیلتی ہیں " —

۱۰ جولائی سنہ ۸۲ کے اخبار میں ایجوکیشن کمیشن پر ایک طویل مضمون ہے —

۲۹ جون سنہ ۸۲ کے اخبار میں " شیشہ بنانے کی ترکیب " پر ایک مفید مضمون ہے - بھٹی کی تصویر اور مفصل ہدایتیں ہیں - اسی اشاعت میں ایک مضمون "یورپ کے معاملات پر ہے - لکھا ہے : —

" آج کل یورپ میں دو ہی مقاموں کی خبروں کی گرم بازاری

ہے ۔ ایک آئرلینڈ دوسرے مصر آئرلینڈ والوں نے جو شور و فساد مچا رکھا ہے اس میں اب تک کمی نہیں نظر آتی اور ہو کیونکر قومی اتفاق ہے کہ تھمتا ...... مصر کی حالت اس سے بڑھ کر نازک ہے - خدیو مصر اور درویش پاشا نے دارالسلطنت کو چھوڑ دیا ہے اور اسکندریہ میں موجود ہیں - ہر ایک سلطنت نے جنگی جہاز اسکندریہ کو روانہ کر دیے ہیں تاکہ اس کی رعایا کو جو اسکندریہ میں آباد ہے سوار کر کے وطن پہنچا دے - فرانس اور انگلستان کی حکمت عملی ظاہرا ایک ہے لیکن فرانسیسیوں کا کچھ اعتبار نہیں کیونکہ وہ تند خو اور ذرا سی بات پر بگڑ کھڑے ہونے والے ہیں - آسٹریا اور جرمنی سلطان کے مددگار ہیں .... ادھر یہ ہے اُدھر روس اور جرمنی میں لڑائی کا چرچا ہے ... ... " —

۱۷ جولائی سنہ ۸۲ کے اخبار میں " ہندوستان اور ریشم کی کاشت" پر ایک نہایت مفصل اور عالمانہ مضمون ہے —

آفتاب پنجاب

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۸۰ع کے اخبار آفتاب پنجاب میں لکھا ہے :—

" حضور پرنس اف ویلز صاحب جو چار لاکھ کے قرضدار ہیں ان کی طرف سے لارڈ لنستھر نے ایک عرضی اس مضمون کی مسٹر گلیڈ سٹون صاحب کے ہاں پیش کی کہ پرنس کو اس قرضہ کی صفائی تک ایک لاکھ روپیہ سالانہ زیادہ دیا جائے گلیڈ سٹون صاحب نے اس عرضی کو فرش پر دے پٹکا اور غصے سے کہا کہ قیصرہ ہند ان کو اپنی گرہ سے دینا چاہیں تو دیدیں پر

گورنمنٹ کچھ نہیں دے سکتی کیونکہ روپیہ کی آگے ہی ضرورت ہے " —

اسی اشاعت میں کتاب 'توبۃالنصوح پر ریویو درج ہے —

۱۴ فروری سنہ ۱۸۸۱ کی اشاعت میں آزاد مرحوم اس پر تپاک استقبال کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو تذکرہ آب حیات کا کیا گیا - اسی ضمن میں فرماتے ہیں :—

°۔ہر نیمروز - بجنور

" اکثر ذوق و شوق کے وقت تھے کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گئے - بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا - وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انہوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی - جاننے والے جانتے ہیں کہ انسان جب تک آپ پختہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا - پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا - لکھنا اور مٹانا - بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا - پھرتے چلتے - جاگتے سوتے بچوں ہی کے خیالات میں رہا - میلوں نہیں برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے " —

کیا ملک کی مختلف ٹکسٹ بک کمیٹیاں اِن اصولی باتوں پر غور کرنا مناسب سمجھیں گی جو اوپر کے اقتباس سے اخذ ہوتی ہیں۔ یعنی ابتدائی مدرسوں کے لئے نصاب کی کتابیں کیونکر بنائی جائیں اور کون اس کام کا اہل ہے - اسی تحریر میں آزاد مرحوم فرماتے ہیں :—

" خیر میرے پیارے اہل وطن! یہ تمہاری خدمت ہے وہ تمہارے بچوں کی خدمت تھی - مگر کاش وہ دن جو میری

عمر کی فصل بہار تھی - طبیعت جوان تھی - جوش تھکتے تھے - مضامین برستے تھے اور رنگ اڑتے تھے ان تصنیفات میں خرچ ہوتے جن سے میرے اہل وطن کی فلاح و اصلاح ہوتی .... میں اس حال میں بھی تمہیں بھولا نہیں - جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا - بہت کم سوتا تھا - اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیالات پیدا ہوتے تھے لکھتا جاتا تھا - اسی میں سے یہ اوراق پریشاں نکالے ہیں جو 'آب حیات' کا جام بنا کر تمہاری ضیافت طبع کے لئے حاضر کئے ہیں " —

* آفتاب پنجاب | ۱۱ - مارچ سنہ ۱۸۸۱ کی اشاعت میں لکھتا ہے : —

" گورنمنٹ بمبئی نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ دیسی اخبارات کی تحریرات سے ہرگز بغاوت نہیں پھیلتی - البتہ جب سرکاری افسر رعایا کی کسی تکلیف کو رفع نہیں کرتے تو اس وقت وہ ملکی ہمدردی سے بڑے جوش کے ساتھ تحریر کرتے ہیں اور ایسی صورت میں ان کی تحریر سے کارآمد اطلاع حاصل ہوجاتی ہے ' —

* ریفارمر - لاہور | اس اخبار نے ۳۰ - جنوری سنہ ۱۸۸۲ کی اشاعت میں اعتراض کیا کہ عیسائی قاضیوں (چیپلین) کو ہندوستان کے خزانے سے تنخواہ دینا نہیں چاہیے - اس نے لکھا : —

" گورنمنٹ کی پالسی یہ نہیں ہے کہ کسی مخصوص مذہب کی وہ حمایت یا اعانت کرے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ گرجا گھروں کے لیے جو چیپلین محض عیسائی مذہب کی وعظ کرنے

کے لیے مقرر ہوتے ہیں ان کو اس ملک کے روپیہ سے تنخواہیں
دی جاتی ہیں - یہ کارروائی گورنمنٹ کی انصاف پر مبنی نہیں ہے "-

اسی اشاعت میں ایک صاحب جن کا نام رحیم بخش ہے صدر بازار ملتان سے "ایک عجیب بد رسم" کی مذمت کرتے ہیں اور تعلیم یافتوں کو سوشل اصلاح میں کام کرنے کی دعوت دے کر لکھتے ہیں: —

"اہل اسلام کی مستورات محرم میں عشرہ کے دن فصد
کھلواتی ہیں- اس کے یہ معنی رکھے گئے ہیں کہ ہمارے آقا
اور سردار امام (رض) جو اس روز شہید ہوے ان کی تکلیف
میں ہم بھی شریک ہوں ..... جس میں ذرا بھی عقل ہوگی
وہ اس بات کے قبول کرنے میں حجت نہیں کرے گا کہ یہ
رسم بد ہی ہے ...." —

یہی اخبار ۲ - فروری سنه ۸۴ کی اشاعت میں 'تیرتھ' کے موضوع پر لکھتا ہے: —

"تیرتھ جاترا میں ہمارے ہندو بھائی بہت روپیہ صرف کرتے
ہیں اور تکلیفیں اُٹھاتے ہیں اگرچہ بعض لوگ صرف تماشے
کے لیے جاتے ہیں مگر اکثر لوگ ثواب حاصل کرنے کی ہی
غرض سے تیرتھ کو جاتے ہیں ....." —

خاتمہ پر شیو جی کا یہ بھجن لکھا ہے: —

"اے پاربتی بے وقوف لوگ 'یہ تیرتھ ہے یہ تیرتھ ہے ایسا
کہتے ہوے گھومتے پھرتے ہیں وہ لوگ روحانی تیرتھ کو نہیں
جانتے پس ان کی نجات کیونکر ہو" —

لارڈ لٹن کی حکومت میں جو ورنیکولر پریس ایکٹ ملک میں

جاری ہوا تھا اور جسے لوگ "گیگنگ ایکٹ" کہتے تھے لارڈ رپن کی گورنمنٹ نے اسے منسوخ کیا۔ اس پر اطمینان اور خوشنودی کے اظہار کے لئے انڈین ایسوسی ایشن کی تحریک سے جو جلسہ ۲۴ - مارچ سنہ ۱۸۸۲ کو باشندگان لاہور کا ہوا تھا اس کی کیفیت ۳ - اپریل سنہ ۸۲ کے ریفارمر میں درج ہے۔ اسی اشاعت میں ایک مضمون "تہذیب (سویلزیشن)" پر ہے جس کا "راقم لاجپت رائے طالب العلم گورنمنٹ کالج لاہور" ہے۔ یہ راقم ضرور زندۂ جاوید لیڈر لالہ لاجپت رائے ہیں - گنجائش کی قلت کی وجہ سے صرف ایک سطر اس میں سے اقتباس کی جاتی ہے جس سے پوت کے پانو پالنے میں دیکھے جا سکتے ہیں - وہ سطر یہ ہے : —

"ہمارے تعلیم یافتوں میں یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے علم و عمل کو ایک نہیں کر سکتے" —

۲۲ مئی سنہ ۱۸۸۲ کا ریفارمر الہ آباد کے ہائی کورٹ کے بنچ پر مسٹر سید محمود کی تقرری کی خبر شایع کرتا ہے —

۲۹ جون سنہ ۸۲ کا ریفارمر لاہور سے دو نئے پرچوں کے نکلنے کی خوشخبری سناتا ہے۔ جن میں ایک تو ہندی کا ہفتہ وار اخبار 'ہمتہشی' ہے اور دوسرا ماہوار رسالہ ہے جس کا نام 'سوانح عمری' ہے۔ پہلے کے مالک اور اڈیٹر پنڈت ہر مکند شاستری تھے جو اورینٹل کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور دوسرے کے منشی نتھو رام آنند برہم سماجی تھے۔

اخبار عام اب لارڈ رپن کی قانونی کونسل میں وہ قانونی مسودہ پیش ہوگیا تھا جو البرٹ بل کے نام سے مشہور ہے - معلوم ہوتا ہے کہ بنارس کے راجہ شو پرشاد جو دو ایک سال بعد انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کے علم برداروں میں شامل ہوگئے اُس وقت اس تاریخی بل کے

حق میں تھے اور سر سید احمد خاں اس کے خلاف۔ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۸۳ کا اخبار عام اس پر ایک تیز مضمون لکھتا ہے —

پایا جاتا ہے کہ کونسل میں ان کے وطن کی ہمدردی سے دور رہنے سے غضب ناک ہوکر پبلک نے کلکتہ میں ان کا پتلا جلایا تھا۔ جس کی تفصیل ۵ مئی سنہ ۱۸۸۳ کے اخبار عام میں ہے —

۴ مئی سنہ ۸۳ کے اخبار عام میں آب حیات کے دوسرے اڈیشن کا اشتہار مصنف کی طرف سے دیا گیا ہے۔ اب اس کی قیمت بعض مضامین کی ایزادی کی وجہ سے ایک روپیہ کی جگہ سوا روپیہ ہو گئی۔

۳ جنوری سنہ ۸۳ کا اخبار عام ناردرن سٹیٹ ریلوے پر انٹرمیڈیٹ کے کھلنے کی خبر دیتا ہے۔ —

۰ جنوری سنہ ۸۳ کے اخبار عام کا افتتاحیہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے :-

"موجودہ امتحان سول سروس کے خوفناک قواعد سے اس امید کو منقطع دیکھکر کہ اس امتحان میں دیسی لوگوں کا کامیاب ہونا ناممکنات سے ہے ہم مجبور ہوتے ہیں کہ گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ یہ امتحان بالکل موقوف کیا جائے" ۔

۱۰ مارچ سنہ ۸۳ کے اخبار عام میں ایک نظم ہے۔ جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

اے ساکنان خطۂ ہندوستاں بڑھو		آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں بڑھو
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو		کاندھے پہ رکھہ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو
بیٹھے ہو پانو توڑ کے کیوں کنج غم میں تم		دیکھو ذرا نشیب و فراز جہاں بڑھو
ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہے		چلا رہا ہے طوطئ ہندوستاں بڑھو

۱۴ اپریل کے اخبار عام میں ہندوستانیوں کے والنٹیر بننے کی

اجازت پر ایک چوٹ ہے - ہوا یہ تھا کہ والنٹیر بننے کے لیے ہندوستانی ہونے کی جو روک تھی وہ ہٹا دی گئی - مگر ان کی والنٹیر فوجیں الگ قایم نہیں ہوئیں اور صرف یہ ہوا کہ انگریزی والنٹیر فوجوں میں وہ شامل ہوسکتے تھے - امر واقعہ یہ ہے کہ قید اڑانے کا نتیجہ واقع میں کچھہ نہ نکلا - انگریز والنٹیروں نے شاید کسی ہندو یا مسلمان کو اپنے میں شامل کیا ہو - ہاں پارسی دو چار ضرور شامل کرلیے تھے —

ریختی اخبار دهلی | ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۸۱ کا ریختی اخبار مولوی فتح الدین بسمل مالک اخبار پنجاب پنچ عرف اخباروں کا تھانہ گاہ کی وفات پر افسوس کرتا ہے --

خیر خواہ هند- دهلی | یکم نومبر سنہ ۱۸۸۱ کا اخبار ایک خبر دیتا ہے - امید ہے اس کو آج کل کی فلم بنانے والی کمپنیاں دلچسپی سے پڑھیں گی - وہ یہ ہے :—

"لندن سے ڈاک روانہ ہونے سے ایک آدہ روز پہلے رسل سٹریٹ میں جو ڈروری لین تھیٹر کے عقب میں ہے یہ واقعہ ہوا - اس تھیٹر میں بڑے دن کے واسطے تماشوں کا سامان ہو رہا تھا اور اشتہار دیا گیا تھا کہ سو لیڈیاں جوان ' کم عمر سڈول جسم کی درکار ہیں - اشتہار دیکھتے ہی رسل سٹریٹ میں سو کی جگہہ پندرہ سو آگئیں اور تمام تھیٹر کو گھیر لیا سڑک پر گاڑیوں سے راستہ بند تھا " ...

یہی اخبار مٹیا برج کلکتہ کی ایک خبر دیتا ہے - جہاں اودہ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ رہا کرتے تھے - وہ خبر یہ ہے :-

" ذوالفقارالدولہ پر نالش دایر ہوئی ہے - صاحب عالم بہادر

مستغیث ہیں - دعوی یہ ہے کہ ذوالفقارالدولہ کی ایک جابرانہ مسانعت سے نواب تابار محل کی زندگی میں خلل آیا " -

۱۶ دسمبر سنہ ۸۱ کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ ۲۴ دسمبر سنہ ۸۱ کو لاہور میں ایک نمایش کھلنی تھی یہ پنجاب کی غالباً پہلی نمایش ہو -

۲۴ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ کا پرچہ لارڈ رپن کے دوسرے معرکۃالآرا بل یعنی لوکل سلف گورنمنٹ بل کے پاس ہونے کی خبر دیتا ہے - یہ معلوم کر کے آپ محظوظ ہوں گے کہ اینگلو انڈین اخبار برسوں تک اسے بگاڑ کر لوکل سلف لکھتے رہے —

علم کی پیاس یہاں تک اور علمی کتابوں کی کمی اتنی تھی کہ پنڈت دھرم نارائن ھاکسر نے جان سٹیوارٹ مل کی پولٹیکل اکونومی کا جو ترجمہ اردو میں کیا تھا وہ امرتسر کے سفیر ہند میں سنہ ۱۸۸۰ ع میں بہ اقساط چھپتا رہا —

تبصرہ

اب ہم اپنے قایم کئے ہوے آخری عہد سے بھی رخصت ہوتے ہیں - آپ کو خیال رہے کہ اس عہد کو اب پورے پچاس برس گزرے - ہمارے اس دور کا آخری سال یعنی ۱۸۸۴ ع دو امور کے لیے بہت ممتاز ہے - ایک تو یہ کہ اسی سال مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ نے دھلی سے ایک اخبار محض صنف نازک کے لئے نکالا - جس کا نام " اخبارالنسا تھا - اور دوسرے یہ کہ اسی سال منشی محرم علی چشتی صاحب کے اخبار رفیق ہند کا جنم ہوا - اس اخبار نے پنجاب کی صحافتی دنیا میں نئی روح پھونکی —

۱- یہ دور اگرچہ مدت میں اور دوروں سے نصف اور کسی سے اور بھی کم زمانہ کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس کی اہمیت کسی سے کم نہیں ترمیم ضابطۂ فوجداری - لوکل سلف گورنمنٹ بل - مہاراجہ دلیپ سنگھ کا معاملہ - دہلی کالج کے حق میں اجی ٹیشن - ڈاکٹر لائیٹنر وغیرہ کے خلاف اظہار نفرت جلسوں نے ایجوکیشن کمیشن میں مخالفانہ اور انگریزی زبان کی تعلیم کے خلاف شہادت دی تھی - سر سید اور ان کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک اور اس کی مخالفت - ہندو مسلمانوں کے خون کے قصاص کا مطالبہ - حالانکہ وایسرائے کی قانونی کونسل میں غیر سرکاری ممبر گورنمنٹ کی پسند سے نامزد ہوتا تھا لیکن ایک خاص ممبر کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ممبر قوم فروش ہے اسے ممبری سے الگ کرکے جس پر پبلک کو اعتماد ہو اسے ممبر بنایا جائے - یہ اور ایسے کئی امور جو تفصیل کے محتاج نہیں ان چند سالوں کے عرصہ میں ایسے پیش آئے جو ملک میں بیداری اور جانداری کا بین ثبوت ہیں - بات یہ بھی ہے کہ پریس کا وہ گل گوٹھو قانون بھی منسوخ ہوچکا تھا - لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ کانگریس ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی - اس کا جنم سنہ ۱۸۸۵ میں ہوگا - سیاسی بیداری کے ساتھ لوگوں میں سوشل اصلاح اور معاشرت کے دوسرے شعبوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی چیٹک بھی شروع ہوگئی تھی - یہ سب کچھ تو تھا لیکن ملیات کے لوث سے اردو صحافت کا دامن اب تک بالکل پاک رہا - اسی سلسلے میں ایک امر کا واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے - وہ یہ کہ جناب چکبست مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا (ان کے مضامین کا مجموعہ چھپ گیا ہے) کہ سوائے لارنس گزٹ کے پرانے اردو اخبار سیاسی معاملات سے مس نہیں

رکھتے تھے - مرحوم کی نظر تنقید اور ذوق تحقیق کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معاملہ اس نے بالکل برعکس ہے - لارنس گوٹ کی کئی جلدیں میرے ہاں موجود ہیں مگر ان میں کہیں بھی سیاسی دلچسپی کا کوئی مضمون نہیں ملتا برخلاف اس کے اور اخبار جو دلچسپی سیاسی معاملوں میں لیا کرتے تھے اس کے نمونے آپ ابھی دیکھ چکے ہیں —

۲ - زبان کے بارے میں اودھ اخبار اور اکمل الاخبار سب سے آگے پائے گئے ان میں بھی اودھ اخبار کو فوقیت حاصل ہے - انشا سے فارسی اسلوب اور جملے کے ارکان کی ترتیب اب قریب قریب غائب ہو گئی تھی - اور اردو نے اردو کا خانہ ساز جامہ پہنا تھا - ہاں انگریزی کے الفاظ اس چار پانچ برس کے دور میں بہت دخل پا گئے - جیسے :- اتیٹوریل - پولیٹیکل اتما سفیر - پسپوسٹ - آپتمسٹ - وغیرہ وغیرہ - قلمی کتابیں جنہیں آج کل قاموسی نام ' مخطوطات ' دیا جاتا ہے اس دور میں ' دستی ' کتابوں کے نام سے پکاری جاتی تھیں - قصہ مختصر صحافت کی زبان سلجھنے لگی تھی - اودھ اخبار کا ایک جملہ دیکھئے اور آج کل کی اخباری زبان کا اُس سے مقابلہ کیجئے لکھا ہے :- " دھلی کالج جیسے نام آور کے ٹوٹ جانے سے دھلی کے باشندوں کے دل ٹوٹ گئے - ان کی آنکھیں دھلی کالج کو ڈھونڈ رہی ہیں " صنف نازک کی تعلیم و تربیت اور ان کے لئے خاص اخبار کا اهتمام بھی اس عہد کی بالغ نظری کا ثبوت ہے —

۳ - املا میں بھی قدرے اصلاح ہوئی - وقفے عموماً استعمال ہونے لگے - التباس کے لئے واوین بھی مستعمل ہوئے - مگر اول لفظ کے الف مضموم کے ساتھ ' واو ' کا پن چھلا اور ' پہنچنا ' میں واو کی ایزادی وغیرہ چیزیں قائم رہیں - یاے آخر لفظ کا امتیاز ابھی تک

قائم نہیں ہو سکا —

اس عہد کے اخباروں میں اشتہاروں کی تعداد اور نوعیت میں بہت ترقی ہوئی - ہالوی صاحب کا مرہم اور گولیاں تو اس بارے میں اولیت کا امتیاز رکھتی ہیں اب گریمالٹ کمپنی کا سرپ آف ہائی پوسفیٹ آف لایم بھی اشتہاری کالموں میں داخل ہوگیا - ان دو تین دواؤں کے سوا بدیشی چیزوں کے اشتہار دیکھنے میں نہیں آے - ہاں دیسی صنعت و حرفت کی چیزوں کے اشتہاروں کی تعداد ترقی پر تھی - اور ایک صوبے کی چیزوں کے اشتہار دوسرے صوبوں کے اخباروں میں نکلنے لگے تھے —

ایک بات اور نوٹ کے قابل ہے - اب تک بعض کھتیا اخباروں کی چندے کی شرح میں بہ اعتبار خریداروں کے جو فرق و امتیاز تھا وا اب بھی جاری رہا - مثلاً خیر خواہ ہند دہلی کی قیمت ' نوابان والا شان و راجگان بلند مکان و سرکار انگلشیہ کے لئے پیشگی سالانہ ۳۰ - رؤسا کے لئے ۱۵ روپے - ملازم آدمیوں سے بہ حساب تنخواہ اگر پچاس روپیہ ہو چار آنہ ماہوار اور جو صاحب کم مقدور ہوں وہ صرف دو روپیہ پیشگی سالانہ اور محصول ڈاک دے دیا کریں - اس میں بہت گڑبڑ ہے - اسی حیثیت کے دوسرے اخباروں نے صرف تین نرخ رکھے ہوے تھے یعنی گورنمنٹ اور والیان ریاست - روسا و معززین اور عام پبلک کے لئے چندے کا یہ امتیاز کوہ نور - اودھ اخبار اور اخبار عام جیسے اخباروں نے نہیں رکھا تھا - ان کا چندہ ہر ایک کے لئے یکساں تھا —

خاتمہ

۱ - مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ خود ہی باندھ لئے اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں سنہ ۱۸۹۶ ع کے پیسہ اخبار کی ایک

اشاعت کا مفصل ذکر کرتا - سردست صرف اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ منشی محبوب عالم مرحوم کے مشہور پیسہ اخبار کا ۷ - نومبر سنہ ۱۸۹۹ کا پرچہ ایک خاص اور تاریخی نمبر تھا - اس لئے کہ اس کے تمام مندرجات نظم و نثر خواتین کے قلم سے نکلے ہوئے تھے —

پیشتر اس سے کہ میں آپ سے رخصت ہوں چند اعداد و شمار کا پیش کرنا منظور ہے جو سرکاری رپورٹوں وغیرہ سے ماخوذ ہیں - سرکاری کاغذات سے صرف صوبہ پنجاب کے اُردو اخباروں سے متعلق یہ دریافت ہوا ہے کہ ان کی مجموعی اشاعت سنہ ۱۹۱۷ ع میں دو لاکھ چھیالیس ہزار- سنہ ۱۹۱۸ ع میں تین لاکھ بیس ہزار - سنہ ۱۹۱۹ ع میں تین لاکھ بیالیس ہزار - سنہ ۱۹۲۰ ع میں تین لاکھ اٹھاون ہزار اور پچھلے سال یعنی سنہ ۱۹۳۳ ع میں چھ لاکھ کے قریب یعنی پانچ لاکھ چورانوے ہزار تھی - حال میں جو اعداد پنجاب کی قانونی کونسل میں بتائے گئے وہ صرف چند مشہور روزانہ اخباروں سے تعلق رکھتے ہیں - اس فہرست میں اور زبانوں کے بھی اخبار شامل ہیں جس سے بالمقابل موازنہ خوب ہوسکےگا- پنجاب لجیس لیٹو کونسل کے اجلاس میں جو ۲۴ - اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ کو لاہور میں ہوا فنانس ممبر نے ایک سوال کے جواب میں پنجاب کے بڑے روز ناموں کی اشاعت کے یہ اعداد پیش کئے : - (۱) ٹریبیون پندرہ ہزار- (۲) سول اینڈ ملیٹری گزٹ بارہ ہزار - (۳) ڈیلی ہرلڈ پانچ ہزار - (۴) ایسٹرن ٹائمز ایک ہزار تین سو جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ سب اخبار انگریزی کے ہیں - (۵) ہندی ملاپ پانچ ہزار - (۶) اکالی پترکا دو ہزار تین سو - اب اردو کے اخبار شروع ہوتے ہیں - (۱) پرتاب گیارہ ہزار دو سو پچیس - (۲) ملاپ گیارہ ہزار دو سو پچیس - (۳)

بندے ماترم تین ہزار- (۴) ویر بھارت دو ہزار پانچ سو- (۵) انقلاب تین ہزار چار سو پچھتر- (۶) زمیندار تین ہزار دو سو اسی- (۷) سیاست ایک ہزار—

بہر حال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ اُردو اخباروں کی تعداد اور اشاعت روز بروز بڑھ رہی ہے—

یہ بتانا آپ کو متعجب کرے گا کہ پنجاب میں انگریزی صحافت کے بانی بھی اہل اُردو تھے- انگریزی اخبار لاہور کرانیکل دہلی کے محمد عظیم نے سنہ ۱۸۴۹ ع میں لاہور سے جاری کیا- یہ بزرگ پنجاب کے مشہور مورخ سید محمد لطیف کے والد تھے- لاہور کرانیکل پنجاب کا پہلا انگریزی اخبار تھا- لاہور کرانیکل نام اور ملکیت بدلتے بدلتے اس وقت آپ کے لاہور کے سول اینڈ ملیٹری گزٹ کی شکل میں موجود ہے- یہ امر واقعہ بھی ہر منصف مزاج کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اہالی اردو اور دیسی زبانوں کے حاسد یا دشمن ہرگز نہ تھے- کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجابی زبان کا سب سے پہلا اخبار بھی انہیں بزرگ محمد عظیم موصوف نے لاہور سے سنہ ۱۸۵۶ ع میں نکالا- اس کا نام بھی 'پنجابی' تھا- یہ اخبار پنجابی زبان میں اور گورمکھی اور پہلو بہ پہلو فارسی حروف میں چھپتا تھا اور سنہ ۱۸۹۰ ع تک زندہ رہا—

ایک بات اور کہنی ہے اس سے پہلے کہ میں ختم کروں- وہ یہ کہ آج کل ہمارے انگریزی خواں ارباب وطن مغرب کی پیروی میں ہر موضوع کا بالمقابل مطالعہ اور موازنہ طلب کرتے ہیں- اس لکچر میں اس طرح کی کمپیریٹو سٹڈی کے نتیجے پیش کرنا غیر ممکن ہے- لیکن میں نے پہلے ہی اس کا کسی قدر خیال رکھا ہے- اُردو پریس کے بیان کے ساتھ اور

ورنیکولر زبانوں کے اخباروں کے کوایف پیش کرنا تو یہاں نہایت دشوار ہے لیکن یہ بتایا جا سکتا ہے کہ جہاں سے هندوستان کا سب سے پہلا اخبار نکلا تھا وهاں یعنی کلکته میں بنگالی پریس کا کب جلم هوا - تحقیق سے پایا جاتا ہے که بنگال میں دیسی زبان کے کئی اخبار انیسویں صدی کے اول ربع میں نکلے ان کے نام اور تاریخ اجرا پر اکتفا کیا جاتا ہے :—

۱ - سما چار درپن - ۲۳ - مئی سنه ۱۸۱۸ ع - بعض محققوں کی رائے ہے که یه اخبار سنه ۱۸۲۱ ع میں جاری هوا تھا -

۲ - برهمن سیدهی - ستمبر سنه ۱۹۲۱ ع -

۳ - سمباد کومُدی - ۴ - دسمبر سنه ۱۹۲۱ ع - یه اخبار راجه رام موهن رائے نے 'رسم ستی' کے خلاف پراپگنڈا کرنے کو نکالا تھا -

۴ - سما چار چندرکا سنه ۱۹۲۱ ع اسے بابو بھبانی چرن بندیو پادهیایه نے نکالا تھا —

۵ - سمباد تمونا شک سنه ۱۸۲۳ ع -

اس اجمال سے یه امر واضح هوگا که همارا اُردو پریس بنگال کے بنگالی پریس سے بہت پیچھے نہیں رها - بلکه یه کہنا درست هوگا که بنگال میں دیسی زبان کے پریس کا ظہور سنه ۱۸۲۱ ع یا سنه ۱۸۱۸ ع سے بہت پہلے هونا چاهیے تھا - کیوں که اهل بنگال سنه ۱۷۸۰ ع سے پریس کی هستی سے واقف هوچکے تھے —

اب میں آپ سے رخصت هوتا هوں اور ایک بات جو شروع میں عرض کی تھی اب پھر عرض کرتا هوں که جو واقفیت قدیم اور اب سے نصف صدی سے پیشتر کی صحافت سے متعلق آپ کی خدمت میں پیش کی گئی اس کی نسبت مکمل هونے کا هرگز ادعا نہیں - هاں التماس

کی صحت کا میں ذمہ دار ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ لٹریچر کے اس اہم شعبہ کی تواریخ کی تکمیل کا کام مجھ سے زیادہ اہل اور زیادہ وسایل تلاش رکھنے والے حضرات اپنے ذمہ لیں یا اس کام میں میری اعانت فرمائیں تاکہ یہ کام پورا ہو جائے۔ ورنہ یہ تو سنتے ہی آئے ہیں:-

کار دنیا کسے تمام نہ کرد



ضرب الامثال اور ان کے ماخذ

از

جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

(۲)

دودھ کا دودھ پانی کا پانی

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی مقدمہ میں حاکم نہایت منصفانہ فیصلہ کرے۔ یا کسی معاملہ میں خود ہی قدرت کی طرف سے دو ٹوک فیصلہ ہو جائے کہتے ہیں کہ یہ مثل اس طرح مشہور ہوئی کہ ایک حلوائی دودھ میں پورا آدھا پانی ملا کر فروخت کیا کرتا تھا۔ اور اس طرح دودھ بیچ کر اس نے دوسو روپے جمع کئے۔ جب دوسو ہو گئے تو اس نے ان کو ایک همیانی میں رکھا اور اپنی کمر سے باندھ کر وطن کو روانہ ہو گیا۔ راستہ میں دریا پڑتا تھا وہ کنارے پر کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ همیانی کمر سے کھول کر نیچے زمین پر رکھ دی اور خود دریا پر ہاتھ منہ دھونے اور پانی پینے لگا۔ اس ساری کارروائی کو ایک بندر درخت پر بیٹھا ہوا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ جب حلوائی پانی پینے کو ذرا نیچے جھکا بندر جھٹ درخت سے اُتر کر چپکے چپکے آیا اور همیانی اُٹھا درخت پر جا بیٹھا۔ حلوائی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بندر همیانی اُٹھائے لئے جا رہا

تھا - وہ اُس کے پیچھے دوڑا مگر بے سود - اب ستم ظریفی سنیے - بندر نے درخت پر اطمینان سے بیٹھ کر ہمیانی کھولی - اور اس میں سے ایک روپیہ نکالا اور تھوڑی دیر تک اُسے دیکھنے کے بعد دریا میں پھینک دیا - حلوائی نے بیتاب ہوکر کہا - ' ہے ہے ظالم! کیا غضب کرتا ہے - میری سالہا سال کی گاڑھی کمائی کو یوں پانی کے راستے بہاتا ہے - بندر نے جھٹ دوسرا روپیہ نکالا اور اسے تاک کر حلوائی کے سر پر مارا - اگرچہ چوٹ تو لگی - لیکن اس بات کی امید بندھ گئی کہ اب بندر سارے روپے خشکی ہی پر پھینکے گا - بندر نے اب تیسرا روپیہ نکالا - اور دریا میں ڈال دیا - پھر چوتھا نکالا اور خشکی میں پھینکہ دیا اور اس طرح آدھے روپے اُس نے دریا میں پھینک دیے اور آدھے خشکی پر - اُس وقت حلوائی نے کہا " میں سمجھہ گیا - دودہ کا دودہ پانی کا پانی ہوگیا - جتنے دودہ کے دام تھے وہ میرے پاس آگئے - جتنی پانی کی قیمت تھی وہ پانی میں مل گئی "-

---

دھم دھم ہیچ نہ غم - مرے سو ہم

یہ مثل ایسے موقع پر بولی جاتی ہے - جب یہ ظاہر کرنا ہو کہ سب سے زیادہ مصیبت اور آفت میں ہم ہی ہیں - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ عوام میں مشہور ہے کہ ایک بنیا اتفاق سے سفر پر روانہ ہوا - راستے میں اسے پیاس لگی - ڈوری لٹیا اس کے پاس تھی - تھوڑی دور پر ایک کنواں مل گیا - اس نے ڈوری کو کھول لٹیا کوئیں میں ڈال بھرنی چاہی - ابھی پانی سے بھری ہوئی لٹیا کنویں میں آدھے ہی راستے پر تھی کہ ڈوری میں سے نکل کنویں میں جا پڑی - بنیے نے سوچا یہ تو کچھہ نہ ہوا - مفت میں لٹیا ہی کا نقصان ہوا - یہ نقصان اسی

طرح پورا ہو سکتا تھا کہ کنویں میں اتر کر لٹیا کو لایا جاے - چنانچہ لٹیا لانے کے لئے بنیا کنویں میں اترا پانی تک پہنچا ہی تھا کہ دیکھا ایک کالا سانپ عین پاؤں کے نیچے بیٹھا پھنکاریں مار رہا تھا بنیے کے اوسان جاتے رہے - افتاں و خیزاں واپس لوٹا - ابھی تھوڑی دور اوپر چڑھا تھا - کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا شیر کنویں پر کھڑا دھم دھم کر رہا ہے - نیچے نظر کی تو سانپ کو یہ کہتے سنا کہ عیچ نہ عم (ہمیں کیا پروا ہے - شیر تجھے پھاڑے گا) اس وقت بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا " مرے سو ہم " یعنی ہماری قضا آگئی - نیچے اترتا ہے تو سانپ ڈسے گا - اوپر جاتے ہیں تو شیر کھاے گا - جب ہی سے یہ مثل بولی جانے لگی —

دیکھو مردوں کی پھیری ' یہ ماں میری یا تیری

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں - جب کوئی آدمی اپنے خیال میں کسی شخص کو دھوکا دینے اور الو بنانے کی کوشش کرے مگر وہ شخص اس آدمی سے بھی زیادہ چالباز ثابت ہو - اس کی ابتدا کے متعلق یہ مزیدار قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک میاں بیوی میں یہ بحث ہوئی کہ دونوں میں سے کون زیادہ ہشیار ہے عورت کہتی تھی میں اور مرد کہتا تھا نہیں میں - آخر یہ طے پایا کہ دونوں ایک دوسرے کا امتحان لیں - دونوں میں سے جو دوسرے کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوجاے وہی زیادہ ہوشیار مانا جاے - خیر بات گئی گذری ہوئی - اور دونوں فکر میں رہنے لگے کہ موقع پڑے تو دوسرے کو دھوکہ دیں - بہت دنوں کے بعد ایک دن جب کہ عورت نے خیال کیا کہ اب خاوند اُس دن کی شرط کو بالکل بھول گیا ہوگا - اُس نے پلنگ پر لیٹ کر چلانا اور شور مچانا شروع کیا - خاوند گھر ہی

میں تھا - وہ دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کیوں کیا ہوا؟ عورت نے کہا اس وقت بیٹھے بیٹھے سر پھٹا جا رہا ہے - جلدی کچھہ دوا کرو - ورنہ میں کوئی دم کی مہمان ہوں - خاوند بیچارہ دوڑا دوڑا گیا - حکیم کو بلا کر لایا - دوا پلائی - مگر کچھہ افاقہ نہ ہوا جب پے در پے بہت سی دوائیں استعمال کرنے کے بعد بھی آرام کی صورت نظر نہ آئی تو بیوی نے درد سے کراہتے ہوے میاں سے کہا کہ مجھے ایک سیانے نے سر کے درد کا ایک نہایت مجرب عمل بتلایا تھا اگر تم وہ کر سکو تو یقین ہے کہ مجھے فوراً شفا ہو جائے گی - خاوند نے کہا - میں ضرور کروں گا - بتلاؤ وہ کس طرح ہے؟ بیوی نے کہا اُس نے بتلایا تھا کہ اپنی ساس کے سر کے بالوں کی ایک لٹ اگر تو اپنے تکیے کے نیچے رکھے گی تو کبھی سر کا درد نہیں ہوگا - اور اگر درد ہو رہا ہوگا تو فوراً رفع ہو جائے گا - میں نے اب تک تم سے اس لئے نہیں کہا کہ شاید تم برا مانو! اور مجھہ پر ناراض ہو - مرد نے جواب دیا - واہ! تم نے اب تک مجھے کیوں نہ بتایا؟ تم ایک لٹ کہتی ہو میں سارے سر کے بال اُتروا کر لے آتا ہوں - یہ کہتے ہی وہ بھاگا بھاگا کمال ہوشیاری کے ساتھہ بجائے بیوی کی ساس یعنی اپنی ماں کے اپنی ساس یعنی بیوی کی والدہ کے پاس پہنچا اور ہانپتا ہوا کہنے لگا - تمہاری بیٹی کے اس وقت سر میں نہایت شدید درد ہو رہا ہے - کسی نے اُسے یہ بتایا ہے کہ تمہارے سر کے بال اُس کے تکیے کے نیچے رکھے جائیں تو فوراً آرام ہو جائے گا - ماں بیچاری مامتا کی ماری حواس باختہ ہو گئی اور اُس نے فوراً اپنے سر کے سارے بال اُتروا داماد کے حوالے کئے خاوند صاحب اُن کو لئے ہوے خوش خوش بیوی کے پاس پہنچے اور کہنے لگے لو میں بال لے آیا ہوں - بالوں کو دیکھتے ہی بیوی صاحبہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں

اور کہنے لگیں - دیکھی تم نے عورتوں کی چالاکی - کس ہوشیاری کے ساتھہ میں نے تمہارے ہی ہاتھوں سے تمہاری ماں کے بال اُتروا لئے اور تمہیں شبہ بھی نہ ہوا کہ کیا چالاکی کی جا رہی ہے - مرد مسکرایا اور کہنے لگا اچھا ذرا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں - تھوڑی دیر میں وہ پھر واپس آیا اور اُس کے ساتھہ دو عورتیں تھیں - ایک ساس اور ایک والدہ اس نے دونوں کو لاکر بیوی کے سامنے کھڑا کردیا - اورھنس کر کہنے لگا - " دیکھہ مردوں کی پھیری (یعنے چالاکی) یہ ماں میری یا تیری " - جب عورت نے دیکھا کہ بجائے میری ساس کے میری ماں کے سر کے بال سارے اڑے ہوے ہیں تو وہ نہایت خفیف اور خجل ہوئی - اس نے مرد کو دھوکا دینا چاہا تھا - مرد بھانپ گیا اور اُس نے عورت کو ایسا چکمہ دیا کہ ساری عمر یاد کرتی ہوگی —

دیکھئے اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے

یہ مثل ایسے موقعہ پر بولتے ہیں - جب کسی بات کا انجام معلوم نہ ہو اور امید و بیم کی سی حالت ہو - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک کمہار اور ایک سبزی فروش نے شراکت میں ایک اونٹ کرایہ پر لیا - اور اس کے ایک طرف ترکاری اور دوسری طرف مٹی کے برتن باندہ کر دونوں شہر سے اپنے گاؤں کو چل پڑے راستہ میں اونٹ گردن پھیر کر ترکاری کھاتا جاتا تھا - یہ دیکھہ کر کمہار سبزی فروش کا مذاق اڑانے لگا - سبزی فروش نے کہا " میرے نقصان پر کیا ھنستا ہے - ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ " اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے " - اس کے بعد پتہ لگیگا کہ نقصان کس کا زیادہ ہوا ؟ اتفاق کی بات کہ منزل مقصود

پر پہنچ کر اونٹ برتنوں کی طرف بیٹھا - جس کی وجہ سے سارے برتن چکنا چور ہوگئے - اب تو کلنجڑے کی بن آئی اور کہنے لگا کہ "میں نہ کہتا تھا کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھے - اب میری تو تھوڑی سی ترکاری اونٹ نے کھائی اور تیرے سارے مال کا صفایا ہو گیا تب سے یہ مثل بولی جانے لگی —

"ڈوبا بنس کبیر کا جو جاے پوت کمال"

رام رام دھن بیچ کے لاے چار ھنوال"

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں اولاد کے متعلق یہ بتانا مقصود ہو کہ وہ نہایت نالائق اور ناخلف ہے - مثل کا سلیس ترجمہ یہ ہے کہ کبیر کی نسل ہلاک ہوگئی جس میں کمال جیسا لڑکا پیدا ہوا - جس نے عاقبت کو چھوڑ کر دنیا کو اختیار کیا - ھنوال کے معنی گدھے یا خچر کے ہیں - اس کا قصہ یوں مشہور ہے کہ کبیر بھگت کے زمانہ میں کسی راجہ کا لڑکا اتنا شدید بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے - ہر چند علاج کئے مگر مرض بڑھتا ہی گیا - جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو ایک دن کسی شخص نے راجہ کو صلاح دی کہ کبیر کا لڑکا شاہ کمال بڑا پہنچا ہوا فقیر ہے - اگر راجہ اس کے پاس جائے اور اپنے لڑکے کے لئے اُس سے صحت کی دعا کرائے تو یقین ہے کہ اس کی دعا سے لڑکے کو تندرستی حاصل ہوگی - راجہ مصیبت کا مارا شاہ کمال کے پاس پہنچا - اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شاہ کمال کی دعا سے راجہ کے لڑکے کو صحت ہوگئی - اس پر راجہ نے بطور اظہار شکر گذاری کے بہت سی اشرفیاں چار خچروں پر لدوا کر شاہ کمال کے حضور میں بطور نذر بھیجیں - شاہ کمال نے اُن کو قبول

کر لیا - اور اُن کا ڈھیر اپنے مکان کے صحن میں لگوا دیا - اس وقت گھر میں کبیر بھگت موجود نہیں تھے - کہیں باہر گئے ہوئے تھے - واپس آئے تو دیکھا کہ انگنائی میں اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے - بڑا تعجب ہوا کہ یہ اشرفیاں کہاں سے آئیں - بیٹے نے سارا واقعہ باپ کی خدمت میں عرض کیا - یہ سن کر کبیر بیٹے پر بہت ناراض ہوئے کہ تونے یہ اشرفیاں لے کر اپنی خودداری اور استغنا کو بٹہ لگایا - اور دعا کے بدلے میں یہ اشرفیاں کیوں وصول کیں - اُس وقت اُنہوں نے یہ دوہا پڑھا - جو بعد میں زبان زد عوام ہوگیا - اور بعد میں عام طور پر ایسے شخص کے متعلق بولا جانے لگا جو اپنی نازیبا حرکتوں سے اپنے آباو اجداد کو بد نام کرے —

ڈوم کا تیر خدا جھوٹ کرے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی مشکل میں پھنس جائے اور وہ اپنی مصیبت کو عام لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہو - یا کوئی شخص کسی بالکل ظاہر بات کو چھپانا چاہے اُس وقت بولتے ہیں - اس کا قصہ اس طرح مشہور ہے کہ ایک دفعہ اتفاقاً کسی ڈوم کی ران میں ایک تیر لگ گیا - اور زخم سے خون بہنے لگا - لوگوں نے دیکھا تو ہمدردی کا اظہار کرنے لگے - مگر ڈوم زخم پونچھتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا - خدا نہ کرے کہ میرے تیر لگے - خدا کرے کہ لوگوں کا یہ کہنا جھوٹ ہوجائے کہ میرے تیر لگا - تماشائیوں نے سنا تو ہنسنے لگے کہ بے وقوف جب تیر لگ چکا تو اب کیا جھوٹ ہوگا - اُس وقت سے یہ مثل بولنے لگے —

رام رام دونیاں گلے مل چونیاں

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی عیار اور چالاک شخص بہ نسبت غیروں کے اپنے دوستوں اور واقفکاروں کو کسی خرید و فروخت کے معاملہ میں زیادہ لوٹے - اوروں سے اگر کسی چیز پر مثلاً چار آنے نفع لیتا ہو تو اپنے دوست سے آٹھ آنے نفع وصول کرے —

اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بھئی مجھے بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے - کوئی ایسی دوکان بتلاو جہاں سے چیز سستی بھی ملے اور عمدہ بھی - دوست نے جواب دیا - فلاں دوکاندار نہایت دیانتدار اور ایماندار ہے - اُس نے اپنا یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ گاہک کے ہاتھ ہمیشہ اچھی اور عمدہ چیز بیچے گا اور نفع نہایت ہی کم لیگا - یعنی صرف ایک پیسہ فی روپیہ - آج تک کوئی گاہک اُس کے پاس اُس کی چیز کی شکایت لیکر نہیں آیا - اُس کے ہاں سے بہتر آپ کو اس شہر میں اور کہیں چیز نہیں مل سکیگی - میرا پرانا واقف ہے اور میرا بہت لحاظ کرتا ہے - یقین ہے کہ بہ نسبت دوسروں کے میری خاطر سے آپ کو چیز اور بھی سستی دے دیگا - چلئے اُس کے ہاں چلیں اور جس چیز کی آپ کو ضرورت ہو وہاں سے لے لیں - چنانچہ دونوں دوست اُس کی دوکان پر پہنچے - اور بہت سا سودا خریدا - جب لے کر گھر آے اور بیوی نے ہر ایک چیز کے دام پوچھے تو چونکہ عورتوں کو عام طور پر عام استعمالی اشیاء کے بھاو معلوم رہتے ہیں - اس لئے اُس نے کہا کہ یہ چیزیں تو تم بہت مہنگی اُٹھا لاے ؟ شوہر نے بازار میں جاکر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ دوسرے دوکاندار دونی فی روپیہ

منافع لیتے ہیں مگر اُس " دیانتدار " دوکاندار نے فی روپیہ چونی کے حساب سے منافع لیا - جس میں دلال صاحب کا جو ساتھ تھے پورا نصف کا ساجھا تھا - تب اُس شخص نے مذکورۂ بالا جملہ کہا اور اُس وقت سے یہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

ریوزی کے پھیر میں آگئے

یعنی کسی بڑی مصیبت اور چکر میں پھنس گئے - مقدمہ بازی میں گرفتار ہوگئے یا قرض کی آفت میں مبتلا ہوگئے - یا کوئی اور ایسی مشکل آپڑی کہ دن رات بھچھلی ور پریشانی میں بسر ہونے لگی - اس مثل کی ابتداء یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ چند نوجوان اور بے فکرے دوست بیٹھے ہوے خوش فعلیاں کررہے تھے - جاڑوں کے دن تھے - ایک دوست نے کہا - بھئی ! ہم تو اُس کو بہادر جانیں جو اس طرح ریوڑیاں کھاے کہ پہلے ایک پھر دو - علیٰ ھذالقیاس ہر مرتبہ دوگنی کرتا جاے - یہاں تک کہ دس دفعہ کھاے - دوستوں میں سے ایک جو خیر سے ذرا زیادہ عقلمند واقع ہوے تھے جھٹ بول اٹھے کہ "واہ یہ کیا مشکل ہے - لاؤ میں کھاتا ہوں " چنانچہ شرط بدی گئی اور ریوڑیاں آگئیں - اُن صاحب نے شروع میں تو بظاہر اس کو بہت ہی آسان کام سمجھا تھا اور خیال کیا تھا کہ صرف چند ریوڑیاں کھانی پڑیں گی - اور شرط مفت میں جیت جاوں گا - مگر جب ریوڑیاں کھانے بیٹھے اور حساب کیا کہ اگر ہر مرتبہ ریوڑیوں کو دوگنا کیا جاے تو دس مرتبہ میں کتنی ریوڑیاں ہوں گی - تو معلوم ہوا کہ اس طرح ایک ہزار اور تیئیس ریوڑیاں کھانی پڑیں گی - اب تو یہ صاحب بڑے چکراے مگر کر کیا سکتے تھے - شرط کر چکے تھے ۔

چنانچہ بادل ناخواستہ ریوڑیاں کھانی شروع کیں۔ مگر آخر کہاں تک
۱۰۲۳ ریوڑیاں کھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کھاتے کھاتے منہ دکھنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں یہ نوبت ہوگئی کہ منہ چلتا ہی نہ تھا۔ اب دوستوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ اور کہنے لگے دیکھا کیا خوب پھنسے۔ آخر ریوڑی کے پھیر میں آگئے نہ۔ دوست مذاق اڑا رہے تھے اور ان صاحب کا نہ پوچھو کہ کتنا پتلا حال ریوڑیاں کھاتے کھاتے ہوگیا تھا۔ آخر کو شرط ہار گئے۔ ان سے ریوڑیاں نہ کھائی گئیں اور تھک کر فرش پر لیٹ گئے۔ اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی۔



ساتھ گاؤں بکری چر گئی

جب کسی بڑے نقصان کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت علی‌العموم یہ مثل بولتے ہیں۔ اس کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ کوئی بادشاہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا۔ وہاں اتفاق سے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اکیلا رہ گیا۔ بھوک پیاس کی شدت سے مجبور ہوکر ایک کسان کے جھونپڑے میں چلا گیا۔ اور اس سے کہا کہ کچھ کھانے کو ہو تو لاؤ۔ میں مسافر ہوں اور سخت بھوکا ہوں۔ کسان نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ فوراً پانی لایا۔ بادشاہ کا ہاتھ منہ دھلایا پھر لسی کا ایک پیالہ بھر کر دیا۔ پھر روٹی اور چنے کا ساگ لایا۔ اور بادشاہ کے آگے رکھ دیا۔ بادشاہ بھوکا تو تھا ہی ایسا ٹوٹ کر روٹی پر گرا کہ تھوڑی سی دیر میں ساری روٹیاں ختم ہوگئیں۔ اس وقت وہ روٹیاں اس کو اعلیٰ درجہ کے لذیذ کھانوں سے بھی زیادہ مزے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہ کسان کی خاطر و مدارات اور مہمانداری

سے نہایت خوش ہوا اور کہنے لگا "دراصل میں اس ملک کا بادشاہ ہوں- اور تمہارے اس سلوک سے مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہوئی ہے- تمہارے اس چھوٹے سے مکان میں میں نے بہت آرام پایا ہے- میں تمہیں ساتھہ گاؤں جاگیر میں دیتا ہوں- تاکہ تم ہر مسافر کی اچھی طرح خاطر مدارات کرسکو"- چونکہ وہاں سند لکھنے کے لیے کاغذ نہ مل سکا- لہذا بادشاہ نے ایک پیپل کے پتے پر کسان کو ساتھہ گاؤں کی سند لکھہ کر دیدی اور چلا گیا —

اب اتفاق یہ ہوا کہ کسان کی بکری جو شام کو جھونپڑے میں آئی تو وہ پتہ رکھا ہوا تھا- اسے کیا پتہ کہ یہ پتہ اس وقت کتنی قیمتی دستاویز ہے- وہ اسے اُٹھا اور کھا گئی- کسان کی نظر بکری پر اس وقت پڑی جب آدھا پتہ بکری کے منہ کے اندر اور آدھا باہر تھا- یہ دیکھکر کسان کی جان ہی تو نکل گئی- وہ دوڑا کہ بکری کے منہ میں ہاتھہ ڈال کر پتے کو نکال لے- مگر اتنے دوڑتا رہا اتنے بکری پتے کو نگل گئی- اب سوائے افسوس کے کیا رکھا تھا- مجبوراً کسان روتا پیٹتا دارالخلافہ میں پہنچا- مشکل سے بادشاہ سلامت تک رسائی ہوئی- اس بیچارے نے اپنی مصیبت کی کہانی رو رو کر بادشاہ کو سنائی- بادشاہ سن کر ہنسا اور کہنے لگا "تو یوں کہو کہ ساتھہ گاؤں بکری چر گئی" یہ کہہ کر دوسری دستاویز اسے لکھدی اور وہ خوش خوش گھر واپس چلا گیا —



سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں

یہ مثل ایسے موقع پر کہتے ہیں جب کہیں بہت کچھہ نقصان ہوچکنے کے بعد اپنی قدر دانی ہو- نام و نمود اور دکھاوے کی خواہش

میں اپنا نقصان کرلینے کے موقع پر بھی یہ مثل بولتے ہیں۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک مرتبہ کسی شیخی باز عورت نے عید کے موقعہ پر بڑی بیش قیمت چوڑیاں پہنیں۔ اور اس امید میں کہ لوگ میری چوڑیوں کی تعریف کریں گے۔ ہر ایک کے آگے ہاتھ مٹکاتی پھری۔ مگر بد قسمتی سے نہ تو کسی نے چوڑیوں کو دیکھا۔ اور نہ ان کی تعریف کی۔ اب تو عورت کو بڑا غصہ آیا کہ میں نے تو اتنے دام خرچ کئے۔ اور کسی نے چوڑیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مگر غصہ ظاہر ہے کہ فضول تھا۔ اور دوسرے آدمیوں پر کیا اثر کر سکتا تھا؟ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ چنانچہ وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گھر آئی۔ اور دیا سلائی کھینچ مکان کو آگ لگا دی۔ مکان دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ لوگ دوڑ پڑے۔ بہ مشکل آگ بجھائی اور عورت سے پوچھا کہ آگ کس طرح لگی؟ عورت نے ہاتھ اٹھا کر چولھے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اور کہنے لگی۔ "اس چولھے میں سے کوئی چنگاری اڑ کر کمرہ میں جا پڑی اور اس سے سارے مکان میں آگ لگ گئی" کسی کی نظر چوڑیوں پر بھی جا پڑی کہنے لگا۔ چوڑیاں تو بڑی خوبصورت ہیں۔ کہاں سے بنوائیں؟ عورت نے کہا۔ کم بخت پہلے سے نہ پوچھا جب سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں۔ پہلے سے پوچھ لیتا تو میرا گھر کیوں جلتا؟ اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی۔



ساس مر گئی اپنی ارواح تونبے میں چھوڑ گئی

یعنی مرنے کے بعد بھی مصیبت باقی رہی۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کوئی ساس تھی۔ بڑی ظالم و جلاد۔ اپنی بہو کو

نہایت ستاتی اور بیحد پریشان رکھتی - نہ اچھا کھانے کو دیتی - نہ بھرپور پہننے کو - اور کام لیتی بے انتہا - غریب بہو کی مجال نہیں تھی جو اس کے سامنے دم بھی مار سکے - بیچاری بڑی خاموشی کے ساتھ اس کے سارے ظلم برداشت کرتی اور زبان سے اُف نہ نکالتی - خیر جب ساس کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے بہو کو بلایا - بہو ڈری کہ دیکھئے اب کیا آفت آتی ہے - ڈری سہمی ساس کے پاس گئی اور چپکی کھڑی ہو گئی - ساس نے کہا بہو - مجھے اپنا آخری وقت قریب معلوم ہو رہا ہے - خیر خدا کی مرضی اسی طرح تھی - مگر دنیا سے جاتے ہوئے میں تجھے ایک وصیت کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ زندگی میں تو جو کام کیا کرتی تھی میری مرضی اور اجازت سے اور میرے حکم سے کیا کرتی تھی - اب جب کہ میں نہ ہوں گی تو کس سے اجازت لیا کرے گی - اس لیے اب میری بجائے تو اس تونبے کو سمجھیو - جو کام کریو پہلے تونبے کے آگے بیان کیجیو - اور پھر اسے کیجیو - خبردار جو اس کے خلاف ہوا - میری روح اس تونبے میں رہے گی - اگر تو نے میرے کہنے کے خلاف کیا تو پھر سمجھ لے کہ تیری خیر نہیں —

تھوڑی دیر کے بعد ساس کا انتقال ہو گیا - اور ڈر کی ماری بہو نے ساس کے حکم کی تعمیل بڑی راسخ الاعتقادی سے کرنی شروع کی - جو کام شروع کرنے کو ہوتی پہلے مفصل طور پر تونبے کے سامنے بیان کرتی اور ڈرتی رہتی کہ ساس کی روح جو تونبے میں بیٹھی ہے کہیں ناراض نہ ہو جائے - اور سب کچھ بیان کر چکنے کے بعد پھر اس کام کو کرتی - ایک زمانہ بیچاری مصیبت کی ماری بہو پر اسی طرح گذر گیا - ایک روز اس کی ایک سہیلی آئی ہوئی تھی - اس نے جو یہ تماشا دیکھا تو بڑے تعجب

سے پوچھا کہ تو نے اس وقت یہ کیا حماقت کی؟ یہ سنتے ھی بہو کا رنگ مارے ڈر کے فق ہوگیا اور کہنے لگی - چپ چپ ساس کو خبر ہوگئی تو مجھے کچی کھا جائے گی - سہیلی بولی - پاگل ہوئی ھے - اُسے تو مرے ہوئے بھی دو برس ہولئے - اب ساس رکھی ھے - اس کی تو ھڈیوں کا بھی پتہ نہ ہوگا - بہو نے جواب دیا - اری پگلی ساس تو بیشک مرگئی ھے مگر اپنی ارواح اس تونبے میں چھوڑ گئی ھے - اسی لیے تو میں نے اس سے اجازت لی تھی - اساں کی وصیت تھی کہ ھر کام کرنے سے پہلے اس تونبے سے پوچھہ لیا کروں - سہیلی نے یہ سن آؤ دیکھا نہ تاؤ - جھٹ تونبا اٹھا زمین پر دے مارا - وہ ٹوٹ گیا تو کہنے لگی - لے اب بتا - تیری ساس کہاں رھے گی - تونبا تو ٹوٹ ٹاٹ ختم ہوا - اس وقت بہو کو معلوم ہوا کہ یہ ساری کارروائی محض میرے ڈرانے کے لیے تھی - نہ روح تونبے میں آئی اور نہ وہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ھے - چونکہ تونبا ھی نہ رھا تھا لہذا اس روز سے بہو کو چھٹی مل گئی - وہ جو چاھتی اپنی مرضی سے کرتی - نہ اس سے کوئی پوچھنے والا تھا نہ اسے کسی کا خوف تھا ـــ

سوت کی انٹی اور یوسف کی خریداری

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ھیں جہاں کوئی معمولی حیثیت والا آدمی کسی عظیم الشان کام میں ھاتھہ ڈالنا چاھے - تھوڑی بساط ھو اور بڑا حوصلہ رکھے - اس کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی جاتی ھے کہ جب ایک قافلے والے حضرت یوسف کو کنوئیں میں سے نکال کر بیچنے کے لیے مصر لے گئے - تو وھاں ان کے حسن و جمال اور لیاقت و قابلیت کا بڑا شہرہ ہوا - بڑے بڑے امیر ان کی خریداری کے لیے آئے - اور گاھکوں کا

بڑا هجوم هوا - اسی هجوم میں ایک بہت غریب بڑھیا بھی موجود تھی- جس کے لباس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے - اور پھٹی ہوئی جوتیاں پاؤں میں پہنے ہوئے تھی - هاتھ میں ایک سوت کی انٹی تھی - کسی نے پوچھا - بڑی بی تم نے اس هجوم میں آنے کی کیوں تکلیف کی ؟ بڑھیا کہنے لگی - بیٹا یہ سوت کی انٹی لے کر آئی ہوں - اس خیال سے کہ اگر مالک راضی ہوں تو یہ انٹی دے کر یوسف کو خرید لوں - میں نے سنا ہے کہ وہ نہایت لائق اور بڑا خوبصورت غلام ہے - لوگ هنسنے لگے - لیکن بڑھیا بدستور سنجیدہ بنی ہوئی تھی —

سوکن تو چون کی بھی بری

یعنی اگر عورت کی سوکن نہایت ہی معمولی اور بے حیثیت بھی ہو شوہر پر اس کا کچھ بھی اثر اور دباؤ نہ ہو تب بھی عورت کے دل پر سانپ ہی لوٹتا رہتا ہے - اور اس کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی - کہتے ہیں کہ کسی آدمی کی بیوی بہت درشت مزاج بد خو اور زبان دراز تھی - خاوند نے یہ کام کیا کہ چونی کی ایک بڑی سی عورت بنائی- اس کو اچھے اچھے کپڑے پہنائے اور اسے لاکر بیوی کے کمرے میں رکھ دیا - جب گھر میں آتا تو بجائے بیوی سے بات چیت کے اس چونی کے پتلے کی غور و پرداخت اور بناؤ سنگار میں مصروف رہتا - بیوی بیٹھی بیٹھی دیکھتی اور جلتی کہ مجھ سے تو ایسی الغرض اوراس فرضی سوکن کی اتنی خاطر- مگر آخرکار بیوی کو سمجھ آگئی - اُس نے خیال کیا کہ محض میری درشت مزاجی ہی خاوند کی بے التفاتی کا سبب ہوئی ہے - اس لئے خاوند سے اپنے پچھلے قصوروں کی معافی مانگی - اس چونی کی سوکن کو

باہر پھنکوایا اور دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے لگے —

سونا سنار کا ابھرن سنسار کا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص کمال ہوشیاری سے کسی شخص نوالو بنا کر اپنا مطلب نکالے - یا کسی بھلے آدمی کو بڑی چالاکی کے ساتھہ دھوکہ دیکر اپنا کام بنائے - اور آدمی باوجود چوکنا رہنے کے دھوکہ کھا جائے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی نہایت چابکدست اور مشہور سنار سے بادشاہ نے پوچھا کہ ایمان ایمان سے بتانا - اگر تمھیں کوئی آدمی کوئی سونے کی چیز بنانے کے لیے دے تو اس میں کتنا کھوٹ ملاتے ہو؟ سنار نے عرض کیا - حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں بادشاہ نے کہا بیشک تمھیں امن ہے جو کچھہ کہنا چاہتے ہو بے خوفی کے ساتھہ کہو - تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا - بادشاہ کی زبان سے اتنا سن کر سنار بولا حضور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سنار لوگ روپے میں پورے سولہ آنے کا مال خود ہضم کرتے ہیں اور گاہک کو خالص کھوٹا مال بنا کر دیتے ہیں - حضور وہ سنار ہی کیا جس نے ذرا سا بھی کھرا مال بنا کر مالک کو دے دیا —

بادشاہ یہ عجیب و غریب بات سن کر نہایت حیران ہوا - اور کہنے لگا - اچھا اگر ہم تمھیں کچھہ مال بنانے کے لئے دیں اور تم پر سخت پہرہ مقرر کر دیں تو پھر تم اس میں کس طرح کھوٹ ملا سکتے ہو؟ سنار نے عرض کیا - حضور خواہ کچھہ ہی انتظام کر لیں - ہونے والی بات تو ہوکر رہے گی - بادشاہ نے کہا اچھا ہم امتحان کرتے ہیں - یہ کہ کر سنار کو ایک سونے کی پتلی بنانے کا حکم دیا - اور ایک علحدہ مکان میں اس کی

ضروریات کی تمام چیزیں مہیا کردیں - اور اس پر دس سپاہیوں کا ایک زبردست پہرہ بٹھا دیا - اور انہیں تاکید کردی کہ خبردار! نہ کسی شخص کو اندر داخل ہونے دینا - اور نہ سنار کو باہر نکلنے دینا البتہ جس چیز کی ضرورت سنار کو ہو وہ خود لا دینا - اور سنار کو دے دیا کرنا - الغرض سنار نے اس سخت قید میں بیٹھ کر کام شروع کیا - جس وقت شام کو سنار کام سے فارغ ہوکر گھر جاتا اس وقت نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی جامہ تلاشی لی جاتی - اور جس وقت صبح کو کام پر واپس آتا تو اچھی طرح تلاشی دینے کے بعد اس کو اندر آنے کی اجازت ملتی —

سنار نے یہ چالاکی کی کہ رات کو گھر پر پیتل کی ایک ویسی ہی پتلی بنانی شروع کی جیسی وہ بادشاہ کی زیر ہدایت سونے کی بنا رہا تھا - قصہ مختصر سونے کی پتلی بھی بنتی رہی اور پیتل کی پتلی بھی تیار ہوتی رہی - یہاں تک کہ ایک دن دونوں تیار ہوگئیں - اب سنار نے یہ کام کیا کہ اپنی بیوی سے کہا کہ تو دہی والی بن کر اور دہی کا ایک مٹکا سر پر رکھ کر اس طرف آئیو جہاں میں کام کر رہا ہوں اور دہی کے مٹکے میں وہ پیتل کی پتلی چھپاتی لائیو جو میں نے بنا کر فلاں جگہ رکھ دی ہے - یہ انتظام کرکے وہ کام پر گیا - اور سپاہیوں سے کہنے لگا کہ کام بالکل تیار ہوگیا - اب صرف اتنا کام کرنا باقی ہے کہ دہی سے اس کے تمام جسم کو صاف کیا جائے - تم کہیں سے تھوڑی سی دہی منگا دو تو آج یہ کام ختم ہو جائے گا - اس پر پہرے والے سپاہیوں میں سے ایک تیار ہوا کہ وہ جاکر بازار سے دہی لے آئے - عین اس وقت ایک دہی بیچنے والی دہی کا مٹکا سر پر رکھے آواز دیتی ہوئی چلی آرہی تھی - سپاہیوں نے اس کو نہایت غنیمت سمجھا اور اسے بلا کر اندر مکان میں لے گئے - اور سنار سے کہا کہ لو

تمہیں دھی کی ضرورت تھی یہ دھی بیچنے والی اتفاق سے ادھر آ نکلی - اس سے جس قدر دھی کی ضرورت ہو لے لو - اب سنار نے یہ کام کیا کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھہ بڑی پھرتی سے سونے کی پتلی تو مٹکے میں ڈال دی اور پیتل کی پتلی دھی میں سے نکال کر سونے کی پتلی کی جگہ رکھہ دی - خیر پتلی بادشاہ کے سامنے پہنچی تو اُس کے رنگ و روغن - آب و تاب اور خوبصورتی و صفائی کو دیکھہ کر بادشاہ بڑا خوش ہوا - وہ ہرگز بھی نہ سمجھا کہ یہ سارا پیتل کا معاملہ ہے اور اس میں ایک رتی برابر بھی سونا نہیں ہے - بادشاہ کو یقین تھا کہ اس کے بنانے میں سنار کوئی چالاکی نہیں کر سکا ہوگا - چنانچہ اس نے سنار کو بلایا اُس کی صنعت اور کمال کی داد دی اور ہنسکر پوچھا کہ کہو اس پتلی میں کتنا کھوٹ ملایا ؟ سنار نے جواب دیا - جہاں پناہ آپ کے ہاتھہ میں خالص پیتل کی پتلی ہے - جس میں سونا رتی برابر بھی نہیں - بادشاہ یہ سن کر بڑا ہی حیران ہوا - اور جوہریوں کو بلایا - جنہوں نے دیکھہ کر کہا کہ حضور یہ تو خالص پیتل ہے - اب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ عجیب و غریب کار روائی کس طرح کی ؟ سنار نے ساری کیفیت من و عن بیان کردی - یہ ہے مثل کی وجہ تسمیہ -

---

سیف تو پٹ پڑی تھی پر نیمچہ کاٹ کر گیا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں جس شخص سے کام بننے کی توقع ہو وہ تو کام کرے نہیں ہاں دوسرا شخص جس سے کچھہ زیادہ امید نہ ہو وہ کام کردے یعنی خلاف توقع کام بن جانے کے موقع پر یہ مثل استعمال کی جاتی ہے - اس مثل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز

ایک نواب صاحب جن کا اسم گرامی سیف خاں تھا اپنی سواری پر بازار میں سے گذر رہے تھے۔ اور اُن کے آگے اُن کا بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ راستے میں جاتے ہوئے ایک فقیر نے نواب صاحب سے سوال کیا مگر نواب صاحب نے کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن ان کے لڑکے نے جھٹ ایک اشرفی نکال کر فقیر کی طرف پھینک دی۔ اُس وقت فقیر نے فوراً یہ فقرہ کہا۔ جو فوراً سارے شہر میں مشہور ہوگیا اور بعد میں ضرب المثل بن گیا۔ سیف کے معنی تلوار کے ہیں۔ اور امیر کا نام سیف خاں تھا۔ اسی مناسبت سے فقیر نے یہ فقرہ چست کیا —

— * —

سیکھ واکو دیجئے جاکو سیکھ سہاے
سیکھ نہ دیجئے باندر واکو جو گھر بئے کا جاے

سیکھ کے معنی نصیحت کے ہیں۔ ضرب المثل کا مطلب یہ ہے کہ واعظ و نصیحت اس شخص کو کرنی چاہئے جو اسے قبول کرے اور کہنا مانے۔ بندر کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جو غصہ میں آکر بئے کے ہی گھونسلے کا صفایا کرے۔ یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی شخص کو نصیحت تو کی جاے۔ ہمدردی کی خاطر وہ شخص اور اُلٹا نصیحت کرنے والے کے گلے کا ہار ہوجاے۔ اور نصیحت کرنے والے ہی کو برا بھلا کہنا شروع کردے۔ مطلب یہ ہے کہ اُلٹی آنتیں گلے میں پڑیں۔ اس مثل کے متعلق یہ پر لطف قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ جنگل کا موقعہ تھا۔ ایک درخت پر بئے نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا اور اس میں بیا اور بئی نہایت آرام اور بے فکری سے بیٹھے تھے۔ نہ ان تک پانی کی کوئی بوند پہنچتی تھی اور نہ بوچھاڑ ہی آتی تھی۔ اتنے میں بئے نے دیکھا کہ ایک بندر بھی سکڑا سکڑا

درخت کی ایک ٹہنی پر بیٹھا ہے - زور زور سے بوندیاں پڑنے لگیں تو وا
اُچھل کر دوسری شاخ پر جا بیٹھا - وہاں بھی امن نہ ملا تو تیسری پر جا
چڑھا - غرض سارے درخت پر اسی طرح سرا سیمہ اور پریشان پھر رہا ہے اور
بیچارے کو کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی - سردی سے الگ کانپ رہا
ہے - تڑا تڑ جو اولے پڑ رہے ہیں وہ اور بلائے جان ہو رہے ہیں - قصہ مختصر
بیچارے کی جان مصیبت میں آرہی ہے اور کچھ بن نہیں آتا کہ کیا کرے
بئے نے بندر کی جو یہ حالت دیکھی تو کہنے لگا " میاں بندر! اللہ میاں نے
تمہیں مضبوط ہاتھ تیز پنجے - پھرتیلا جسم دیا ہے - اگر برسات آنے سے پہلے
ایک اچھا سا گھر بنا لیتے تو اِس وقت کیسا آرام پاتے اور اس مصیبت سے
بچ جاتے جو اس وقت اُٹھا رہے ہو - مجھے ہی دیکھ لو - تمہارے سے چھوٹا او
کمزور پرندہ ہوں - نہ میرے ہاتھ پاؤں ایسے مضبوط ہیں جیسے تمہارے
نہ پنجے ایسے تیز ہیں اور نہ جسم ایسا چست و چالاک ہے - پھر بھی میں نے
محنت اُٹھاکر ایسا اچھا گھر بنا لیا ہے کہ اب اس میں بیٹھا ہوا چین کر رہا
ہوں - نہ بارش کا خطرہ ہے اور نہ سردی کا خوف - کاش میری طرح تم بھی
عاقبت اندیش ہوتے تو یہ برے دن کیوں دیکھنے نصیب ہوتے —

بندر مارے سردی اور اولوں کے پہلے ہی بد حواس ہو رہا تھا
اس بے وقت کی نصیحت سے اپنے آپے میں نہیں رہا - جھٹ جھلاّ کر ایک
آن کی آن میں بئے کا گھونسلا نوچ ناچ پھینک دیا - اور کہا " ہا
اب کہ کیا کہتا ہے - میں نے سنا نہیں تھا " - غریب بیا اور بچّے
دونوں اڑ کر ایک شاخ پر جا بیٹھے اور اب ان کی بھی وہی حالت
تھی جو بندر کی —

— * —

سینک سڑ پے تو لالہ جی کے ساتھ گئے اب تو دیکھو اور کھاؤ

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں بہ نسبت پہلے کے اور زیادہ کفایت شعاری کرنے کی تاکید کی جائے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک بنیا حد درجہ کا کنجوس اور بخیل تھا - اُس کے بخل کی انتہا یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے ایک شیشی میں تھوڑا سا گھی لیکر رکھہ لیا تھا - کھانے کے وقت ایک سینک اُس میں ڈبو کر نکال لیتا اور دال میں ڈال دیتا خیر اسی طرح گھر کا گزارہ چلتا رہا - اور لالہ جی روپ جوڑتے رہے - یہاں تک کہ وقت آپہنچا - اور لالہ جی بیکنٹھہ باشی ہو گئے اب صاحبزادہ بلند اقبال نے سنبھلے - وہ جو گھر کے مالک ہوے تو اُنھوں نے سارے گھر والوں کو جمع کیا - گھی کی قدیمی شیشی سامنے رکھہ لی اور فرمانے لگے سنو بھئی - یہ تو سب جانتے ہیں کہ سر گباشی لالہ جی اس شیشی میں سے دونوں وقت ایک ایک سینک نکال کر دال میں ڈالا کرتے تھے - مگر بات یہ ہے کہ لالہ جی کی آمدنی کثیر تھی - وہ اگر ایسی فضول خرچی کرتے تھے تو وہ تو اپنی نبھا گئے - مگر ہم سے نبھنی بہت مشکل ہے - کیونکہ اگر اس طرح روز دونوں وقت اس شیشی میں سے ایک ایک سینک استعمال کی جاتی رہی تو ایک نہ ایک دن ضرور سارا گھی ختم ہو جاے گا - اور ذرا سوچنے کی بات ہے کہ پھر اور گھی کہاں سے آے گا - تو بھائیو سینک سڑ پے تو لالہ جی کے ساتھہ گئے اب تو دیکھو اور کھاؤ - بس یہی ترکیب آسان معلوم ہوتی ہے کہ کھانا کھانے بیٹھے تو شیشی کو طاق میں سے اتار کر سامنے رکھہ لیا اس کی خوشبو دماغ میں پہنچتی رہی - اور گھر والے کھانا کھاتے رہے یقین جانو اس سونگھنے میں وہ لطف آیا کرے گا جو کھانے میں کبھی نہیں آسکتا - چنانچہ سب گھر

والوں نے بہ خوشی خاطر اس زرین تجویز کو منظور کیا - اور پہلے سے زیادہ کفایت شعار بن گئے —



عذر گناہ بدتر از گناہ

یہ فارسی ضرب المثل ہے مگر اردو میں بھی بہ کثرت استعمال ہوتی ہے - جب کوئی شخص اپنے قصور کی ایسی غلط اور قابل مضحکہ تاویل کرے کہ وہ تاویل اصل تصور سے بھی بڑھ جاے - جرم پہلے سے بھی زیادہ سنگین نظر آے - اس وقت یہ مثل بولتے ہیں - یہ تو پتہ نہیں لگ سکا کہ اس مثل کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی مگر اس کے متعلق ایک بڑا ہی پر لطف تاریخی لطیفہ مشہور ہے جو ہم ناظرین کی تفنن طبع کی خاطر یہاں لکھتے ہیں :-

خلیفہ ہارون الرشید نے ایک روز دربار میں کہا کہ "عذر گناہ بدتر از گناہ کا فارسی مقولہ بظاہر نہایت لغو اور فضول نظر آتا ہے - بھلا یہ بات کس طرح سمجھہ میں آسکتی ہے کہ قصور کی عذر خواہی کی جاے اور وہ عذر خواہی خود اصل قصور سے بھی بڑھ جاے - فارس کے باشندے دراصل ہوتے ہی ہیں بڑے لغوگو اور مبالغہ پسند" اس وقت دربار کا مشہور شاعر ابو نواس بھی حاضر تھا - وہ جواب دیے بغیر نہ رہ سکا اور کہنے لگا - حضور! مقولہ بالکل درست اور ٹھیک ہے - اور اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ یا مبالغہ نہیں - ہارون الرشید نے کہا - اچھا اسے ثابت کرو ابو نواس نے عرض کیا کہ " بیشک اس کا ثابت کرد کھانا میرے ذمہ ہے - حضور چندے توقف فرمائیں - میں اس کی صداقت کو جلد ہی ثابت کرد کھاؤں گا - یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ جب تک حضور عملی طور پر اس کی صداقت کو ملاحظہ نہ فرمائیں گے اس وقت تک یہ مقولہ ذرا مشکل سے سمجھہ

میں آئے گا" یہ کہ کر ابو نواس خاموش ہو گیا اور بات بظاہر آئی گئی ہوئی۔

اسی دن رات کو ابونواس نے یہ کام کیا کہ خواجہ سراؤں کو کسی طرح راضی کر کے زنانی ڈیوڑھی میں ایسے مقام پر چھپ کر بیٹھ گیا جہاں اتفاق سے کچھ اندھیرا تھا۔ بادشاہ جو باہر سے ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگے تو جس وقت اس مقام پر پہنچے جھٹ ابونواس نے پردے کے پیچھے سے نکل کر بادشاہ کا منہ چوم لیا۔ بادشاہ نے گبھرا کر کہا۔ کون ہے ؟ ہیں ابو نواس ! تو ہے۔ ابے یہ کیا نامعقول حرکت تھی۔ ابونواس نے بڑی شرمندہ صورت بنا کر کہا کہ افوہ ! حضور ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ زبیدہ خاتون ہیں۔ خیر اس وقت تو معاف کر دیجئے آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی" اس عجیب وغریب جواب سے ہارون الرشید کے غضب کا پارہ آخری ڈگری پر پہنچ گیا۔ اور وہ مارے غصہ کے تھر تھر کانپنے لگا اور ڈپٹ کر اس نے ابونواس سے کہا "مردود! کیا بکتا ہے" ابونواس فوراً قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا۔ حضور ایسے ہی موقع پر تو بولتے ہیں کہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" ہارون الرشید ہنس پڑا اور ابونواس کو کچھ انعام دے کر رخصت کر دیا —

کالی بھلی نہ سیت دونوں کو مارو ایک ہی کھیت

سیت کے معنی سفید کے ہیں کہتے ہیں کسی شخص کے دو بیویاں تھیں ایک کالی کلوتی اور بدصورت اور دوسری گوری چٹی اور خوبصورت مگر تھیں دونوں اول درجہ کی بدطینت شوہر کو ہمیشہ دق اور پریشان رکھتیں۔ یہاں تک کہ بیچارے کی زندگی اجیرن ہوگئی جب گھر میں پڑتا دونوں جھاڑ کا کانٹا ہو کر اسے چمٹ جاتیں ایک دوسرے کی شکایت

کرتیں - شوہر کو صلواتیں سناتیں - قسمت کا گلہ کرتیں اور اپنے آپ کو کوستیں - یہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا - ایک روز کسی دوست نے تذکرۃ " پوچھا کہ دونوں میں سے زیادہ نیک اور سلیقہ شعار آپ کی کون سی بیوی ہے؟ اس پر جل کر شوہر نے جواب دیا کہ " کالی بھلی نہ سیت دونوں کو مارا ایک ہی کھیت " یعنی دونوں ہی نکھد اور نالائق ہیں - میرا بس چلے تو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی نہ ملے ---

اس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا - اور ایسے موقع پر بولا جانے لگا جب کسی آدمی کے دو دشمن ہوں اور دونوں بظاہر ہمدردی کا اظہار کریں --

---

کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں دو آدمیوں کے درمیان اشاروں کناؤں میں ایسی طنز آمیز گفتگو ہو جسے دوسرے لوگ نہ سمجھ سکیں - مگر وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سمجھ کر خاموش ہو جائیں - بیان کرتے ہیں کہ کسی مسافر کے پاس ایک ہزار روپے کی تھیلی تھی - اور وہ ایک غیر آباد راستہ پر سفر کر رہا تھا - پیچھے سے اتفاقاً ایک اور مسافر اس سے آملا - اس نے کہا بھائی تو میرے سے زیادہ طاقتور اور مضبوط ہے اور راستہ خطرہ سے خالی نہیں - میرے پاس ہزار روپیہ نقد ہے - یہ تو اپنے پاس رکھہ لے - منزل مقصود پر پہنچ کر لے لوں گا - نو وارد نے جواب دیا - نہیں بھائی! میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتا - اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا - اب مسافر نے خیال کیا کہ اچھا ہی ہوا تھا جو میں نے روپیہ اس اجنبی کے پاس نہیں رکھوایا تھا - اگر یہ لے کر

چل دیتا تو میں کیا کر لیتا - اب ادھر کی سنیے - نو وارد مسافر کے دل میں آگے جا کر خیال آیا کہ مفت میں رقم آرہی تھی - ہاتھ سے دے کر بڑی بے وقوفی کی - چلو اب واپس چلو - اور رقم ہاتھ آجائے تو لے کر فنرو ہو جاؤ - میرا بنا ہی کیا لے گا - یہ خیال کر کے واپس پیچھے کی طرف لوٹا - مسافر بیچارا آہستہ آہستہ آرہا تھا - اسے دیکھتے ہی کہنے لگا - میاں میں نے خیال کیا کہ اگر اپنے سے کسی کا کام بنتا ہو تو اس کا کام کر دینا چاہئے - لاؤ روپیہ رکھ لوں - منزل پر پہنچ کر لے لینا - اچھا ہے بے فکری سے راستہ طے کر لوگے —

مسافر ہوشیار ہو چکا تھا - فوراً سمجھ گیا کہ یہ اظہار ہمدردی بلا وجہ نہیں - اس پر کہنے لگا - بھائی آپ کی مہربانی - لیکن بات یہ ہے کہ کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے - ایسا کیا بوجھ ہے - خود ہی لے جاؤں گا - اسی وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

کر تو ڈر - نہ کر تو بھی ڈر

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی آدمی کو یہ نصیحت کرنی ہو کہ ہر وقت اور ہر گھڑی خدا سے پناہ مانگتے رہنا چاہئے - نہ معلوم کس وقت کیا آفت آن پڑے - کہتے ہیں کہ دو دوست تھے جو بازار میں پاس ہی پاس دوکانیں کرتے تھے - ایک روز ایک دوکاندار نے اپنے دوست سے کہا " بھئی ! کر تو ڈر ، نہ کر تو بھی ڈر "

دوست نے جواب دیا - واہ یہ کیا بات ہے - اگر برا کام کریں تو تو ڈریں بھی - جب برا کام ہی نہ کریں تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ مجرم ہی کو سپاہی پکڑتا ہے - جس نے کوئی قصور ہی نہیں کیا اسے سپاہی سے

کیا تھا ؟ خیر دونوں کا مباحثہ اس مسئلے کے متعلق ہوتا رہا اور دن گذرتے رہے - ایک روز ایک امیر آدمی بڑا شاندار لباس زیب تن کئے دوکان پر آیا - اس کے ساتھ اس کا ملازم بھی تھا - جو ایک چھوٹے بچے کو کندھے سے لگائے ہوئے تھا - خیر آقا نے بہت سا سامان دوکان پر سے خریدا - اور ملازم سے کہا دیکھو جی یہاں بیٹھ جاؤ - میں یہ سامان گھر لے جاتا ہوں - وہاں سے آدمی کے ہاتھ قیمت بھیج دوں گا - پھر تم واپس چلے آنا یہ کہہ کر امیر آدمی تو چلا گیا اور اس کا ملازم دوکان پر بیٹھ گیا - دوکاندار مطمئن تھا کہ بچہ اور ملازم دونوں موجود ہیں ابھی روپیہ آتا ہوگا - تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ملازم نے بچہ کو آہستہ سے دوکان کے فرش پر لٹا دیا - اور کہنے لگا ذرا پیشاب کر آوں - دوکاندار نے خیال کیا کیا ہرج ہے بچہ تو سامنے سو رہا ہے - بچہ کو چھوڑ کر یہ کہاں جا سکتا ہے ؟ جب ملازم کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی اور آقا صاحب کی واپسی کی بھی کوئی امید نہ رہی تب تو دوکاندار بڑا گھبرایا - جلدی سے اٹھ کر بچہ کو دیکھا تو وہ مردہ تھا - اب تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا - چاہتا تھا کہ پولیس کو اس عجیب و غریب چالاکی کی اطلاع دے کہ یکایک امیر آدمی اور اس کا نوکر سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے - اور آتے ہی کہنے لگے - معاف کیجئے - ہمیں کچھ دیر ہوگئی - خیر لیجئے - اپنی رقم اور ہاں وہ ہمارا بچہ کہاں ہے؟ اچھا یہ رہا - یہ کہہ کر امیر آدمی نے جوں ہی اسے اٹھانا چاہا - فوراً ایک چیخ ماری اور کہنے لگا - ہیں یہ تو مر گیا - کیوں میاں دوکاندار ! اس معصوم کا گلا کس جرم میں گھونٹا ؟ چلو تھانے میں - بیچارہ دوکاندار سخت پریشان ہوا کہ اب کیا کرے - پولیس کو خبر ہوگئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اسی نے اس کا گلا گھونٹا ہے - اصل بات کون دیکھتا ہے - اس لئے اپنی

موقعہ بچانے کی خاطر اس نے اسی آدمی کی خوشامد کرنی شروع کی اور بہ مشکل ایک ہزار روپیہ اسے دے کر اپنی جان چھڑائی - ملازم نے بچے کو اٹھا کر پھر کندھے سے لگا لیا اور دونوں جدھر سے آئے تھے ادھر ہی چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد دوکاندار کو خیال آیا کہ اس جھگڑے میں مال کی قیمت بھی ان سے وصول نہیں ہوئی - لیکن اب کیا ہو سکتا تھا —

دوست نے یہ سارا واقعہ دیکھا اور کہنے لگا - کیوں بھئی کیا اب بھی تم اس فقرے کی صداقت کے قائل نہیں ہوگے کہ "کر تو ڈر نہ کر تو بھی ڈر" —

—— * ——

کماویں خان خاناں اُڑاویں میاں فہیم

اس مثل کو دوسری طرح یوں بیان کرسکتے ہیں کہ مال مفت دل بے رحم - یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کماوے کوئی اور اڑاوے کوئی - اکبری امرا میں سے عبدالرحیم خان خاناں نہایت مشہور گزرا ہے - بڑا فیاض طبع اور دریا دل انسان تھا - اُس کا ایک نہایت ہی عزیز اور چاہتا غلام تھا فہیم نام - فہیم آقا کے مزاج میں اس قدر دخیل تھا کہ جو چاہتا کرتا اور جس قدر چاہتا خرچ کرتا - کوئی اس کے معاملہ میں بولنے والا اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا - میاں فہیم بے دریغ روپیہ دھڑنے سے خرچ کرتے تھے اور بڑی شان سے رہتے تھے - انہی فہیم کو دیکھ کر یہ مثل بنائی گئی —

—— * ——

کھچڑی کھاتے پہنچا اُترتا ہے

اس مثل کا استعمال ایسے موقع پر ہوتا ہے جب کہ بہت ہی معمولی

سا کام کرتے ہوئے کوئی بڑی تکلیف اتفاقاً پہنچ جائے - نازک مزاج آدمی کے لئے بولی بولتے ہیں - اس مثل کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کوئی نواب صاحب تھے - نہایت بسیار خور اور بڑے کھاؤ - ان کی ایک وقت کی خوراک پندرہ بیس سیر کے قریب تھی - ایک روز نواب صاحب کی طبیعت کچھہ علیل تھی - حکیم صاحب نے غذا میں کھچڑی تجویز کی - خیر جب کھچڑی پک کر آئی تو ایک بہت بڑے لگن میں بھردی گئی - نواب صاحب کھانے بیٹھے اور پہنچے تک ایک دفعہ ہی اپنا ہاتھہ اس میں ڈال دیا - کھچڑی تھی بہت گرم - ہاتھہ جل گیا - سوزش جو ہوئی تو نواب صاحب نے جلدی سے اپنا ہاتھہ اس میں سے نکالا - جلتی کھچڑی ہاتھہ میں لگی رہ گئی تھی اس کے لئے ہاتھہ کو جو زور سے جھٹکا دیا تو فوراً پہنچا اُتر گیا - اور بڑی مالش کے بعد درست ہوا - اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی —

— * —

کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے

فارسی زبان میں اس مثل کی مترادف مثل " گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل " ہے - یعنی ایسی بات جو نہ کہتے بن پڑے اور نہ چپ رہا جائے - آدمی تذبذب میں پڑجائے کہ اب کیا کروں - کہتا ہوں تو خرابی نہ کہوں تو مشکل - اس مثل کے متعلق ایک بڑے ہی مزے کی حکایت مشہور ہے - اللہ کو پتہ ہے کہ کہاں تک سچ ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہے دلچسپ - کہتے ہیں کہ دو میاں بیوی تھے - اور دونوں میں روز مرہ کا فضیحتی رہتی تھی - خاوند بہت سخت تھا اور کوئی دن ایسا نہ جاتا ہوگا جو دو چار مرتبہ بیچاری بیوی پر مار نہ پڑجاتی

ہو - عورت تھی جاہل مطلق - کسی بیوقوف نے اسے بتا دیا کہ اگر تو کسی کتے کو پکڑ کر اور اُسے کاٹ کر اس کا گوشت خاوند کو کھلا دے تو خاوند فوراً تیرا ہاتھہ باندھا غلام ہوجائے گا - جس طرح تو کہیگی اس طرح کرے گا - اور جو تو حکم کریگی بجالائے گا - بیوی نے سوچا یہ تو بڑا سہل نسخہ ہے - لاؤ کیوں نہ آزماؤں - فوراً ہی ہمسائی کی معرفت ایک بازاری کتا پکڑوا کر منگوایا - اور اس کے گلے پر چھری پھیر گوشت کو صاف کر چولھے پر چڑھا دیا - مصالحہ اور گھی اس میں کافی ڈالا اور اچھا ترترا تا شوربا کردیا - شوربا کیا معنی قورما - خیر شوہر صاحب جو باہر سے آئے تو جھٹ خوشی خوشی ان کے سامنے کھانا نکالنے بیٹھی - جب وہ رکابی میں تار تار نکال رہی تھی تو صاحبزادہ بلند اقبال بھی پاس ہی تشریف فرما تھے - جن کی عمر ہوگی کوئی آٹھہ سات برس کی اور کتے کے پکڑے ہوئے آنے اور اس کے پکنے کی ساری کارروائی نور بصر کے سامنے ہی ہوئی تھی - اور ماں نے اس خیال سے کہ بچہ ہے کیا سمجھے گا اس سے معاملہ کو چھپانے کا کوئی اہتمام نہ کیا تھا - اب جو سالن نکلنا شروع ہوا تو برخوردار سوچنے لگا کہ یہ تو بری ہوئی - اگر یہ کہتا ہوں کہ ہیں ابا جان ! یہ مت کھانا کتے کا گوشت ہے تو ماں کی آج خیر نہیں - اور اگر چپ رہتا ہوں تو یہ کس طرح گوارا کرلوں کہ والد بزرگوار کتے کا گوشت کھائیں - آخر کو جو آپ کے دل میں تھا آہستہ آہستہ زبان پر بھی آنے لگا - اور آپ نے دبی زبان کہنا شروع کیا —

کہوں تو ماں ماری جائے   نہ کہوں تو باپ کتا کھائے

باپ کو شبہہ ہوا ا ر اس نے پیار سے پوچھا - بیٹا ! کیا بات ہے ؟ آج تو تم ایک نئی بات کہہ رہے ہو - اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوا -

اور میاں صاحبزادہ نے سارا کچا چٹھا باپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا -
شوھر نے کڑے تیوروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور بیوی کے :—

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

اس کے بعد جو کچھ ھوا اسے ھم ناظرین کے تخیل پر چھوڑتے ھیں -

گٹھڑی اِدھر اور میں اُدھر

یہ مثل ایسے بےوقوف اور احمق کے متعلق بولتے ھیں جس کے منہ سے نادانستہ طور پر جلدی میں ایسی بات نکل جائے جس سے وہ خود ملزم ھوجائے - اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کرتے ھیں کہ ایک صاحب تھے اُنھیں جو ھوئی کوئی ضرورت - تو سوچتے سوچتے یہ ترکیب اُن کی سمجھ میں آئی کہ ھمسایہ کے مکان میں چوری کرنی چاھئے - فوراً بہت سا مال ھاتھ آجائیگا - اور سب دلدر پار ھوجائیں گے - دیوار بیچ تو تھی ھی - اس لئے کام بھی کچھ مشکل نہ تھا - رات گئے آپ دیوار پھاند ھمسایے کے مکان میں داخل ھوے - یہاں سب سو رہے تھے اور سناٹا پڑا ھوا تھا - آپ نے جو قیمتی قیمتی چیزیں ملیں اور نقد جو کچھ دستیاب ھوسکا ایک جگہ جمع کیا - وھیں سے ایک چادر لی اور اس میں سارے مال غنیمت کو باندھا - اور اُٹھا کر لے چلے - ابھی کوٹھے پر نہ پہنچے تھے کہ اُن کی بدقسمتی سے گھر کے لوگ جاگ اُٹھے - اور اُنھوں نے وھیں سے چور چور کا شور مچایا - یہ گٹھڑی لے کر بھاگے - دیوار جو پھاندنے لگے تو گٹھڑی سر پر سے گر پڑی - فوراً لوگ پہنچ گئے اور گٹھڑی کو قبضہ میں کیا - خیریت یہ ھوئی کہ یہ دوسری طرف کود چکے تھے - اور اُنھیں کودتے ھوے کسی نے نہیں دیکھا - یہ دبک گئے اور چپکے سے جاکر پلنگ

پر لیٹ گئے - اب محلہ کے جس قدر آدمی جمع تھے سب نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق رات کے واقعہ پر رائے زنی کرنی شروع کی - چور صاحب سب انسپکٹر کی طرف مخاطب ہوئے اور کہنے لگے تھانیدار صاحب! میرے تو خیال میں چور اس بیچ والی دیوار پر سے آیا ہوگا - اور اسباب باندھ کر اسی طرف واپس کودنا چاہتا ہوگا کہ گھر والے جاگ اُٹھے - اس کے آگے یہ کہنا چاہتے تھے کہ جلدی میں گھڑی اِدھر گر پڑی اور چور اُدھر کود گیا - لیکن اُن کی زبان سے نکلا یہ کہ " بس جناب گھبراہٹ میں گھڑی اِدھر اور میں اُدھر " تھانیدار نے مسکرا کر کہا " ہاں جناب آپ نے سچ فرمایا کہ گھڑی ادھر اور میں اُدھر - مگر اب تو آپ بھی ادھر ہی آجائیے " یہ کہہ کر تھانیدار نے سپاہی کو اشارہ کیا اور اُس نے اس اقبالی مجرم کے ہتھکڑیاں لگالیں —

گربہ کشتن روز اول باید

یہ فارسی کی ضرب المثل ہے جو اردو میں بہ کثرت استعمال ہوتی ہے - مطلب یہ ہے کہ کسی کام کا انتظام پہلے دن اور ابتداہی میں کرنا چاہئے - جب شروع میں کسی خرابی کی روک تھام نہ کی گئی تو پھر بعد میں اُس کا انتظام محال کے قریب ہوجاتا ہے - اور سخت دقتیں اور مشکلات پیش آتی ہیں - اس کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کی دو تین دوست تھے جو آپس میں بڑی محبت سے رہا کرتے تھے مختلف اوقات میں سب کی شادیاں ہوگئیں - اور ہر شخص فکر معاش میں مشغول ہوگیا - مدت کے بعد جو دوستوں کا آپس میں ملنا ہوا تو ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ کہو بھئی بیوی کیسی ملی ! ایک صاحب فرمانے لگے -

بھئی کچھ نہ پوچھو ہماری بیوی تو سخت بد مزاج ہے - بات بات پر پہاڑ کھانے دوڑتی ہے - میں تو اس کے ہاتھوں سخت تنگ ہو رہا ہوں - بن نہیں آتا کہ کیا کروں ؟ دوسرے دوست فرمانے لگے - میاں ! ہماری بیوی تو ہمارے سامنے چوں نہیں کرسکتی - حکم کی بندی ہے - مجال نہیں کہ ہمارے کہنے کے خلاف کرے - شاکی دوست نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ آخر بتاؤ تو سہی تم نے ایسا کیا عمل کیا تھا جو تمہاری بیوی اس قدر تمہاری فرمانبردار ہے ؟ ان صاحب نے جواب دیا - میں نے شادی سے پہلے ہی سن لیا تھا کہ میری ہونے والی بیوی بہت بد مزاج ہے - اس لئے میں نے یہ تدبیر کی کہ پہلے ہی دن ایک بلی کو تمام دن بھوکا رکھہ کر شام کو اپنے پلنگ سے باندھ دیا - رات کو جس وقت سونے کے لئے پلنگ پر لیٹا تو بلی بھوک کے مارے میاؤں میاؤں کرنے لگی - میں فوراً پلنگ سے کودا - اور بڑے غصہ کی شکل بناکر میں نے کہا اچھا تو کیا تو مجھے سونے بھی نہیں دیگی ؟ یہ کہا اور بڑے غصہ میں آکر میں نے تلوار سے بلی کے دو ٹکڑے کردیے - میری بیوی پہلے ہی دن میرے غصہ کو دیکھہ کر کانپ اُٹھی - اور اُس نے سوچا کہ یہ تو بڑا غصیل اور سخت آدمی ہے - اگر میں نے ذرا بھی اس کے ساتھہ سختی برتی یا اس کا حکم نہ مانا تو پھر میرا بھی یہی حشر کرے گا - بس اُس روز سے جو میرا رعب بیوی پر بیٹھا ہے تو اس وقت تک وہی حالت ہے - اور اسی وجہ سے بڑے چین و آرام سے زندگی بسر ہوتی ہے —

دوسرے دوست نے یہ عجیب و غریب قصہ سنا تو اپنے دل؟ میں پختہ ارادہ کرلیا کہ میں بھی یہی تدبیر کروں گا - تاکہ بیوی کی درشت مزاجی سے نجات ملے - چنانچہ آپ نے بھی کہیں سے ایک بلی حاصل کی اور اسے اپنے پلنگ سے باندھ دیا - شب کو جس وقت سونے لگے تو اس نے

بلدھے ہونے کی وجہ سے میاؤں میاؤں کرنی شروع کی اس پر آپ فوراً اٹھہ بیٹھے اور تلوار کھینچ کر جو پہلے ہی سے پاس رکھہ لی تھی بلی پر حملہ کیا - اور نہایت غصہ کا منہ بناکر اس کے تلوار ماری - معاً بیوی نے پیچھے سے ایک دو مکہ رسید کیا - اور کہا کہ آج بیٹھے بٹھائے یہ کیا خبط سوجھا ؟ عقل بھی ٹھکانے ہے - حواس غائب کیوں ہوگئے - میں تم سے پوچھتی ہوں - آج تمھیں کیا ہوا ؟ شام تک تو تم اچھے بھلے چلگے تھے --

اب میاں کیا بولیں - دم بخود پلنگ پر لیٹ گئے اور غم و غصہ میں ساری رات گذار دی - صبح سویرے اُٹھہ کر اُن دوست صاحب کے پاس پہنچے جن سے یہ ترکیب سیکھی تھی - اور کہنے لگے - واہ حضرت اچھی ترکیب بتلائی - اور الٹی ہمارے ہی اوپر مار پڑی - دوست نے متعجب ہوکر حال پوچھا - اور کیفیت معلوم ہونے پر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا - دوست ! گربہ کشتن روز اول باید - یہ طریقہ تو تمھیں پہلے دن اختیار کرنا چاہئے تھا - اتنے دنوں کے بعد اب کیا بن سکتا ہے - اب تو بیوی کے ہاتھہ سے "جتنی جوتیاں کہانی قسمت میں لکھوا لائے ہو کھانی ہی پڑیں گی —

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

یعنی بہ نسبت غیر شخص کے گھر کے راز دار سے بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے - شہروں میں اکثر چھوٹی موٹی چوریاں گھر کے واقفوں اور ملازموں ہی کے پتہ بتانے پر کی جاتی ہیں - یہ مثل اس مشہور و معروف واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ رام چندر جی نے سیتا جی کو چھڑانے کے لیے لنکا کے راجہ راون پر حملہ کیا ہے - اور اسے شکست دیکر

لنکا کو پھونک دیا ہے - کہتے ہیں کہ لنکا کی فتح میں سب سے بڑا ہاتھ راون کے بھائی کا تھا - جو رام چندر جی سے مل گیا اور تمام راز کی باتیں ان کو بتلادیں - جس کی وجہ سے رام چندر جی اتنی آسانی کے ساتھ لنکا پر قابض ہو سکے - اگر وہ یہ غداری نہ کرتا تو شاید رام چندرجی کو لنکا فتح کرنے میں بہت کافی عرصہ لگتا - یا بالکل ہی فتح نہ ہو سکتی -

---

لینا ایک نہ دینا دو

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں نہایت ہی معمولی بات پر جھگڑا ہونے لگے - یا مفت میں کوئی شخص مشکل میں پھنس جاے - فضول اور بیکار میں پھنس جانے والے کے لیے بھی بولتے ہیں اس کا قصہ یہ مشہور ہے کہ ایک مور اور ایک مینڈک کی بڑی گہری دوستی تھی - مینڈک پانی میں سے باہر آجاتا اور دونوں دیر تک خوب سیر کرتے - پھر مور مینڈک کو پانی میں چھوڑ جاتا اور اپنے آپ چلا جاتا - ایک روز اسی طرح مور مینڈک کو چھوڑ کر واپس جا رہا تھا کہ کسی چڑی مار کے جال میں پھنس گیا - اور چڑیمار اسے شہر کو لے چلا - اب تو مور بڑا گھبرایا - اور چڑیمار سے کہنے لگا کہ تم نے آخر مجھے کس غرض سے پکڑا ہے ؟ اور تم میرا کیا کروگے ؟ چڑیمار نے کہا کروں گا کیا - بازار میں لیجا کر بیچوں گا - اور پیسے لیکر بال بچوں کو کھلاؤں گا - مور نے کہا اچھا اگر میری معمولی قیمت سے بہت زیادہ قیمتی شے تم کو میرے معاوضہ میں مل جاے تو کیا تم مجھے چھوڑ دوگے چڑیمار نے کہا ہاں مجھے اور کیا چاہئیے ؟ اس پر مور نے کہا اچھا تو مجھے سمندر کے کنارے لے چلو - خیر سمندر کے کنارے پہنچ کر مور نے مینڈک کو آواز دی - وہ فوراً پانی سے باہر آیا

یہاں دیکھا تو دوست کو جال میں پھنسا پایا۔ مور نے کہا۔ بھئی اس وقت میں اس چڑیمار کے جال میں پھنس گیا ہوں اور اس بات پر میری رہائی کا وعدہ چڑیمار کرتا ہے کہ اگر بازار میں جو کچھ میری معمولی قیمت اٹھے اس سے بہت زیادہ قیمتی چیز اس کو دے دی جائے تو یہ مجھے چھوڑ دے گا۔ اب میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم میری رہائی کے معاملہ میں میری مدد کرو۔ مینڈک نے فوراً پانی میں غوطہ مارا اور ایک بڑا سا موتی لاکر اسے دکھایا۔ اور کہنے لگا او یہ ایسا موتی ہے کہ ہزاروں روپے کا فروخت ہوگا۔ اور سوائے بادشاہ کے اور کوئی اس کی قیمت نہیں دے سکتا۔ اسے لو اور مور کو چھوڑ دو۔

اتنے بڑے موتی کو دیکھ کر چڑیمار کو لالچ پیدا ہوا اور کہنے لگا کہ میں تو جوڑا لوں گا۔ مینڈک نے کہا اچھا تم مور کو چھوڑ دو۔ میں اس کا جوڑا لاتا ہوں۔ چڑیمار نے مور کو چھوڑ دیا۔ اور مینڈک نے مور سے کہا بھئی! اب تم تو یہاں سے فوراً ہوا ہوجاؤ۔ اور کہا چڑیمار! تو یہ ایک موتی لیتا نہیں اور میں اسے جوڑا دینے کا نہیں۔ لہذا لینا ایک نہ دینا دو۔ تم اپنی منزل کھوٹی کیوں کرو۔ جاؤ اب کل ملیں گے۔ یہ کہا اور پانی میں غوطہ مار کر غائب ہوگیا۔ اور بیچارا چڑیمار کف افسوس ملتا ہوا گھر کو چلا آیا۔

مایا تیرے تین نام پرسا۔ پرسو۔ پرس رام

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کہ کوئی شخص ادنیٰ حالت سے ترقی کرکے دولت مند بن جائے تو لوگ اس کی دولت کے سبب اس کی عزت کرنے لگیں۔ اور اس کا نام تعظیم سے لینے لگیں۔ حالانکہ پہلے اس کو

اس کے معمولی نام سے مخاطب کرتے تھے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ پرسا نام ایک معمولی غریب آدمی کسی قصبہ میں رہتا تھا - لوگ اسے پرسا پرسا کر کے پکارتے تھے - کیونکہ یہی اس کا نام تھا - رفتہ رفتہ اس کی مالی حالت سدھرنے لگی اور وہ اچھا کھاتا پیتا شخص ہوگیا - اب لوگ اسے بجائے پرسا کے ذرا کچھہ لحاظ کے ساتھہ "پرسو" کہنے لگے - کچھہ عرصہ کے بعد اتفاق سے وہ ایک بڑا دولت مند اور امیر ہوگیا - اب لوگوں نے اسے تعظیماً سیٹھہ پرسرام کہنا شروع کیا - دولت کے ساتھہ ساتھہ ناموں کی ان تبدیلیوں کو دیکھہ کر ایک شخص نے یہ فقرہ کہا اور آهستہ آهستہ ضرب المثل بن گیا —

مُلا کی داڑھی تبرک میں گئی

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی چیز فضول اور بے کار خرچ ہوجائے اور جائز طریقے پر خرچ نہ ہو - کہتے ہیں کہ یہ مثل یوں شروع ہوئی کہ کوئی مولوی صاحب تھے - جو کسی گاؤں میں وعظ کرنے کے لیے گئے - اور وعظ کے بعد حسب معمول کچھہ مٹھائی ان کے سامنے بطور تبرک کے تقسیم کرنے کے لیے رکھی گئی - مولوی صاحب جو تبرک تقسیم کرنے کے لئے کھڑے ہوے تو اتفاقاً ایک بال اُن کی لمبی داڑھی میں سے گرا - اور جاہل دیہاتیوں نے اُسے بھی تبرک جان کر فوراً خود اٹھا لیا - دوسروں نے دیکھا تو جھٹ ہاتھہ بڑھا مولوی صاحب کی داڑھی کے چند بال اُکھیڑ بطور تبرک آپس میں تقسیم کرلیے - اُن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی جو اب تک بیٹھے ہوے یہ تماشا خاموشی سے دیکھہ رہے تھے مولوی صاحب کی داڑھی پر ہاتھہ صاف کیا اور چند بال حاصل کرلئے - قصہ مختصر آن

کی آن میں مولوی صاحب کی ساری ڈاڑھی تبرک بن کر رہ گئی- اور مولوی صاحب جاہل دیہاتیوں کی اس عجیب و غریب تبرک پسندی سے پریشان ہو کر وہاں سے سر پر پیر رکھہ کر بھاگے اور گھر آ کر دم لیا - یار لوگوں نے جو یہ لطیفہ سنا تو ان کو ایک بات ہاتھہ آئی اور گھر گھر مولوی صاحب کے تبرک کا تذکرہ ہونے لگا - اور بعد میں یہ واقعہ بطور ضرب المثل کے بیان کیا جانے لگا —

مونچھوں پر تاؤ دینا

یہ اگرچہ کوئی ضرب المثل نہیں بلکہ ایک محاورہ ہے - لیکن چونکہ اس کے متعلق ایک قصہ بھی مشہور ہے لہذا ضرب الامثال کی ذیل میں اسے درج کیا گیا ہے - یہ محاورہ شیخی باز آدمی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے - اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کوئی شیخ صاحب تھے - گھر سے جو نکلے تو مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوے اور اینٹھتے ہوے - اتفاقاً سامنے سے ایک خان صاحب بھی تشریف لا رہے تھے - انہوں نے جو شیخ صاحب کو مونچھیں چڑھاے ہوے آتے دیکھا تو انہیں بڑا غصہ آیا - کہنے لگے سنو شیخ صاحب ! کیا تم ہی سب سے زیادہ بہادر اور شجاع ہو ؟ اگر تمہیں بہادری کا کچھہ زعم ہے تو آو دو دو ہاتھہ ہو جائیں - جو جیتے وہی اپنی مونچھوں پر تاو دے - شیخ صاحب بھی نہایت ہوشیار واقع ہوے تھے - سوچنے لگے مقابلہ پر پٹھان بھائی سے ور آنا مشکل ہے - لاو اس وقت کوئی چال چلو - جھٹ اکڑ کر جواب دیا - خان صاحب ہم کیا تم سے کسی بات میں ہٹے ہیں ؟ مگر یوں لڑنے کا لطف نہیں - ایک کام کرو - تم اپنے گھر والوں کا صفایا کر آو - اور میں اپنے بچوں اور

بیوی کو قتل کراؤں - پھر دونوں بے فکر ہوکر لڑیں گے - آگے نتیجہ خدا کے ہاتھہ ہے - خان صاحب سپاہی آدمی تھے - اس چال کو نہ سمجھے اور جوش شجاعت میں کہنے لگے " منظور " اور یہ کہہ گھر کی طرف روانہ ہوگئے - اور جاتے ہی ایک ایک کرکے سارے گھر والوں کو مار دھرا - فارغ ہوکر آپ باہر تشریف لائے تو شیخ صاحب بھی سامنے سے آتے ہوے دکھائی دیے - ان کی مونچھیں اسی طرح چڑھی ہوئی تھیں - آتے ہی انھوں نے خان صاحب سے ہنس کر کہا " خان صاحب ! اچھا آپ یہ تو بتائیں کہ آپ مجھہ سے کیوں ناراض ہیں ؟ اور کیوں آپ کو مجھہ پر غصہ آرہا ہے " خان صاحب نے فرمایا - وجہ ظاہر ہے - تم میرے مقابلہ پر مونچھوں کو تاو دیتے ہوے گھر سے نکلے - اس سے زیادہ بڑا مخاصمت اور کیا ہوسکتی ہے ؟ اس لئے اب یا تو تم ہی دنیا میں رہوگے یا میں ہی رہوں گا - آو مقابلے پر اور نکالو اپنے ہتھیار —

شیخ صاحب نے جواب دیا - واہ خان صاحب ! آپ نے اچھی کہی - کیا صرف اتنی سی بات آپ کی ناراضگی کا موجب ہوئی - لاحول ولا قوۃ - بھلا یہ بھی کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے اتنا جھگڑا بکھیڑا کرنا پڑا - اگر آپ میری مونچھیں چڑھانے سے خفا ہیں تو لیجئے میں اپنی مونچھیں نیچی کرلیتا ہوں - آپ ناراض نہ ہوں - اور غصہ تھوک دیں - یہ کہہ کر جھٹ اپنی مونچھیں نیچی کرلیں - اور فوراً وہاں سے چل دیے - پٹھان بے چارا پیچ و تاب کھاکر رہ گیا کہ مقابلہ بھی نہ ہوا اور اہل و عیال بھی سارے موت کے گھاٹ اترے - مگر اب کیا ہوسکتا تھا جو کچھہ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا - مگر اس معاملہ کا صدمہ بے چارے خان صاحب کو ہمیشہ رہا - اس وقت سے یہ محاورہ استعمال ہونے لگا —

نمازی کا ٹکا

یہ ضرب المثل ایسے وقت میں بولتے ہیں جب کہ یہ ظاہر کرنا ہو کہ فلاں کام کی جزا کبھی نہ کبھی مل ہی جاے گی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کوئی لڑکا تھا بڑا شریر اور چالاک - اس کو یہ ایک بری عادت پڑی کہ مسجد میں جب لوگ سجدہ میں جاتے تو ان کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیتا - ایک مرتبہ جو ایک شخص کی ٹانگیں اس نے پکڑ کر گھسیٹیں تو اس نے بڑی نرمی اور شفقت سے اسے پاس بلایا - اور ایک ٹکا جیب میں سے نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا لو میاں صاحبزادے اس کی ریوڑیاں کھانا ٹکا پاکر لڑکا بڑا خوش ہوا - اور خیال کرنے لگا کہ اس آدمی نے ڈرکر مجھے یہ ٹکا دیا ہے تاکہ میں پھر کبھی اس کی ٹانگیں نہ کھینچوں۔ یہ تو بڑا اچھا روزگار ہے۔ اگر لوگ اسی طرح ڈرکر مجھے روزانہ ٹکے دیا کریں تو پھر تو قسمت میں چین ہی چین لکھا ہے - روز مرہ ریوڑیاں کھانے میں آیا کریں گی - چنانچہ اسی امید میں اس نے پہلے سے بھی زیادہ مستعدی کے ساتھ یہ فرض انجام دینا شروع کیا - مگر اس نمازی نے در اصل یہ ٹکا اس کو اس غرض سے دیا تھا کہ ٹکے کے لالچ میں جب یہ لڑکا اسی طرح لوگوں کی ٹانگیں کھینچا کرے گا تو کبھی نہ کبھی کوئی ایسا آدمی بھی نکل آے گا جو اس کو اس کرتوت کی پوری پوری سزا دے دے گا - حسب امید لڑکے نے ایسا ہی کیا - اتفاقاً ایک روز کوئی اجنبی پٹھان صاحب بھی نماز پڑھنے مسجد میں آگئے - لڑکے نے حسب معمول ان کی بھی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹیں اور امید کی کہ شاید یہ بھی مجھے ٹکا دے - پٹھان صاحب کو جو غصہ آیا تو انہوں نے ایک دو ہتڑ ایسا رسید کیا کہ سارا کھایا پیا معدہ کے راستے نکل گیا - اور خون کی قے جاری ہوگئی - لوگ اسے

اٹھا کر اس کے گھر لے گئے - اور بہت دنوں کے بعد وہ اچھا ہوا - سبق ایسا ملا تھا کہ پھر ساری عمر کو اسے کان ہوگئے اور آئندہ کسی شخص کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹنے کی جرأت اسے نہیں ہوئی - غرض یہ ہے کہ اس نمازی کا ٹکا بیکار نہیں گیا - اور اسی کا ثمرہ تھا کہ لڑکا ہمیشہ کے لئے اس فعل سے تائب ہوگیا —

—— * ——

ننانوے کے پھیر میں پڑ گیا

کسی ایسی مشکل میں پھنس جانے کے موقع پر بولتے ہیں جس سے رہائی ہی نہ مل سکے - کہتے ہیں کہ کوئی شخص تھا - اگرچہ گھر میں غربت تھی مگر معمولی طور پر گھر کا گذارا چلتا رہتا تھا - اور گھر کے سب لوگ اس غریبی میں بھی خوش و خرم رہتے تھے - کیونکہ کچھہ فکر نہ تھا - ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ شخص جنگل میں چلا جاتا تھا کہ اس کو ایک تھیلی درخت کے نیچے پڑی ملی - اٹھا کر جو کھولا تو روپوں سے بھری ہوئی تھی - جلدی سے تھیلی کو اپنے کرتے کے نیچے چھپا لیا - اور لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا گھر پہنچا - کواڑ اچھی طرح سے بند کر کے بیوی کو بلایا - اور اس کے سامنے تھیلی رکھہ دی - بیوی نے حیرت سے میاں کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ کیا بات ہے اور اتنے سارے روپے کہاں سے مل گئے ؟ شوہر نے سارا واقعہ سنایا - دونوں نے اس مال غنیمت کے ملنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ اب بڑے چین و آرام سے زندگی بسر ہوگی - دونوں نے روپوں کو گنا تو ۹۹ روپے تھے - سوچنے لگے کہ یہ تو کچھہ نہ ہوئی - پورے سو بھی نہ ہوے - اچھا خیر کچھہ مضائقہ نہیں - ہم محنت مزدوری کر کے اس میں ایک روپیہ اور ملا دیں گے - اور پورے سو روپے

کردیں گے - چنانچہ انھوں نے بڑی محنت مشقت اٹھا کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر ایک روپیہ ذرا ذرا سا کرکے روزانہ اخراجات میں سے بچایا - اور پورے سو روپے کردیے جب سو روپے ہوگئے تو اب دونوں میاں بیوی کو خیال آیا کہ اگر یہ دو سو روپے ہوجائیں تب تو ہم خاصے امیر آدمی ہوجائیں گے - یہ خیال کرکے دونوں نے پھر گھر کے اخراجات میں کتر بیونت کرنی شروع کی - اور پہلے سے زیادہ کفایت شعاری کیا معنی بلکہ کنجوسی کے ساتھ خرچ کرنا شروع کیا - گھر کا آرام راحت اور خوشی اس خبط میں سب جاتی رہی - اور ہر وقت یہی دھن انھیں لگ گئی کہ کسی طرح یہ رقم دو سو روپے تک پہنچ جائے - کسی شخص نے جو اس مصیبت میں ان کو دیکھا تو ان کے حسب حال یہ فقرہ کہا اور چونکہ بالکل موزوں تھا بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

—— * ——

واہ پیر علیا! پکائی تھی کھیر - ہوگیا دلیا

کسی کام کے بری طرح سے بگڑ جانے کے موقع پر یہ مثل بولا کرتے ہیں - اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ علیا نامی کوئی پیر صاحب تھے - انھوں نے ایک بڑھیا سے پوچھا کہ بڑی بی کیا پکا رہی ہو - بڑھیا نے کھیر چڑھا رکھی تھی خیال کرنے لگی - اِن سے کہا کہ کھیر ہے تو ساری چٹ کرجائیں گے اور مجھے کچھہ بھی نہ بچے گی - کہنے لگی- پیر جی صاحب! تھوڑا سا دلیا پکا رہی ہوں اور تو کچھہ نہیں - خیر پیر جی صاحب خاموش ہو کر چلے گئے تھوڑی دیر میں بڑھیا نے جو چپنی اتار کر ھنڈیا کو دیکھا تو واقعی دلیا ھی کھدر بدر پک رہا تھا - بڑھیا نے دلیا دیکھہ کر اپنا سر پیٹ لیا - اور کہنے لگی - واہ پیر علیا! پکائی تھی کھیر ہوگیا دلیا - اب کیا کروں پیرجی کی بد دعا لگ گئی -

وہ پانی ملتان گیا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی شخص سے یہ کہنا ہو کہ تم نے غفلت اور سستی میں وقت گذار دیا - اور اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے - اس کہاوت کا ماخذ یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ بنارس میں کوئی چمار رئیداس نام رہتا تھا مگر تھا ایشور کا بڑا بھگت - اور دور دور اپنے زھد و تقدس کی وجہ سے مشہور تھا - ایک روز گورکھہ ناتھہ نامی ایک بڑے مہاتما اس سے ملنے کے لیے آئے - اس کے ہاں پہنچتے ہی ان کو ایسی پیاس لگی کہ جان بے چین ہو گئی - انہوں نے رئیداس سے کہا ذرا سا پانی پلاؤ - رئیداس فوراً اٹھا اور ایک مٹی کے پیالہ میں پانی لاکر گورکھہ ناتھہ کے سامنے رکھہ دیا - اس وقت گورکھہ ناتھہ مہاتما کو خیال آیا کہ اوھو یہ تو چمار ہے - اس کے ہاں کا پانی کس طرح پاک ہو سکتا ہے - خیر جب وہ پانی لایا تو انہوں نے کہا بھئی میری چھاگل میں ڈال دو اور آپ باتوں میں مشغول ہو گئے - اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھہ کر اور چھاگل لے کر چلے آئے - اس کے بعد کبیر صاحب کے ہاں پہنچے - چھاگل رکھہ دی اور کبیر صاحب سے باتیں کرنے لگے - اتنے میں کبیر صاحب کی لڑکی آئی - پانی رکھا تھا - اسے جو پیاس لگی تو غٹ غٹ سارا چڑھا گئی - پانی کا حلق سے اترنا تھا کہ لڑکی پر چودہ طبق روشن ہو گئے - اور زمین و آسمان کا سب پوشیدہ حال اس پر ظاہر ہو گیا - جب گورکھہ ناتھہ پر یہ حال کھلا تو وہ بہت ہی پچھتائے کہ وہ پانی میں نے کیوں نہ پی لیا - بھاگے بھاگے پھر رئیداس کے ہاں گئے - اور چھوٹتے ہی اس سے کہنے لگے - میاں ذرا سا پانی تو پلواؤ - وہ اپنے علم کے زور سے سارے حال سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا - کہنے لگا گورکھہ ناتھہ مہاراج ! وہ

پانی ملتان گیا - بات یہ تھی کہ بعد میں وہ لڑکی جس نے پانی پیا تھا اپنی سسرال روانہ ہو چکی تھی - جو ملتان میں تھی - اسی وجہ سے رئیداس نے کہا کہ وہ پانی ملتان گیا - گورکھہ ناتھہ بیچارے سمجھہ گئے کہ اب پھر پانی کا ملنا محال ہے - لہذا افسوس کرتے ہوئے گھر کو چلے آئے —

وهی مرغے کی ایک ٹانگ

یعنی کسی بیجا اور ناموا جب بات کے صحیح اور درست ہونے پر اصرار کرنا - اپنی ضد پر اڑے رهنا - اس مثل کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ کسی صاحب بہادر کا ایک خان ساماں تھا نہایت چالاک - ایک مرتبہ صاحب نے اس سے کہا کہ رات کے کھانے کے لیے ایک مرغ پکاؤ - چنانچہ خانساماں نے ایک نہایت فربہ مرغ کا سالن تیار کیا - اور نصف سالن اور ایک ٹانگ خود چٹ کی - صاحب کے سامنے جس وقت ایک هی ٹانگ آئی تو انہوں نے خانساماں کو بلایا اور پوچھا کہ مرغ کی ایک ٹانگ کیا ہوئی ؟ بغیر ایک لحظہ تامل کیے ہوئے خانساماں نے برجستہ جواب دیا کہ حضور! یہ بڑا اصیل اور نہایت اعلیٰ نسل کا مرغ تھا جو میں حضور کے لیے بڑی تلاش سے بہت قیمت دے کر لایا تھا - اس نسل کے مرغوں کی اور خصوصیات کے علاوہ ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ صرف ایک ٹانگ کے ہوتے ہیں - صاحب عقلمند تھے - سوچا کہ خانساماں جوتیوں سمیت آنکھوں میں بڑنا چاهتا ہے - هنس کر چپکے ہو گئے - دو تین روز کے بعد اتفاقاً صاحب کہیں جا رہے تھے - خانساماں ساتھہ تھا - کہ راستے میں ایک مرغ اپنا ایک پاؤں پروں میں چھپائے کھڑا تھا - خانساماں نے دیکھتے هی

چوہت صاحب کو ادھر متوجہ کیا - اور کہنے لگا دیکھئے حضور یہ مرغا بھی اسی نسل کا ہے جو آپ نے پرسوں کھایا تھا - اس کے بھی ایک ہی ٹانگ ہے اور اس کے بھی ایک ہی ٹانگ تھی - صاحب نے مسکراتے ہوئے تالی بجا کر جو ہش کی تو فوراً مرغا چوکنا ہوکر دونوں ٹانگوں سے کھڑا ہوگیا - صاحب نے خانساماں کی طرف دیکھا - خانساماں بڑا ہی ہوشیار اور حاضر جواب تھا - فوراً بول اٹھا - آج تو حضور نے کمال کردیا جیسے تالی بجا کر یہاں حضور نے مرغے کی دونوں ٹانگیں پیدا کردیں ایسا ہی حضور نے کھانے پر اس روز تالی نہ بجائی - نہیں تو وہاں بھی فوراً دوسری ٹانگ موجود ہوجاتی - صاحب کو اس کے اس برجستہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور قصہ آیا گیا ہوا - اس وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا -

---

ہنوز دہلی دور است

اس فارسی ضرب المثل کے معنی ہیں "ابھی دلی دور ہے" یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب یہ ظاہر کرنا ہو کہ کام کے بننے اور مقصد کے حاصل ہونے میں ابھی بہت دیر لگے گی - اور منزل مقصود ابھی کوسوں دور ہے - یہ اگرچہ فارسی کی کہاوت ہے مگر اردو میں بہ کثرت مستعمل ہے - اور اسی لئے ہم اسے یہاں لکھتے ہیں - خوش قسمتی سے یہ مثل ایسی ہے کہ اُس کی ابتدا کے متعلق تاریخ کے روشن صفحات ہماری پوری پوری رہنمائی کرتے ہیں اور ہمیں صحیح اور یقینی طور پر اُس کے ماخذ کا پتہ معلوم ہے تفصیل حسب ذیل ہے :—

خسرو خاں نامی ایک نوجوان شخص نے سنہ ۷۲۰ ھ مطابق ۱۳۱۳ ع

میں قطب الدین مبارک شاہ بادشاہ دھلی کو قتل کرکے دارالسلطنت پر قبضہ جمایا - اور ھندوستان کا بادشاہ ہوگیا - اس شکر میں اس نے دھلی میں جتنے بڑے بڑے علماء اور زھاد اور صوفیاے عظام تھے سب کو معقول ھدیے اور نذرانے بھیجے - اور تمام مشائخ دھلی کے سرتاج حضرت شاہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے حضور میں بھی پانچ لاکھ تنکہ پیش کئے - اُس دربار میں شاھی نذرانے کی کیا وقعت ہونی تھی - فوراً حضور نے تمام رقم غریبوں اور حاجتمندوں میں تقسیم فرما دی اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا —

زمانہ کی بساط الٹی اور خسرو خاں نے صرف چار ماہ حکومت کے مزے لوٹے تھے کہ اس کو بھی وھی دن دیکھنا نصیب ہوا جو اس نے قطب الدین کو دکھایا تھا - یعنی غیاث الدین تغلق کے ھاتھہ سے مارا گیا - اور اب غیاث الدین دھلی کا بادشاہ تھا —

بادشاہ ہوتے ھی اس نے تمام مشائخ دھلی کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ جس جس شخص کو خسرو خاں نے ھدیے اور نذرانے پیش کیے تھے سب واپس لاکر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں - کیوں کہ یہ خسرو خاں کا اپنا مال نہیں تھا - بلکہ شاھی خزانہ جو سلطنت کی چیز تھی بے دریغ لٹایا گیا تھا - پس جو اشخاص رقمیں واپس پیش نہ کریں گے - غضب سلطانی کے مورد بنیں گے - چنانچہ مارے خوف کے تمام بزرگوں نے فوراً بلا توقف رقمیں شاھی قاصدوں کے حوالے کیں - اور جنھوں نے رقمیں واپس کرنے میں ذرا بھی تامل کیا - انھیں سخت تکلیفیں دی گئیں - جب شاھی قاصد حضرت سلطان الاولیاء کے حضور میں پہنچا اور فرمان سلطانی پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ بھئی میری طرف سے کہہ دینا کہ

روپیہ تو خرچ کرنے اور غریبوں کی امداد کرنے کے لئے ہوتا ہے - نہ کہ جوڑنے اور حفاظت سے رکھہ چھوڑنے کے لئے - میں نے تو اسی وقت تمام روپیہ ضرورتمندوں اور مساکین میں تقسیم کردیا تھا - اب میرے پاس روپیہ کہاں جو میں دے دوں —

غیاث الدین کو اس صاف جواب پر غصہ تو بہت آیا مگر حضرت سلطان المشائخ کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ بادشاہ ان کو گرفتار کرانے یا کسی سزا کے دینے کا خیال بھی نہیں کرسکتا تھا - مجبوراً چپ ہو رہا - کینہ توز اور بد باطن ارا کین دولت نے جب دیکھا کہ بادشاہ حضرت سلطان المشائخ سے ناراض ہے تو انہیں اور کیا چاہیے تھا - حضرت کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے کا خوب موقع ہاتھہ آیا - چنانچہ انہوں نے حضرت محبوب الٰہی کے خلاف بہت سے اتہامات تراشے اور انہیں خوب نمک مرچ لگا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا - منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ حضور وہاں تو ہر وقت محفل سماع منعقد رہتی ہے جو بالکل خلاف شرع اور بدعت ہے - فوراً علماے کرام سے اس کے متعلق استفسار کیا جاے کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہونی چاہئے جو یوں علانیہ شریعت کی ہتک کرے - فرشتہ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :—

" جمعے کہ با شیخ عداوت و حسد داشتند و منکر سماع بودند - فرصت یافتہ بہ عرض رسانیدند کہ این شیخ با جمیع مریدان خود غیر از سماع کارے ندارد و سرود کہ در مذہب حنفی حرام است - می شنود - پس بادشاہ را واجب است کہ علماء را طلبیدہ محضرے سازد و او را ازاں فعل نامشروع نہی نماید " -

کتاب سیر الاولیاء کے صفحات ۵۲۰ - ۵۲۷ پر یہ واقعہ نہایت تفصیل سے لکھا ہوا ہے - اور اس میں ان تمام کمینہ خصلت لوگوں کے نام بھی گنائے گئے ہیں جو اس شیطانی فعل میں شامل تھے- چنانچہ علماء نے حسب معمول بڑے ذوق و شوق سے حضرت سلطان الاولیاء کے خلاف کفر اور فسق کے فتوے دے دیے اور اپنے نزدیک بڑی خدمت اسلام انجام دی- نتیجہ یہ ہوا کہ علماء عصر اور حضرت محبوب الہی کے درمیان دربار سلطانی میں ایک زبردست مباحثہ ہوا - جس میں علماء کو شکست کی ذلت نصیب ہوئی - اور حضرت شیخ واپس گھر چلے آے - اور اس طرح یہ قضیہ نامرضیہ بہ ظاہر ختم ہوگیا - مگر بادشاہ کے دل میں دشمنی اور کاوش پیدا ہوگئی —

اس واقعہ کے تھوڑے ھی عرصہ بعد بادشاہ کو بنگالہ کی مہم پیش آگئی - اور وہ وہاں چلا گیا - مہم کو سر کرنے کے بعد جب وہاں سے واپس دارالسلطنت کی طرف لوٹا تو راستہ ھی میں سے حضرت سلطان الاولیاء کو فرمان بھیجا کہ ہم واپس پایہ تخت کو آ رہے ہیں- اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو فوراً دہلی کو خالی کر دو - اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ - میرے داخلہ دہلی کے وقت اگر تم وہیں ہوئے اور وہاں سے چلے نہ گئے تو پھر تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا —

حضرت شیخ کے پاس جس وقت یہ فرمان شاہی پہنچا تو آپ ہنس کر ہنسے اور صرف اتنا فرمایا کہ "ہنوز دہلی دور است" یعنی بادشاہ نے جو لکھا تھا کہ میں دہلی آرہا ہوں- اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ابھی دہلی بہت دور ہے- حضرت محبوب الہی کے منہ سے اس فقرہ کا نکلنا تھا کہ معاً سارے شہر میں مشہور ہوگیا —

اب سنئے کہ شہنشاہ بڑے شان و شوکت اور تزک و احتشام سے منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا نہایت اطمینان سے دارالسلطنت کو واپس آرہا تھا -

اور خیال کر رہا تھا کہ نظام الدین کی کیا مجال ہے جو میرے اس قاہرانہ حکم سے ذرا سرتابی کر سکے - اور یقیناً میرے داخلۂ دھلی سے پہلے دھلی اُس کے وجود سے پاک ہو جائے گی - اِدھر بادشاہ کی واپسی کی خبر ملتے ہی دارالخلافہ میں اُسکے شاندار استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں اور تمام شہر دلہن کی طرح سجایا جانے لگا - قرار یہ پایا کہ شہر کے تمام معززین اور بادشاہ کے اراکین دربار شہر سے باہر تین کوس پر جا کر شہنشاہ کا استقبال کریں - جہاں ایک رفیع الشان محل اس غرض سے تعمیر کیا جائے کہ بادشاہ آن کر اُس میں قیام فرمائیں - اور کچھ عرصہ وہاں اپنی تکان دور فرما کر پھر دارالسلطنت میں داخل ہوں - غرض ولیعہد نے نہایت سرعت کے ساتھ محل تیار کروایا - اور اُسے ہر قسم کے سامان آرائش سے آراستہ کیا - جس وقت بادشاہ کے آنے کی خبر ہوئی ایک بڑا جم غفیر معزز لوگوں اور درباری آدمیوں کا بادشاہ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلا اور اُسی قصر میں سب نے اپنی نذریں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں - ولیعہد نے ایک نہایت پرتکلف دعوت بادشاہ اور تمام حاضرین کی کی - لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے اور بادشاہ نے ابھی ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے کہ قہر الٰہی بجلی بن کر گرا - اور بادشاہ کے ساتھ چلد اور امرا کو بھی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے - معاً تمام حاضرین کو "ہنوز دھلی دور است" کا الہامی فقرہ یاد آیا - اور سب نے نہایت صاف طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بادشاہ کے لئے دھلی صرف تین کوس کے فاصلے پر ہونے کے باوجود کس قدر دور ہے اور ہمیشہ دور ہی رہے گی - سب نے حیرت اور تعجب کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اب وہاں ہر شخص کی زبان پر

" هنوز دهلی دور است " کا جملہ تھا - جس کو دھراتے ہوئے وہ لوگ افسوس کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے - اُسی وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا - چنانچہ عبدالقادر بدایونی اپنی تاریخ کی جلد اول کے صفحہ ۲۲۵ پر لکھا ہے :—

" مردم چوں دانستہ بودند کہ سلطان بہ سرعت سوار می شود - دست ناشستہ ازاں خانہ بر آمدند - و سلطان بہ تقریب دست شستن از آں خانہ بر نیامد تا دست از جہات شست و قصر بر سر او افتاد ... ... سلطان غیاث الدین تغلق با سلطان المشائخ چوں سوء مزاج داشت از راہ لکھنوتی پیغام بہ شیخ فرستاد کہ بعد ازاں کہ من بہ دهلی رسم یا شیخ آں جا باشد یا من - شیخ فرمود "هنوز دهلی دوراست " واین سخن ازاں روز ضرب المثل گشتہ شہرت یافت "-

دیکھا سلطان وقت نے سلطان المشائخ سے مقابلہ کا انجام! کیا اچھا کہا ہے :—

جو خدا کا ہے اُسے للکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبۂ زار و نزار

یک من علم را دہ من عقل باید

مطلب یہ ہے کہ محض علم فائدہ مند نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ انسان میں عقل بھی نہ ہو - اردو میں اس مثل کا لفظی ترجمہ بھی بطور ضرب المثل کے مستعمل ہے یعنی ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہئے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ کسی

بادشاہ نے اپنے لڑکے کو ایک بڑے ماہر نجومی اور جفار کے حوالے کیا اور
کہا کہ اِسے خوب اچھی طرح نجوم اور جفر کی تعلیم دو غیر پانچ چھ
سال کے بعد نجومی نے ایک روز بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ میں
نے شہزادہ کو نجوم میں کامل کردیا ہے اور جو کچھ مجھے آتا تھا سب
کچھ اُسے بتا دیا ہے - بادشاہ نے ایک تاریخ شہزادہ کے امتحان لینے
کی مقرر کی - بڑی شان سے دربار آراستہ کیا اور نجومی کو اپنے برابر تخت پر
بٹھایا - خیر اب امتحان شروع ہوا - بادشاہ نے ایک سونے کی انگوٹھی
اپنی مٹھی میں دبا کر شہزادہ سے پوچھا - بتاؤ! میرے ہاتھ میں کیا ہے -
شہزادہ نے تھوڑی دیر کچھ حساب لگاکر جواب دیا "والا حضرت کے ہاتھ
میں کوئی ایسی چیز ہے جو بیچ میں سے خالی ہے" - بات ٹھیک تھی -
ظاہر ہے کہ انگوٹھی کا چھلا بیچ میں سے خالی ہوتا ہے - بادشاہ اُس کی
مہارت علم پر بڑا خوش ہوا - اور کہنے لگا " ہاں بالکل ٹھیک ہے -
اچھا بتاؤ وہ ہے کیا چیز" - کچھ دیر سوچنے کے بعد کہ آخر ایسی کونسی
چیز ہوسکتی ہے جو درمیان میں سے خالی ہو شہزادے نے جواب دیا
جناب! میرے خیال میں تو غالباً آپ کی مٹھی میں چکی کا پاٹ ہوگا" -
اس عجیب و غریب جواب پر سب اراکین دربار حیران رہ گئے اور
اُس کی عقل پر ہنسنے لگے - بادشاہ نے شہزادہ کے اُستاد کی طرف
تعجب کی نگاہ سے دیکھا - اُستاد نے دست بستہ عرض کیا کہ "حضور!
جہاں تک علم کا تعلق تھا وہاں تک تو میری تعلیم کے مطابق اُس نے ٹھیک
جواب دیا مگر آگے علم نہیں بلکہ عقل کی ضرورت ہے - اور یہ میں کہاں سے
لاؤں جو اِسے پڑھاؤں - سچی بات تو یہ ہے کہ یک من علم را دہ من
عقل باید - بغیر عقل کے علم بالکل بے کار ہے - علم سے اُس نے اتنا تو

بتا دیا کہ مٹھی میں کس قسم کی چیز ہے - مگر اتنی سمجھ اس میں نہ تھی کہ سوچ سکتا کہ چکی کا پاٹ مٹھی میں کس طرح بند ہوسکتا ہے - تو بس حضور اس میں میرا کیا قصور -

---

یک نہ شد دو شد

یہ مثل وہاں بولتے ہیں جہاں کسی نئی اور عجیب بات یا واقعہ کے بعد دوسرا ویساہی واقعہ ظہور پذیر ہو - اس مثل کے متعلق جو حکایت مشہور ہے بڑی دلچسپ ہے - کہتے ہیں کہ ایک کفن چور کو کوئی ایسا منتر یاد تھا کہ جب وہ کسی تازہ قبر پر جا کر اُسے پڑھتا تو مردہ کفن سمیت باہر نکل آتا - یہ کفن لے لیتا - اور دوسرا منتر پڑھتا - تو مردہ بدستور قبر میں واپس چلا جاتا - اور یہ بازار میں کفن کے کوڑے کرتا - یہی اُس کا ذریعۂ معاش تھا - کسی طرح ایک اور صاحب کو بھی جو بد قسمتی سے تلاش معاش میں سرگرداں تھے - اُن حضرت کی اس کرتوت کا پتہ لگ گیا - محنت سے بچنا اور حرام خوری کی عادت کچھ، آج سے نہیں قدیم سے چلی آتی ہے - ان صاحب نے سوچا کہ چلو اس کفن کھسوٹ کی شاگردی اختیار کریں - اگر یہ فن آگیا تو پھر ساری عمر چین ہی چین ہے - کم از کم ایک کفن بھی روز حاصل ہوا تو روٹی کی طرف سے تو بے فکری ہو جائے گی - یہ خیال کرتے ہی آپ فوراً اُس کے پاس پہنچے - اور منت سماجت کے بعد اس کے شاگرد بن گئے - مدتوں اُس کی جوتیاں سیدھی کیں - مگر اُس نے یہ "پاک عمل" اپنے شاگرد رشید کو نہیں

بتایا - جب مرنے لگا تو شاگرد نے کہا اُستاد! اب مرتے ہو اور اُس عمل کو اپنے ساتھ لئے جاتے ہو - ابتو بتا دو - اُستاد نے کچھ سوچ کر وہ عمل بتا دیا - جس سے تازہ مردہ قبر میں سے باہر آجاتا تھا - مگر وہ منتر نہ بتایا جس سے مردہ واپس قبر میں چلا جائے - نہ ہی ان حضرت کو اپنی کامیابی کی خوشی میں اس کے پوچھنے کا کچھ خیال آیا - خیر تھوڑی دیر کے بعد اُستاد کا انتقال ہو گیا - اور شاگرد صاحب عمل کی صداقت آزمانے کو خوشی خوشی قبرستان پہنچے - اور ایک تازہ قبر پر کھڑے ہوکر وہی عمل پڑھا - معاً مردہ قبر میں سے نکل آیا اور کفن ان کے حوالے کیا - انہوں نے کہا - بس بھائی! تیرا شکریہ - جا تو اب واپس جا - لیکن مردہ کھڑا رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا - اُس وقت اُن کو خیال آیا کہ اوہو میں اُستاد سے وہ عمل تو پوچھنا بھول ہی گیا - جس سے مردہ دوبارہ واپس قبر میں چلا جاتا ہے - بڑے شش و پنج میں ہوئے اور سوچنے لگے یہ تو بڑی مشکل ہوئی اب کیا کرنا چاہئے - آخر سوچتے سوچتے یہ تدبیر ذہن میں آئی کہ چل کر اُستاد سے پوچھنا چاہئے - واپس ہونے کے لئے مڑے ہی تھے کہ مردہ بھی ساتھ چل پڑا - انہوں نے ہر چند اُسے روکنا چاہا - مگر وہ بھلا کیوں رکنے لگا تھا - آخر یہ اُسی حالت میں اُستاد کی قبر پر پہنچے اور وہی عمل پڑھا - معاً استاد کا مردہ باہر آ گیا - اور کفن اتار کر ان کے حوالے کیا - انہوں نے کہا - استاد! میں کفن لینے نہیں آیا - مشکل میں پھنس گیا ہوں - میری مدد کیجئے - اور اس مصیبت سے نجات دیجئے - مگر استاد صاحب خاموش کھڑے رہے - اور کچھہ جواب نہ دیا اُس وقت شاگرد کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ "یک نہ شد دو شد" یعنی

ایک تو ساتھہ تھا ھی - یہ دوسرا اور گلے پڑا --

--- * ---

یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے

یہ مثل ایسے کام کے لئے بولا کرتے ھیں جس کے کرنے میں مشکلات اور دقتیں ھوں اور جو آسانی کے ساتھہ بنتا نظر نہ آے - یہ مقولہ سب سے پہلے کس شخص کے منہ سے نکلا اس کے متعلق یہ قصہ ادب کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک نابینا فقیر سے جو جنم کا اندھا تھا کسی نے پوچھا کہ بڑے میاں کھیر کھاؤ گے ؟ فقیر بیچارے نے کھیر کھانی تو درکنار آج تک اس کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا - کہنے لگا " بابا ! کھیر کیسی ھوتی ہے اُس نے جواب دیا " بالکل سفید ھوتی ہے" فقیر کی سمجھہ میں اب بھی خاک نہ آیا - کیونکہ اس نے سفید رنگ بھی کبھی نہیں دیکھا تھا - ناچار کہنے لگا " بابا ! میں تو سفید بھی نہیں جانتا کہ کیسا ھوتا ہے ؟ ذرا مجھے سمجھاؤ تو سہی - اب اس شخص نے کہا کہ " بڑے میاں ! سفید رنگ کو ایسا سمجھو جیسا کہ بگلے کا پر " - بھلا اندھا کیا سمجھتا کہ بگلا کس رنگ کا اور کیسا ھوتا ہے ؟ مجبوراً اُس نے پھر پوچھا " میاں ! میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ بگلا کیسا ھوتا ہے ؟ اب وہ شخص سوچنے لگا کہ میں اسے کس طرح بتاؤں کہ بگلا کیسا ھوتا ہے ؟ خیر کچھہ سوچنے کے بعد اس نے اپنے ھاتھہ کو ٹیڑھا کیا اور بگلے کی کچھہ شکل سی بنا کر کہنے لگا کہ دیکھو بگلا ایسا ھوتا ہے "- فقیر نے اس کے ھاتھہ کو خوب اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا اور پھر کہنے لگا " بابا ! یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے - مجھہ سے تو نہیں کھائی جاے گی " --

--- * ---

یہ منہ اور مسور کی دال

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں طنز کے طور پر کسی شخص کے متعلق یہ بات ظاہر کرنی ہو کہ وہ اس کام کے لائق نہیں - یا یہ بات اُس کی طاقت اور ہمت سے بالاتر ہے - مندرجہ ذیل واقعہ ممکن ہے کہ اس مثل کی شاید اصلی وجہ تسمیہ نہ ہو لیکن قصہ چونکہ سچا اور دلچسپ ہے لہذا ہدیہ ناظرین ہے :-

جب اودھ کے شاہی خاندان پر انقلاب آیا اور واجد علی شاہ مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کردیے گئے تو محلات کے ہزارہا ملازمین تتر بتر ہوگئے - جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا - انہی میں ایک شاہی باورچی ملو میاں نامی بھی تھا - جس کے متعلق صرف یہ خدمت تھی کہ وہ مسور کی دال پکایا کرے اور بس اس خدمت کا معاوضہ اسے سو روپے ماہوار ملتا تھا - خیر بیچارہ باورچی تلاش معاش میں در بدر پھرتا رہا - اور پھرتا پھراتا بٹالہ پہنچا - جو پنجاب ضلع گورداسپور کا مشہور قصبہ ہے - یہاں ایک سیٹھ صاحب سردار بھاگ سنگھ نام رہتے تھے - جن کی امارت کے سارے قرب و جوار میں چرچے تھے - باورچی ان کی خدمت میں پیش ہوا اور نوکری کی درخواست کی - سیٹھ صاحب نے پوچھا بھئی بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں سے آے ہو؟ باورچی نے ساری داستان الم بیان کی اور کہا کہ حضور کا نام سن کر در دولت پر حاضر ہوا ہوں کہ شاید روٹی کا ٹھکانا حضور کی بدولت ہوجاے اور زندگی کے باقی دن اطمینان سے حضور کے زیر سایہ کٹ جائیں —

اگرچہ ملو میاں تلاش معاش میں لکھنؤ سے نکلے تھے مگر تھے اس شان سے کہ ایک اچھے خاصے رئیس معلوم ہوتے تھے اور کیوں معلوم نہ ہوتے

آخر شاہی باورچی تھے - جسم پر ایک نہایت سفید اچکن - پاؤں میں کامدار جوتا - ایک دوپٹہ کلدھے پر پڑا ہوا - ہاتھہ میں ایک چھڑی - سیٹھہ صاحب نے اُن کی یہ نوابی شان دیکھی اور مسکرا کر کہا اچھا تو آپ شاہی باورچی ہیں - ملو میاں نے جواب دیا - ہاں حضور برسوں اس سرکار کا نمک کھایا اور عیش اڑایا ہے - اب جس وقت وہ زمانہ یاد آتا ہے تو کلیجہ پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے —

سیٹھہ صاحب نے کہا - شاہی مطبخ میں تمہارے سپرد کیا خدمت تھی ؟ ملو میاں نے جواب دیا کہ حضور ! میں صرف مسور کی دال تیار کرنے پر ملازم تھا - اور کوئی خدمت میرے سپرد نہ تھی - سیٹھہ صاحب نے کہا - تب تو مسور کی دال تم نہایت اعلیٰ درجہ کی پکاتے ہوگے - ملو میاں نے جواب دیا - حضور ارشاد فرمائیں تو نمونتاً ذرا سی بناکر دکھاؤں - سیٹھہ صاحب نے کہا " بیشک " ! اور یہ کہہ کر ملازم کو آواز دی - اور اسے حکم دیا کہ دیکھو ملو میاں کو جس جس چیز کی ضرورت ہو وہ ان کو لادو - اور باورچی خانہ ان کو بتادو - یہ مسور کی دال تیار کریں گے - اتنا کہہ کر سیٹھہ صاحب اپنے کام میں مصروف ہوگئے - اور ملو میاں اپنے کام میں —

کھانے کا وقت آیا تو دسترخوان پر منجملہ اور چیزوں کے ایک چھوٹی سی طشتری میں ذرا سی مسور کی دال بھی موجود تھی مگر اتنی خوشبودار کہ سارا دسترخوان مہک رہا تھا - سیٹھہ صاحب نے تو کھانے میں ایسی خوشبو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی بہت ہی شوق کے ساتھہ سب سے پہلے اسے ہی کھانا شروع کیا - روٹی کا پہلا ہی نوالہ منہ میں گیا تھا کہ حلق تک معطر ہوگیا - ان کے وہم میں بھی کبھی

یہ بات نہیں گذری تھی کہ دال بھی اس قدر نفیس اور ایسی لذیذ ہو سکتی ہے - منو میاں کی بے حد تعریف کی - سارے کھانوں کو چھوڑ دیا اور نہایت مزے لے لے کر دال کھانی شروع کی - اور ساتھہ ہی ساتھہ منو میاں کی تعریف بھی ہر نوالہ پر کرتے جاتے تھے - جو اس وقت سامنے ہی کھڑے تھے کھاتے کھاتے کچھہ خیال آیا اور کہنے لگے کہ " منو میاں! دال تو تم نے آج ایسی کھلائی ہے کہ عمر بھر کبھی نہیں کھائی تھی - مگر یہ تو بتاؤ کہ اس طشتری پر لاگت کیا آئی؟ منو میاں نے بڑی ہی لاپروائی سے جواب دیا کہ حضور! زیادہ لاگت نہیں لگی - ایک پائی کی دال تھی اور اُس پر صرف چونتیس روپے خرچ کے آے ہیں - چونتیس روپے کا نام سنتے ہی سردار بھاگ سنگھہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا - اور اُنہوں نے بہت ہی گھبرا کر کہا "ہیں کیا کہا؟ چونتیس روپے - اس قدر خرچ اور صرف ایک پائی کی دال پر!! تم نے بھی غضب کر دیا !!!" —

چونتیس روپے کا لفظ منو میاں کے لیئے تو نہایت معمولی تھا کیونکہ انہوں نے تو وہ سرکار دیکھی تھی جہاں ہزاروں روپے کی بھی کچھہ قیمت نہیں تھی اور سینکڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی کسی نے نہیں پوچھا کہ کتنا خرچ ہوا؟ انہیں کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ چونتیس روپے کے لفظ نے بیچارے بھاگ سنگھہ کے ساتھہ کس قدر روح فرسا برتاؤ کیا - اور صرف دال کی ایک طشتری کی تیاری پر چونتیس روپے کا نام سن کر اُس کی کیا حالت ہوئی - اندازہ ہونا تو درکنار - وہ تو ان الفاظ کو بڑی برداشت نہیں کر سکے جو سردار صاحب نے بڑی گھبراہٹ میں کہے تھے - انہیں اس وقت اپنے آپ پر بڑا غصہ آرہا تھا کہ ایک بخیل اور کنجوس کے ہاں آکر ناحق ذلیل ہوا - نہ اس کو چیز کی قدر ہے

اور نہ اس نے کبھی آنکھہ کھول کر شاہی کھانوں کی بو سونگھی ہے - بندر کیا جانے ادرک کا سواد - اور شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ - یہ خیال آنا تھا کہ ملو میاں کو یارائے ضبط باقی نہ رہا اور غصہ سے بیتاب ہو کر انہوں نے فوراً جیب میں سے چونتیس روپے نکال سیٹھہ صاحب کے آگے پھینک دیے اور کہنے لگے "لو - انہیں پھر تمہارا کلیجہ پھٹا پڑتا تھا - اب تو ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی - تمہاری حیثیت مسور کی دال کھانے کی ہرگز نہیں ہے - یہ منہ اور مسور کی دال" —

یہ کہہ کر بغیر جواب کا انتظار کئے ہوئے ملو میاں سیٹھہ صاحب کے مکان سے فوراً باہر نکل آئے - اور پھر کبھی بھول کر بھی اُدھر کا رخ نہیں کیا —



قاضی نذر الاسلام کی تین نظموں کے ترجمے

(قاضی نذر الاسلام بنگال کے پرجوش اور انقلابی شاعر ہیں ان کی شاعری کا خاص رنگ ہے اس کا جوش اور زور ایک تلاطم خیز طوفان کے مشابہ ہے جو بعض اوقات کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے - ہندوستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا - اس کے کلام میں ایک آگ بھری ہوئی ہے جس کے سامنے عامیانہ خیالات اور ہماری شاعری کے معمولی مضامین گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں - ہم اختر حسین صاحب رائے پوری ' ساہتیہ لنکار ' بی اے کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے اردو خواں اصحاب کے لئے بنگالی زبان سے اُن کی تین نظموں کا ترجمہ عنایت فرمایا ہے - شعر کا ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے بلکہ بعض اوقات محال ہوتا ہے - لیکن لایق مترجم نے بڑی کاوش اور خوبی سے ترجمہ کیا ہے جس میں اصل کی بہت کچھ قوت پائی جاتی ہے اور شاعر کا اصل رنگ پھیکا نہیں ہونے پایا ہے --

(اڈیٹر)

صور اسرافیل

تم سب انقلاب کے نعرے بلند کرو تم سب بغاوت کے گیت گاؤ —

دیکھو طوفان اور آندھیوں میں بھی سرنگوں نہ ہوکر وہ دور جدید کا پرچم لہرا رہا ہے —

قیامت کے نشہ میں متوالا ہوکر تباہی و بربادی کو اشاروں پر نچاتا ہوا وہ وحشی آپہنچا اور اس نے سمندر کے سوتوں پر نشتر لگا دیے -

اس کے مہیب اور ڈراونے چہرے پہ موت تبسم بن گئی ہے - عزرائیل

کا محشر انگیز لبادہ اوڑھے اجل سے زیادہ عمیق اندھے کنوں سے سر نکال
کر مشعل برق روشن کیے جب وہ قہقہہ لگاتا ہو —
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ -
جب وہ اپنی زلفوں کو پھیلا دیتا ہے تو ان میں سے شر و فساد کی
چنگاریاں نکل کر آسمان میں آگ لگا دیتی ہیں —
دمدار ستارہ کی شرر بار نگاہیں اس کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہیں -
دنیا کے دل و جگر سے خون نکال کر وہ اپنی تلوار کو دھوتا ہے جس
کی بے پناہ جھنکار سن کر سب خاکی و نوری دم بخود رہ جاتے ہیں —
جب وہ فضا کو خاموشی کے سبق پڑھاتا ہو
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ -
آفتاب سوا نیزے پر آکر اپنی تمام گرمی اس کی دزدیدہ نظروں
میں ڈھال دیتا اس کے پریشان بالوں میں فریادیں آ آکر چھپ جائیں گی -
سمندر خشک ہو ہو کر اس کی آنکھوں کے آنسو بن جائیں گے —
جب خود زمین اس کے کاندھوں کا سہارا لے کر شور قیامت پر
گوش بر آواز ہو جائیگی —
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ -
خبردار ! ہوشیار ! اس بار قیامت برف کی سلیں دنیا کے سینہ
پر رکھ دے گی —
بوڑھوں اور مردوں کے لیے اس ہنگام حشر میں کہیں جگہ نہیں —
کل جب یہ ہنگامہ فرو ہو جائیگا تو بنت نور بیوہ ہو چکی ہوگی اس
کے ماتھے کا سیندور — صبح کی لالی غائب ہو چکی ہوگی - چاند کے ذرات
انگارے بن کر صبر و سکون میں آگ لگا دیں گے

پھر کیوں نہ تم نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ —
وہ دیکھو دجال نے اپنا خونیں عصا سنبھالا اور قہر و غضب کے دیوتاؤں
کو آتش و باد کے کفن پہنا دیے —
اور نو برق و رعد نے طوفان اور اندھی نے اپنے ترنم سے آسمان کے
تاروں کو منتشر کر دیا —
اس کی ٹھوکروں سے ستارے ٹکرا ٹکرا کر شہاب ثاقب بن گئے اور آسمان
میں شگاف ڈالنے لگے —

زلزلوں نے کنوں کو یوں اچھال دیا کہ وہ مینار بن گئے —
اور ایسے ہی موقع پر اگر وہ رخش قہر و ستم پر سوار آ جائے
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ
مگر شور قیامت سے تو کیوں لرزہ بر اندام ہو رہا ہے؟
یہ تو ایک نئی دنیا کی آفرینش کا پیغام ہے —
وہ زمانہ آرہا ہے جب کہیں کثافت اور نفرت کا نام نہ رہے گا —
قیامت کی ان بربادیوں کے باوجود جو چیز باقی رہ جائے گی وہ
جمال باری ہے جو از سر نو حسن و رنگینی کی دنیا بسائے گا —
جب ہر شے حسین و رنگین بننے والی ہے —
تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں کیوں نہ بغاوت کے گیت گائیں
یہ تو تعمیر و تخریب کا کھیل ہے اس سے خوف و خطر لا حاصل ہے —
دلہنوں سے کہہ دو کہ سہاگ کے گیت گائیں دو شہزادوں سے کہہ دو کہ
چراغ جلا دیں - اب دنیائے حسن تاریکی و تباہی کا لباس پہننے والی ہے -
جب حسن کی تخلیق بھی بربادی کے ہاتھوں ہوتی ہے
تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں کیوں نہ بغاوت کے ترانے الاپیں -

پیام شباب

میں اس شباب کے گیت سناتا ہوں —

جو آج تلوار لیے ہوئے اس نا معلوم منزل کی طرف روانہ ہوا ہے

جس کی بربادکن تاریخ میں ماضی کے اوراق گم ہو جائیں گے

جس کی سانسوں کی آہٹ میں دقیانوسی کتابیں جل جائیں گی

جو ان عبادت گاہوں کو تاخت و تاراج کرتا چلتا ہے جنہیں بزدل بوڑھوں نے گناہ و معصیت کا مرکز بنا رکھا ہے —

جس کی زندگی کی روانی میں رسم و رواج کی چٹانیں بہہ جاتی ہیں قدامت کی ہڈیاں چکنا چور ہو جاتی ہیں

جو بلا خوف و خطر فریب و تزویر کی کمندوں کو تار تار کر ڈالتا ہے

جس کی جرأت رندانہ تہمت کی پابندیوں کو ٹھکرا دیتی ہے

جو دور فریباں کے ان پھولوں کو مسل ڈالتا ہے جن کے بہار زندگی آج پھلے ہوتی ہے-

یہاں میں اسی شباب کے گیت سناتا ہوں —

میں ان کے گیت گاتا ہوں

جو چوگان ہستی میں آج سب کے پیش رو ہیں —

صبح تک بھی وہ مسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اس اندھیری رات کو تلاطم خیز دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی تھی —

اسی دیوانہ کی یاد میں میں نالۂ نیم شبی میں مصروف ہوں -

چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھا میں چاہتا ہوں کہ نیند کی صورت میں وہ آ جائے —

جہان نو کا وہ جویا — منزل ناتمام کا وہ مسافر جو رات کی تاریکی

میں سما گیا تھا، صبح بھی نہ لوٹا۔

جس کے خوف سے موت کا فرشتہ ہمیشہ لرزہ بہ اندام رہتا ہے۔

وہ، جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں، زندگی کے ہیجان میں، فضا کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے۔

وہ، جو تحت الثریٰ میں گوہر شب چراغ کی تلاش میں جا پہنچتا ہے۔

وہ، جسے ڈس کر ناگ خود زہر مار ہو جاتے ہیں۔

وہ، جس نے بادل کی بھٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے۔

وہ، جس کی فرماں برداری طوفان کیا کرتے ہیں۔

میں اسی کے آستانہ پر سر جھکاتا ہوں اور اسی کے گیت گاتا ہوں۔

میں اس کا ثنا خواں ہوں، اس کا حمد گو ہوں۔

پھانسی کی رسی جس کے گلو گیر ہوتی ہے

جس کے خون سے شفق سرخی حاصل کرتی ہے

قید خانہ میں جس کی خدمت کے لئے آزادی کی دیوی آتی ہے —

میں اسی کے گیت گاتا ہوں —

—— * ——

یاد ایام

میرے محبوب!

تجھے میں نے پہچانا بھی تو کب۔

جب میرا مقصد حیات صرف یہ رہ گیا ہے کہ دھول ناگن کی طرح اپنی آنکھوں میں خاک جھونک کر دن رات ایک خونیں دایرہ میں رقص شرر کرتا پھروں ۔

اور اب محسوس ہوا کہ میں تو تجھے روز ازل سے جانتا ہوں —
تیرے گلے میں مچلتی اور زبان پر تھراتی ہوئی اس راگنی ک
ان فلاتی آنکھوں کو، اس آئینہ جبیں کو —
اس جان جہاں آرا کو، راج ہنس کو شرمانے والی اس لغزش مستانہ کو
ہر ادا کو میں پہچانتا ہوں، ہاں خوب جانتا ہوں -
اسی لئے زندگی کے بے آب اور آتشیں سر چشمہ میں تیرتی ہوئی
جان حزیں پیہم تجھے پکار اٹھتی ہے -
مری فریاد کی صرف ایک لے ہے - میں تجھے جانتا ہوں مں
تجھے پہچانتا ہوں -
نہ تو اقلیم محبت کی ملکہ تھی نہ گداگر - تو پریم مندر کی جو
اور پجارن تھی اور بس -
مجھ سنگ دل پر تو نے کس کس طرح عشق کے نقش بنائے تو
خود کو جلا کر میرے سیہ خانۂ دل میں محبت کی لو بھڑکائی تھی
اپنی پوجا کے پھولوں سے اس بے برگ و ثمر پیڑ کو ہرا بھرا کر دیا تھ
زندگی کی صبح و شام میں اور حیات و ممات کی الجھنوں م
میں نے تجھے دیکھا ہے -
مگر تو مجھ سے جدا ہوگئی ہے - ایک اجنبی دیس میں مجھے بیچار
و تنہائی کے عالم میں چھوڑ کر تو رخصت ہو چکی ہے —



جب شفق آفتاب سے محروم آسمان کے خون تمنا کو نمایاں کرتی
تو میرے آنسو بھولے ہوئے افسانوں کو از سر نو زندہ کرتے ہیں -
وہ دن یاد آتا ہے —— جب بہار خزاں کی طرف حسرت و یہ

سے تک رہی تھی - اور وہ رنگینیوں میں شرابور مبارک رات میرے گھر آئی تھی جب میری آنکھیں تیرے چھلکتے ہوے پیمانوں میں ڈوب گئی تھیں - اس وقت میں جوانی کے در پر ٹھٹکا ہوا کھڑا تھا - لڑکپن کی نیم باز آنکھیں شباب کے فتنے جگا رہی تھیں - جوانی کی حرماں نصیبی شفق کی لالی کی طرح اپنا رنگ رچ رہی تھی - دور سے آتی ہوئی نغمہ کی صدا میں ڈوب جانے والی ہنسی کی طرح جوانی کی سرمستیوں میں میری معصومیت معدوم ہو رہی تھی —

گم کردہ راہ باد سموم کی مانند میں راہ بھٹک کر کس پردیس میں آ پھنسا - اب میں ہوں اور وہ اشک ہاے درد آشنا جو کسی غریب الوطن کے غم گسار ہوتے ہیں -

صبح سویرے جب میں نیند سے بیدار ہوا تو تو میری طرف دیکھ کر کس دلسوز انداز میں مسکرائی تھی -

اور اس تبسم میں میرے آنسوؤں نے چمک کر پوچھا تھا کہ تیرا آشیانہ کہاں ہے؟ کس نے تجھے اسیر بنا رکھا ہے؟ -

تیری نگاہیں کتنی نازک تھیں - میں تو سمجھا کہ میرے نغمۂ فراق میں تو ہی سوز و گداز بن کر اتر آئی ہے -

جیسے باد بہار کی نغیر سے کلیاں چٹک جاتی ہیں اور ہرنیاں راہ بھول جاتی ہیں -

پھر آدھی رات آئی اور تو رخصت ہونے لگی تو میں نے وہ ترانہ الاپا جس کے سر گم آنسوؤں میں گندھے ہوے تھے اور جس میں میری بے قراری مچل رہی تھی - کہہ نہیں سکتا کہ ان گیتوں کی روشنی میں میں کسے اپنے خانۂ دل میں تلاش کر رہا تھا —— وہ دل جس میں ہمیشہ تاریکی

اور ویرانی چھائی رہتی تھی —

اتنا یاد ہے کہ کچی نیند سے جاگی ہوئی تیری مخمور چشم کے گلابی ڈوروں میں میری پلکیں جھک رہی تھیں —

یہ بھی یاد ہے کہ ان پلکوں میں حیرت و مسرت نے نمی پیدا کر دی تھی گویا یہ درد فرقت کی گھلاوٹ تھی —

جب تو میرے حال زار پر ترس کھاکر کانپ اٹھتی تو محسوس ہوتا کہ لیلائے شب نے کسی کا سوگ لیا ہے —

جان جاں! تیری آنکھوں میں محبت اور ہمدردی نے جو جوت جگائی تھی اس میں میری پیاسی آنکھیں کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں —

جب میں نے ہنسی ہنسی میں تجھے پکارا تھا تو نہ معلوم کیوں تیرے غرور عشق کو ٹھیس لگی اور آنکھوں کی کشتی جذبات کے تلاطم میں بہہ نکلی —

اور ساحل رخسار دم بھر میں آب آلودہ ہوگیا

میری پجارن بتلا تو سہی ایک ذراسی چھیڑ اور یہ محشر جذبات؟

میری خاطر یہ عز و ناز کیوں کہ تیرا کملایا ہوا چہرہ فرط شرم سے اور ننھا سا دل وارفتگیِ شوق سے تصویر درد بن گیا —

میری آواز کو سنتے ہی تیرے آنسو ان خواب آگیں دریچوں سے کیوں جھانکنے لگے؟

میں اس نامعلوم راستہ کا اجنبی مسافر تھا - تیری معصوم آنکھیں میری جدائی کے صدمے سے کیوں اشک فشاں ہوگئیں؟

مجھے دیکھ کر تو سب لوگ ہنسا کرتے تھے —

بد دعاؤں کے اثر سے میری سانس اتنی گرم ہوگئی تھی کہ اس سے آشیانے جل کر خس و خاشاک ہو جاتے تھے —

میری مسکراہٹ کو سانپ کا من سمجھ کر لوگ جب اٹھانا چاہتے تو وہ زہر آمیز پھن بن کر انھیں ڈس لیتی تھی —

دنیا جس سے ڈر کر گھبرا کر دور بھاگتی تھی اس بد بخت کو تو نے کیوں گلے کا ہار بنا لیا —

اور پھر اسی وحشت زدہ کے لئے تو کیوں سینہ فگار ہو رہی ہے —

کیا تجھے اور کوئی پیار نہیں کرتا ؟ اور کوئی تیرا ناز برداشت نہیں بنتا ؟ کیا تو اوائل زندگی سے جوگن ہے ؟

یہی ہے ورنہ آنسوؤں کا یہ دریا اور کسی کو کب میسر !......

نہیں یہ نہیں ہے دل کے اندر سے کوئی کہتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا ۔

بارہا طالبان دید کو محروم تماشہ دیکھا ہے ۔ پھر بھی تو تشنۂ محبت تھی اور تشنۂ محبت رہی —

مگر صرف مجھے ہی شراب عشق سے سرشار کرنے کے لئے تو کیوں بضد تھی ؟

میری رانی یہ راز نہ تجھے معلوم ہے اور نہ مجھے؛ صرف عشق کو اور دل کو اس بھید کا پتا ہو سکتا ہے کہ یاس و حسرت بلا سبب رگ رگ میں کس طرح ساری ہوگئے ہیں —

تجھے نہ جانتے ہوئے بھی اس روز محسوس ہوا کہ میں تجھے ہمیشہ سے پہچانتا آیا ہوں —

تو وہ 'لیلا' ہے جو جنگل میں بھٹکنے کے لئے اکیلی چھوڑ دی گئی تھی ۔

تو وہ ہے جس کی آرتی کی تھالی ہمیشہ ٹھکرا دی گئی

جس کی مالا ہمیشہ ہنسی ہنسی میں مسل دی گئی

تو وہ دیوی ہے جسے دنیا میں رہنے کی بد دعا دی گئی تھی ۔ تو خاموشی سے ان کلفتوں کو برداشت کرتی رہی —

پہلی ہی نظر میں تو سمجھ گئی کہ تو مجسمۂ شباب ہے اور میں شعر مجسم -

---

پھر —— پچھلے پہر میری روح تیرے نغموں میں مرتعش ہوتی تھی — ان گھڑیوں میں جو لاج کے مارے تھرا رہے تھے —

نہ جانے کیوں ان الفاظ کے معانی میرے لئے صرف اس جملہ میں سمٹ آئے تھے — تو مجھے جانتا ہے روز ازل سے پہچانتا ہے —

متھرا پہنچ کر جب شیام رادھا کو بھول گیا تو شاید وہ اس کی یاد میں بھی گیت گنگنایا کرتی تھی —

نل جب دمن کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا تو شاید وہ بھی انہیں منتشر انگوز سروں میں اس کی یاد کیا کرتی تھی —

جنگلی پھولوں کے ہار گوندھتے ہوئے جب سکنتلا کو پیتم یاد آتا تھا تو وہ بھی یہی یاس آفریں گیت گایا کرتی تھی —

پہاڑوں اور بیابانوں کی خاک چھانتے ہوئے مہادیو کی یاد میں گوری نے یہی نغمہ چھیڑا تھا —

ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے —

لیکن اس وقت شباب محو خواب تھا تجھے دل نشیں نہ کر سکا - صرف تیری نغمہ آفرینی کو روح میں بسا کر میں دور دراز کے سفر پر چلا گیا -

دوسرے ہی دن گومتی کے نشاط افزا کناروں پر دل میں چھپی ہوئی تیری یاد نے مجھے وطن کے اس آہو کی طرح تڑپا دیا جو اپنے سینہ میں نافۂ مشک رکھ کر اس کی تلاش اپنے آس پاس کرتا ہے -

میں ڈھونڈتا پھرا کہ کس کی یاد مجھے یوں محروم قرار رکھتی ہے یہاں تک کہ میرے واویلوں نے زمین و آسمان کو فراق آشنا بنا دیا -

پھول پتھ‌ان ندی اور پہاڑ سب میرے ہم زبان ہو کر بہاگ کے گیت گانے لگے۔
ساتھ ہی میرا ہیتا نصیب آتش شباب میں تپ کر میرے دل کی
گہرائیوں میں پیاس سے بیتاب ہوا تھا۔
یہ جان حزیں جز منزل مقصود سے نا آشنا تھی چیخ چیخ اٹھی کہ
کون سا ہے وہ دیس جہاں بہار کا سوال نکلتا ہے؟۔
زندگی اداس سی رہتی تھی دل ڈوبا ڈوبا سا رہتا تھا۔
میں سوچتا تھا کہ جوانی کا زمانہ ایک طویل آہ کے سوا کچھ نہیں
آنکھوں کے آگے ہمیشہ دھوپ چھاؤں کے پردے سے لٹکے رہتے تھے۔
یہ نکہت بہار کہاں سے آ کر میری روح میں سمائی جا رہی تھی۔
میرا دل آہوے رمیدہ کی طرح آپ اپنے سینہ میں پوشیدہ مشک کی تلاش
میں حیران و سرگرداں تھا۔
یہ خودی کا عشق کتنا عجیب و غریب تھا! اپنی محبت سے اپنی
تمنا کی خلش مٹانے کی کوشش کتنی حسرتناک تھی۔ میری جوانی کی
تشنہ لبی کی انتہا نہیں۔ محبت کے دریا اوس کی بوندوں کے مانند اس
کے ہونٹوں تک آتے آتے خشک ہو جاتے ہیں۔ الٰہی! اس پیاس کی
کوئی حد بھی ہے!
کیسے بجھے؟ یہ پیاس کیسے بجھے؟ کہاں ہے وہ ناپید اکنار دریاے
عشق جو اس آگ کو ٹھنڈا کر دے۔
مجھ لاابالی رند لم یزل کی تشنگی کو کون بجھا سکتا ہے!۔
وہ کہاں ہے جسے کھو کر یہ ساری دنیا میرے لئے ہیچ ہے جہاں
سکون میرے لئے حرام ہو گیا ہے۔
کچھ دور اور چل کر دیکھوں۔ اس راستہ سے کئی مستانہ خرام دو شہزادیں

گڑرتی ہیں۔ ان کے پیچھے یہ پریم پیاسا دل اندھوں کی طرح دوڑنے لگتا ہے اور اگر کوئی ایک نگاہ غلط انداز ڈال جاتی ہے تو خود داری کے احساس سے آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں —

یہ دیکھ کر وہ مجھ پر ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے - کوئی دروازے پر آکر پوچھتی ہے 'بھیک لے گا ؟'

یہ سن کر دل بے مایہ رو رو اٹھتا ہے - درد و غرور سے میرے قیامت خیز جذبات میں آگ سی لگ جاتی ہے -

اور جب وہ چنچل لڑکی لجائی چتونوں سے بھیک کا پیالہ میری طرف بڑھاتی ہے تو میں اسے ٹھکرا دیتا ہوں ۔

وہ روتی ہوئی بھاگ جاتی ہے اور خوف کے مارے کوئی میرے پاس نہیں آتا۔

'گوتم' کی طرح یہ جان عزیز کشکول گدائی لئے محبت کی بھیک مانگنے در در صدا لگاتی پھرتی ہے -

میری آواز سن کر کتنے آتے ہیں کتنے حیرت و تردد لے کر لوٹ جاتے ہیں -

کسی کے دل میں ٹھیس لگتی ہے' کسی کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں -

میں بھیک میں مایۂ حیات مانگتا ہوں پھر بھلا یہ دنیا دار میرے سوال کو کیسے سمجھ سکتے ہیں —

پہلے تو وہ تمسخر اڑاتے ہیں اور پھر خود بھی پشیمان ہوکر روتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں —

پوچھتے ہیں کہ مسافر کہہ تو سہی تو چاہتا کیا ہے ؟ تیری آواز میں یہ سوز کیوں ہے ؟ تیری آواز میں کس کی آتش تمنا سلگ رہی ہے !

کسی کی سمجھ میں نہیں آتا - کوئی تن من لاتا ہے' کوئی متاع حسن' کوئی دولت جمال —

ہوئی مغرور راجکماری دولت کے نشہ میں چور ہوکر مجھ پر جوانی کے منتر پھونکتی ہے —

مگر ان سب کی طرف میں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا – مایوس ہوکر میں بادیہ پیمائی میں مصروف ہو جاتا ہوں —

آہ! میری وہ پجارن کہاں ہے جو کہے کہ میرے مالک میں تیری خاطر جوگن بنی ہوں – کیا تو مجھے پیار نہ دیگا؟ میرے پاس محبت کے سوا کچھ نہیں "کیا تو اس تحفہ کو قبول نہ کریگا!' —

اس ریگستان میں آبلہ پائی سے کیا حاصل جہاں یہ پیاس شدید تر ہو جاتی ہے۔

سراب صحرا بن کر کوئی آنکھوں کے آگے آتا اور پھر اوجھل ہو جاتا ہے – صرف یہ ندا جرس کارواں بن کر کانوں میں آتی ہے —

' میرے مالک نہیں بھوک نہیں تجھے چاہتی ہوں – میں تجھے جانتی ہوں اور تو مجھے پہچانتا ہے –

میں سمجھ نہ سکا کہ یہ میری ہی صدائے بازگشت ہے – نہ یہ دریا ہے اور نہ ساحل – یہ سراب صحرا کے سوا کچھ نہیں —



میں جب تیری نگری میں آیا تو میری زندگی خون آلودہ اور کانٹوں سے چھدی ہوئی تھی –

اس وقت تک مجھے خبر نہ تھی کہ میری چبھن تیرے سینہ میں پیوست ہوکر کسک بن جاتی ہے

تاہم محسوس ہوتا تھا کہ تیری مخمور کن قربت میرے تمام مصائب کو دور کردے گی —

همدم! معلوم هوتا تها که میرے دل میں تیری یه فریاد تڑپ رهی هے - ' مسافر ' یه کانٹا مجھے نکالنے دے - بتلا تو سہی که درد کہاں هے اور کیوں هے ؟

بے زبانی تیری زبان تهی ' خاموشی تیری گویائی تهی آه تیرا نغمه تهی - اسی لئے یه دل تنگ سب سن کر بهی نه سمجهه سکا که اس التجا میں ناکام محبت داد طلب هے —

اس کشمکش کے عالم میں جب اندهیری رات موسلا دهار بارش میں نہا رهی تهی ' نه جانے کہاں سے میری ماں آئی اور مجھے گود میں اٹها کر ان روتی هوئی آنکهوں کو بار بار چوم لیا —

پهر نه وه بے راه روی رهی نه وه شورش طلبی - اس کے بوسوں نے آتش غم کو سرد کردیا - نا کامی کی تیرگی میں ماں کی مامتا جگنو کی طرح جگمگا اٹهی —

ایک عرصهٔ دراز کے بعد وه آشفته مزاج خانه زاد آواره گردی سے تهک کر گهر لوٹ آیا - اور اسے سکون ملا تو ماں کی شفقت میں —

اس کے آواره ترانوں کی گونج شفقت مادری کی تیز هواؤں میں گم هوگئی -

---

مگر ایک بار اور میں اپنے راسته سے بهٹکا :-

جب یه معلوم هوا که ایک شوخ حسینه میرے در کی زنجیر کهٹکهٹا رهی هے تو مجھے یاد نه رها که اب تک میں کس کی تلاش میں کهویا هوا تها یه بهی بهول گیا که میں کس پوجا کے پهولوں کا طلبگار تها - حسرت و یاس کا پته نه رها —

گویا شادیٔ مرگ سے دل کے بند بند کهل گئے ' بے اشک آنکهیں

پھر آنسوؤں سے چمک اٹھیں - کسی کی عطر بیزی سے روح مہک اٹھی -

فراق و وصل کی ہنگامہ خیزیوں میں زندگی بھنور میں پڑی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا نے لگی —

ایک بار بچ کر یہ گل دیدہ بلبل پھر دامِ صیاد میں آ پھنسا ...

سندر کی صورت میرے خون میں ڈوب گئی تو بھی وہ پتھر کی صورت بھٹکتی ہی رہی —

یوں ذلیل ہوکر غرورِ عشق انتقام کی آگ میں کود پڑا اور میں اشہبِ بغاوت پر سوار ہوکر بادلوں کو چھوتا اور نعرے لگاتا ہوا اس خدائے قہار کی طرف جھپٹ پڑا جو سارے مصایب وآلام کا خالق ہے - نقیبِ قیامت ستارۂ تخریب بن کر میں نے اس عالمِ صحرائی میں جو آبِ محبت سے یکسر خالی ہے خون اور آگ کے دریا بہادیے —

لیکن یہ فریب ہستی ! میرے محبوب! بیچ بیچ میں محسوس ہوتا تھا کہ تیری بانسری کہیں دور میرے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہے -

اس نامعلوم دور افتادہ منزل کی طرف دیکھتے ہوئے ان آنکھوں میں دردمندی کے آنسو تیرنے لگتے تھے جن کی پلکیں خون آلودہ تھیں -

مجھے یقین ہوگیا کہ ایک تو ہی جنگل کی وہ شہزادی ہے جو میرے لئے پھول چنا کرتی ہے اور بڑے جتن سے ایک ہار بنا کر اپنے پاس رکھ چھوڑتی ہے - میری بھکارن! معلوم نہیں شرم وحیا کے پھولبن میں کتنی مدت سے تیری محبت کا سدا بہار پھول کھلا ہوا ہے -

دل کے اندر موجیں مارتا ہوا دریائے اندوہ کھلکھلا کر کہتا ہے - " پہچان گیا - جسم مردہ میں پھر سے جان پڑگئی - یہ آواز تو اس کی ہے جس کے بغیر اس وسیع دنیا میں تجھے کہیں سکون میسر نہ تھا -

مگر ساتھ ساتھ نالہ و شیون کی یہ روح فرسا صدائیں کیسی ؟ —
جیسے کوئی پیچھے سے پکار کر کہتا ہو دوست ابھی وقت نہیں آیا ۔
تو بھی میں نے سنی ان سنی کردی - چشم زدن میں بجلیوں پر بیٹھ کر تیری رگ جاں سے بھی قریب آ گیا ۔

نہ معلوم وہ راہ فنا ، وہ خونیں پرچم ، وہ آتشیں رتھ کیا ہوے - اتنا یاد ہے کہ تیرے آغوش میں سکون و اطمینان کے پھول بکھرے ہوے تھے —

اس کے بعد میں جو کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے الفاظ نہیں ملتے ۔
اب نہ دل میں دھڑکن باقی ہے نہ آنکھوں میں آنسو اور نہ امید میں تقویت ۔
اب جو کچھ کہوں گا وہ گیت نہ ہوگا - یہ وہ نوحہ ہے جسے خون دل. ناکامی کی زبان میں بیان کر رہا ہے —

تم سوچتی ہوگی کہ اس کنگال کی بے حیائی کی بھی کچھ انتہا ہے کہ شرف و عزت کا متمنی رہتا ہے —

دراصل یہ حقیقت کتنی حیرت انگیز ہے ! اب میں بھی ان باتوں کے تصور سے ہنس دیتا ہوں —

مگر میرے محبوب نہ بھول کہ در در کی خاک چھان کر میں تھکا ہارا تیرے پاس آیا تھا - سچے پیار کی جو تھوڑی بہت کائنات رہ گئی تھی اس کا ہدیہ میں نے ڈرتے ڈرتے تیرے سامنے پیش کیا تھا ۔
اے ستمگر ! کس ذوق و شوق سے میں نے اپنی کم مائیگی کے احساس کے باوجود تیری پوجا کے سامان کئے تھے —

سوچا تھا کہ جس بار کو یہ ہوسناک دنیا نہ اُٹھا سکی اسے تو خوشی سے سنبھال لیگی - اس ازلی باغی کو تو پابند محبت بنالیگی - سوچا

تھا کہ اس سرکش ، خود سر پہ فتح پاکر میرا عشق روشن ہوجائے گا -
بعد ازاں میرے ناتواں بازوؤں میں تیرا خلوص وہ زور پیدا کردے گا
کہ میں نعرۂ بغاوت بن جاؤں گا اور تو بغاوت کی بجلی ـــ
دل میں یہ آرزو تھی اور اس کی تکمیل کی یہاں تک جرأت
تھی کہ میں دنیا کی ساری رنگینیوں کو تجھ پہ نثار کرسکتا تھا -
لیکن آہ ! نہ وہ تو ہے نہ وہ ولولے نہ وہ خلش و تپش !
یکایک تو زمانہ کی طرح بدل گئی - عجب کہ تو بھی مکر و فریب
کے دام میرے لیے بچھانے لگی ـــ
میرا سینہ ہمیشہ حقیقت سے معمور رہتا ہے - اس کی دور بین نگاہیں
خون کی ایک ایک بوند کو پرکھ سکتی ہیں ـــ
تیری پوجا کو جس تاثیر نے آج گناہ آلودہ کردیا کیا وہ مجھ
سے چھپی ہوئی ہے ؟ آج تو اسے بھولنے کی کوشش کر رہی ہے کل تک تونے
دل و جان جس کے سپرد کر رکھا تھا ـــ
میں حیران ہوں کہ تیرے شفاف دل پر گناہ کی لکیر کس نے
کھینچ دی ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بھی فریب دنیا سیکھ جائے ـــ
اگر یہ سچ ہے تو کون فریب خوردہ نہیں کہوں نہ اس جھوٹی دنیا
میں آگ لگا دی جائے ! ـــ
میں اور تو چاند اور سورج ارض و سما سب فریب زندگی کے شکار ہیں -
جلا دے اے بیداد گر اس جھوٹی دنیا کو اپنی عشوہ طرازی سے جھلسا دے

ـــ * ـــ

آج جو میں تیری طرف نظر اٹھاتا ہوں تو خود داری بجلی بن
بن کر دل کے آسمان میں کوندنے لگتی ہے - تیری بیوفائی اور اپنی

بےحیائی کا احساس سوھان روح بن جاتا ھے - جی چاھتا ھے کہ زمین شق ھوجاے اور اپنی اس حسرت نصیب اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹ لے

جب کبھی امید کی ایک آدہ کرن چمکتی ھے تو اس کی طرف دیکھتے ھی سارے حوصلے پست پڑ جاتے ھیں —

ھائے! کہاں ھے وہ پجارن ' وہ جوگن - کیا یہی بیدرد ' تند خو وہ پیکر عصمت ھے ؟

میری زندگی کو اس نے کھلونا کیوں سمجھہ لیا ؟ میرے ارمانوں کو اس کج ادائی سے وہ کیوں کچل رھی ھے ؟

ان بتوں کے آگے وفا شعاری کی کوئی قیمت نہیں - عورت کی ھوس کی انتہا نہیں - ایک کی پرستش اسے مطمئن نہیں کر سکتی - وہ ھمیشہ بہت سے چاھنے والوں کی جویا رھتی ھے - جس کے لیے میں خدا کی عبادت سے منحرف ھوگیا آج وھی یوں مجھے قعر مذلت میں گرا رھی ھے -

—— * ——

معلوم ھوتا ھے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ھم سفر بن جاؤں - راستوں میں کس کی یاد میں میں فریاد کرتا پھروں ؟ —

کیوں نہ اس بار آتش فشاں پہاڑ اپنے غارت گر دھانے کھول دیں؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے فرشتے میرے ھم سخن بن جائیں ؟ —

لے آؤ اپنے آتشیں رتھہ اور پھونک دو ھنگام قیامت کے صور - نکالو زھر و آتش میں بجھے ھوے تیر - برباد کردو اس دنیائے معصیت کو - ٹپکا دو یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں - تہ و بالا کردو اس عصیاں

کندہ تو اپنی تمناؤں سے! —



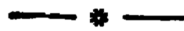
درآں حالیکہ دل صد چاک میں غضب کی جلن ہے، تو بھی او ظالم! مجھے خوب یاد ہے کہ جب تک میں تجھے قابل اعتنا نہ سمجھتا تھا، جب تک میں محبت کی ابلہ فریبیوں سے ناواقف تھا تب تک تو حریم محبت کی گداگر تھی۔ میری بے التفاتی تیرے نازک احساسات کا افسانہ آنسوؤں سے لکھا کرتی تھی - سہاگ کے دو چار تنکے چلنے کے لئے تو کس طرح میرے آستانہ کی جبیں سائی کرتی تھی --

میں تیری نظر فریبیوں سے بچا رہا آج کیا تو اسی کا انتقام لے رہی ہے- اب میں موت سے ہم آغوش ہوکر سسک رہا ہوں - بیدرد! کیا میرا دل اسی لئے تھا کہ یوں چور چور کر دیا جائے-

اس کرم کی نگاہ کے بعد اس کور چشمی کو میں کیوں کر برداشت کرسکتا ہوں- عورت! اگر مرد تیرے جذبات کی یوں تحقیر کرتا تو تو اسے کیا کیا دشنام نہ دیتی؟ -

سوچتا ہوں کہ کیا ہر معصوم دو شیزہ کا بوسہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ دل میں داغ بن کر رہ جائے -

نہیں، یہ نہیں ہے - نسیم کلی کے دل کو گدگدا کر پھول کھلاتی ہے مگر صرف بھونرے کو معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کر پھول کا دل چاک کیا جاتا ہے —



جب بہار کا چل چلاؤ تھا میں آہستہ خرام باد بہاری کے ساتھ اُس دیس کو چل دیا، جہاں نہ حیات ہے نہ موت، ہمیشہ اندھیری رات کا سایہ رہتا ہے -

اس دن کو یاد کرکے آج بھی میں لبریز مسرت ہو جاتا ہوں' جب میں الوداع کہہ رہا تھا اور آنکھیں فرط انبساط سے رونے لگی تھیں -

میں جب تجھے پیار نہ کر سکا تھا' تو نے بھی پہلے پہل میرے ہونٹوں سے پریم پیالہ لگایا تھا -

اب تک میرا بے تاب آغوش اُن حیات آفریں سانسوں کی لپٹ کو محسوس کرتا ہے جو دوشیزگی کی دنیا سے چلی تھیں -

اخلاص و محبت کی اُن رنگیلیوں سے یہ زندگی چمک اُٹھی' اس حد تک کہ اب میں موت میں کوئی تلخی محسوس نہیں کرتا -

جب اپنے موت در کنار ہونٹوں پر تیرے حسین و جمیل بوسوں کی لرزش محسوس کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ تیرے نام کو ہزار بوسے دوں —

—— * ——

میرے محبوب! ایک آرزو یہی ہے کہ جب کبھی جوانی کی راتیں کسی دوسرے کے لئے راحت کا پیام لے کر آئیں اور تو اپنے فرقت زدہ دل میں کھٹک سی پائے - تو کوئی تجھے بتلا دے کہ وہ دکھیارا اب اس دنیا سے سدھار گیا —

کبھی یہ نہ ہوگا کہ تیرے بوسہ کی گرمی کا تصور اسے ندی نالوں کو پار کراتا یہاں تک لے آئے گا -

وہ رشک و حسد کا پتلا' وہ غرض و نفس کا بندہ تو مر گیا -

اور لازوال بنا گیا اسے جو جدائی اور ناکامی میں محبت کا راز داں ہوکر شاعر بن گیا! —

—— * ——

ٹیگور کے ادبی مضامین

حیات شاعر

مترجمہ

(جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار)

ٹینیسن شاعر کے لڑکے نے اپنے مرحوم باپ کے خطوط اور سوانح حیات کو دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے —

قدیم شعرا کی زندگی کے مفصل حالات تلاش و جستجو کے باوجود بھی نہیں ملتے - اس وقت لوگوں کو سوانح عمری لکھنے کا شوق نہیں تھا - اس کے علاوہ اس زمانے میں بڑے اور چھوٹے سبھی (اس زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے) گمنامی کی حالت میں رہتے تھے - خطوط ' اخبارات ' مجلسیں ' انجمنیں اور ادبی مباحثے اس قدر زیادہ نہیں تھے اس لئے غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے اشخاص کی زندگی کے حالات کو مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا —

بہت سے گشت کرنے والوں نے بڑے بڑے دریاؤں کے سرچشموں کی تلاش میں دشوار گزار راستے طے کئے ہیں - شاعری کے بڑے بڑے دریاؤں کے سرچشموں کا کھوج نکالنے کے لئے طبیعت میں ایک خواہش ہوتی ہے ' امید ہے کہ موجودہ شاعروں کی سوانح حیات ہماری اس خواہش کو

پورا کر دے گی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ معاشرے میں شاعر کے چھپے رہنے کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی ہے - جس بلندی سے شاعری کا سرچشمہ نکلتا ہے وہاں تک ریل گاڑی جاری ہے —

اسی امید میں میں نے بڑے شوق سے کتاب کی دو ضخیم جلدوں کا مطالعہ کیا - لیکن شاعری کا سرچشمہ کس جگہ سے پھوٹ نکلا' باوجود تلاش کے اس کا پتا نہ لگ سکا - یہ کتابیں تھلیسن کے حالات زندگی کہی جا سکتی ہیں لیکن شاعر کی زندگی نہیں کہلا سکتیں - ہم اس کتاب کے ذریعے یہ نہ سمجھ سکے کہ شاعر کب انسانی دل کے سمندر میں جال ڈال کر اتنے علوم و جذبات باہر نکال لایا' اور کہاں بیٹھ کر اس نے ایسے عالمگیر نغمہ کے سروں کو اپنی بانسری پر مشق کر کے بجایا —

شاعر نے جس طرح اپنی شاعری کی تخلیق کی اس طرح اپنی زندگی نہیں بنائی' کیونکہ اس کی زندگی شاعری نہیں ہے - جو میدان عمل کے مرد ہوتے ہیں وہ اپنی زندگی بھی بناتے ہیں جس طرح شاعر زبان کی دشواریوں میں سے شعر کی بحر کو پیدا کر لیتے ہیں - معمولی جذبے کو غیر معمولی جوش اور چھوٹی سی بات کو بڑے معنی دے دیتے ہیں اسی طرح میدان عمل کے مرد دنیا کی دشواریوں کے بیچ میں سے اپنی زندگی کی بحر بنا لیتے ہیں اور اپنے اطراف کی حقیر چیزوں کو بے مثل طاقت کے برتے پر اعلیٰ بنا دیتے ہیں - وہ اپنے پاس جن معمولی چیزوں کو پاتے ہیں انہیں کے ذریعے اپنی زندگی کو اور خود ان چیزوں کو بھی بڑا بنا دیتے ہیں - اُن کی زندگی کا مشغلہ ہی اُن کی شاعری ہے' اس لئے انسان ان کی زندگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا —

لیکن شاعر کی زندگی سے انسان کو کیا فائدہ ہے؟ اس میں کونسی

دوامی چیز ہے؟ شاعر کی زندگی کو اس کے نام کے ساتھہ ملاکر بڑا بنانے سے چھوٹے کو بڑی جگہ بٹھاکر شرمندہ کرنا ہے - سوانح عمری بڑے لوگوں کی ہوتی ہے اور شاعری بڑے شاعروں کی —

بعض غیر معمولی ذہانت والے اشخاص شاعری اور زندگی کے کام دونوں میں اپنی ذہانت کو ترقی دے سکتے ہیں - شاعری اور کام دونوں ان کی ایک ہی ذہانت کے نتائج ہوتے ہیں - شاعری اور ان اشخاص کی زندگی کو اگر ہم ایک جاکر کے دیکھیں تو اس کے معنی وسیع تر اور جذبات زیادہ گہرے ہوجاتے ہیں - دانتے (Dante) کی شاعری میں دانتے کی سوانح عمری شامل ہے - اگر ہم دونوں کو یک جا کر کے پڑھیں تو اس کی زندگی اور اس کے کام کے حدود اچھی طرح نظر آتے ہیں —

ٹھنیسن کی زندگی اس قسم کی نہیں ہے - وہ ایک شریف آدمی کی زندگی ضرور ہے لیکن اس کا کوئی بھی پہلو قابل تعریف اور مختلف النوع نتائج کا حامل نہیں ہے' وہ اس کی شاعری کا ہم وزن نہیں ہے لیکن اس کی شاعری کے جس پہلو میں تنگ خیالی ہے اور عالمگیر وسعت کا فقدان ہے' اس میں آج کل کے ولایتی تمدن کی دوکانوں اور کارخانوں کی تازہ بو کچھہ زیادہ مقدار میں ہے - اس کی زندگی میں ان پہلوؤں کا عکس تو پایا جاتا ہے لیکن جس پہلو میں وہ وسیع ہے' جس پہلو میں اس نے انسان کے ساتھہ انسان کو' کائنات کے ساتھہ خالق کائنات کو' ایک دلکش نغمے کی قلمرو میں ہر پہلو سے دکھایا ہے' اس کا وہ اہم پہلو اس کی زندگی میں نمایاں نہیں ہے —

ہمارے قدیم ہندوستان کے کسی شاعر کی سوانح عمری نہیں ملتی - اس کے جاننے کے لئے ہمارے دل میں خواہش ضرور رہے گی لیکن ہمیں اس کا افسوس

نہیں - والمیکی * کے بارے میں جو کہانی مشہور ہے اسے تاریخی حیثیت سے کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا' لیکن ہماری رائے میں شاعر کی سچی تاریخ وہی ہے - والمیکی کے پڑھنے والے والمیکی کی شاعری سے اس کی جو زندگی تخلیق کرتے ہیں' والمیکی کی اصلی زندگی کے مقابلہ میں وہی زیادہ سچی ہے - کس چوٹ کے ذریعے والمیکی کے دل سے شاعری کی سوت پھوٹ پڑی؟ احساس درد کی چوٹ سے - رامائن احساس درد کے آنسوؤں کا سوتا ہے- مہجور کراونچ کے فراق کے تڑپا دینے والے آہ و نالے رامائن کی کہانی کے تہ میں گونج رہے ہیں- راون نے بھی صیاد کی طرح دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جدا کردیا ہے اور لنکا کانڈ کی جنگ' مہجور پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہے - راون نے جس جدائی کو پیدا کیا تھا وہ موت کی جدائی کے مقابلہ میں بھی بھیانک تھی - وصال کے بعد بھی اس جدائی کی تلافی نہیں ہوئی —

عیش کے اسباب کس خوش اسلوبی سے فراہم ہورہے تھے - ایک طرف تو باپ کی محبت' رعایا کی اُلفت' بھائیوں کی شفقت اور اِن سب کے بیچ میں نئے شادی شدہ رام اور سیتا کا ملاپ' اور دوسری طرف ولی عہدی

والمیکی کو سنسکرت کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے - اس کی شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی اس کے متعلق یہ کہانی مشہور ہے کہتے ہیں کہ ایک دن والمیکی اشنان کے لئے دریا کے کنارے گئے - وہاں کراونچ (پرند کا نام) کا ایک جوڑا محبت کی کلیلوں میں مُنہمک تھا - اتنے میں ایک صیاد نے تیر سے ایک پرندے کو مار ڈالا - یہ دیکھکر والمیکی کے دل پر سخت چوٹ لگی اور کہتے ہیں کہ اسی وقت ذیل کا خیال نظم میں اُن کے منہ سے نکل پڑا :-
"اے صیاد تو صدہا سال تک ذلت ہی ذلت میں بسر کرے کیوں کہ تونے ان دو پریمی پرندوں میں سے ایک کو مار ڈالا" - جوش فرو ہونے کے بعد جب انہوں نے اپنے الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک اچھی خاصی نظم ہے - کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی انہوں نے رامائن نظم کرنی شروع کردی -

کی رسم، ان تمام مسرتوں کو کامل اور شاندار بنانے کے لئے آ موجود ہوئی تھی - ٹھیک اسی وقت صیاد نے تیر کھینچا اور نشانے پر بیٹھا جب سیتا چوری گئی۔ اس کے بعد آخر تک فراق کا کہیں اختتام نہیں ہوا - معاملا زندگی کے عیش کی ابتدا اور انجام ایک ہی تھا —

کراونچ کے جوڑے کی کہانی رامائن کے اصلی جذبات کا مختصر نمونہ ہے، موٹی سی بات اتنی ہی ہے- لوگوں نے بلا شبہ اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اس بڑے شاعر کی شفاف بحروں کی روانی احساس درد ہی کی گرمی سے پگھل کر بہی ہے - محبت کرنے والے جوڑے کے بے وقت دائمی فراق نے وحشی کی اثر پذیر قوت شعری میں ایک تہلکہ ڈال دیا -

اور دوسری کہانی رتنا کر* (والمیکی کا پہلا نام) کی ہے- وہ ایک اور ہی جذبے کی مظہر ہے - رامائن کی شاعری کس قسم کی ہے اس کی یہ ایک دوسری تنقید ہے - اس کہانی سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ رام اور سیتا کے درد فراق کی بےانتہا اثر پذیری ہی رامائن کا بڑا سبب نہیں ہے، اس کا باعث شاعر کے دل میں رامچندر جی کی زندگی کی اعلیٰ ترین عظمت کا احساس ہے - رام کی زندگی نے ایک ڈاکو کو شاعر بنا دیا، اعتقاد کی قوت ایسی ہوتی ہے - رامائن کا رام ہندوستان کی نظروں میں کس عظمت کے ساتھ نظر آتا ہے، رامائن کی کہانی نے اسے اجاگر کر کے دکھا دیا ہے —

ان دونوں کہانیوں سے پتہ لگتا ہے کہ روزانہ کی بات چیت، خط و کتابت، ملنا جلنا، کام کاج اور تعلیم و تربیت ان چیزوں میں شاعری کی اصلیت نہیں ہے اس کی اصلیت ایک زبردست احساس کی تحریک

* والمیکی کا پہلا نام رتناکر تھا اور کہتے ہیں کہ یہ ایک بڑا زبردست ڈاکو تھا -

ہے ' جو اس عالم سے بالاتر ' وقتی اور الہام کے مانند ہے اور وہ شاعر کی قابلیت سے بالاتر ہے —

کوی کلکن (ایک بنگالی شاعر) نے جو نظم لکھی ہے وہ بھی خواب میں ایک دیوی کے حکم کی بجا آوری میں اور اُسی کے اثرات کے تحت لکھی ہے —

کالی داس کے بارے میں جو کہانی مشہور ہے وہ بھی اسی قسم کی ہے۔ وہ ایک بے وقوف ' اُجڈ اور ایک قابل عورت کی دل لگی کا آلہ تھا - یکایک وہ ایک فیضان الٰہی کے سبب شاعری کے جوہر سے مالا مال ہوگیا - والمیکی ایک سنگ دل ڈاکو تھا اور کالی داس ایک اجڈ بے وقوف ' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں - والمیکی کی تصنیف میں درد انگیز تقدیس اور کالی داس کی تحریروں میں رسیلی شوخی کی حیرت انگیز برتری کو نمایاں کرنے کی کوشش جھلکتی ہے —

لوگوں نے ان کہانیوں کو شاعر کی زندگی سے نہیں بلکہ اس کی شاعری سے انتخاب کیا ہے - اگر شاعر کی زندگی میں ایسی حقیقی باتیں ملتیں تو ان کا شاعر کی شاعری کے ساتھہ کوئی گہرا اور دوامی تعلق نہ ہوتا - والمیکی کی روز مرہ کی زندگی کا کسی طرح بھی ان کی رامائن کے ساتھہ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اُن کے اور سب کام وقتی اور غیر مستقل تھے - رامائن ان کی اندرونی مستقل فطرت کی فطری تخلیق ہے - وہ ایک (غیر قابل بیان) اور غیر محدود قوت کا ارتقا ہے - وہ دوسرے معمولی کاموں کی طرح ذرا سے جوش کا نتیجہ نہیں ہے —

تینیسن کی شاعری کی زندگی پر بھی کچھہ لکھا جا سکتا ہے - حقیقی زندگی کے تخیل کے سوا اسے حقیقی نہیں کہہ سکتے ۔ اس سے لہذی شیلٹ

(Lady Shaloth) اور کنگ آرتھر (King Arthor) کے زمانے کے ساتھہ وکٹوریہ (Victoria) نے بہت کا عجیب طرح سے میل ہو جائے گا - اس سے مرلن (Merlin) کا جادو اور سائنس کی ایجادات اکٹھی ہو جائیں گے - موجودہ زمانے نے بچپن ہی میں اسے سوتیلی ماں کی طرح تخیل کے جنگل میں جلا وطن کر دیا تھا وہاں اس نے قدیم زمانے کے شکستہ قلعے میں تنہا رہ کر کس طرح علاءالدین کا چراغ حاصل کر لیا ؟ کس طرح ایک شہزادی کے ساتھہ اس کی ملاقات ہوگئی ؟ کس طرح قدیم زمانے کی دولت لے کر وہ موجودہ زمانے کے اندر شاہی لباس میں داخل ہوا ؟ یہ طویل قصہ نہیں لکھا گیا - اگر یہ لکھا جاتا تو دو لکھنے والوں میں یکسانی نہ پائی جاتی اور ٹینیسن کی زندگی مختلف لوگوں کی زبانوں پر مختلف شکلیں اختیار کر لیتی -

---

تبصرے

نام کتاب	صفحہ
ادب	
بال جبریل	۴۰۵
منشورات	۴۰۹
علم الحروف	۴۱۰
سرود زندگی	۴۱۱
دیوان غالب	۴۱۲
نذیر احمد کی کہانی	۴۱۴
آغاز ہستی	۴۱۵
خواب پریشان	۴۱۶
۱. لیلیٰ کے خطوط - ۲. روزنامچہ	۴۱۷
رباعیات جذب	۴۲۳
راسپوتین	۴۲۴
لطیفیات جلد دوم	۴۲۵
فن انشا پردازی	۴۲۶
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	۴۳۱
مذہب و اخلاق	
وحی محمدی	۴۳۷

نام کتاب	صفحہ
تعلیم	
مصلحان تعلیم	۴۳۸
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	۴۳۹
متفرقات	
عصر جدید	۴۴۰
اردو کے جدید رسالے	
شاہکار	۴۴۱
عروس خیال	۴۴۳
ادراک	۴۴۴
ارمغان	۴۴۴
تبصرہ	۴۴۵
سالنامے	
سفیر سخن	۴۴۵
مجموعۂ تحقیقات علمیہ	۴۴۶

تبصرے

ادب

بال جبریل

(مجموعۂ تازہ کلام اردو سر محمد اقبال مجلد -
تاج کمپنی لمیٹڈ لاهور سے مل سکتا هے)

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی هے
ابھی محفل میں هے شاید کوئی درد آشنا باقی (بال جبریل)

یہ اردو زبان کی خوش نصیبی هے کہ آج (پورے ایک قرن کے بعد اقبال نے اردو کی طرف توجہ کی هے جس کا نتیجہ هم "بال جبریل" کی صورت میں دیکھتے هیں - اقبال نے اردو اساتذہ کی اُس سنت کو قائم رکھا جو ابتدا سے حالی تک برابر جاری رهی - یعنے اردو زبان کے جتنے نامور شاعر هوے هیں ان کا کلام اردو اور فارسی دونوں میں هے، مثلاً مظہر جان جاں، درد، میر، سودا، مصحفی، انشا، مومن، غالب، شیفتہ، حالی) وغیرهم - هم نے انہیں کبھی یہ الزام نہیں دیا کہ وہ فارسی میں کیوں کہتے هیں (خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ همارے بعض هم وطن انگریزی میں فکر فرما تے هیں)

البتہ اتنی شکایت ضرور تھی کہ اردو میں کہنا کیوں چھوڑ دیا - لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ فقیر کیا نکالتا اور کیا ڈالتا ہے - "بال جبریل" نے شکایت کا منہ بند کردیا اور ہم جیسے بے صبروں کو مطمئن کردیا - اقبال نے اردو کو نہیں چھوڑا اور نہ اردو اُن کو چھوڑ سکتی ہے - مانا کہ فارسی میں شیرینی، لطافت، لوچ اور نرماہٹ ہے، لیکن اردو پھر بھی اپنی زبان ہے - فارسی بنی بنائی اور سنوری سنورائی ہے اور اردو کو ابھی بنانا اور سنوارنا ہے - جب بنانے اور سنوارنے والا ہی منہ موڑ لے تو پھر دوسروں سے کیا توقع ہوسکتی ہے - لیکن ہم اس کی ضرور داد دیں گے کہ وہ خاموشی سے سب شکایتیں سنتے رہے مگر چپکے چپکے اپنی زبان کی پرورش کرتے رہے - آج اس کا حال کھلا تو ہمیں بے حد مسرت ہوئی -

اردو ادب میں اقبال کی جگہ مستقل اور قائم ہے - اس نے صرف شاعری ہی میں انقلاب نہیں پیدا کیا بلکہ دلوں میں بھی انقلاب پیدا کیا ہے - آج اس کی بدولت ہم جدید رنگ اور نئے ڈھنگ دیکھتے ہیں جو آگے چل کر نئے برگ و بار لائیں گے -

جب ("بال جبریل" آیا (یا آئی) تو ہم نے اُسے اس طرح کھولا جیسے کوئی مرد متقی اپنی کتابِ اوراد و وظائف کو کھولتا ہے - اس (میں وہ جوش و خروش اور ہنگامہ نہیں جو بانگ درا میں ہے - مگر لے وہی ہے گو سر دھیمے ہیں - اس دھیمے پن میں دوسری قوت ہے جو ہنگامے میں نہیں - اس کے اسلوب بیان میں زیادہ سلاست اور صفائی ہے اور حکیمانہ رنگ گہرا ہے - بعض اوقات جوش و خروش وہ کام نہیں دیتا جو دھیمی بات دے جاتی ہے - فرنگی تہذیب و تمدن سے اقبال کو ہمیشہ تنفر و کراہت رہی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حال کے سفر نے اس میں کسی قدر

تلخی اور بڑھا دی ہے —

اقبال ہندی نژاد ہے، فارسی ذوق اس کی سرشت میں ہے، عرب کا عاشق اور عربی شعرا کی طرح آزاد ہے، مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور اس کے سرچشمہ پر پہنچ کر اس سے سیراب ہوا ہے - اس ترکیب سے یہ طبیعت بنی ہے - وہ خود کہتا ہے —

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی   نفس ہندی مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ انداز افرنگ   طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

بال جبریل پرانے جوش و خروش سے بالکل خالی نہیں، کہیں کہیں یہ رنگ آگیا ہے) مثلاً —

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میرے نواؤں کی تاب
جس میں نہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

چند متفرق اشعار اس نئے مجموعے سے نقل کرتا ہوں، صاحب ذوق لطف حاصل کریں گے —

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے   تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری   تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا میرا گریباں چاک

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں غنچۂ گل
یہی ہے فصل بہاری ؟ یہی ہے باد مراد
قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہو صیاد

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے   عشق بیچارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

تبرک ہے مرا پیراہن چاک   نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر   نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

آخر میں ایک نصیحت بھی سن لیجیے —

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

منشورات

(مجموعۂ مضامین جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب ۳۲۴ صفحات - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے - انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن ' شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ' الناظر بک ایجنسی لکھنؤ اور کتابستان الہ آباد سے مل سکتی ہے)

حضرت کیفی اردو کے بڑے ادیب اور محسن اور اردو زبان کے دلدادہ ہیں - ان کی زبان ٹکسالی اور دلی کی زبان ہے - ان میں جدت فکر اور جدت بیان دونوں پائے جاتے ہیں جن پر ان کے مضامین کا یہ مجموعہ جو منشورات کے نام سے شایع ہوا ہے ' شاہد ہے - اس مجموعے میں بارہ مضامین ہیں جو سب کے سب ادب اور لسانیات پر ہیں اور ہر مضمون میں ان کی محققانہ کاوش نظر آتی ہے - مضامین کی تفصیل یہ ہے —

اردو لسانیات - مبادیات فصاحت - اردو کی موجودہ ضرورت -

تذکیر و تانیث - تشبیہ - متروکات - دل' گلاب - اردو اور لکھنؤ - نظر اور خود نظری - شمس العلما حضرت آزاد مرحوم - اردو اور پنجاب -

ان میں سے ہر مضمون ایک جدا حیثیت رکھتا ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے ان کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو گلدستہ کے پھولوں اور تسبیح کے دانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے - زندہ لوگوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جنھوں نے اردو زبان پر لسانیاتی اور محققانہ پہلو سے اس طرح نظر ڈالی ہو - یہ مضامین ادیب اور طالب ادب کے لیے نہایت قابل قدر ہیں - اور اس قابل ہیں کہ جن یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی اعلی تعلیم ہوتی ہے' وہاں کے نصاب میں داخل کیے جائیں -

---

علم الحروف

(تالیف حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر' مطلہ

فراہم خانہ' دہلی - قیمت تین روپے)

اس تالیف کے چار حصے ہیں - حصۂ اول کے شروع میں مختصر طور پر تخلیق السنہ سے بحث کرنے کے بعد سامی زبان کا ذکر چھیڑ دیا ہے اور ایک شجرہ دیا ہے جس میں اس کی تمام شاخیں آگئی ہیں - اس کے بعد علم الکتابت کا بیان ہے جس کے ذیل میں دنیا کے مختلف قسم کے خطوں کا سرسری ذکر ہے - اس باب کے آخر میں اقوام عرب کی ابجد اور رسم الخط کا تذکرہ ہے - اس کی تاریخ اور عہد بعہد ترقی اور عربی خط کے تمام اقسام کی تفصیل درج ہے -

حصۂ دوم میں خطوط ممالک ایران کا تذکرہ ہے - قدیم خطوط کا

مختصر ذکر کرنے کے بعد عہد اسلام کے ساتوں خطوں کا ذکر کیا ہے - پھر خط نستعلیق اور اس کے اساتذہ کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے جو بہت دلچسپ ہے - ان ممالک کا بھی ذکر کیا ہے جہاں فارسی یا عربی خط رائج ہے - اس کے تحت ہندوستان بھی آجاتا ہے - ہندوستان کی خوش نویسی اور خوشنویسوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے ، اور بابر سے لے کر آخر تک ہر عہد کے خطاطوں کا حال اور ان کے انداز خط کا بیان کافی طور سے کیا ہے —

حصۂ سوم میں جو بہت مختصر ہے ، کاغذ ، قلم ، سیاہی کا بیان ہے اور ان کی تاریخی حیثیت سے بھی بحث کی گئی ہے —

حصۂ چہارم میں قدیم و جدید ابجدوں کے نقشے دیے ہیں - ان سے حرفوں کی شکلیں اور ان میں جو تغیرات ہوے ہیں صاف نظر آتے ہیں - اس باب کے آخر میں قدیم خط کوفی ، خط تعلیق ، شکستہ اور نستعلیق کے بہت اچھے نمونے درج ہیں - نستعلیق میں میر عماد ، میر علی ہروی ، آقا عبدالرشید دیلمی ، محمد موسیٰ ، محمد امیر رضوی اور میر علی تبریزی کے قطعات کے فوٹو دیے ہیں جنہیں دیکھ کر ان اساتذہ کے کمال کی داد دینی پڑتی ہے —

سرود زندگی

(جناب اصغر گونڈوی کا کلام - مجلد قیمت دو روپے - مصنف سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے پتے سے مل سکتا ہے)

حضرت اصغر اردو کے ان چند زندہ شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے

اردو غزل میں ایک خاص رنگ پیدا کیا ہے - وہ کائنات کو حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی میں ان کا تخیل اور ان کے جذبات پنہاں ہیں۔ نظر بلند اور خیال وسیع ہے، اسلوب بیان بھی پختہ ہے - لیکن ان کی شاعری خواص کے لیے ہے، عوام کے لیے نہیں - مولانا حالی کے بعد ابھی ہم میں ایسے شاعر پیدا نہیں ہوے جن کے کلام سے خواص و عوام دونوں حظ حاصل کر سکیں۔ اصغر صاحب کے اسلوب بیان میں بھی اب زیادہ پختگی اور صفای پیدا ہو گئی ہے جس نے حکیمانہ رنگ کے ساتھہ دلاویزی بھی پیدا کر دی ہے —

یہاں چند شعر ناظرین کے لطف سخن کے لیے نقل کیے جاتے ہیں —

یہ راز ہے میری زندگی کا پہنے ہوے ہوں کفن خودی کا
او لفظ و بیاں میں چھپنے والے اب قصد ہے اور خامشی کا
ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک دے مر کے ثبوت زندگی کا

ہوے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس سے
نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اس کی نہ ایماں کو

دیکھیے اٹھتا ہے کب کوئی یہاں سے اہل درد
کعبہ و بت خانہ دونوں ہیں خدا کے سامنے
رشک صد ایماں ہے اصغر میرا طرز کافری
میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

رسم فرسودہ نہیں شایان ارباب نظر
کوی منظر بالاتر از کفر و ایماں دیکھیے

ہر ہر قدم پہ جلوۂ رنگیں ہے تو بتو	خود رفتگیِ نگاہ جو زنجیر پا نہو

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیر ساحل دیکھنے والے

اتھہ رہی ہے مٹ رہی ہے موج دریاے وجود
اور کچھہ ذوق طلب میں ہے نہ کچھہ منزل میں ہے
جستجو ہے زندگی، ذوق طلب ہے زندگی
زندگی کا راز لیکن دوریِ منزل میں ہے

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے
بہار انجام سمجھوں اس چمن کا یا خزاں سمجھوں
زبان برگ گل سے مجھہ کو کیا ارشاد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیِ ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقه هائے دام کیا؟ رنج اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو هر طرح آزاد هوتا هے ٭

مجاز کیسا؟ کہاں حقیقت؟ ابھی تجھے کچھه خبر نہیں هے
یه سب هے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا هے سحر نہیں هے
شمیم گلشن، نسیم صحرا، شعاع خورشید و موج دریا
هر ایک گرم سفر هے ان میں مرا کوئی همسفر نہیں هے
چمک دمک پر مٹا هوا هے یه باغباں تجھه کو کیا هوا هے
فریب شبنم میں مبتلا هے چمن کی اب تک خبر نہیں هے

دیوان غالب

یه دیوان مطبع آفتاب کا مطبوعه هے - خط نسخ میں چھپی تقطیع پر - یه وهی خط هے جس میں جامعهٔ ملیه اسلامیه دهلی نے اپنا دیوان غالب طبع کرایا تھا - بہت صاف اور خوشنما چھپا هے - کاغذ بھی اعلیٰ درجه کا هے - لیکن اصل چیز جو قابل ذکر هے وہ اس کی نفیس اور خوبصورت جلد هے جو حیدرآباد دکن کے مشہور محبوبیه کارخانهٔ جلد سازی (گولی گوڑہ) میں تیار هوئی هے - دیوان اس کارخانه سے ۵ روپے میں مل سکتا هے جو جلد اور طباعت کی اس خوبی کے ساتھه بہت سستا هے ــ

نذیر احمد کی کہانی

کچھه افتخار عالم اور کچھه مرزا فرحت کی زبانی

(مولفه منشی محمد خاں صاحب انٹرمیڈیٹ کالج بنگلور)

اس ۳۵ صفحے کے رسالے میں منشی صاحب نے سید افتخار عالم

مرحوم کی کتاب حیات النذیر اور مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے مضمون (مطبوعۂ رسالہ اردو) پر تبصرہ کیا ہے - اور ان صاحبوں کی غلطیوں یا اختلاف بیان کو بتایا ہے جو مولانا نذیر احمد مرحوم کے حالات کے متعلق ان سے سرزد ہوا ہے - لیکن مولف کا لہجہ اس قدر تلخ و ترش ہے کہ پڑھنے والے کو ناگوار گزرتا ہے - اگر کوی شخص بد نیتی سے یا دیدہ و دانستہ واقعات کو غلط بیان کرے یا ان میں تصرف کرے یا مسخ کر کے لکھے تو بیشک وہ قابل الزام ہے - سہو و خطا ہر مولف سے ممکن ہے - اس پر اظہار غصہ کرنا غیر ضروری ہے - مجھے مولف کے بعض اقوال سے جن میں انہوں نے "صاحبین" کی غلطیوں کا انکشاف کیا ہے کامل اتفاق ہے لیکن ان کے اظہار میں متانت کو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا —

آغاز هستی

(مترجمۂ مجنوں گورکھپوری - مطبوعۂ ایوان پریس گورکھپور - قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ طباعت و کتابت اچھی) —

یہ ڈرامے برنرڈ شا کے ڈرامے Back to Mathusaleh کے پہلے حصے کا ترجمہ ہے برنرڈ شا کے نام سے اردو داں پبلک کچھہ نہ کچھہ واقف ہو چکی ہے - اس کی ضرورت تھی کہ اس کی تصانیف کو بھی اردو میں ترجمہ کر کے پیش کیا جاے - مجنوں گورکھپوری کا یہ ترجمہ ایک قابل مبارکباد کوشش ہے - ڈرامے کے متن کا ترجمہ انہوں نے کافی محنت سے کیا ہے - وہ مقدمہ جو انہوں نے لکھا ہے اس میں البتہ کچھہ خامیاں ہیں - ایک تو یہ کہ وہ برنرڈشا کو اچھی طرح روشناس نہیں کراسکے ہیں دوسرے یہ کہ خود اس ڈرامہ کے مقصد اور "پیغام"

کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ناکافی ہے - برنرڈشا کی " تمہیدیں " بسا اوقات ڈراموں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں - اگر مترجم صاحب برنرڈشا کی اصل تمہید کا ترجمہ کردیتے تو زیادہ مناسب تھا —

اس ڈرامے کے باقی چار حصوں کا بھی اگر مترجم صاحب ترجمہ کردیں تو اُردو میں جدید ادب اور جدید ڈرامے کا ایک شاہکار مکمل شکل میں دستیاب ہوسکے گا - اپنے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے " باقی چار تمثیلوں کو چھوڑ دیا - نہ صرف اس لئے کہ اردو خواں طبقہ اپنے کو اس سے کسی قدر غیر مانوس پائے گا بلکہ بالخصوص اس لئے کہ اس میں جو صورتیں پیش کی گئی ہیں وہ ممکن الوقوع بھی ہوں تو اُن سے انسان کی فلاح ممکن نہیں " - ہماری رائے میں اگر مترجم صاحب اس نقطۂ نظر کو چھوڑ کر محض اس خیال سے کہ اردو ادب میں ایک معیاری ڈرامے کے ترجمے کا اضافہ ہوجائے ' اس کا ترجمہ کردیں تو یہی زبان کی ایک اہم خدمت ہوگی - اور اس ترجمے کے ساتھ برنرڈشا کی اصلی تمہید کا ترجمہ اور برنرڈشا کے حالات اس کے فن ' اسلوب ' اور ' پیغام ' پر بھی ایک مکمل مضمون شروع میں شامل کردیں — + + +

خواب پریشان

مترجمہ منشی امیر احمد صاحب علوی بی - اے - کتب خانۂ امیر محل کاکوری ضلع لکھنؤ —

منشی امیر احمد صاحب علوی نے شکسپیر کے (Mid summer Night's Dream) کا ترجمہ کیا تھا جو اب سے پینتیس سال قبل بالاقساط اودھ پنچ میں

طبع ہوتا رہا - اب ان کے صاحبزادے مشہر احمد صاحب علوی نے اس کو کتابی صورت میں شایع کیا ہے - اس زمانے کو دیکھتے ہوے جس میں یہ ترجمہ کیا گیا ہے مترجم کی محنت قابل ستایش ہے - لیکن یہ ترجمہ شکسپیر کے اس شاہکار کا معیاری ترجمہ نہیں قرار دیا جاسکتا —

اس ترجمے کا مقصد اردو داں پبلک کو شکسپیر کی تصنیف سے آگاہ کرنا ہے - قصے کی حد تک تو یقیناً اس ترجمے سے پبلک آگاہ ہوسکتی ہے - لیکن شکسپیر کی لطیف تر خوبیاں اس میں نمایاں نہیں ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ روا روی میں کیا گیا ہے - اور زیادہ تحقیق و تجسس سے اصل کی ہر ہر خوبی کو اردو میں منتقل کرنے کی سعی نہیں کی گئی ہے —

+ +

---

۱ - لیلیٰ کے خطوط - ۲ - روزنامچہ

از قاضی عبدالغفار صاحب - ناشر دارالادب پنجاب ' لاہور - قیمت دو روپے —

ہماری زندگی کی طرح ہمارے ادب پر بھی ایک انقلاب کا اثر پڑ رہا ہے - جو مغربی اثرات کی وجہ سے رونما ہو رہا ہے - ادبی نقطۂ نظر ' طرز خیال اور طرز ادا میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے - زیر نظر تصنیف (یعنی لیلیٰ کے خطوط) اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ اس جدید طرز کے ادب کا ایک کامیاب نمونہ ہے —

کتاب کی تحریر کا مقصد مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے " مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا گیا - حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر

اس بد نصیب ملک میں کچھ لوگ ان نقوش کے معنی سمجھ سکیں تو سمجھ لیں : —

اسی وجہ سے کتاب کی ھیروئن "لیلی" محض معمولی بیوا نہیں۔ وہ ایک مجسم استعارہ ھے جس کہ پردے میں هندوستان کی زخم خوردہ اور مظلوم نسوانیت نظر آتی ھے - "لیلی کے خطوط" لیلی کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھے گئے ہیں - شروع سے آخر تک مصنف ھی کا نقطۂ نظر اس کی اس خونچکاں قلبی کیفیت کو دیکھ رھا ھے، محسوس کر رھا اور دوسروں کو دکھا رھا ھے، محسوس کرا رھا ھے —

مصنف نے اپنے خیالات اور رائے کے اظہار کے لئے معاشرت کے اس پہلو کا تجزیہ کیا ھے - ان کثیف حقیقتوں کو جو رات کے سیاہ و تاریک پردوں میں چھپی رھتی ہیں مگر اندر ھی اندر معاشری زندگی کو گھن کی طرح کھائے جا رھی ھیں اس نے کھلم کھلا بیان کیا ھے - بعض بعض مقامات پر ان تاریک حقیقتوں کو بیان کرنے میں مصنف کا قلم کمال کو گیا ھے - لیکن ایسے موضوع کے لئے مکمل اور محیط حقیقت نگاری کی ضرورت تھی - جس زندگی کے پوشیدہ پہلووں پر سے مصنف پردہ اٹھانا چاھتا ھے، اسے چاھئے تھا کہ تفصیل سے اس زندگی کے ہر ظاہری اور باطنی واقعے پر داخلی اور خارجی کیفیت کو دیکھتا اور ناظرین کو دکھاتا - اگر "لیلی کے خطوط" میں "زندگی" پوری طرح، اپنی پوری تفصیلوں، اسباب و علل، اور نتائج کی پوری کڑیوں کے ساتھ موجود ھوتی تو مصنف کا مقصد خود بخود حاصل ھو جاتا نہ اسے اس شاعرانہ تجزیے کی ضرورت ھوتی نہ پند و موعظت کی - افسانہ کی بنیاد اگر پوری طرح زندگی کے واقعات پر ھو، اگر افسانے کی ہر "تفصیل" زندگی کی تفصیل پر منحصر ھو

تو افسانہ خود زندگی کا آئینہ بن جاتا ہے اور زندگی کا مہلک سے مہلک پہلو بھی اس میں اپنی پوری دھشتناک حقیقت کے ساتھہ منعکس نظر آتا ہے۔

لیلی کی زندگی کا اگر کوئی واقعہ اس ناول میں ہے بھی تو اس کا ذکر محض اشارتاً آیا ہے ۔ ورنہ شروع سے آخر تک وہی داستان غم ہے جو ابتدائی خطوط میں مصنف کے زور قلم کے باعث نہایت پر اثر ہے مگر البتہ آخر آخر میں کہیں کہیں تصنع اور تکلف پیدا ہوگیا ہے —

صرف ایک خط میں لیلی اپنی گذشتہ زندگی کا ذکر کرتی ہے۔" — ہم کہیں جارہے ہیں ' ریل کا استیشن ہے ' میرے والد کے ساتھہ ایک خوشرو جوان ہے ' مردانہ حسن کی ایک تصویر ' جو ہنوز مکمل نہ ہوی تھی ' یہ میرا منگیتر ہے ' جس کے ساتھہ میری جوانی ' میرا بڑھاپا گذرنا چاہئے تھا ! میں اس کی طرف نیچی نگاہوں سے اس طرح دیکھہ رہی ہوں کہ گویا دیکھہ نہیں رہی .... پھر ایک ۲۲ سالہ جوان رعنا اس دریچہ کے سامنے سے گذرا — یہ میرا پہلا مرد ہے - جس نے مجھے عورت بنایا مگر بیوی نہ بنایا - جس نے مجھے میری شاخ سے چن کر چند روز گلے کا ہار بنایا پھر مسل کر بدررو میں پھینک دیا - جس ظالم نے میری دوشیزگی کو وہاں پہنچا دیا جہاں اب تم دیکھہ رہے ہو جس نے مجھے وہ بنا دیا جو میں اب نظر آتی ہوں " —

اس پہلے گناہ کے بعد وہ ایک شریف لڑکی سے ایک معمولی بازاری رنڈی بن گئی - مصنف اس کی روح اور اس کے باطن کی مصوری اور نقاشی میں اس قدر منہمک ہے کہ اس نے اس کی ظاہری زندگی کی تفصیلی مصوری کی کوشش نہیں کی جس سے یہ "باطن" تعمیر ہوا ہے - کہیں کہیں البتہ اس کی جھلک نظر آجاتی ہے - مثلاً صفحۂ ۳۱ سے صفحہ

۳۴ تک - کتاب کا دوسرا حصہ اس منزل پر شروع ہوتا ہے جب لیلی اپنے مجنون کی مسلسل الحاح وزاری کے بعد اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ محبت کا جذبہ اُسے بھی چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے - مگر وہ ہوس پرستی اور ہوسناکی کی اس قدر عادی ہوگئی ہے کہ اس سچی محبت کے جذبہ کو ایک خطرناک اور نقصان رساں کمزوری سمجھ کے وہ اپنے عاشق کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے - اور سال بھر تک دونوں میں خط و کتابت نہیں ہوتی - اس دوران میں وہ اپنے آپ کو اور بھی زیادہ بے احتیاطی سے ایک مجنونانہ جذبے کے ساتھ سفلی تعیش میں غرق کردیتی ہے یہاں تک کہ اس کے شباب کی تازگی رخصت ہونے لگتی ہے - اس اثناء میں ایک مرتبہ جب اس کا عاشق بہت سخت بیمار تھا وہ اس کی تیمار داری کرتی ہے - اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ ایک نئی زندگی کا خواب دیکھنے لگتی ہے - چند روز اس نئی دنیا میں مجھے دم لینے دو جس کے دروازے میرے لیے کھلتے جاتے ہیں - اس ویرانے کو آباد ہونے دو - مجرموں سے میرے انتقام کا وقت وہ آئے گا جب میں بیوی اور ماں بن کر بغاوت کا علم بلند کروں گی ...... " —

اگر یہی روئداد ناول کی صورت میں پیش کی جاتی اور اس کا پلاٹ تمام تر ظاہری اور باطنی خارجی اور نفسیاتی تفصیلوں کے ساتھ لکھا جاتا تو افسانہ شاید مصنف کے مقصد کو اور بھی اچھی طرح ادا کرتا اور یہ کتاب اردو ادب میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتی - موجودہ صورت میں یہ قصہ ایک کہر میں لپٹا ہوا ہے - کہیں کہیں اس پر زندگی کی شعاع پڑ جاتی ہے - ورنہ مصنف ہر جگہ "موعظت" اور "تلقین" میں مصروف نظر آتا ہے —

مصنف کی شوخی تحریر کی داد نہ دینا ظلم ہے - یہ اسلوب اردو میں ایک بالکل نئی چیز ہے - کہیں کہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قلم سے پھلجھڑیاں گر رہی ہیں - "جس کو وہ عشق کہتے ہیں وہ ایک غزل ہے' جس کا مقطع وہی خلوت بے ناموس ہے! جب وہ میرے پہلو میں آکر بیٹھتے ہیں اور بسور بسور کر سوز و گداز عشق کا حال بیان کرتے ہیں' کہتے ہیں میں مرتا ہوں' میں تم پر جان دیتا ہوں' مجھے جیسی تم سے محبت ہے ایسی تو کبھی کسی سے نہیں ہوئی' تم میری دل و جان کی مالک ہو' تم بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا" تو میں دل میں ہنستی ہوں اور کن انکھیوں سے دیکھتی ہوں کہ اس اظہار التفات بے پایاں کے ساتھ اب وہ میری طرف کھسکتے آتے ہیں' اس عالم بے اختیاری میں ان کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف آتا ہے' ان کا سر میرے شانہ کی طرف' ان کا دوسرا ہاتھ میری کمر کی جانب' اور میں اندازہ کرلیتی ہوں کہ غزل کا مقطع قریب ہے - پھر چند روز ان کا عشق کافی گرم رہتا ہے - تا آنکہ ہوس کا اشارہ کسی دوسری جانب ہوتا ہے اور میرے باسی بوسوں کی تھکن وہ محسوس کرنے لگتے ہیں - ... کسی دن وہ غائب ہوجاتے ہیں اور پھر کبھی میری طرف نہیں آتے - کبھی سن لیتی ہوں کہ اب ان کے عشق کے سمند باد پاکی باگ کسی دوسری طرف پھر گئی ہے" —

قابل مصنف نے بعض غیر متعلق مباحث بھی کہیں کہیں چھیڑ دیے ہیں جن سے تسلسل اور توازن میں فرق پیدا ہوجاتا ہے - طنز آمیز موعظت بھی جب حد سے گزر جاتی ہے تو دلچسپ نہیں رہتی - مثلاً پندرھواں خط' یا اکیسواں خط کچھ اسی قسم کا ہے

لیلی اپنے آپ کو "حسن فروش فلسفی" کہتی ہے - لیکن اس کے طرز استدلال میں نسوانیت نہیں - اور اسی وجہ سے جب وہ ان خشک مباحث میں مبتلا ہو جاتی ہے جن کو مصنف "فلسفانیہ مباحث" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں مگر جن میں کسی قسم کا فلسفہ موجود نہیں، تو کتاب کا وہ حصہ کسی قدر غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے —

اس کتاب کا موضوع، اس کا اسلوب بیان، اس کی بیباکی اور مصنف کی اخلاقی جرأت ہمارے ادب میں ایک جدید چیز ہے - اس لیے اس کا مطالعہ ہر ادب کے دلدادہ کے لیے لازم ہے —

روز نامچے میں تصویر کا دوسرا رخ ہے - لیلی کے خطوط میں لیلی کی سرگذشت تھی - یہ اسی لیلی کے مجنوں کا روز نامچہ ہے - دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں "عہد جدید کے ایک ہندوستانی نوجوان کی معنوی کیفیات کو بے نقاب کرنے کے چند پہلو پیدا کیے گئے ہیں" اور آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "اگر میرے ادعا کو خود بینی پر محمول نہ کیا جائے تو اتنا ضرور عرض کروں کہ "روز نامچہ" کا ایک حرف بھی محض زور قلم کے مظاہرے کے لیے نہیں لکھا گیا" —

یہاں ہمیں مصنف سے اختلاف ہے - ہماری دانست میں کتاب کے ہر ہر حرف سے زور قلم کا اظہار ہوتا ہے گو معنوی کیفیت کے بے نقاب کرنے میں مصنف کو پوری کامیابی نہ ہوئی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ یہ ایک ایسے نوجوان کی زندگی کے ایک رخ کا پورا نقشہ ہے جس کا حلیہ قابل مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے —

"دور جدید کے وہ نوجوان جو تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں اور جو زندگی کی کش مکش سے فارغ رہ کر اپنے جذبات اور محسوسات کی زنجیریں کھول دیتے ہیں، ہمہ تن جہل مرکب

بن جاتے ہیں اور زندگی کے مسلمات سے بے نیاز اور بے خبر
ہوکر اپنے لیے جہل مطلق کی ایک نئی دنیا بنا لیتے ہیں ...
نوجوانوں کے سامنے زندگی کے نئے نئے حقائق مغرب کی تعلیم
پیش کرتی ہے - وہ ان حقائق کو قبول کرنے میں کہیں ان کے
اور اپنے قدیم عقائد کے درمیان توازن قایم نہیں کر سکتے اور
آخر بھٹک جاتے ہیں" —

اگرچہ آپ اس میں اشخاص کے کردار اعلیٰ معیار کے نہیں پائیں گے لیکن جس زندگی کا نقشہ مصنف نے اپنے خاص طرز میں کھینچا ہے وہ بھولنے والا نہیں - اس میں شک نہیں کہ اس میں وہ زور قلم وہ خیالات کا ہجوم اور جدت اور تڑپ نہیں جو لیلیٰ کے خطوط میں ہے اور ہونا بھی نہیں چاہئے کیونکہ وہ مظلومیت کی داستان ہے اور یہ عیاشی کی تاہم آپ مصنف کے بیان کی روانی اور فصاحت ادائے خیال کے ڈھنگ کا ضرور لطف حاصل کریں گے - اگر زیادہ لطف مقصود ہے تو ان دونوں کتابوں کو ایک ساتھ پڑھئے — (+ +)



رباعیات جذب

از راگھوندر راؤ جذب - عالم پوری - مطبوعۂ نظامی پریس
لکھنؤ - کتاب با تصویر شایع ہوئی ہے - کتابت و طباعت
اچھی اور دیدہ زیب

راگھوندر راو صاحب جذب کی رباعیات کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے بہت قابل تحسین ہے کہ موصوف نے ان میں جا بجا تلنگی' ہندی' سنسکرت

شاعری کے جواہر پاروں کے ترجمے کیے ہیں - اور خود ان کے خیالات میں انتہائی پاکیزگی اور متانت ہے —

موصوف نے خود ابتدا میں لکھا ہے کہ ان کی مادری زبان کلنڑی ہے لیکن ان کو اردو شاعری سے بہت لگاؤ ہے - اس کتاب کے دیکھنے سے پھر یہ امید بندھتی جاتی ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی متحدہ قومیت کی زبان ہوگی - اور بلا امتیاز فرقہ و ملت ہندوستان کے باشندے خواہ وہ ملک کے کسی حصے کے رہنے والے ہوں اس کو اپنی ادبی زبان بنائیں گے -

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو —

گو نیکوں کی صحبت میں رہا بھی بدکار لیکن نہ اثر ہوا رہا ناہنجار
گو ایک جگہ مل کے رہیں زاغ اور ہنس کوے کو کہاں ہنس کی آئی رفتار



ہشیار کہ ہر دم ہے کھڑی سر پہ اجل مطلوب ہے باتوں کے عوض حسن عمل
ہاں وقت عمل یہی ہے ورنہ اے جذب جائے گی کسی روز یہ جان تن سے نکل

(+ +)



راسپوتین

مترجمہ ملیح آبادی - مطبوعہ ہند پریس نمبر ۲۸ اے
چترنجن ایو نیو کلکتہ قیمت آٹھ آنے

روس کے مشہور اور عجیب و غریب راسپوتین کی شخصیت اب تاریخ سے گذر کر داستان کا رنگ اختیار کر چکی ہے - زیر نظر کتاب بھی ایک طرح کی داستان ہے جس میں اس راہب کی زندگی کے حالات کافی مبالغے

کے ساتھہ بیان کیے گئے ہیں - کتاب کا پلاٹ بڑی حد تک اس فلم سے ملتا جلتا ہے جو امریکہ میں تیار کیا گیا تھا - اور تاریخ سے زیادہ "افسانہ" کا رنگ کتاب پر چھایا نظر آتا ہے —

کچھہ تصویریں بھی ہیں جو فلم سے لی گئی ہیں (+ +)

لطیفیات جلد دوم

از ایم حسن لطیفی مطبوعۂ شاطر پریس لدھیانہ حجم تقریباً چار سو صفحات۔

یہ لطیفی صاحب کی ایک سو اُنیس نظموں کا ترجمہ ہے جو "ذاتی" "مناکاتیہ" "مناظریہ" "فلسفیانہ اور سائنٹیفک" "پوئیٹک' پالٹیکس" "سیاسی" "معاشرتی" "انجامیہ" عنوانات پر لکھی گئی ہیں - مصنف نے مغربی شاعری کی اس قدر مکمل پیروی کی کوشش کی ہے کہ روح تو روح جسم کی حد تک بھی وہ چاہتے ہیں کہ بالکل مغربی نظموں کا سا ہو جائے - مثلاً "بنگال کا باغی شاعر" ملاحظہ ہو (صفحہ ۳۷۰)

ایک سپاہی جاگ رہا ہے —
خندق میں سب اس کے ساتھی خستۂ خواب
تاریکی ہے' خاموشی ہے' سناٹا ہے اور میدان
دن بھر جس کے دامن میں تھا گرم لڑائی کا گھمسان
تیغوں تیروں کی جھنکاروں اور بوچھاڑوں کا طوفان
اب شورش کے تھم جانے سے گورستان
ویران مرگھٹ یا شمشان

اس نظم کو کہیں مقفیٰ نثر نہ سمجھیے گا - یہ لطیفی صاحب کی شاعری ہے جو شاعری کے تمام قیود سے آزاد ہے - خیر یہ " نظم " تو شاعر کی جدت کا انتہائی نمونہ تھی - عام نظموں میں بھی شاعر کا تخیل اس قدر آزاد ہو جاتا ہے - اور آزاد ہوکر شاعر کی علمی قابلیت سے اس طرح متصادم ہوتا ہے کہ جو ہیولیٰ اس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے اُس کو نظم نہیں کہہ سکتے - مثلاً پہلی ہی نظم میں جس میں اُردو سے خطاب ہے ، فرماتے ہیں :--

پر ادھورے ہیں تہاتر میں ترے نقش و نگار
کہ ہر آرائش نو اس کے جلو میں ہے "دبو"
نشر اصوات و صور تک ہے رسائی دشوار
اے سبک زینۂ لاسلکئی تار لب درو
تیری پرواز سے کہتی ہے طراز سہ جہت
تو ابھی نیم رس وخام ہے مجھہ کو مت چھو

مصنف کی جدت طرازی کا یہ عالم ہے کہ صحیح توازن باقی نہ رہ سکا - ہر نظم کا یہی حال ہے - بے ساختگی کم اور آورد زیادہ معلوم ہوتی ہے - مصنف نے عنوانات میں بھی تک بندی کی ہے لیکن اس میں بھی ان کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوی (+ +)



فن انشا پردازی

(مصنفۂ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور - بڑی تقطیع ، صفحات ۱۱۲ ، لکھائی چھپائی اچھی ، کاغذ عمدہ - قیمت درج نہیں - مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن) —

اس کتاب میں "اردو انشا پردازی و تصنیف و تالیف میں کامیابی حاصل کرنے کے ابتدائی اصول اور عملی طریقے" بیان کیے گئے ہیں - کتاب کی تقسیم اکیس ابواب پر کی ہے ' جن میں اس فن شریف سے متعلق تقریباً تمام ضروری باتیں درج کی گئی ہیں —

انشا پردازی بہت ہی نازک فن ہے - ہر پڑھا لکھا شخص انشا پرداز نہیں بن سکتا - اس کے لئے فطری مناسبت ' ذوق ' خاص مشق اور مناسب ماحول و حالات کی ضرورت ہے - جو ان چیزوں سے محروم ہے اس کا کامیاب ہونا یقینی ممکن نہیں - تاہم ہر تعلیم یافتہ شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو صحت و خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کرے - اگر تعلیم سے اتنی بات بھی پیدا نہ ہوسکی تو اس سے بڑھ کر کوئی امر قابل افسوس نہیں ہوسکتا —

تجربہ کاروں کا مقولہ ہے کہ لکھنا لکھنے ہی سے آتا ہے - مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے اس گلی کی خاک چھاننے میں عمریں صرف کردیں لیکن گوہر مقصود ہاتھہ نہ آیا اور ان کی عمر بھر کی کوششیں بادر ہوا ثابت ہوئیں - ڈاکٹر صاحب اس کو نہیں مانتے ہیں بلکہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے لئے انشا پردازی کے ایسے ایسے خزانے اور ذخیرے محفوظ اور مدفون ہیں جن کو نمودار کرنے اور جن سے مالا مال ہونے کی بہت گنجائش ہے - ضرورت ہے کہ ہمارے اکثر نوجوان (خواہ وہ کسی پیشے سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں) اس طرف متوجہ ہوں ' آج ہی سے اپنی فرصت کے اوقات میں لکھنا شروع کردیں ... " —

خدا کرے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تمنا بارآور ہو اور ہمارے ملک میں بکثرت انشا پرداز پیدا ہوں ' لیکن جو آسان لائحۂ عمل انہوں نے

متوقعہ انشا پردازوں کے لئے پیش کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اگر اس پر ہمارے ہر پیشے کے نوجوان اپنی کوششوں کو صرف کریں تو وہ کامیاب اور حقیقی انشا پرداز بنیں یا نہ بنیں لیکن انشا پردازی کی مشینیں ضرور بن جائیں گے۔ اور اگر کہیں ان کے اس سہل نسخے کو دیکھ کر ہر بوالہوس انشا پردازی کو اپنا شعار کرلے تو اس سے بڑھ کر ملک کی بدنصیبی نہیں ہو سکتی ' اس لئے کہ جہاں یہ گھن لگا اور ناکامی کی ذلت کا خیال دل سے محو ہوا ' وہ عمر بھر اسی میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور اپنی ناکام کوششوں کی قباحتوں پر کسی طرح نظر نہیں کرتا —

ڈاکٹر صاحب نے تمام ظاہری اور اوپری گُر تو بتادئے لیکن وہ پُرپیچ راہیں اور چھپے ہوئے دانو گھات بیان نہیں کئے جن سے صرف انشا پردازہی واقف ہوسکتا ہے۔ سیکھتڑوں کو یہ پوشیدہ اسرار کیا معلوم؟ محض مشق و مزاولت اور چند رسمی پابندیوں سے انشا پردازی نہیں آسکتی ' اس کے لئے صحیح و سلجیدہ دماغ ' فطری لگاو اور موافق ماحول و حالات کی ضرورت ہے۔ انشا پردازی کو ڈاکٹر صاحب "جسمی دماغی یا رقمی بار" سے بھی سبکدوش سمجھتے ہیں اور اس کو محبوب و بے ضرر مشغلہ اور تفریح خیال کرتے ہیں۔ ان کی یہ راے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انشا پردازی بھی باوجود اپنی دلکشیوں اور دلفریبیوں کے ایک قسم کی خشک عبادت ہے۔ اس میں ضبط و برداشت اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ توجہ کو ایک مرکز پر لگانا اور خیالات کو انتشار وپریشانی کا شکار نہ ہونے دینا ' نماز سے بڑھ کر حضورِ قلب ' یہ سب چیزیں اس کے لئے درکار ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان چیزوں کو نہیں مانتے ہیں تو پھر انشا پرداز اور مشین میں کوئی فرق نہیں —

ڈاکٹر صاحب نے انشا پردازی کے اصولی اور عملی طریقوں کے ساتھہ "اشاعت کے راز" بھی ایک باب میں بیان کئے ھیں اور اُن نوجوانوں کو بڑی پر لطف ہدایتیں کی ھیں جو "کار زار ادب میں پہلے پہل قدم رکھنا چاھتے ھیں اور خواھش مند ھوں کہ ان کے مضامین یا افسانے اشاعت کے لئے روانہ کرنے کے بعد بہت جلد رسائل میں شایع ھو جائیں تو انہیں چاھیے کہ حسب ذیل امور کا ضرور خیال رکھیں ورنہ اپنے مسودوں کو مطبوعہ دیکھنے کے انتظار، مدیروں کی سرد مہری، یا مسودہ واپس حاصل کرنے کی ندامت وغیرہ کی زحمتیں اندیشہ ھے کہ انہیں پست ہمت نہ بنا دیں" --

اس کے بعد جو ہدایتیں فرمای ھیں ان پر عمل کرنے سے فایدہ ھو یا نہ ھو لیکن ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں - اس مختصر تبصرے میں گنجائش نہیں کہ ان کو بیان کیا جاے اوپر کے اقتباس سے ناظرین کو ان کا اندازہ ھو جاے گا --

ایک باب "مسودہ کی تشکیل اور مراسلت" پر ھے - اس میں بڑے مزے کی باتیں لکھی ھیں - ایک مقام ناظرین کی تفریح طبع کے لئے نقل کیا جاتا ھے "مسودہ بھیجنے کے بعد اس کی اشاعت کے لئے بار بار یاد دھانی کی ضرورت نہیں - جتنا زیادہ آپ اپنے مضمون کے لئے بے چینی ظاھر کریں گے اتنا ھی مدیر کی نظروں میں آپ کے مضمون اور خود آپ کی وقعت گھٹتی جاے گی - اگر آپ کو اپنے مضمون کی قسمت کا تصفیہ معلوم کرنے کا اشتیاق ھو اور آپ زیادہ دنوں تک امید و بیم کی حالت میں رھنا پسند نہ کرتے ھوں تو اپنے مسودہ کے ساتھہ اپنا پتہ لکھہ کر ایک پوسٹ کارڈ بھی ملفوف کر دیجیے تاکہ مدیر آپ کو آسانی سے اور جلد مطلع

کر سکے کہ آپ کا مضمون شایع ہو سکے گا یا نہیں اور اگر ہوگا تو کب " —

ڈاکٹر صاحب نے ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ باب "اپنے کام پر تنقید" لکھا ہے، جس میں بڑی کارآمد ہدایت فرمای ہے " آپ اپنی تحریر کا بار بار مطالعہ کیجئے اور ان تمام غلطیوں اور کمزوریوں کو دریافت کرنے کی کوشش کیجئے جو اثناے تحریر میں ممکن ہے غیرارادی طور پر، آپ کے قلم سے سرزد ہوی ہوں اور جنھیں آپ اس وقت معلوم نہ کر سکے ہوں " —

کیا اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر صاحب اس کتاب کے مسودے پر بار بار نہ سہی ایک ہی بار تنقیدی نظر ڈال لیتے - ایسی صورت میں ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی پوری کتاب کو یہ سمجھتے کہ " غیرارادی طور پر قلم سے سرزد ہوگئی ہے " —

اس کتاب میں ہمیں ایک باب کی کمی محسوس ہوتی ہے، کاش ڈاکٹر صاحب اس باب کا اضافہ کرتے جس میں اپنی انشاپردازی کی سرگذشت لکھتے اور یہ بتاتے کہ انھوں نے کس طرح اور کس حد تک کامیابی اور شہرت حاصل کی - یہ بہت ہی مفید اور سبق آموز باب ہوتا اور ان کی موجودہ کتاب پر بھاری —

(چ)

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ' بڑی تقطیع ' صفحات
مع اشاریہ وفہرست ۲۰۶ ' کتابت طباعت اچھی ' کاغذ عمدہ '
قیمت درج نہیں - مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

گذشتہ ربع صدی میں اردو زبان کو جو غیر معمولی اور حیرت انگیز فروغ حیدرآباد میں نصیب ہوا اور جامعہ عثمانیہ کے قیام نے جو دماغی بیداری اور تعلیمی انقلاب پیدا کردیا ہے ' وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے صحیح اسباب کا کھوج لگایا جاے اور دیانت و صحت کے ساتھ ان کو قلم بند کیا جاے اور اس کے جو گونا گوں اثرات اورفواید مترتب ہوے ہیں ان کا صحیح اندازہ کیا جاے - خوشی کی بات ہے کہ خود اہل حیدرآباد کو اس کا احساس ہوا - چنانچہ کتاب زیر تبصرہ اسی مبارک احساس کا نتیجہ ہے - اس کے لایق مولف جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل یعنی جدید تعلیمی انقلاب کی پیداوار ہیں جو اپنی کثیر تصانیف کی وجہ سے کافی روشناس ہیں —

انہوں نے اپنی کتاب کی ترتیب یہ رکھی ہے :- پہلے چار صفحوں کا دیباچہ ہے ' جس میں کتاب کی وجۂ تالیف اور اس کی ترتیب و تبویب کو بیان کیا ہے - اس کے بعد دس صفحوں کی تمہید ہے جس میں اعلی حضرت خسرو دکن کی ان ذاتی دلچسپیوں اور فیاضیوں کا تذکرہ ہے جو اردو زبان کے حق میں اب تک ظاہر ہوی ہیں - اس کے بعد اصل کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے - پہلے حصے میں اعلی حضرت سلطان العلوم کی اردو نوازیوں کا بیان ہے ' اس کے پانچ ذیلی ابواب ہیں جن میں علی الترتیب حسب ذیل مضامین

ہیں - اردو شاعروں اور انشا پردازوں کی قدر دانی - ان انجمنوں اور اداروں کی قدر افزائی جو ترقیٔ اردو کا باعث ہیں - اردو رسائل و اخبارات کی امداد - جامعۂ عثمانیہ کی تشکیل - سر رشتۂ تالیف و ترجمہ کا قیام - دوسرے حصے میں حضرت سلطان العلوم کی سرپرستی کے اثرات دکھائے گئے ہیں ' جس کے حسب ذیل چار باب ہیں - انفرادی کوششیں - اجتماعی خدمات - حیدرآباد میں اردو کی وسعت - حیدرآباد کے باہر اردو کا استحکام و وقعت اور اس کا ہمہ گیر اثر - اس کے بعد تین ضمیمے ہیں جن میں شاعروں ' انشاپردازوں ' انجمنوں ' اداروں اور رسایل و اخبارات کی فہرستیں ہیں - آخر میں ۱۸ صفحوں کا اشاریہ ہے جو ہر طرح مکمل اور سہولت بخش ہے —

کتاب کی ترتیب و تبویب اصولی اور باقاعدہ ہے لیکن مولف نے ہر چیز کا نہایت ہی اجمالی ذکر کیا ہے - کتاب میں بہت سی ضمنی و ذیلی باتیں ایسی ہیں جو اختلاف آرا کا باعث ہیں لیکن مولف نے اپنے دیباچہ میں معذرت کی ہے کہ وہ اپنے موجودہ ذوق اور مطالعہ کی وجہ سے مجبور ہیں - تاہم ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے بعض ایسے شاعروں ' ادیبوں ' انجمنوں اور کتابوں کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے جن کی حیثیت یقینی طور پر مشتبہ بلکہ ناقابل التفات ہے - اور بعض چیزوں کو باوجود علم و اطلاع کے نہایت سرسری اور اجمالی بلکہ تشنہ طور پر بیان کیا ہے ؛ جس کے لئے ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب کوئی معذرت پیش نہیں کرسکتے ہیں ' جو شخص حیدرآباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذرا بھی علم رکھتا ہے اس کو ضرور یہ شکایت ہو گی -

جامعہ عثمانیہ کی تخئیل و تشکیل اور اس کے قیام پر ڈاکٹر صاحب

نے بہت تفصیل سے لکھا ہے - حقیقت یہ ہے کہ حضرت سلطان العلوم کے عہد مبارک کا سب سے زیادہ درخشاں اور اہم کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جس نے اردو زبان کی جڑیں مضبوط کردیں اور اہل ملک میں ذہنی و دماغی بیداری پیدا کردی - یہ سب تاجدار دکن کی شاہانہ فیاضیوں، ذاتی دلچسپیوں، دور اندیشیوں اور اہل ملک کی شدید ضرورتوں کے گہرے احساس کا خوشگوار نتیجہ ہے - لیکن عجیب بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد ہی اس کی تخئیل و تشکیل کی ملکیت کے بارے میں نزاع پیدا ہوگئی ہے - ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرز بحث سے یہ مسئلہ بہت اہم بنا دیا ہے کہ یہ خیال ابتداءً کب اور کس کو پیدا ہوا - اس پر ابھی باضابطہ رد و قدح تو شروع نہیں ہوی ہے لیکن اس کے کھلے آثار نظر آرہے ہیں، چنانچہ ہمارے لایق مولف نے اپنی کتاب میں اس بحث کو چھیڑ دیا ہے - ان کا خیال ہے کہ "اس قسم کی پہلی تحریک آج سے قریب ساٹھ سال اور قیام جامعہ عثمانیہ کے پینتالیس سال قبل کی گئی تھی - اس کے محرک مولوی شیخ احمد حسین خان بہادر نواب رفعت یار جنگ مرحوم ہیں" —

ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ مرحوم نواب صاحب کی یہ تحریک "تین مطبوعہ فلسکیپ صفحوں پر مندرج ہے" - اگر یہ تحریر اس کتاب میں بجنسہ نقل کردی جاتی تو مناسب تھا لیکن انہوں نے جستہ جستہ اقتباسات دیے ہیں اور ان کی بنیاد پر یہ رائے صادر فرمای ہے کہ "یہ سب امور قریب قریب وہی ہیں جو جامعہ عثمانیہ کی تشکیل اور تعلیمی نظام العمل میں مضمر ہیں" - ہم نے متذکرۂ بالا تحریک کے اقتباسات بہت غور سے پڑھے، اس میں یہ کہیں درج نہیں کہ مادری زبان (اردو) میں

علوم و فنون کی تعلیم دی جائے جو جامعہ عثمانیہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔

مرحوم کو یہ رونا تھا کہ فارسی زبان کی چند مخصوص کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور دیگر ضروری علوم و فنون کی درس و تدریس کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے - یہ شکایت مدت دراز سے چلی آرہی ہے ' ہمارے اکثر قدیم مکتبوں میں گلستان ' بوستان ' رقعات ابوالفضل ' سہ نثر ظہوری ' بہار دانش وغیرہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں - جس نے یہ کتابیں پڑھ لیں اس کو سند فضیلت مل گئی - ظاہر ہے کہ ان کے پڑھا دینے سے تعلیم کا حقیقی مقصد کس حد تک پورا ہوتا تھا - تعلیمی ضروریات بہت وسیع ہیں - مرحوم نواب صاحب کی تحریک کا مقصد ادب کے ساتھ دوسرے ضروری علوم و فنون کی تعلیم کا لزوم ہے - مختلف علوم کے ساتھ انہوں نے اردو زبان کی تعلیم کو ضروری بتایا ہے' لیکن ان کی تحریر سے کہیں یہ ثابت یا ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ اس زبان کو اعلی تعلیم کا ذریعہ قرار دیا جائے بلکہ ان کے الفاظ کا صاف و صریح مدعا یہ ہے کہ اردو کو بحیثیت زبان (نہ کہ بحیثیت ذریعۂ تعلیم) سکھایا جائے - اس کو کھینچ تان کے یہ معنی پہنانا کہ ان کے ذہن میں موجودہ جامعہ عثمانیہ کا نقشہ تھا اور اس قسم کی یونیورسٹی کے سب سے پہلے محرک وہ ہیں ایک زبردستی ہے - قدیم فارسی نصاب سے بیزاری ایک عرصہ سے چلی آرہی تھی اور اس کی خرابیوں کے ازالے کی زبردست کوششیں بھی ہوئیں - ایسی صورت میں مرحوم کے اقتباسات سے اپنے مفید مطلب معنی نکالنا ہمارے خیال میں کچھ عجب قسم کا حسن عقیدت ہے - "مادری زبان میں تعلیم" اہل زبان کا فطری حق ہے - یہ انسان کی شدید ترین قدرتی ضرورت ہے - اس کو کسی خاص شخص کی ذہنی یا خیالی ایجاد

سمجھنا ایک اصولی غلطی ھے - موجودہ جامعہ عثمانیہ کا خیال ھماری شدید ترین ضرورتوں، دیگر جامعات کے تجربوں اور جدید مغربی تعلیم و تہذیب کے اثر سے پیدا ہوا - ہندوستان میں اس قسم کی پہلی عملی تحریک کا نتیجہ دہلی کالج تھا - خود حیدرآباد میں ایک صدی قبل نواب شمس الامرا عملاً اس خیال کے سب سے بڑے محرک تھے - انہوں نے آج سے ٹھیک ایک سو سال قبل کیمیا، ریاضی، مساحت، جرثقیل، مقناطیس، برق، ھیئت، معدنیات، طب، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کی جدید ترین مغربی مطبوعات کو اردو میں منتقل کرایا، اپنا ذاتی مطبع قائم کیا اور ان کو چھپوایا - ان کی مفت اشاعت کی - اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان علوم کو اھل ملک میں عام کرنے کی خاطر مدارس قائم کئے - ان کے ایک مدرسہ میں ان علوم کی تعلیم پانے والے چارسو سے اوپر طلبہ تھے جن کو کچھ وظیفہ بھی دیا جاتا تھا - یہ ایک طرح کی یونیورسٹی تھی اور اپنے وقت کے لحاظ سے موجودہ جامعہ عثمانیہ سے عملاً بہت کم اختلاف رکھتی ھے - حیدرآباد میں اس قسم کی تحریک کے سب سے پہلے عملی محرک نواب شمس الامرا ھیں، اس کا اعتراف نہ کرنا انصاف سے بعید ھے - ھماری اکثر تحریکیں شخصی ہوتی ھیں - اس لئے نواب صاحب مرحوم کے بعد اس کا باقاعدہ سلسلہ جاری نہیں رہا ورنہ اگر یہ تحریک جاری رہتی تو جامعہ عثمانیہ کے لئے تیار زمین ملتی اور ھمیں بہت جلد متوقعہ فواید حاصل ہوتے - لیکن معلوم ہوتا ھے کہ اھل ملک کو اتنا احساس نہ تھا اور جدید ضرورتوں نے اتنا مجبور نہیں کیا تھا —

مولف نے اس تحریک کی تاریخ بہت تفصیل سے لکھی ھے اور ان تمام لوگوں کا نام بنام ذکر کیا ہے جنھوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار

کیا تھا ۔ انھوں نے جو اقتباسات دیے ھیں ان سے کہیں اس نئی تعلیمی تنظیم اور جامعہ کی مکمل تشکیل پر روشنی نہیں پڑتی ھے - بعض تحریریں تو بالکل طوطے کی رٹنت معلوم ھوتی ھیں - ان کے لکھنے والوں کے دماغ میں اصل خیال تو سوں دور تھا ' وہ ان تحریکوں کا شور سنتے تھے اور اپنے محدود حلقۂ اشاعت میں ان خیالات کو دھراتے تھے- ظاھر ھے کہ ایسی کوششیں کیا وقعت رکھتی تھیں اور کس حد تک بار آور ھوسکتی نہیں - تمام جامعہ عثمانیہ سچ یہ ھے کہ عہد عثمانی کا زرین اور درخشاں کارنامہ ھے - اب اس کے تخیل کا کھوج لگانا اور بعض غیر متعلق لوگوں کی طرف اس کو منسوب کرنا ھمارے خیال میں زبردستی ھے - اس مسئلہ پر تفصیلی اور اطمینان بخش بحث کرنے کی اجازت وقت اور مصلحت نہیں دیتے ھیں ' یہ جو چند سطریں حوالۂ قلم کی گئی ھیں وہ بھی محض اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس بحث کو خاص اھمیت دے کر چھیڑ دیا ھے - بات یہ ھے کہ یہ زمانہ حب وطن کے انتہائی ھیجان اور کھولن کا ھے ' اس میں ضبط و اعتدال اور توازن کا برقرار رکھنا دشوار ھے - اور اس کے خلاف کچھہ کہنا بھی دانشمندی و مصلحت سے دور ھے —

بحیثیت مجموعی کتاب بہت مفید ھے - اس سے حیدرآباد میں اردو زبان کے فروغ اور علمی و ادبی سر گرمیوں کا بڑی حد تک اندازہ ھوتا ھے ' ڈاکٹر صاحب نے بہت اختصار سے کام لیا ھے جس کی وجہ سے بعض ابواب تو بالکل فہرست معلوم ھوتے ھیں ' تاھم اس کے مفید ھونے میں کلام نہیں - آئندہ چل کر یہ کتاب معاصرین کے بہترین تذکرہ کی حیثیت پیدا کرلے گی —

(چ)

مذہب و اخلاق

وحیء محمدی

(تصنیف علامہ سید محمد رشید رضا ' اڈیٹر المنار ' مصر - مترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اڈیٹر جدید ہند - ناشر قاضی سید محمد عبدالغفور نقوی القبائی - قیمت دو روپیہ ' حجم ۴۰۰ صفحات - دارالشاعت کلکتہ ۱۱ بو بازار اسٹریٹ سے مل سکتی ہے)

کتاب کے مصنف اس زمانے کے بہت بڑے مسلمان عالم اور مجتہد ہیں - مترجم ان کے شاگرد رشید مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں - بس اس کتاب کی قدر و قیمت کے لیے اس قدر لکھہ دینا کافی ہے —

اس کتاب میں اصل بحث قرآن سے ہے اور اسی کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے - اور اُسے معجزہ ثابت کیا ہے - فاضل مصنف نے قرآن کے دس مقصد قرار دیے ہیں - پہلا ' ایمان باللہ دوسرا نبوت ' تیسرا اسلام دین عقل ہے - چوتھا ' وحدت (جس میں آٹھہ وحدتیں ہیں) - پانچواں ' اسلام آسان دین ہے - چھٹا ' حکومت شوریٰ - ساتواں ' مال آزمائش ہے - آٹھواں ' جنگ اور اسلام - نواں ' اسلام میں عورت کے حقوق - دسواں ' اسلام اور غلامی - خاتمۂ کتاب میں آنحضرت کی نبوت اور قرآن کی حقانیت کے متعلق چند اُمور سے بحث کی ہے - آخر میں اسلام کی دعوت عام ہے اور خاص کر یورپ امریکہ اور جاپان کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے —

جو لوگ اسلام کی حقیقت اور حقانیت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں اُن کے لیے یہ نہایت عمدہ کتاب ہے ' اس میں ہر مسئلہ کو نہایت سادگی اور صفائی اور دلائل سے ثابت کیا گیا ہے - ترجمہ بھی بہت صاف ستھرا اور سلیس ہے ــ

تعلیم

مصلحان تعلیم

'ز ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی - ملنے کا پتہ : دکن بک ایلڈ استیشنری مارٹ - عابد بلڈنگ - حیدرآباد دکن

اُردو میں فن تعلیم پر کتابوں کی بڑی سخت ضرورت ہے- یہ کتاب فن تعلیم پر کوئی محض اصولی کتاب نہیں بلکہ اس میں تاریخی لحاظ سے مغرب کے اہم مصلحان تعلیم کی خدمات ' اور اُن کے تعلیمی نظریوں کا مکمل مطالعہ کیا گیا ہے- مصنف کی محنت ' اور اُن کا ذوق ' مستحق تحسین ہے کہ ایسے اہم موضوع پر اُردو میں ایک قابل قدر کتاب لکھی گئی ہے ــ

کامی نیئس' لاک ' روسو ' بیس ڈو' پسٹالوزی ' ہربارٹ اسپنسر وغیرہ پر مختلف علوانات قائم کئے ہیں- ترتیب یہ ہے کہ پہلے ہر ایک کے حالات زندگی مختصر طور پر بیان کئے ہیں- اجمالاً اُن کی تصانیف کا ذکر کیا ہے پھر تعلیم کے متعلق اُن کے نظریوں کی تشریح اور تجزیہ کیا ہے - اس سے نہ صرف یورپ کے اِن مشہور مصلحوں کی خدمات اور اُن کی شخصیتوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ ایک حد تک تاریخ تعلیم

سے بھی آگاهی هو جاتی هے —

اُردو میں اس قسم کی کتابوں کی بہت ضرورت هے - قابل مصنف کی یہ کوشش هر طرح قابل مبارکباد هے (++) —



حیدر آباد کی تعلیمی ترقی

مولفۂ عبدالقادر سروری صاحب' صفحات مع فہرست و اشاریہ وغیرہ ۱۲۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کے- قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ : سید عبدالقادر تاجر کتب' چار مینار ' حیدر آباد —

حیدرآباد میں گزشتہ ربع صدی میں جو تعلیمی ترقی هوئی ' اس کو لایق مولف نے اس میں مختصراً درج کیا هے- کتاب کے آٹھ باب هیں- ابتدائی پانچ ابواب دراصل تمہیدی هیں جن میں قدیم زمانے کے تعلیمی حالات اور درس و تدریس کی کیفیات کو نہایت سرسری طور پر بیان کیا هے اور اس کے بعد ان تحریکات اور حالات کو دکھانے کی کوشش کی هے جن کے اثر سے موجودہ تعلیمی انقلاب رو نما هوا- اس کے بعد تین باب هیں- جامعہ عثمانیہ ' اُردو ذریعۂ تعلیم ' اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے اثرات- آخر میں اشاریہ هے —

کتاب کا موضوع بہت دلچسپ هے لیکن معلوم هوتا هے کہ لائق مولف نے بہت هی روا روی میں اس کو تحریر فرمایا هے- ان کے پیش نظر دو ایک انجمنوں اور محکمۂ تعلیم کی چلد رپورٹیں تھیں' جن کی مدد سے جدید تعلیمی ترقی کی تاریخ قلم بند فرما دی هے- جس مربوط ' مسلسل اور اطمینان بخش مواد کی همیں ضرورت هے وہ اس میں نہیں- یہ

ابتدائی کوشش ہے اگر کوئی شخص یا خود لائق مولف ذرا محنت اور تلاش سے اس موضوع پر قلم اٹھائیں تو بڑی مفید اور دلچسپ کتاب لکھی جا سکتی ہے —

(چ)



متفرقات

عصر جدید

مولفہ جانکی پرشاد صاحب، صفحات مع اشاریہ ۱۰۵ - قیمت درج نہیں - عبدالقادر تاجر کتب، چارمینار، حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے —

اس چھوٹی سی کتاب میں مولف نے ان ترقیوں کا اجمالی بیان لکھا ہے جو اعلیٰ حضرت و اقدس خسرو دکن کے عہد مبارک میں حیدرآباد میں ہوئی ہیں - مولف نے حکومت کے تمام شعبوں سے بحث کی ہے اور ان تمام کاموں کا ذکر کیا ہے جو حکومت نے ملک و اہل ملک کی ترقی و بہبودی کی خاطر انجام دیے ہیں - کتاب مختصر ہے لیکن اس میں تمام ضروری چیزوں کا ذکر ہے - جو لوگ حیدرآباد کے جدید دور سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مفید ہے —

(چ)



اُردو کے جدید رسالے

شاہکار

(اڈیٹر پروفیسر تاجور صاحب - جائنٹ اڈیٹر ن - م - راشد،
ایم - اے - لاہور - سالانہ چندہ چھہ روپے)

مولانا تاجور کسی تعارف کے محتاج نہیں - اخباری اور ادبی دنیا میں کون ہے جو انہیں نہیں جانتا - اردو زبان کی جو خدمت انہوں نے کی ہے اور کر رہے ہیں وہ ہر طرح سزاوار تحسین ہیں - اگرچہ "ادبی دنیا" سے وہ بالکل قطع تعلق کر چکے تھے لیکن ان سے نچلا نہ بیٹھا گیا اور اب انہوں نے "ادبی دنیا" کا قائم مقام بلکہ اس سے کہیں بڑھا چڑھا نیا رسالہ جاری کیا ہے جس کا نام "شاہکار" ہے - یہ گویا "اردو مرکز لاہور کا علمی، تعلیمی، فنی و ادبی ماہنامہ" ہے - "اردو مرکز" کے مرکز بھی مولانا تاجور ہی ہیں —

شاہکار کو پڑھ کر حقیقی مسرت ہوئی - اس نے جو مقصد پیش نظر رکھا ہے اس کی حرف بحرف تعمیل کی ہے - ہم اس مقصد کو خود شاہکار کے ہی الفاظ میں بیان کرتے ہیں —

"ازبسکہ شاہکار کے ادارے کا یہ مقصد ہے کہ یہ مجلہ ملک اور قوم کی ذہنی اور عقلی حیثیت میں رفعت اور ترقی پیدا کرنے کا موجب ہو، ہمارا نصب العین اور طریقۂ کار حاضرالوقت مجلات سے بہت مختلف ہوگا - شاہکار

کی زبان اور اسلوب بیان کے متعلق ہم نے عہد کیا ہے کہ موضوع اور محل کی ضرورتیں جہاں تک اجازت دیں ' ہم اسے مشکل نگاری کے عیوب سے پاک رکھیں "- اس کے بعد " مزید برآں اس بات کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ " شاہکار " میں نہ تو اس قدر خشک مضامین کی اشاعت کی جائے گی جن کا مطالعہ عام قارئین کے لیے صبر آزما بن جائے نہ اسے رنگین نگارشات کا ایسا نگار خانہ بنایا جائے گا جسے دیکھنے سے ثقہ نگاہوں میں تلخی پیدا ہونے کا احتمال ہو "

" ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم " شاہکار " کے ذریعے ایسا ادب اور ایسا فن پیدا کریں جو ہمارے نوجوانوں کی جمالی تشنگی کی تسکین کا باعث ہو ' لیکن اپنی اس خواہش کو فروغ دیتے ہوئے ہم اپنے ملک کی تعلیمی اور معاشرتی ضروریات کو نہیں بھلا سکتے اور نہ ادبیات کے اصلی مقصد ' ضرورت اور اثر کو فراموش کر سکتے ہیں " —

اس کے علاوہ ہم چاہتے ہیں کہ " شاہکار کے ذریعے تنقید کا معیار بلند کریں " —

قابل اڈیٹروں نے اس پرچے میں جو پہلا نمبر ہے اپنے مقاصد کو بڑی خوبی اور سلیقے سے انجام دیا ہے —

انھوں نے بعض مستقل عنوانات بھی قائم کردیے ہیں - مثلاً " بزم تحقیق " جس میں اردو ادب کے بحث طلب مسائل پر اہل الرائے اظہار خیالات فرمایا کریں گے - اس کے تحت میں اس نمبر میں جدید الفاظ کے اضافہ اور الفاظ کے تذکر و تانیث پر بہت خوب بحثیں ہیں - ایک عنوان " مشاہیر عالم " کا ہے - جس میں فرانسیسی محب وطن پوانکارے

کا تذکرہ ہے —

" تعلیمات " کے عنوان میں تعلیمی کانفرنس کے اجلاس دہلی کا حال ہے - ایک عنوان " اصلاحات " کا ہے جو مستقل طور پر رہے گا اس مہینے کے پرچے میں اس عنوان کے تحت " عامل اور جوتشی " کی فریب کاریوں کا ذکر ہے - سینما ' شخصیات اور تدبیرات کے عنوان بھی دلچسپی سے خالی نہیں —

" مذہب اور باطنیت " پر مرزا محمد سعید صاحب کا قابل قدر مضمون ہے جو ابھی نا تمام ہے - حسن نظامی صاحب نے غمزہ بیگم (بہادر شاہ کی پوتی) کی داستان بہت دلچسپ لکھی ہے - اس کے علاوہ افسانے اور نظمیں بھی ہیں اور چند تصویریں بھی جن کے انتخاب میں صحیح ذوق سے کام لیا گیا ہے —

ہم مولانا تاجور اور ان کے شریک کار راشد صاحب کو اس ماہنامہ کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہیں —

اگر " شاہکار " اس طریق کار پر جو اس نے اپنے لیے قرار دیا ہے پابندی کے ساتھ عامل رہا تو اس کا شمار اردو کے بہترین رسالوں میں ہوگا اور وہ اردو زبان کی سچی خدمت انجام دے گا —

عروس خیال

(اڈیٹر مظہر انصاری - دہلی - سالانہ چندہ تین روپے)

دلی سے یہ ایک نیا ماہانہ رسالہ شایع ہوا ہے - دلچسپ اور اچھا پرچہ ہے - بعض مضامین تاریخی اور اکثر ادبی یعنی فسانے، ڈرامے اور

نظم پر مشتمل ہیں - زبان کی صحت اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے - لکھنے والوں میں بعض مشہور اہل قلم ہیں —

ادراک

(اڈیٹر سید منصور حسین نجم امروہوی - امروہہ)

معلومات اور تفریح دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے - آخر میں کتابوں پر مختصر تبصرے بھی ہیں - امروہے سے ایسے رسالے کا نکلنا بہت غنیمت ہے - شروع کے صفحات میں ایک صفحہ پر حسن نظامی صاحب کا مضمون " روح کا افطار " ہے جس میں ظاہری اور معنوی کوئی خوبی نہیں - بعض دوسرے علمی مضامین اچھے خاصے ہیں --

---

ارمغان

(اڈیٹر منشی سید لیاقت حسین تمنا میرٹھی - کراچی-
چندہ سالانہ دو روپیہ)

کراچی سے اور بھی دو ایک پرچے شایع ہوے ہیں - اردو زبان کا شوق سندھ کے بڑے شہروں میں اچھا خاصا پایا جاتا ہے - رسالہ اوسط درجے کا ہے - اس کے سرپرستوں میں اچھے اچھے لوگ ہیں اس لیے ہمیں امید ہے کہ آیندہ یہ رسالہ ترقی کرے گا - شروع کے صفحات میں انجمن ترقی اردو کراچی کا ذکر ہے - یہ پڑھ کر خوشی ہوی کہ انجمن جو کچھ دنوں پہلے نیم مردہ سی ہوگئی تھی اب اس میں بعض پرجوش

اور فاضل ارکان کی بدولت بیداری پیدا ہوگئی ہے اور ترقی کے آثار نظر آرہے ہیں —

تبصرہ

(مالک و مدیر محمد یعسوب حسن صاحب - دارالادب پنجاب لاہور - چندہ سالانہ ایک روپیہ).

خیال بہت اچھا ہے - ایسے رسالے کی شدید ضرورت ہے بشر طیکہ لکھنے والے ایسے مل جائیں جو انصاف کے ساتھہ نقادی کا حق ادا کریں - قابل اڈیٹر نے رسالے کا مقصد اس ایک سطر میں بڑی خوبی سے بیان کردیا ہے - " تبصرہ سطحی ذوق ادب اور مذاق علم کے خلاف مجاہدہ کرے گا " - اس سے بہتر ایک ادبی رسالے کے لیے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے - عمل اور کوشش شرط ہے - فی الحال اصل منزل تک پہنچنے کے لیے کچھہ مدت درکار ہے —

سالنامے

سفیر سخن

یہ پشاور (صوبۂ سرحد) کا مقبول رسالہ ہے - اس نے بھی اس سال سالنامہ شایع کیا ہے - جس کا حجم ۳۰۰ صفحے ہے - ایک دستر خوان ہے جس پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے ہیں - تفنن طبع اور آسان معلومات کا بہت اچھا ذخیرہ ہے - فسانے اور نظمیں متعدد ہیں - فوٹو اور رنگین

تصاویر بھی ہر جلد صفحوں کے بعد نظر آتی ہیں- بعض رنگین تصویریں اور اکثر فوٹو بہت اچھے ہیں --

---

مجموعۂ تحقیقات علمیہ

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

یہ رسالہ جامعہ عثمانیہ کا ہے جو سال میں ایک بار شایع ہوتا ہے ایک حصہ اس کا انگریزی میں ہوتا ہے اور دوسرا اردو میں - تمام مضامین دونوں زبانوں میں جامعۂ عثمانیہ کے پروفیسروں کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں- انگریزی کے حصے میں علاوہ ادب اور تاریخ کے فلسفہ، طبعیات، ریاضیات، کیمیا پر بھی اچھے اچھے مضامین ہیں - لیکن اردو حصہ سوائے ادب اور تاریخ کے دوسرے علوم سے محروم ہے - ہمیں توقع یہ تھی کہ جامعۂ عثمانیہ کے فاضل پروفیسر اپنی علمی تحقیقات سے اردو زبان کو نوازیں گے کیونکہ اس میدان کے مرد یہی لوگ ہیں- اگر اردو جامعۂ عثمانیہ سے خالص علمی رنگ میں جلوہ گر نہ ہوی تو کسی دوسرے ادارے سے اس کی توقع مشکل سے ہوسکتی ہے - شاید یہ خیال ہوگا کہ چونکہ یہ رسالہ دنیا کے بڑے بڑے علمی اداروں اور انجمنوں میں پہنچتا ہے اگر پروفیسروں کی علمی تحقیقات اردو میں ہوئیں تو انہیں کون پڑھے گا اور کون داد دے گا - یہ خیال بھی معقول ہے - اگر کوئی علمی تحقیق ایسی ہے جو قابل قدر ہے تو اس میں جامعہ کی بھی ناموری ہے - لیکن اردو کو بالکل محروم رکھنا کسی طرح جائز نہیں-

کم سے کم دو ایک مضمون جدید علمی تحقیق پر ضرور ہونے چاہئیں - اگر کوئی مضمون خاص طور پر ایسا ہے جس سے دنیا کے علم میں ذرا سا بھی اضافہ ہوتا ہے یا اس میں کوئی غیر معمولی جدت پائی جاتی ہے تو اس کا ترجمہ الگ انگریزی میں کیا جا سکتا ہے —

اردو کا حصہ معمولی ہے ' اس میں علمی تحقیق کی کوئی خاص شان نہیں پائی جاتی —



تاریخ ادب فارسی

(به زبان انگریزی)

(به عهد سلاطین مغل)

هر سه جلد طلائی (مکمل سیت) تخفیف شده قیمت دس روپے

مصنفہ

شمس العلما پروفیسر محمد عبدالغنی صاحب (کیلنٹب)

مجلد اول - "بابر" ۱۸۰ صفحات مع ۱۲ نادر عکسی تصاویر ۲ روپے آٹھ آنے

مجلد دوم - "همایون" ۲۱۱ صفحات مع ۱۲ نادر عکسی تصاویر ۲ روپے آٹھ آنے

مجلد سوم - "اکبراعظم" ۵۰۰ صفحات مع ۱۸ نادر عکسی تصاویر ۵ روپے

نوٹ :— ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی) ' ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاهور)
و دیگر مستشرقین نے اس تصنیف کو ادبی و تاریخی حیثیت سے مستند
مانا هے اور مصنف کو اس کی تکمیل پر دل کھول کر مبارک باد دی هے -
اپنے طرز کی یہ پہلی اور نہایت قابل قدر تصنیف هے —

ملنے کا پتہ :- انڈین پریس - الہ آباد

اردو

فہرست مضامین

پندرھویں جلد — **سنہ ۱۹۳۵ ع**

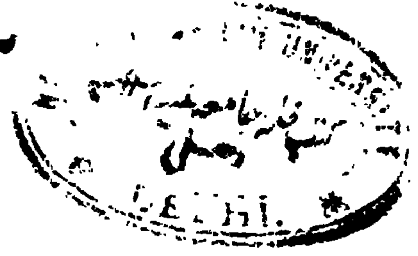
مقالے

نمبر سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مولانا حالی مرحوم	اڈیٹر	۱
۲	حالی اور غزل	سر شیخ عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل لندن	۱۸
۳	نثر حالی	جناب شیخ چاند صاحب ایم' اے - ایل ایل' بی -	۲۴
۴	سید مرتضیٰ بینش مدراسی	جناب محمد حسین محوی صاحب صدیقی لکھنوی (مدراس)	۳۶

۵	ضرب الامثال اور ان کے ماخذ (۱)	جناب شیخ محمد اسمعیل صاحب پانی پتی	۸۹
۶	اثر کی تاریخ وفات	جناب محمد اسد خاں صاحب بی' اے	۱۳۸
۷	جایزۂ زبان اردو	اڈیٹر	۱۴۰
۸	بادۂ کہن	اڈیٹر	۱۵۴
۹	اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار	جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی	۱۸۵
۱۰	ضرب الامثال اور ان کے ماخذ (۲)	جناب شیخ محمد اسمعیل صاحب پانی پتی	۳۱۹
۱۱	قاضی نذر الاسلام کی تین نظموں کے ترجمے :- (۱) صور اسرافیل- (۲) پیام شباب- (۳) یاد ایام -	مترجمہ جناب اختر حسین صاحب رائے پوری ساھتیا النکار بی' اے -	۳۷۹
۱۲	ٹیگور کے ادبی مضامین (حیات شاعری) -	مترجمہ پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار	۳۹۹
۱۳	ادب اور زندگی	اختر حسین صاحب رائے پوری	۴۴۹
۱۴	ٹیگور کے ادبی مضامین	پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار	۵۱۹
۱۵	سخنوران ایران در عصر حاضر	جناب آغا محمد تقی ' پارسا ' شیرازی	۵۲۸
۱۶	سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ	اڈیٹر	۵۴۳
۱۷	شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا و ترقی	جناب شیخ چاند صاحب ایم' اے - ایل ایل' بی —	۵۵۹
۱۸	گجرات کا باکمال شاعر اردشیر خبردار	اختر حسین صاحب رائے پوری	۵۹۹

۱۹ بادۂ کہن (غزلیات اشرف)	(چ)	۵۸۴
۲۰ سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ اردو لغات کا نمونہ	اڈیٹر	۶۲۵
۲۱ سوویت روس کا ادب	جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی' اے آنرز (علیگ) ساہتیا النکار	۶۳۹
۲۲ ٹیگور کے ادبی مضامین	جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار	۶۸۱
۲۳ آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار	جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب راشد - ایچ سی یس - مددگار معتمد فینانس حیدرآباد دکن	۷۰۳
۲۴ فرنچ اکاڈمی	جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لیٹ (پیرس)	۷۱۶

تبصرے



ادب

نام کتاب	صفحہ	نام کتاب	صفحہ
دیوان مومن مع شرح	۱۵۹	دیوان غالب	۴۱۴
اُردو کا پہلا ناول نگار	۱۶۱	نذیر احمد کی کہانی	۴۱۴
قربانی	۱۶۲	آغاز ہستی	۴۱۵
بچوں کا تحفہ حصہ اول و دوم	۱۶۲	خواب پریشاں	۴۱۶
سہل اُردو آموز کا پہلا حصہ	۱۶۲	۱ - لوای کے خطوط - ۲ - روزنامچہ	۴۱۷
ہندوستانی (اُردو اور ہندی)	۱۶۴	رباعیات جذب	۴۲۳
تاریخ مثنویات اُردو	۱۶۵	راسپوتین	۴۲۴
گل ہاے جعفری	۱۶۹	لطیفات جلد دوم	۴۲۵
سپہارۂ دل	۱۷۰	فن انشاپردازی	۴۲۶
معاشقۂ نپولین	۱۷۱	عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی	۴۳۱
حسن پوش	۱۷۱	دریاے لطافت	۵۹۱
بال جبریل	۴۰۵	نکات الشعرا	۵۹۵
منشورات	۴۰۹	دیوان تاباں	۵۹۶
علم الحروف	۴۱۰	حامد کے سو شعر	۵۹۷
سرود زندگی	۴۱۱	حضرت احمق کے سوا سو شعر	۵۹۸

نام کتاب	صفحہ
صہبائے ولا - جوش ولا	۵۹۸
اتالیق الصبیان	۵۹۹
مرقع سخن	۶۰۰
سلسبیل	۶۰۲
خمستان	۶۰۵
سودیشی اُردو - ضروری کہانیاں	۶۱۰
منتخب افسانے	۶۱۲
لال قلعے کی ایک جھلک	۶۱۳
بہادر شاہ ظفر	۷۳۴
دیوان معروف	۷۳۷
— انجام (ڈراما)	۷۳۹
ٹیگور اور ان کی شاعری	۷۴۰
— نیم شب (ڈراما)	۷۴۱
— جوش کے سو شعر	۷۴۳
— غالب کے سو شعر	۷۴۴
آ ۃ کے سو شعر	۷۴۴
محمود اور فردوسی	۷۴۴
سالنامۂ بزم اُردو جامعہ عثمانیہ	۷۴۵
— بچوں کی رباعیاں	۷۴۷

تاریخ و سیر

نام کتاب	صفحہ
عرب کی موجودہ حکومتیں	۱۷۳
حیات مسعودی	۶۱۴
تذکرۂ محسن	۶۱۵
انقلاب فرانس	۶۱۹ —
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش	۷۴۸ —
انقلاب فرانس	۷۵۲
دو خدائی خدمت گار	۷۵۳ —
ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ	۷۵۴
ضروری کہانیاں	۷۵۵

مذہب و اخلاق

نام کتاب	صفحہ
حقیقت حج	۱۷۴
علم اور اسلام	۱۷۵
وحیٔ محمدی	۴۳۷
فلسفۂ تعلیم اسلام	۷۵۶
اسلام اور حق خلع	۷۵۸
چالیس حدیثیں	۷۵۹ —
مسلمان بیبیاں	۷۶۰ —

متفرقات

نام کتاب	صفحہ
عصر جدید	۴۴۰
مدارس صوبۂ متوسط وبرار کا درسی سلسلہ	۶۱۹
اجتماعیت	۷۶۰

تعلیم

نام کتاب	صفحہ
مصلحان تعلیم	۴۳۸
حیدر آباد کی تعلیمی ترقی	۴۳۹

اردو کے جدید رسالے

طارق	۱۷۷
عارف	۱۷۸
تبصرہ	۱۷۸
تنویر	۱۷۹
البرق	۱۷۹
الضیا	۱۸۰
شاہکار	۴۴۱
عروس خیال	۴۴۳
ادراک	۴۴۴
ارمغان	۴۴۴
تبصرہ	۴۴۵
انیس	۶۲۰
صبح امید	۶۲۰
اولڈ علیگیرین	۶۲۱
ایشیا	۷۶۱
رومان (مصور ماہنامہ)	۷۶۲
کوثر	۷۶۳

نام کتاب	صفحہ
مصحف	۷۶۴
شاعر	۷۶۴
کنول	۷۵۵
شباب	۷۶۸

دوسری زبانوں کے رسالے

ہنس	۷۷۷

زنانہ رسالے

جوہر نسواں	۱۸۰
صدائے نسواں	۷۶۸
رہبر نسواں (سالگرہ نمبر)	۷۷۷

خاص نمبر اور سالنامے

سالنامۂ ساقی	۱۸۱
سالنامۂ ادبی دنیا	۱۸۳
سفیر سخن	۴۴۵
مجموعہ تحقیقات علمیہ	۴۴۶
ہمایوں کا روسی ادب نمبر	۶۲۲
ہمایوں کا فرانسیسی ادب نمبر	۷۶۹
نیرنگ خیال کا مشرق نمبر	۷۷۴
سالنامہ مجلہ کابل	۷۷۵
نظام گزٹ (سالگرہ نمبر)	۷۷۶

تاریخ ادب فارسی

(به زبان انگریزی)

به عهد سلاطین مغل

هر سه جلد طلائی (مکمل ست) تخفیف شدہ قیمت دس روپے

مصنفهٔ

شمس العلما پروفیسر محمد عبد الغنی صاحب (کینٹب)

مجلد اول - "بابر" ۱۸۰ صفحات مع ۱۲ نادر عکسی تصاویر ۲ روپے آٹھ آنے -

مجلد دوم - "همایوں" ۲۱۶ صفحات مع ۱۲ نادر عکسی تصاویر ۲ روپے آٹھ آنے -

مجلد سوم - "اکبر اعظم" ۵۰۰ صفحات مع ۱۸ نادر عکسی تصاویر ۵ روپے -

نوٹ :- ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی)، ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاهور) و دیگر مستشرقین نے اس تصنیف کو ادبی و تاریخی حیثیت سے مستند مانا هے اور مصنف کو اس کی تکمیل پر دل کھول کر مبارک باد دی هے - اپنے طرز کی یہ پہلی اور نہایت قابل قدر تصنیف هے -

ملنے کا پتا :- انڈین پریس الہ آباد

اردو

جلد ۱۵	جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع	حصہ ۵۹

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اُردو

فہرستِ مضامین

بابت جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ادب اور زندگی	اختر حسین صاحب رائے پوری	۴۴۹
۲	ٹیگور کے ادبی مضامین	پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار	۵۱۹
۳	سخنوران ایران در عصر حاضر	جناب آغا محمد تقی "پارسا" شیرازی	۵۲۸
۴	سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ	اڈیٹر	۵۴۳
۵	شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا و ترقی	جناب شیخ چاند صاحب ایم - اے ایل ایل - بی	۵۵۹
۶	گجرات کا باکمال شاعر اردو شہرخبردار	اختر حسین صاحب رائے پوری	۵۶۹
۷	بادۂ کہن (غزلہات اشرف)	(چ)	۵۸۴
۸	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۵۹۱

ادب اور زندگی

از

(از جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی - اے)

ماضی کو سمجھ، مستقبل کا پیغام دنیا کو سنا — میرے ضمیر سے
ادب کا یہ تقاضا تھا - ماضی اور استقبال کو میں سمجھا لیکن
'آج کی' دنیا میں میرے لئے جگہ نہیں - اب ادب کا یہ تقاضا
ہے کہ میں اپنی زندگی ختم کردوں " —

(روسی ادب جدید کے علم بردار 'میکووسکی' کا آخری خط)

ادب کیا ہے ؟ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ؟ ادب کے مقاصد کیا ہیں ؟ — یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی علم ادب کی زندگی - ارباب حل و عقد نے اس مبحث پر بڑے بڑے دفتر سیاہ کردئے اور اب اس موضوع پر از سر نو کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھا جائے گا - اگر مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے سماج ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقاء بالضد (Dialectics) کے دوراہے پر آکر ہر ایمان دار ادیب سے پوچھ رہی ہے کہ —

" دونوں میں سے کس کے موئید ہو — پیشہ ور گوشہ نشینی
یا عوام سے یگانگی ؟ جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت یا انسان
کی خدمت ؟ غیر ذمہ وارانہ خودسری یا خیالات کا ارتباط

قدرت یا ضمیر ؟ جبر یا اختیار ؟ تقدیر یا تدبیر ؟ قدرت کی اطاعت یا قدرت پر حکومت ؟ آرٹ آرٹ کے لئے یا آرٹ انسان کے لئے ؟ زمین یا آسمان ؟ دوئی یا یگانگی ؟ — ان میں سے ایک پر زندہ درگور دنیائے قدیم کا انحصار ہے اور دوسرے پر مستقبل کا دار و مدار — تم دونوں میں سے کس کے حامی ہو ؟ "

(زمانۂ حال کا ادب از پی - سی - کوگن)

اگر یہ مرحلہ در پیش نہ ہوتا اور ادیب سماج کا ایک فرد نہیں بلکہ کوئی بن باسی ہوتا تو مضمون کی نوعیت مجھے قلم اُٹھانے کی اجازت نہ دیتی - مگر چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور حقائق زندگی و اشارات ادب کی خلیج اس ملک میں وسیع تر ہوتی جاتی ہے اچھا ہو کہ یہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے اور یاران نکتہ داں کے آگے یہ اہم سوال پیش کیا جائے —

مضمون کے پہلے حصے میں دکھایا جائے گا کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے - پھر جب یہ تصفیہ ہو چکے گا کہ زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں تو روح مقصد کی وضاحت کے لئے ہم ہندوستانی ادب کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہمارے ادب نے اپنے فرائض کی تکمیل کس حد تک کی ہے - میرا خیال ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کی فتح سامنتی (Feudal) تمدن پر حرفتی (Industrial) تمدن کی فتح تھی اور دیسی سماج کی سامنتی بنیاد جو پلاسی کی جنگ سے پہلے متزلزل ہو رہی تھی ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع کے صدمے سے اس کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہونے لگا - ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع ہمارے سماج کی منزل ارتقا میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے - اس زاویۂ نگاہ کی روشنی میں ادب ہند کے بھی دو دور مقرر کئے جا سکتے ہیں - ایک وہ

جو اس زمانہ کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہونے لگتا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد رفتہ رفتہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے - آسانی کے لئے ہم انہیں قدیم اور جدید ادب کہینگے - یہ تجزیہ خالصاً معاشی ہے - برسبیل تذکرہ مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ غزل گوئی کا زوال سامنتی تہذیب کی تباہی کا پرتو اور نظم کی اٹھان سماج کے بلد پانی کی روانی کی علامت ہے جو ہنوز رسوم و اوہام کی کشمکش میں مبتلا ہے —

کسی یونانی حکیم کا قول ہے کہ خیالات کی اینٹوں کو جذبات کے چونے سے ہی جوڑا جاسکتا ہے - انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے - سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرتا اور ان کی تراش خراش کرتا ہے - آرٹ جذبات کو بناتا ' سنوارتا اور نقش و نگار اشارات و الفاظ کے ذریعے ان کی ترجمانی کرتا ہے - ادیب اپنی جذباتی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے - مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے - دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب و تکوین کس طرح ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطیع ہے اور حالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں - فضا کا ہیر پھیر کبھی آدمی کو رلاتا اور کبھی ہنساتا ' کبھی آزردہ اور کبھی غضبناک بنا دیتا ہے - مثلاً ' موت ' اور ' بھوک ' کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رلاتے رہے ہیں - ایک کے لئے قدرت دوسرے کے لئے سماج ذمہ وار ہے - اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت بہت کم ہوجائے گی اور پھر فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اسے رنج دیا کریں گی - اگر سماج اور قدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ فضا بدل جائے تو ایسے جذبات بھی پیدا نہ ہوں گے —

اب تک ہمارے تنقید نگاروں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ادیب نے جذبات کو کس طرح ظاہر کیا ہے - (Form) کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے - لیکن اگر یہ سمجھہ لیا جاے کہ ادیب جن جذبات کو آشکار کو رہا ہے وہ الہامی نہیں بلکہ ماحولی ہیں تو یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ان جذبات کو کون اور کیوں ظاہر کر رہا ہے - ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے - وہ جس زمانے میں جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پاے گا' جن لوگوں کے ساتھہ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا — وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ روپ دیں گے' اس لیے میری ناچیز راے میں کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لئے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اُس نے پرورش پائی - جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جاے یہ سمجھہ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کہا' اس کے خلاف کیوں نہیں کہا - اس لئے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے - اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے —

فرض کیجئے کہ کسی شہر میں ایک کارخانہ بنایا جاتا ہے - اس کی تعمیر کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ایک امیر نے سرمایہ لگایا انجنیر نے نقشہ بنایا اور مزدوروں کی محنت نے سرمایہ کھڑا کردیا - لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ جب تک اقتصادی ضروریات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ کارخانہ بنایا جاے اس وقت تک اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا - کارخانے کی وجہ تعمیر کو سمجھنے کے لئے اس زمانہ کی مالیات پر غور کرنا چاہئے نہ کہ اس سیٹھہ کی تھیلی کی لمبائی اور انجنیر کے نقشہ کی

سکھرائی پر۔ اسی طرح کسی زمانے کے ادب کا غائر مطالعہ مقتضی ہے اُس زمانے کے حالات کو سمجھنے کا ۔ کہ اُن مخصوص جذبات کو اُن مخصوص حالات نے ہی پیدا کیا تھا۔ سنسکرت شاعری جن جذبات کی حامل ہے وہ قدیم ہند کے اساطیر (Myths) کے پس منظر میں ہی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ سماج اپنے عہد طفلی میں اپسراؤں* اور راکشسوں کے افسانے سن اور سمجھ سکتا ہے لیکن اب اپنے زمانۂ پیری میں وہ ان رنگین خوابوں کا تانا بانا کیوں کر بُن سکتا ہے جب کہ اپسرا کی جگہ سینما کی طوائف اور راکشس کا نمبر روبٹ† (Robot) نے چھین لیا ہے اب شمع پر پروانے بھی کم آتے ہیں کہ آگ کی جگہ بجلی آ گئی اور خرمن پر برق بھی کم گرتی ہے کہ اس پر برقی سلاخ نصب کر دی گئی ہے! صحراؤں میں محمل کا پتا نہیں کہ موٹر چلنے لگے اور ڈولیوں کا رواج بھی کم ہو چلا کہ کہاروں کے کاندھے چھل گئے۔ زمانے کے رد و بدل نے سنسکرت شاعری کے پر نوچ لیے اور احساسات و جذبات کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوا کہ ہندوستانی ادب کا دھارا اپنے بہاؤ کے لیے نیا میدان تلاش کرے —

اب یہ دیکھنا ہے کہ ادب کے فرائض کیا ہیں۔ میرا مطلب اُن کے مقصد سے نہیں ہے۔ طالسطائی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ آرٹ جذبات انسان کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے مغنی ایک یاس انگیز نغمہ چھیڑتا ہے اور سننے والے بلا امتیاز اندوہ و الم سے چیخ اُٹھتے ہیں۔ شاعر طرب و نشاط کا گیت سناتا ہے تو سننے والے شادماں ہو جاتے ہیں۔ دستوویسکی جب "گناہ اور سزا" میں ایک روح کی کشمکش دکھاتا ہے تو ناظر کی روح میں گتھی سی پڑ جاتی ہے۔ ادیب کے کمال کا ایک معیار

---

* اپسرا — حور کا ہندو تصور۔　　† روبٹ — مصنوعی انسان۔

بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے جذبات سے وہ دوسروں کو کس حد تک متاثر کر سکا۔ اُس کی عبارت زمان و مکاں کے امتیاز سے جتنی بالا تر ہوگی ' اس کا آرٹ اتنا ہی دیرپا اور مستحسن سمجھا جائے گا - مگر وہ اپنے ماحول سے جدا نہیں ہو سکتا اپنے ماحول کے تاثرات کو بیان کرتا ہے یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے - جب تلسی داس ایک زن مرید باپ کی اطاعت کو بیٹے کا دین و مذہب بتلاتا ہے تو اُس کے قلم سے اُس زمانے کی تہذیب بولتی ہے جس میں بیٹے کی حیثیت باپ کی غیر ملقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی - آج جب ہر بیٹا اپنی انفرادیت کو شفقت پدری سے زیادہ قیمتی سمجھ رہا ہے تو اس قسم کی تعلیم رجعت اور قدامت سے تعبیر کی جائے گی-

یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آرٹ کا مقصد کیا ہے:

' ادب برائے ادب ' کے علم برداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی مافوق اللامین (Super Organic) شئے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام معیار پر نہیں جانچا جاسکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جائے - جمالیاتی نقطۂ نظر ' جس کے موئید ھیگل ' شوپین ہوڑر نٹشے اور بہت سے انگریز ادبا اور مفکرین ہیں ' آرٹ کا مقصد تلاش حسن کو قرار دیتے ہیں - اخلاقی نقطۂ خیال جس کی تشریح طالسطائی نے کی ' آرٹ کو نیکی کا آئینہ دار قرار دیتا ہے - معاشی اور مادی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں معیار مبہم اور ادھورے ہیں - اگر یہ صحیح ہے کہ ادیب انسان ہے اور ہر انسان کی طرح ماحول کے متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اس سے اثر اندوز ہوتی ہے - تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں -

ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سرزمین میں جذبات انسانی کی تشریح و تفسیر کرتے ہوے وہ روح القدس بنلے اور عرش پر جا بیٹھنے کا دعویٰ کرے۔ زندگی کا ڈھانچا مکمل اور واحد ہے۔ اس میں سائنس آرٹ اور فلسفہ کے مختلف خانے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا غرض' میں آپ اپنے لئے زندہ ہوں! اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں۔ ادب ماضی و حال اور حال و مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بندشوں کو توڑ کر وہ بنی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سناتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی فریضے کو ایک فن کار اپنی ذاتی ملکیت سمجھے اور اس کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیا جاے۔ حسن کیا ہے جس کی تلاش میں مدعیانِ ادب براے ادب مدتوں سے سرگرداں ہیں؟ حسن کی تعریف ناممکن سی ہے۔ والٹیر نے اپنی مشہور تصنیف (Dictionaire de Philosophie) میں ان لوگوں کا بڑا مذاق اُڑایا ہے جو حسن کا کوئی معیار قایم کرنا چاہتے ہوں۔ وہ لکھتا ہے کہ مینڈکی کو بھی اپنی نرم اور چمک دار جلد پر خوبصورتی کا دعویٰ ہے اور ایک حبشی حسینہ کے چہرے اور موٹے ہونٹوں پر بھی عاشقوں کا گروہ دل و جان قربان کرتا ہے۔ جرمنی کے کلاسکل فلسفروں کے نزدیک یہ وہ چیز نہیں ہے جو آدمی کو خوش کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہوے کہ ادب کا مقصدِ اُولیٰ تفریح طبع ہے اور چونکہ دعویٰ یہ بھی ہے کہ آرٹ زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے لہذا تفریح زندگی کی معراج ہوئی! پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس چیز سے مسرور ہوتا ہے وہ دوسرے کے لیے اجیرن ہے۔ زندگی اور ادب کا یہ نظریہ اس قدر بے معنی ہے کہ اس پر کچھ لکھنا فضول ہے۔ پھر کیا آرٹ کا مقصد تلاش حق ہے؟ حقیقتاً

کہا ہے! کیا حقیقت کی کوئی قطعی اور آخری تعریف ہوسکتی ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو؟ جو چیز ایک کے لیے اچھی ہے دوسرے کےلیے بری - امیر کے لیے جو حق ہے وہ غریب کے لیے ناحق ہے - پھر ادب کس حقیقت کا جویا ہے -

میں پھر اپنے اسی جملے کو دہراتا ہوں کہ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کرسکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے - زندگی کی روانی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے' عام اس سے کہ وہ اپنے آپ کو رموز حیات کا محرم اور حسن و عشق کا پروردگار کہتا رہے - ایک انسان اور ایک ادیب کے فرایض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے - یہ صحیح ہے کہ دنیائے ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ادیب اپنے ماحول سے بے خبر اور آزاد ہوکر آگے یا پیچھے جانا چاہتا ہے ۔ اپنے موقع پر ایسی واردات کے اسباب پر بھی غور کیا جائے گا اور ہم دیکھیں گے کہ یہ حالات کا ہی رد عمل تھا، کوئی الہامی کیفیت نہ تھی -

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں -

(۱) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے -

(۲) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں -

زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر ہمیں سماج کی بنیاد کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بنتا اور بگڑتا ہے اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں -

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے لیے یک جا ہوتے ہیں - اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے- ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں اور سماج کی

ابتدا اس غرض سے ہوتی ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی ہے - یعنی سماج کا سنگ بنیاد انسان کی مالی ضروریات کی پیداوار اور تقسیم پر ہے اور افراد کا رشتۂ باہمی اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے - سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اس کے افراد کا رشتہ مستحکم ہوتا جاتا ہے یعنی ضروریات زندگی کی بہم رسانی آسان ہوتی جاتی ہے جس سے انہیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا موقع ملتا ہے - پیداوار کے ذرائع جتنے وسیع اور کارآمد ہوں گے اور مال کا طریقۂ تقسیم اکثریت کے لیے جتنا قابل قبول ہوگا اسی اعتبار سے نظام معاشی کی عمر دراز ہوگی - سماج کے ارتقا سے مراد دراصل پیداوار کے انہیں ذرائع کے ارتقا سے ہے - دور وحشت سے گزر کر انسان دور حرفت میں کیسے پہنچ گیا، اسے سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کلہاڑی نے ٹریکٹر کی شکل کس طرح اختیار کرلی اور نیزہ مشین گن کیسے بن گیا - پیداوار کے ذرائع دو حصوں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں - ایک طرف تو قدرتی ذرائع و عناصر ہیں جنہیں حسب ضرورت کارآمد بنانا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی محنت ہے جو یہ فرض انجام دیتی ہے - زمین کان اور خام اشیا کی دوسری قدرتی رسد گاہیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں - ان میں فرق نہیں آتا - سماج کا ارتقا و تغیر محتاج ہے انسانی محنت کا، جو ان اشیا کو قابل استعمال بناتی ہے - جس کھیت میں کاشتکاری کے فرسودہ طریقوں سے دس من غلہ پیدا ہوتا تھا آج وہاں مشینوں سے سیکڑوں من اناج پیدا ہوتا ہے - یہ پیداوار کے ذرائع کی ترقی ہے جسے ہم سماج کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں - پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ نظام معاشی کا بنیادی پتھر، ضروریات زندگی کی پیداوار پر رکھا گیا ہے اور سماج اسی

وقت تک قایم ہے جب تک اس کے افراد کا رشتۂ باہمی مستحکم ہے جس کی ضمانت ہر فرد کی ضروریات کی تکمیل ہے - اس سے یہ لازم آیا کہ پیداوار اور تقسیم کے طریقے ایسے ہونے چاہئیں کہ ہر فرد اپنی بساط کے مطابق محنت کرکے اپنی ضروریات حاصل کرسکے - یعنی پیداوار اور تقسیم کا ارتباط رشتۂ افراد کے استحکام کا ضامن ہو سکے - ہر فلسفۂ زندگی کا منشا یہی ہے کہ ہر فرد بشر کو روحانی ' ذہنی و جسمانی نشو و نما کا موقع مل سکے - مگر انسان کا مادّی وجود اس کا مقتضی ہے کہ سب سے پہلے اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام ہو - سرمایہ دولت یا امارت سے وہی لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں جو پیداوار کے ذرائع پر کسی نہ کسی طرح قابض ہوتے ہیں - غریب و فقیر وہ لوگ ہیں جو ان کی ملکیت سے محروم ہیں - اگر کبھی ایسا ہوسکے کہ پیداوار کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج قابض ہو اور مال کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر محنت کش فکر روزگار سے آزاد ہو جائے اور آئندہ نسل کی تربیت و پرورش کی کفالت و تحفظ سماج کرسکے ' تو یہ سماج کی مادی ترقی کی انتہا ہے اور اس کے ساتھہ ساتھہ وہ ذہنی و تمدنی اعتبار سے بھی انسانیت کو مرتبہ بلند کی طرف لے جاسکے گا ' اور اس وقت روح الاجتماع خدا وند بن جائے گی اور کثرت و وحدت میں کوئی تنازع نہ رہے گا - یہ زندگی کا مقصد اولیٰ ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کا ہر شعبہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ہو —

(اسی چیز کو مدنظر رکھہ کر ادب جدید کا پیغمبر ' میکسم گورکی ' کہتا ہے : ادب انسانیت کا نقاد ہے - وہ اس کی کجروی کو ظاہر کرتا اور اس کی خامکاریوں کو بے نقاب کرتا ہے - اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے - ادب کی بھلائی

اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں - وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جاسکتا ہے - اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے - "

ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے محبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے - یہ سچ ہے کہ تدریسیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں - روگی انسانیت کو وہ پند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا بلکہ ہلکے اور میٹھے سروں سے اس کی عیادت کرتا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال نہیں لیکن وہ مستقبل کا جویا ہے - وہ پیچھے یا دائیں بائیں طرف اس غرض سے دیکھ لیتا ہے کہ منزل حیات کے نشیب و فراز کو دیکھ سکے اور آگے بڑھ سکے - تاریخ کے محاذ میں اس کی جگہ صف آخر میں نہیں بلکہ پیش پیش ہے - لہذا ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہوکر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو - علم اور ادب میں وہی فرق ہے جو استاد کی دھمکیوں اور ماں کی لوریوں میں - ادب وہ استاد ہے جو کہانیوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے - ادب کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے - کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہوسکے —

ادب هند کا ایک خاکہ پیش کرکے هم یہ دیکھینگے کہ وہ کہاں تک مذکورہ مقصد کا حامل رہا ہے کیا وہ زندگی کے حقائق اور مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا ہے اور کیا وہ انسانیت کا مصلح 'ور پیشوا کہا جاسکتا ہے - ابھی صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ادیب عموماً کس ماحول میں رہتے آے هیں کیونکہ همارے تجزیہ کے مطابق اُن کے جذبات کی شکل اسی ماحول میں ہوتی - کیا یہ ماحول اور یہ جذبات زندگی کے لئے چراغ راہ بن سکتے هیں ؟ اب زندگی کو کس طرف جانا چاهئے اور همارا ادب کس طرف جارها ہے ؟

زمانۂ قدیم اور عہد وسطی بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر تک علم وادب پر دو قسم کے لوگوں کا اجارہ رہا ہے - ایک وہ جو بیراگی یا صوفی تھے اور دوسرے وہ جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی کی تگ ودو سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا - آشرموں یا حجروں میں اور درباروں یا امیروں کی ڈیوڑھیوں میں پڑے ہوے یہ عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے - وہ ایک ایسے ماحول میں رہتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا اور یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا - سوچئے کہ دربار یا آشرم میں رہ کر انسان کِن جذبات کی ترجمانی کِن کی زبان میں کرے گا - ایک محدود دائرے میں رہ کر جہاں ایک سے لوگ ایک قسم کی زندگی بسر کرتے هیں ' جہاں حزنیت یا منافقت کا دوردورہ ہے — وهاں کسی ادیب کی حالت کیا ہوگی ! اس لحاظ سے همارے ادب قدیم کے تین نقائص اتنے نمایاں هیں کہ حاشا تشریح طلب نہیں :

۱ — موضوعات ادب بہت ہی فرسودہ اور محدود هیں -

۲ — لطف بیان اور زیب داستاں پر معنی و مقصد قربان کئے جاتے هیں -

۳ - ادب کو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں -

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک کا ادب ہر دور میں طبقۂ امرا کا خادم اور منت پذیر رہا ہے - کچھہ صوفی شاعر اور عہد وسطی کی ' بھکتی تحریک ' کے علم بردار ادیب ایسے ضرور ہوے ہیں جو امیروں کے دست نگر نہ تھے لیکن ان میں سے اکثر دنیا سے بیزار اور بے نیاز تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے - کبیر داس اور نظیر اکبرآبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوے ہیں جو گھوم پھر کر آپ اپنی روٹیاں کماتے ' اور زندگی کو کوچۂ یار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگار خانے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے - ان درباری بھاٹوں اور بے غیرت عاشقوں کے متعلق طالسطائی کہتا ہے :

" کیونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خود داری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا - قبول عام کی ہوس میں یہ اندھے ہوجاتے اور مدح و ثنا پر اپنا دین و ایمان نثار کر دیتے ہیں - یہ دیکھہ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرٹ کی خاطر یہ زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ بہ ایں ہمہ آرٹ کو فائدہ کیا الٹا نقصان پہنچاتے ہیں - علاوہ بریں یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بیزار ہوکر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح کو تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں - امیروں کو آرٹ یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان نیکی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہے - امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے

اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی ترجمانی آرٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں وطن پرستی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلتے جاتے ہیں - یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرٹ کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہرجائی کا ہوتا ہے - آرٹسٹ فصاحت و بلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بیانی میں اپنی ضمیر فروشی اور نفس پروری کو چھپاتا ہے، طوائف روغن و غازہ سے اپنی بد صورتی پر پردہ ڈالتی ہے - غرض کہ ہمارے زمانے اور ہمارے طبقے کے آرٹ اور کسی کسبی میں ذرا فرق نہیں - یہ تشبیہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے — آرٹ اتنا ہی خود فروش، سیاہ باطن اور فریب کار ہے !"

یہ باتیں ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کے لئے زیادہ سچائی کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ادیب اور فن کار ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ رہی ہے۔ زمانۂ حال کا سحر طراز ادیب رومان رولاں ادب کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوا کہتا ہے - " پچھلی صدی کے ادیبوں اور فن کاروں نے سماج کے ضمیر کو سلا دیا ہے - سماج کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انہوں نے لوگوں کو نئے نئے بہانے سکھا دئے ہیں اور حقیقت سے بچنے کے لئے نئے نئے بت خانے کھڑے کئے ہیں۔ ان کی تاویلوں کے بعد ہر شخص کے لئے یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے کہ سماج کے مظالم اور ستم خیزیوں کے لئے میں ہرگز ذمہ دار نہیں ہوں ! "

آج ادیبوں کی حالت کیا ہے - جو پیشہ ور ہیں وہ فلم کمپنیوں، جاہل کتب فروشوں اور تن آسان ناظروں کے ساتھ خود کو بیچ رہے ہیں -

جو شوقیہ لکھتے ھیں. وہ نہ زندگی کو سمجھتے ھیں اور نہ سمجھ سکتے ھیں - زندگی کھیتوں اور کارخانوں میں ھے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں میں - پھر جب کبھی ان سے کہا جاتا ھے کہ تمھارے فرائض و مقاصد کم از کم ایک معمولی انسان جیسے تو نہیں انھیں ان خوش گوار حالات کو بدلنے کی کوشش کرنی چاھئے تو یہ بندگان خدا 'ادب برائے ادب' کی دھائی دینے لگتے ھیں - مطلب یہ ھے کہ ھم اپنے لیے زندہ ھیں! توپیوں اور جوتیوں کی طرح بازار کی ضرورت کے لحاظ سے کتابیں لکھتے ھوے اور مشاعروں کی تحسین و آفرین اور امیروں کے مہر و کرم کے خیال سے تک بندی کرتے ھوے بھی یہ لوگ بیباکی سے کہتے ھیں کہ آرٹ صرف انفرادی آزادی کی فضا میں پنپ سکتا ھے - انھیں مخاطب کرکے 'لینن' اپنے اخبار نوواژیجن میں ایک جگہ لکھتا ھے : " ھم ادب کو کامل طور پر آزاد کرنا چاھتے ھیں - صرف سیاسی بندشوں سے ھی نہیں بلکہ دولت اور خود غرضی کی پابندیوں سے بھی ھم اسے آزاد کردیں گے - یہی نہیں بلکہ ھم اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت کا خادم بھی نہ رھنے دیں گے —

یہ آخری الفاظ ناظرین کو متضاد معلوم ھوں گے - ممکن ھے کہ کوئی آزادی کا پرستار ادیب چیخ اُٹھے کہ تم سماج کی چکی میں آرٹ کو پیسنا چاھتے ھو، تم اس تخلیقی صلاحیت کو معدوم کرنا چاھتے ھو جو مکمل انفرادی آزادی کی فضا میں ھی پروان چڑھ سکتی ھے - میں کہتا ھوں کہ یہ لمبے چوڑے دعوے تمھاری منافقت کے ثبوت ھیں - جس سماج کی بنیاد کھسۂ زر پر رکھی گئی ھے، جہاں معدودے چند سیٹھہ عیش اور مزدور فاقہ کشی کرتے ھیں، وھاں آزادی کا ذکر تک مضحکہ خیز ھے - میں مصنفوں سے پوچھتا ھوں کہ کیا وہ سرمایہ دار پبلشروں کے دست نگر نہیں ھیں ؟

کیا وہ عیاش طبع ناظرین کے زیر احسان نہیں ہیں جو ننگی تصویروں کے دلدادہ ہیں کیا ان کی خاطر 'ادب براے ادب' میں طوائفوں کا ذکر مسعود نہیں کرنا پڑتا ؟ سماج میں رہتے ہوے آپ سماج سے الگ نہیں ہو سکتے - کسی سرمایہ دار مصنف' آرٹسٹ اور ایکٹر کا دعوئی آزادی — اُس کی جہالت کا پردہ ہے ! "

صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقہ سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اثر قبول کرسکیں - اس کے لئے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہئے کیونکہ ادب پیغمبری کی طرح خودگزاری کا مقتضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور! ماضی' حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی دردمندی رائیگاں نہ جاے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے ۔ پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جاے اور اس کے ہنگاموں میں حصہ لیا جاے - اس کی تگ ودو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہوکر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا - اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیام اُن تک پہنچا سکتا ہے - یہ معیار بہت بلند اور مشکل معلوم ہوگا اس لئے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی راجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گننے کی تنخواہ لیا کرتا تھا —

پوچھا جاے گا کہ ادبا و شعرا کون سی راہ اختیار کریں - اپنے تخیل اور تخلیق کی باگ کس طرف موڑیں کہ زندگی کی شاہراہ سے آملیں جس سے ہنوز وہ بہت دور رہے ہیں - روس کا مشہور مفکر ' پرنس کروپاٹکن '

جواب میں کہتا ہے : " اگر تمہارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے ' تمہارے جذبات کا رباب اُن کے دکھہ سکھہ کے ساتھہ ہم آہنگ ہوتا ہے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام کو سن سکتے ہو — تو تم ہر قسم کے ظلم کے مخالف ہوجاؤ گے ! جب تم کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کروگے ' جب تم میدان جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کے لاشے تڑپتے دیکھوگے ' جب تمہارے بھائی بند قید و بند اور دار و رسن کے مصائب جھیلتے نظر آئیں گے ' اور جب تمہاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتح یاب ہوگی — تو ادیبو اور شاعرو ' اگر تم انسان ہو تو ضرور آگے آوگے ! تم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے - تم مظلوموں کی طرف داری کروگے کیونکہ حق و صداقت کی حمایت ہر انسان کا فرض ہے - "

ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹاکر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے - اُسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہئے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریاے زندگی کو چھوٹے چھوٹے بچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں - کیا زمانۂ حال کا ادیب یہ کرے گا؟ اب تک وہ قدامت اور رجعت ' خود پرستی اور ظلم پروری کا ساتھہ دیتا رہا ہے جس کی مثالیں ہم نے مضمون کے دوسرے باب میں پیش کی ہیں - گو یہ تبصرہ مختصر ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ غور و فکر کے لیے تھوڑا سا سامان ضرور مہیا کرے گا —

قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ

پلاسی کی لڑائی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں کی ٹکر تھی - اس نے بعد پورے ایک سو سال تک ہندوستانی سماج کا شیرازہ منتشر ہوتا رہا اور سنہ ۵۷ ع کی آخری کشمکش کے بعد سامنتی تمدن نے ہتھیار ڈال دیے - اور یہ معلوم ہوگیا کہ گرگھوں اور ہلوں کے دن گئے اور مشینوں کا زمانہ آگیا - تاہم حرفتی تمدن کا اثر سنہ ۵۷ ع کے بعد زیادہ نمایاں ہوا جس کی گونج پہلے راجہ رام موہن رائے کی مغرب دوستی اور بعد ازاں سر سید کی انگریز پروری میں سنائی دی - ہندوستان کی زندگی میں انقلاب سا آگیا جس کی رو میں پرانی روشنی کے چراغ گل ہونے لگے - جیسا کہ عرض کرچکا ہوں میں نے اسی اعتبار سے ادب ہند کے دو دور مقرر کیے ہیں - کیونکہ اس سے پہلے ہزاروں سال تک ہمارے سماج کی حالت یکساں رہی - پیداوار کے ذرائع ایک سے رہے اور تقسیم کے اصولوں میں بھی کوئی فرق نہ آیا - مقامی حالات میں عارضی طور پر خیرات یا قحط کی وجہ سے یونہی سی تبدیلی ہو جاتی تھی ورنہ وہی آسمان تھا اور وہی زمین —

دنیا کے ہر گوشے میں سامنتی تمدن طبقۂ امرا پر رزم اور بزم کے نقوش چھوڑ جاتا ہے - اس کی پوری زندگی خون آشامیوں یا رنگ رلیوں میں گزر جاتی ہے - ہند قدیم کی تہذیب عوام اور امرا کو مذہبی اعتبار سے بھی دو طبقوں میں بانٹتی اور علم و ادب * کو صرف برہمنوں کا

* علم و ادب —— Knowledge & Literature

اجارہ قرار دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ کشتریوں اور ویشیوں میں بھی علم و فن کے چرچے ہونے لگتے ہیں لیکن عوام الناس یعنی شودروں کو نہ انہیں حاصل کرنے کی فرصت ہے نہ اجازت - بیچارگی سے قناعت اور اس سے قسمت پرستی عبارت ہے اور پچھلے جنم کے ناکردہ گناہوں کے لیے شرمساری اور اگلے جنم کی کامرانیوں کا خیال خام ان میں رس جاتا ہے - پوری سنسکرت اور ہندی شاعری کو چھان ڈالیے ' اساطیر اور افسانوں کا ورق ورق الٹ جائیے ' شاذ و نادر ہی کہیں عوام کا ذکر آتا ہے اور وہ بھی نفرت و حقارت کے ساتھ - البتہ راجاؤں کو رعایا پروری اور عدل گستری کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ رعایا کی خوشنودی ہی قیام حکومت کی ضامن ہے - سنسکرت کے قواعد ادب اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ ہر ادبی تصنیف دیوتاؤں کے علاوہ حکومت اور برہمن جماعت کی دعاے خیر کے ساتھ شروع ہو - برہمنوں کی خداداد برتری اور کشتریوں کے اختیار حکومت کو بار بار دوہرایا جاتا اور ان سے سرکشی کرنے والوں کو جہنمی اور لعنتی قرار دیا جاتا ہے - شودروں کو بار بار ٹوکا جاتا ہے کہ اونچی جاتیوں کی خدمت ان کا فرض منصبی اور دین و ایمان ہے - مندروں اور دیوتاؤں کی نگہ کرم ہمیشہ روح اور جسم کے خداوندوں کے لیے مخصوص ہے اور ہندو ادب ان کی مدح و ثنا سے لبریز ہے - ' شرنگار رس ' اور ' شانت رس ' سنسکرت شاعری پر چھاے ہوے ہیں کیونکہ ایک امیروں کے صنفی رجحان کو پرچاتا اور دوسرا بوڑھوں کے احساس گناہ کو کم کرتا ہے - خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ فضا ٹریجیڈی کے تذکرے تک کی متحمل نہیں اور اسے مخدوش سمجھتی ہے ' چنانچہ ہر سنسکرت ٹریجیڈی خواہ مخواہ کامیڈی میں منتقل کردی جاتی ہے !

اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عیش و طرب میں ڈوبا ہوا بزم کی رنگینیوں کی داد دے رہا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے کے ادب کو دیکھیے - اکثر سنسکرت افسانے مثلاً 'دش کمار چرتر' بھگال پنچشت (بھگال پچیسی) اور 'مرچھ کتک' (مٹی کی گاڑی) وغیرہ ڈرامے بد اخلاقی، اوباشی اور قابل نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں ۔ شاعر اور ادیب انہیں یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں - عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ 'شرنگار' ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور بوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا - ہندو اصناف سخن میں 'نائیکہ بھید' اور نکھ شکھ ورنن یعنی اقسام معشوق کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس کی شہوت پرست ذہنیت کا پرتو ہے - نائیکہ بھید میں جس تجسس اور انہماک سے صرف کنواری ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کی بدکاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فضا کا اخلاقی معیار کیا تھا - شعر و ادب اس فضا کے لیے قوت باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے - اس زمانے میں طبقۂ امرا کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے مہابھارت کے کچھ واقعات پر غور کرنا دور از مبحث نہ ہوگا —

جب ارجن نے کرشن جی کی بہن سبھدرا سے بیاہ کیا تو انہیں جہیز میں ایک ہزار حسین و جمیل دوشیزائیں دی گئیں! یودھشٹر نے جب 'راجسویہ یگیہ' کیا تو انہیں راجاؤں نے ایک لاکھ حسینوں کے پارسل بھیجے! کرشن جی کی ۱۶ ہزار گوپیوں کا قصہ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن مہابھارت اور بھاگوت میں ایسے صدہا واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حرم میں ہزاروں عورتیں رہتی تھیں - یہی نہیں یودھشٹر کے

'دھرم راج' میں ۸۸ ہزار طلبا کی ضروریات حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک اہم جنس یہ تھی کہ ہر طالب العلم کی خدمت کے لئے ۳۰ دو شہزادیاں مقرر تھیں - لطف یہ ہے کہ مہابھارت کا مصنف کہیں اشارتاً بھی اس شہوانی گرم بازاری کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا - یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ عہد قدیم اس قسم کی بزم آفرینیوں سے جگمگا رہا ہے! اس زمانے کے لوگ تاریخ نویسی سے بے بہرہ تھے' شعر و ادب میں ہی راوی نے چٹخارے بھر بھر کر یہ کہانیاں سنائی ہیں - یہ اس زمانے کی زندگی کا بزمیہ پہلو اور عشقیہ شاعری میں اس کا عکس ہے - اب ششوپال ودھ راماین وغیرہ رزمیہ نظموں کو دیکھیے - قتل و غارتگری کا کوئی اثر قسم کھانے کے لیے شاعر پر نہیں ہوتا - حتیٰ کہ والمیک اور تلسی داس تک لنکا کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کے تہ تیغ ہونے پر اظہار تاسف نہیں کرسکے بلکہ بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی فریاد پر یہ لوگ خندہ زن ہیں!

ملک کی آبادی کا ۹۵ فی صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ہے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ہندی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے - جابجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ہے لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہ ملے گا - کبھی کوئی نیک طینت وزیر راجا کے آگے "پرجا" کی تکالیف کا دکھڑا روتا ہے یا کوئی راجا خیرات کرتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں 'رعایا' نام بھی کوئی چیز تھی - ورنہ 'منیوں' 'راجاؤں' بنیوں اور حسینوں کے تذکرے اس کثرت سے ملینگے کہ یقین سا ہوجاتا ہے کہ اس جنت نشان میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا تھا!

کالیداس اس عہد کا مایۂ ناز ادیب اور شاعر ہے - اس کی سحر طرازی اور جادو بیانی کا لوہا مشرق و مغرب میں سب نے مانا ہے - منظر کشی اور تصویر نگاری میں وہ اپنا مقابل نہیں رکھتا - ایشیا کے شاعروں پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا بیانیہ کلام تناسب سے دور ہوتا ہے - ایک کالیداس ہے جس کا ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جہاں جم گیا وہاں سے اٹھ نہیں سکتا - کالیداس کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی - لیکن ماحول کا جیسا اثر جذبات پر پڑتا ہے اس کی سبق آموز مثال بھی شاعر ہی ہوتا ہے - اس کے آگے انسانیت کا مقصد اگر کچھ ہے تو محض یہ کہ نیک دیوتاؤں، رحم دل راجاؤں اور ہٹ دھرم رشیوں کی پوجا کرے - شکنتلا میں جا بجا برہمنوں کی عظمت کا اعلان کیا گیا ہے 'رگھوونش' میں رام چندر جی کے اجداد کی فوج کشی اور بزم آرائی کا ذکر ہے - قدرت کے استبداد اور سماج کے مظالم کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کہتا اور اس کے کردار ایک ہی طبقے میں رہتے اور ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے ہیں —

کیونکہ 'ویدک' عہد میں آرام و آسائش کے سامان کم تھے اس لیے اس زمانے کی شاعری بھی تصنع سے پاک ہے - رفتہ رفتہ جاہ و حشمت کے طلسم کھڑے ہوتے اور عیش و طرب کے نئے نئے سامان مہیا کیے جاتے ہیں - ادب و شعر اس عروج یا زوال کی جو تصویر کھینچتے ہیں اس میں معنی آفرینی کی جگہ ندرت بیان اور لفظی بندشیں لے لیتی ہیں - یہ امر قابل غور ہے کہ علم بیان و معانی کے لیے سنسکرت میں 'النکار' کا لفظ ہے جو 'زیور' کا ہم معنی ہے - عبارت آرائی و رنگین بیانی کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ادب آخر میں پہیلیاں بجھوانے لگتا ہے - چنانچہ 'بان بھٹ' کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کو یوں ترکیب دیتا ہے کہ ایک ایک لفظ ۲۰-۲۶

سطروں تک پھیل جاتا ہے اور تشبیہ و استعارے کے بیان میں اتنی بلند پروازی کرتا ہے کہ مطالب چیستاں بن کر رہ جاتے ہیں - ایک خاص صنف سخن 'بھر مر چھند' ہے جس کی مثال مہا بھارت اور سورداس وغیرہ کے ہندی کلام میں ملےگی - اب تک سخن سنجوں میں یہ بحث ہوتی ہے کہ ان سے شاعر کی مراد کیا ہے - غرض ایسے لفظی تکلفات سے وہ تمام شاعری بھری پڑی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا - شاعر کے مشاہدات اور احساسات اسے آگے بڑھنے کی اجازت کیوں کر دیتے - ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا اور نہ دوئی کے پردے کو چاک کرنے کی سعئی رائیگاں میں وقت گنواتا ہے - وہ اس زندگی اور اس کی لذتوں کے لیے زندہ ہے اور اسی وجہ سے 'بھرتھری' جیسے دو چار بیراگیوں کو چھوڑ کر حزنیاتی رنگ کم ملےگا اور تصوف کا تو کوسوں پتا نہیں ہے !

'پانچ تنتر'، 'ہتوپدیش' اور 'مدرا راکشس' وغیرہ میں ہمارے لیے ایک جہان عبرت پنہاں ہے کیونکہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے طبقۂ امرا اور علماے سو کا اخلاق کتنا پست اور انسانیت سوز تھا - مگر افسوس تو اس پر ہوتا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمے یہ خدمت لے لی تھی کہ ان بدعنوانیوں کو ایسی ساحرانہ رنگ آمیزی سے بیان کریں کہ دیکھنے والا نفرین کے بدلے آفرین کہے اور کف حسرت ملے کہ ہم ان محفلوں میں کیوں نہ شریک ہوسکے !

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہندو سماج کی ذہنیت جس طرح بدلی اُس کے دو بین اثرات ہندی شاعری میں موجود ہیں - ایک تو رزمیہ اور جوشیلی نظموں کی مقبولیت - 'پرتھوی راج راسو'' ہمیر راسو

اور 'آلہا اودل' وغیرہ اس زمانے کی نظمیں ہیں - بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جب ہندوؤں کے خلاف جذبۂ قومیت میں ہیجان پیدا ہوا تب شیواجی اور درگاداس جیسے سورماؤں کے ساتھ 'بھوشن' اور "رام داس جیسے شاعر بھی پیدا ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا - پچھلے دنوں جب اس ملک میں ہندو، مسلم فساد کی آندھی امنڈی تھی تو یہ دونوں فرقہ پرست شاعر قبر میں کروٹ بدلنے لگے تھے —

ہندو مذہبی پیشواؤں کے آگے یہ مسئلہ بھی پیش تھا کہ اسلام کے نرغے سے ہندو عوام کو کس طرح بچایا جائے جو برہمنوں اور پنڈتوں کی دست برد سے عاجز تھے - اس جد و جہد کا اظہار شاعری میں کبیر داس 'دادو دیال' اور تکارام وغیرہ بھگت شاعروں نے کیا - انہوں نے روزمرہ کی زبان میں سمجھایا کہ سارے فساد مذہبی دلالوں کی وجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بھگوان کی نظر میں سب انسان برابر ہیں - کبیر داس ہندوستانی جنتا (Masses) کا پہلا اور سب سے بڑا شاعر تھا جس نے امیروں اور پنڈتوں سے بے نیاز ہوکر عوام میں خودداری اور خود احساسی کے جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی - کیونکہ وہ اور اس کے معاصرین امیروں کی نہیں بلکہ غریبوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں' اس لیے ان کا کلام ہر طرح کے الٹے تلٹوں سے پاک ہے - یہ صحیح ہے کہ گوشہ نشین اور سادھو منش ہونے کی وجہ سے یہ شعرا موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور لوگوں کو زندگی کی تگ و دو سے الگ رہنے اور جسمانی تفکرات سے بے پروا رہنے کی نصیحت کرتے ہیں - چنانچہ کبیر داس ایک جگہ مارٹن لوتھر سے ہمنوا ہوکر کہتا ہے کہ پرجا راجا بن جائے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا؟

روحانی تسکین کے لیے وہ جسمانی تسکین کو ضروری نہیں سمجھتا —

عشقیہ شاعری کا عنصر ہندو ادب پر اب بھی اتنا ہی غالب ہے جتنا عہد قدیم میں - بنگال میں 'چنڈی داس' بہار میں ودیاپتی اور برج بھاشا میں بہاری 'دیو' متی رام وغیرہ سماج کی اس بے حرکتی اور بے حسی کے نقاش ہیں جو مسلمانوں کے آنے اور یہاں جم جانے کے بعد پیدا ہوگئی تھی - پھر بھی ان میں سے اکثر فطرت اور عوام کے قریب رہتے ہیں' اردو شاعروں کی طرح نوابوں اور معشوقوں کے در پر نہیں پڑے رہتے' لہذا ان کا عشق ایسا بیہودہ نہیں جیسا ان کے مسلمان متاخرین کا - تاہم کوئی نصب العین اور مسلک نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی 'کرشن' اور گوپیوں کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھتے جس سے ان کا محدود زاویۂ نگاہ ظاہر ہوتا ہے - میرا خیال ہے کہ اگر 'کرشن جی' پیدا نہ ہوتے تو شاید قدیم ہندی شاعری کا بڑا حصہ نہ لکھا جاتا - یہ ہندو طبقۂ امرا کی ذہنیت کا اظہار ہے جسے بڑھاپے میں اپنے بچپن کے افسانے سننے میں لطف آتا ہے - رام اور کرشن کی فتوحات میں یہ لوگ ظالموں کی شکست کا خواب دیکھ رہے ہیں —

اردو ادب کے دور قدیم پر کچھ کہنے سے پہلے دو تین باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں - ایک یہ کہ اردو ادب کا پیش منظر ایرانی ہے - عروض' بیان' معانی' تشبیہ و استعارات اور اساطیر ہی نہیں تقریباً تمام اردو شعرا کی ذہنیت بھی غیر ملکی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایرانی دس سال عرب میں رہنے کے بعد ہندوستان آیا اور یہاں کی زبان میں شاعری کرنے لگا - وجہ ظاہر ہے - مسلمان حکمراں طبقے اور عوام کے مابین ایک سد سکندری قائم تھی - حضرات شعرا میں سے کم ایسے

ہوئے ہیں جو دیہاتوں اور جنگل پہاڑوں کی سیر کرچکے ہیں - شہروں میں اور وہ بھی محبوب کی گلیوں اور نوابوں کے آستانوں میں ان کی عمریں گزر جاتی ہیں - ' درد ' اور ' نظیر ' جیسے شاعر کم ہوئے کہ جنہوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہ بنا لیا ہو - جب شاعری ایک جنس سمجھہ لی جائے تو اُسے بازار کے خرید و فروخت کے اصولوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کے خریدار صرف دولت مند ہوتے ہیں لہذا ان کے ذوق و طبیعت کا پاس لازمی ہے ورنہ سیر تقی میر کی سی حالت ہوجائے - اب درد جیسے صوفیوں کو دیکھیے کہ دنیا سے الگ رہتے اور نظم میں عبادت کرتے ہیں - ممکن ہے کہ حیات بعدالموت کے مسائل کے لیے اُن کی راہبانہ شاعری مفید ہو ورنہ جہاں تک اس زندگی اور اس کے ارتقا کا سوال ہے ' اس قسم کی شاعری ' کرم ' اور ' قسمت ' کے اصولوں کی طرح عوام کے لیے مضر اور جوش عمل کے حق میں نشہ آور ہے —

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ قصائد پر مشتمل ہے جن پر کچھہ کہنا لاحاصل ہے - قصیدہ خواں شاعر ایک ایسا مصاحب ہے جو مقفیٰ تک بلدی کرلیتا ہے - غزل گوئی میں اظہار واردات کا دائرہ اتنا محدود رہ جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھہ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشین ایک رفتار سے ایک سی آواز کرتی چلی جارہی ہے - اب ان معمولی اور متوسط طبقوں کے ماحول کو دیکھیے جس میں لوگ روز ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں - ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں کبھی فرق نہیں آتا تھا - آمد و رفت کے ذرائع کم ہونے کی وجہ سے سفر کی نوبت بھی کم آتی تھی - نہ اخبارات شائع ہوتے تھے اور نہ خطوط آسانی سے آجاسکتے تھے تاکہ باہر کے حالات معلوم ہوسکیں - اس بے رنگ و بو

زندگی کی جھلک غزل کی مقبولیت کی صورت میں نمایاں ہوئی- معشوق سے ہم کلام ہونا — یہ دوسری بات ہے کہ وہ عرش آشیاں تھا یا فرش نشیں — اردو شاعر کا سب سے اہم فریضہ تھا! بجز مثنوی اور مرثیے کے دوسرے اصناف سخن کی زبوں حالی اس طبقے کی کم نگہی اور محدود خیالی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کی اردو شاعری امیروں کی تفریح کے سوا کوئی کام انجام نہ دے سکی- اس میں دو رجحانات زیادہ واضح ہیں- ایک تو 'معشوق حقیقی' سے خطاب اور جسم کی قید سے آزادی کے لیے روح کی بے کلی- یہ صوفیوں کی ترجمانی ہے جو نام نہاد مسلمان امرا کی عیش کوشی اور منافقت سے تنگ آکر دنیا سے بیزار ہوگئے اور ایک جہان نو کی طرح ڈالنے لگے - غربت اور افلاس کی وجہ سے جن شاعروں کی پہنچ محفل جاناں میں نہ ہوسکتی تھی' انہیں بھی اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ جمال باری کے آئینے میں جلوۂ یار دیکھنے لگے!

فتح ہند کے بعد ہی مسلمان امرا اور علما میں تنازع شروع ہوگیا تھا- مذہبی جماعت امور سلطنت میں دست اندازی کی متواتر کوشش کرتی رہی جس میں اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا - مولویوں نے رئیسوں کو احتساب کی تلقین کی بلکہ کئی مرتبہ مے خانوں پر پہرے بھی لگادیے' جس کی وجہ سے عیش پسند اور رند مشرب ان سے سخت ناراض رہنے لگے- چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر محتسب' زاہد اور شیخ کی جس بری طرح خبر لی گئی ہے شاید بوالہوس شاعروں نے سرمایۂ دار معشوقوں کو بھی اتنا نکو نہ بنایا ہوگا- در اصل یہ اس ماحول کی رند روشی اور احتساب و شریعت کی پابندی سے بیزاری کا اظہار ہے — تاریخ شاہد ہے کہ عہد وسطیٰ میں عموماً اور اورنگ زیب کے بعد خصوصاً

مسلمانوں کے زوال کے ساتھ سماج میں ایسی ابتری پھیل گئی جس کی مثال نہیں ملتی - دلی اجڑنے لگی اور لکھنؤ کی چمن بندی شروع ہوئی - نادر شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے دلی کو جیسا خستہ و خراب کیا اس کا اضمحلالی اثر میر درد اور دلی اسکول کے دوسرے شاعروں پر کم و بیش نمایاں ہے - لکھنؤ کی خوشحالی اور خوش باشی کا اثر وہاں کے شاعروں پر جیسا کچھ پڑا اس کے آئینہ دار 'امانت' 'رشک' 'رند' اور جان صاحب' وغیرہ ہیں - 'آتش' ان سے کسی قدر الگ ہے کیونکہ دوسرے لکھنوی شاعروں سے اس کی زندگی مختلف ہے —

تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے' ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے' اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے - پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا' پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیام موت تھی' ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا - اور ان سب سے اہم سنہ ۵۷ع کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا - کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا ؟ کتنے نوحے لکھے گئے ؟ کہاں تھے وہ رجزگو مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی ؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی * پر ایک نوحہ نہ لکھا - واقعۂ سنہ ۵۷ع پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت

* گذشتہ صدی کے آخر میں جب بنگالیوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا تو اس سانحے پر ان کے شیریں مقال شاعر نوین چندر سین نے ایک ولولہ انگیز نظم بعنوان " پلاسیر یودھ " لکھی - اسی طرح اس موضوع پر بنگال کے مشہور شاعر نذر الاسلام نے بھی ایک نظم قلم بند کی ہے واقعۂ سنہ ۵۷ع پر ظہیر شکوہ آبادی کے کچھ کلام اور شاہ ظفر کی کچھ غزلوں کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے -

کا فیصلہ ہو رہا تھا ' یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھہ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزدلانہ اور رجعت پرورانہ طریقوں سے جو زندگی، اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں —

اس ادب کی مثال امربیل سے دی جاسکتی ہے جو اسی درخت کو فنا کرتی ہے ' جس پر پرورش پاتی ہے - کیونکہ عہد قدیم کے تمام شاعر پیشہ ور تھے اور نوابوں اور راجاؤں کے منت کش تھے لہذا امیروں کے مذاق سے اُن کا اثر پذیر ہونا لازمی تھا - اُن کی خوشنودی کے لیے اُن کی زبان میں بولنا بھی ضروری تھا اور بعد میں تو زبان دانوں کے معرکے بٹیروں کی پالی کی طرح عام ہو گئے - اردو زبان میں بال کی کھال جس طرح نکالی گئی شاید اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی - معنی پر زبان کو ترجیح دینا ' اس طبقے اور اس کے لگے لپٹوں کے چھوٹے نظریۂ زندگی کا ثبوت ہے جو نظام زندگی پر سانپ کی کینچلی کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھہ کر طالسطائی کے اس خیال سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "ہمارے سماج میں لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر کوئی آرٹسٹ فکر معاش سے آزاد ہو جائے تو زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے - یہ خیال میرے اس دعوے کی پرزور تائید کرتا ہے کہ ہم جس چیز کو آرٹ سمجھتے ہیں وہ ہرگز آرٹ نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں ہے ! آرٹ اور صنعت میں بڑا فرق ہے - آرٹ فن کار کے ہیجانات کو دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے - ہیجان اسی آدمی میں پیدا ہوگا جو ایک معمولی انسان کی طرح اپنی فطری زندگی کے ہر پہلو کو نشوونما حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے - اگر فن کاروں کو مفت کی روٹیاں ملیں تو ان کی تخلیقی قوت برباد ہو جائے گی - کیونکہ پھر قدرت اور سماج سے خود حفاظتی کے لیے وہ کیسے لڑیں گے

اور ان مطالب کو کیوں کر سمجھیں گے جن سے فکر معاش میں ہر فرد بشر کو دو چار ہونا پڑتا ہے - اس طرح وہ سب سے اہم ہیجانات سے محروم رہ جاتے ہیں جو ہر آدمی میں کم و بیش موجود ہیں اور انفرادیت کے ارتقاء کے لئے ناگزیر ہیں - آج ہمارے سماج میں آرٹسٹ جس عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے، اس سے زیادہ مضر ماحول کسی فنی تخلیق کے لئے ہو نہیں سکتا —

اردو شاعروں میں 'درد' اور 'نظیر' جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے - 'درد' دنیا سے بیگانہ اور 'میر' اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار! اس لحاظ سے دونوں زندگی کے لیے ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں - افسردگی، رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، بدنصیبی اور ناکامی کے گلے ہیں، حسرت و یاس کے افسانے ہیں - زندگی کی کش مکش سے الگ رہنے اور فطرت سے محظوظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان حضرات کو برائیوں کے سوا کہیں کچھہ نہیں دکھائی دیتا - چونکہ میں اظہار جذبات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا، اس لئے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کہتا کیا ہے، کیسے کہتا ہے کا سوال بعد میں آتا ہے - 'نظیر' کے یہاں حسن بیان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہہ اس کی آوارہ اور خانہ بدوش زندگی ہے - لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھہ رہتا، انہیں سمجھتا اور اُن کے تاثرات کو انہیں کی زبان میں بیان کرتا ہے - اس زمانے کی زندگی کا معیار اتنا جاہلانہ تھا کہ ادیب سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی - اگر وہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر پیش کردے اور ساتھہ ہی قلب میں جذبۂ درد ملدی رکھتا ہو تو

بہت ہے - اس لحاظ سے نظیر تلسی داس اور کبیر داس سے پیچھے ہے - تاہم وہ ایک عام شہری کی نظر سے دنیا کو دیکھتا اور اپنے آئینۂ زندگی میں وہ تمام خرابیاں دکھاتا ہے جو اسے نظر آتی ہیں - طور اور نجد کے تذکرے اُس کے کلام میں ناپید ہیں - وہ بوڑھوں، غریبوں اور فقیروں کے ساتھ رہتا اور انہیں قوت گویائی بخشتا ہے - افسوس کہ نظیر محنت کش نہ تھا ورنہ اس کا زاویۂ نگاہ بلند ہوتا - اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کے ادب قدیم میں اسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہے - کبیر عوام کا مصلح ہے تو نظیر ان کا یار غار ہے - کاش یہ دونوں فقیر نہ ہوتے!

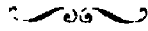
چند صفحات میں ہزاروں سال کے ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا - ہم نے اپنے تجزیہ کے مطابق یہ اصول قایم کیا تھا کہ ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں - اچھے جذبات اچھے ماحول کے محتاج ہیں - پھر یہ بھی دیکھا کہ زندگی ارتقا بالضد کے زینوں سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور ادب اس وقت تک زندگی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمدوش نہ ہو - ادیب کا فرض ہے کہ ماضی کے عیوب سے حال کو باخبر کرے اور حال کی تصویریں کھینچے کہ اس میں مستقبل کے لیے اشارات پنہاں ہوں - جب ہم نے اس روشنی میں ہندوستانی ادب کو دیکھا تو مایوسی اور شرمساری کے ساتھ ہم گورکی سے ہم آہنگ ہو کر چیخ اٹھے کہ " ماضی کے بت کو پوجنے والے شاعرو حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیبو اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگارو مت جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں مٹا دے گی!"

اردو شاعری کے عیوب کے لیے کئی اسباب ذمہ وار تھے - ایک یہ کہ وہ اس زمانے میں پھولی پھلی جو مسلمانوں کی حکومت اور سامنتی تمدن

کے زوال کا دور تھا - جس طبقے نے اسے گود لیا وہ خود قعر مذلت میں پڑا ہوا تیزی سے بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا - پھر اس کی تربیت ایسے ہاتھوں سے ہوئی جنھوں نے نان بائی کی دکان کی طرح اسے اپنی روٹی کمانے کا وسیلہ بنا لیا - یہ تو تھا ہی ساتھ ساتھ ایک تنگ نظر سوسائیٹی میں پرورش پا کر اس نے اپنے لیے عرصہ حیات تنگ کر لیا - سماج کے دباؤ اور اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے شاعر بہت کم موضوعات پر لکھ سکتا تھا - ادب کا پودا آزادی کی ہوا میں ہی پروان چڑھے گا - پھر یہ بھی ہے کہ پودے کی بیجا سنگی اور جنسی تشدد کی وجہ سے گلوے تغزل میں پھانسی کا پھندا سا ہو گیا - اردو شاعری کی معشوقہ — اگر ایسی کوئی چیز ہے تو — ایک ہرجائی طوایف ہے اور سوچئے کہ اس سے کسی قسم کا لگاؤ شاعری کی نازک روح پہ کس قدر گراں ثابت ہوگا —

اس تجزیہ سے کسی کی تنقیص یا تضحیک مقصود نہیں - اس بحث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور کسی چیز کو اس پر فوقیت اور برتری نہیں دی جا سکتی - ادب زندگی سے عبارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے - ادب کے نام پر جو چیز انسان کو زندگی سے بیزار ہونے کی تعلیم دیتی ہے انسان کو فوراً اس سے بیزار ہو جانا چاہیے - سچ پوچھا جاے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ ضائع ہوے ہیں - اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ہوا ہی نہیں - کالیداس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا —

ہندوستانی ادب کے دور جدید کا معاشی تجزیہ



ہندوستانی ادب کے دور جدید پر ہم زیادہ تفصیلی نظر ڈالیں گے کیونکہ اس کا براہ راست ہماری نسل سے تعلق ہے اور اس کی ترکیب و تدوین ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے —

اشاروں اشاروں میں پہلے ہم یہ دکھلا چکے ہیں کہ سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتۂ مادی کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا ہے - علاوہ بریں' ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے - سچ پوچھو تو ہمارے ادب کے سرچشمہ سے جو نئی نئی نہریں کٹ رہی ہیں وہ دراصل متوسط طبقے کی حالت کا پتا دیتی اور اس ذہنی رد عمل کو ظاہر کرتی ہیں جو ایک طرف تو حرفتی اور سامنتی تمدن کی کش مکش اور دوسری طرف ہندوستانی قومیت یعنی دیسی حرفت اور غیر ملکی ملوکیت کے تصادم کی وجہ سے ان میں پیدا ہوگئی ہے —

سنہ ۱۸۵۷ کے بعد انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانیوں کی ذہنیت میں سرعت سے ایک انقلاب ہوتا رہا. کیونکہ انسان جب اپنے مادی

حالات میں رد و بدل کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ان کے قبول کرنے کے لیے تاویلیں بھی پیدا کرلیتا ہے۔ مسلمان حکمراں طبقہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے برسر پیکار رہ کر انحطاط پذیر ہوچکا تھا اب اس کی پذیرائی کے لیے مجبور ہوا - چنانچہ علی گڑھ تحریک در حقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی - پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں جو تحریک شروع کی تھی سرسید نے اب اس کی تجدید مسلمانوں میں کی اور دونوں کا رد عمل قومی زندگی پر تقریباً ایک سا ہوا - جب نئی تہذیب کے نشے میں سرشار ہوکر ایک دو نسلیں بنگال میں نکل چکیں تو وہاں کے اکابر کو یکایک محسوس ہوا کہ انگریزی زبان اُن کی زندگی میں ناسور ڈال رہی ہے' درآں حالیکہ ناسور پہلے سے موجود تھا جسے یہ مغربی نشتر اب ابھار کر دکھا رہا تھا۔ سرکاری نوکریوں میں فرقہ وارانہ تمیزکی وجہ سے آہستہ آہستہ ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی گئی - ادھر زندگی کے نئے نظریوں نے قدامت کا قلع قمع شروع کیا اور ضرورت ہوئی کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ڈھالی جاے اور اس پر جدت کی چھینٹیں چھڑکائی جائیں- فرقہ وارانہ تفریق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قومیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اپنی معاشرت اور تاریخ کے تاریک پہلو کو چھپائیں' اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر دکھائیں اور ساتھ ساتھ نئی روشنی کے حملوں سے بچنے کے لیے جدید کو اپنے مشق ستم کا ہدف اور 'قدیم' کو تمام خوبیوں کا منبع ثابت کریں ـــ

چیکن اور کھٹلے کے ساتھ مسلمان متوسط طبقے نے طلسم ہوشربا اور اندرسبھا کا بانا بھی چھوڑا اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے پیراے نکالے - انگریزی تعلیم کی مقبولیت نے ان کے آگے قدرت کے نئے مناظر پیش

گئے اور سماج کے ساتھہ ادب کو بھی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش ہونے لگی - نظام حکومت کی تبدیلی نے اس طبقے کو مجبور کردیا کہ تحفظ حیات کے لیے اپنی ذہنیت کو مادی ضروریات کے لحاظ سے بدلے اور پھر تو اسے یکا یک معلوم ہونا ہی چاھئے تھا کہ مذھب کا وہ تصور غلط ہے جو اسے حرفتی تمدن کے ساتھہ چلنے سے روکتا ہے - زندہ رہنے کے لیے قبل از غدر کی رومانی اور داخلی (Subjective) فضا سے نکل کر واقعیاتی نقطۂ نگاہ پر آنا ضروری تھا اور اب ادب و زندگی میں بے ربطی اس طبقے کے لئے مضرت رساں تھی - قعر مذلت میں پڑے ہوے مسلمانوں کے جگانے کے لیے بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا - نظم کا عروج اور غزل کا زوال خود فریبی پر خود تنقیدی ' تصور پر عقل اور پابندی پر آزادی کی فتح یابی کا ثبوت ہے - نئے جذبات اپنے لیے نئے اصناف تلاش کرلیتے ہیں - ادھر بنگال میں ٹیگور نے پیش پا افتادہ اور پامال بحروں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی طرز کی طرح ڈالی - اس کاوش میں اسے عہد وسطیٰ کے ویشنو شاعروں سے بڑی مدد ملی جو سماج کی پابندیوں کے ساتھہ سنسکرت چھندوں کی قید سے بھی آزاد تھے اور اپنی تیز رفتاری کے لیے نئی راھیں تلاش کرتے تھے - ھندی پر ان دوتحریکوں کا گہرا اثر ہوا اور برج بھاشا کو چھوڑ کر لوگوں نے کھڑی بولی کو اپنایا جو میرے خیال میں سنسکرت آمیز اردو ہے - اسی طرح گجراتی اور مرھٹی میں بھی شاعری نے نیا رنگ روپ اختیار کیا - غرض زندگی کے ساتھہ شاعری کا ظاھر بھی بدلا - اب یہ دیکھیے کہ زندگی کی مختلف النوع تبدیلوں کے ساتھہ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی کیسے بدل رہے ہیں —

'سرشار' اور ' مولوی نذیر احمد' کے ناول سامنتی تمدن کی پستی کے

دور کا نقشہ کھینچتے ہیں جو اب اتنی نمایاں تھی کہ چشم پوشی سے کام نہ چل سکتا تھا - یہ دونوں حضرات لکھنؤ اور دلی کی زندگی سے خوب آشنا تھے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں شہر مسلمان حکمراں طبقے کے نقش آخر اور اب ان کے انتہائی تنزل کے آثار تھے - سجاد حسین کا اخبار ایک چھوٹے پیمانے پر وہی کر رہا تھا جو 'مولیر' نے فرانس میں اور 'سروونٹس' نے اسپین میں صدہا سال پہلے کیا تھا - یہ دونوں سامنتی تمدن کے دور انحطاط میں پیدا ہوتے اور اپنے طنز کے تیروں سے اس کی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں - سجاد حسین اور سرشار نے اپنی بساط کے مطابق یہی کیا -

ادھر ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق نے ان میں فرقہ پرستی کے بیج بو دیئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ادب پر مردہ پرستی کی مہر لگ جائے اور دونوں قوموں کے اہل قلم ایک دوسرے پر چشمک زنی شروع کریں - ادب کی زندگی کا نیا دور انگریزی زبان کی رومانی تحریک سے متاثر تھا اور اس جذبۂ قومیت کے اظہار کے لیے رومانی ناول سب سے زیادہ مناسب تھے - چنانچہ بنگال میں 'بنکم چندر' اردو میں مولانا شرر اور مرہٹی میں آپٹے نے ناول نگاری کو نئے طریقے سے چمکایا - بنگال میں انگریزوں کے خلاف نسلی تعصب کے جذبات پھیل رہے تھے اور اس طرح بنکم چندر کے ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی بھی داستان ہم پڑھتے ہیں - تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے کا یہ سرکاری عہدہ دار اور خطاب یافتہ مصنف دل میں وہ ولولۂ قومی رکھتا تھا کہ اس کا ایک ناول 'آنند متھ' بنگال میں تراج (Anarchism) کا محرک اور اس کا گیت بندے ماترم قومی تحریک کا ترانہ بن گیا - 'شرر' اسلامی فتوحات کا قصہ گو ہے لیکن بنکم چندر کی تحریروں سے پیچ و تاب

کہا کر 'منصور موہنا' جیسے ناولوں میں اپنے معاصر کی 'چلچل کماری' کا جواب دیتا ہے - شکر ہے کہ ادب کے سر سے یہ آسیب جلد اتر گیا اور بعد میں صرف اخباری نظموں اور 'افسانہ' کے نام سے منسوب کی جانے والی چیزوں میں اس کا اثر باقی رہ گیا —

حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ان کے ہم عصر اردو اور ہندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو خیالات کی تبلیغ کے لیے بہت موزوں سمجھا - موجودہ دور کے ہندی شاعروں میں 'بابو میتھلی شرن گپتا' کا رتبہ بہت بلند ہے - مسدس سے متاثر ہوکر انہوں نے 'بھارت بھارتی' نامی نظم لکھی جو ہندی میں بے حد مقبول ہوئی - موضوع دونوں کا ایک ہے، دونوں کا رنامۂ اسلاف سنا کر زمانۂ حال کی زبوں حالی کی تصویر کھینچتے اور اپنی اپنی قوم کو پیام عمل سناتے ہیں - مسدس جس کی نقالی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں کی گئی، ادبی انقلاب اور قومی بیداری کی خبر دیتی ہے - اس کے چند سال بعد ہی انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آتی ہے اور کچھہ عرصے بعد بنگال سودیشی تحریک شروع ہوتی ہے - یہ قومی اور سیاسی تحریکیں بیداری کے آثار ہیں - ان کے محرک اور موید ایک تو وہ لوگ تھے جو سیاسیات اور حکومت میں شرکت کے طالب تھے یا وہ لوگ جو قومی حقوق یعنی دیسی صنعت و حرفت کی توسیع کا مطالبہ کر رہے تھے - ہندوؤں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً قومی خودداری کا احساس بڑھتا جاتا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھہ ادب میں بھی جوش و ولولہ کے اثرات پیدا ہونے لگے تھے - گذشتہ صدی کے اواخر میں جب نیل کی کاشت کے انگریز اجارہ داروں کے مظالم حد سے تجاوز کرچکے تو ایک

بنگالی مصنف کا ڈراما موسومہ 'نیل درپن' ہی تھا جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کا علم بلند کر دیا اور بالآخر حکومت کو ان شکایتوں کو رفع کرنا پڑا - 'نوین چاندر سین' نے پلاشیر جدھ (پلاسی کی لڑائی) کے عنوان سے ایک عدیم النظیر رزمیہ نظم لکھ کر بنگال کو اس خوں چکاں واقعے کی یاد دلائی اور مشہور ڈراماتسٹ ڈی - ایل - رائے نے کئی قومی نغمے لکھے جو آج بھی بنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں —

نئی روشنی اور پرانی روشنی کا تنازع در اصل ہندوستانی سماج کی اس کش مکش کو ظاہر کرتا ہے جو مشینوں کے عروج اور دست کاری کے زوال کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی - ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظریۂ زندگی بھی بدل جائے - یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی انسان میں ماضی کی پرستش کا جذبہ پیدا کردیتی ہے چاہے وہ بذات خود کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو - جس طرح بوڑھا عہد پیری میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے درآں حالیکہ یہ یاد بے سود ہے' اسی طرح جب کوئی تہذیب غارت ہوتی ہے تو اس کے نام لیوا زمانۂ قدیم کی مدح سرائی کی صورت میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں - روس میں سامنتی دور کے انحطاط اور سرمایہ داری کی اٹھان کے ساتھ 'طالسطائی' پیدا ہوتا ہے' انگلستان میں 'رسکن' اور 'کارلائیل' مشینوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں 'فرانس میں 'روسو' رجعت قہقری کی حمایت کرتا ہے - اس دور کے ہندوستانی ادیبوں میں بھی بڑی حد تک یہ ذہنیت کام کررہی ہے - چونکہ ہندو اور اسلامی تمدنوں کا امتیاز متوسط طبقے میں رہتا آیا ہے اور یہی لوگ ہنوز قومی زندگی کے نگہبان اور علم و ادب کے پاسباں رہے ہیں' اس لیے اپنی اپنی

روایتوں کے لحاظ سے یہ اس جذبۂ شکست کا اظہار کرتے ہیں - 'طالسطائی' جس قسم کے نراج کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہندو تمدن کے عہد زریں کی تصویر ہے - عدم تشدد' رہبانیت' مشینوں کا ناس اور اس قسم کی چیزیں ہندو تمدن کے عناصر میں سے ہیں اور ان کے لئے قابل قبول ہیں - اسی وجہ سے 'طالسطائی' کے اصول' 'ٹیگور' کے ادب اور 'گاندھی جی' کی تحریکوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں' حالانکہ میرے خیال میں 'ٹیگور' اس روسی ادیب سے قریب تر ہے - مسلمان ادبا بھی دور حرفت اور مشینوں سے منحرف ہیں لیکن ان کی برائیوں کا حل وہ اسلامی روایتوں کے مطابق تلاش کرتے ہیں - تاہم دور حرفت اور سائنس سے کلیتاً بغاوت اور ماضی کی پرستش اس دور کے ادب کی بڑی خصوصیتیں ہیں - 'اکبر الہ آبادی' 'اقبال' اور 'ٹیگور' جابجا مغربیت کے خلاف مشرقی معاشرت کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں - خصوصاً 'اکبر' کو ہر پرانی چیز اچھی اور ہر نئی چیز بری معلوم ہوتی ہے - لیکن چونکہ وہ کوئی مفکر نہیں اس لیے اپنے باقی دونوں معاصروں کی طرح موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کرسکتا —

ادب ہند کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر یہ دیکھ لینا چاہئے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملک میں کیسی کیسی تحریکیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں —

دیسی سرمایہ داروں کی تحریک بنگال کی سودیشی تحریک سے شروع ہوکر سنہ ۲۰-۲۲ ع کے عدم تعاون میں اپنے حد عروج کو پہنچتی اور پھر رفتہ رفتہ کم زور ہونے لگتی ہے اور گزشتہ تحریکوں کے بعد پر شکستہ ہو جاتی ہے - قومی تحریکوں کی وسعت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا صور پھونکا

جاتا ہے اور ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش ہونے لگتی ہے - عربی فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے اور ہندی میں اردو اور اردو میں ہندی الفاظ مقبول ہونے لگتے ہیں - مسلمان متوسط طبقے پر چونکہ حجاز و شیراز کا رنگ چڑھا رہا ہے لہذا ان کی تہذیب میں بڑی غیر ملکی عنصر پایا جاتا ہے مگر یہ ایک عجیب بات ہے کہ وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی 'برج نارائن چکبست' آنجہانی تھے - ہندو متوسط طبقہ ان تحریکوں میں پیش پیش رہا ہے اور اسی لیے اس کا ادب زیادہ قوم پرورانہ ہوتا جاتا ہے - ادھر قبل از جنگ اور دوران جنگ کی پان اسلامی تحریکیں اور سنہ ۲۱ - ۲۰ ع کی تحریک خلافت سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوتی ہے اور 'اقبال' کی سرکردگی میں اسلامی قومیت کے سپاہی اردو ادب پر چڑھ آتے ہیں - بایں ہمہ مسلمان نوجوانوں کا ایک طبقہ ملکی تحریکوں کا ہمدرد اور موئید ہے اور 'جوش ملیح آبادی' سیماب اکبرآبادی' اور 'ساغر نظامی' وغیرہ ان جذبات سے متاثر ہوے ہیں - عدم تعاون کی ناکامیابی کے بعد ملک میں کئی سال تک جمود کی سی کیفیت رہتی ہے - نوجوانوں کا ایک طبقہ مستقبل سے ہراساں ہوکر یا توانگریزوں پر بم پھینکنا چاہتا ہے یا طرب و نشاط میں اپنی کلفتوں کو بھول جانا چاہتا ہے - اس دور کی بعض ہنگامی تصنیفیں اور اردو اور ہندی شاعری کی رومانی تحریکیں اس جذبۂ شکست کو ظاہر کرتی ہیں - گاندھی جی کے عدم تشدد اور انقلاب پروروں کے نظریۂ تشدد میں تصادم ہو رہا ہے جس کا عکس ہم ایک طرف کنڑی کے مشہور شاعر 'اناگولا' اور گجرات کے سحر طراز قومی

شاعر 'اردھیر خبردار' کی ستیاگرھی نظموں اور دوسری طرف شاعر انقلاب 'قاضی نذرالاسلام' کے ھنگامہ پرور کلام میں دیکھہ سکتے ھیں - سنہ ۲۵ ع کے بعد سے عوام کی خفتہ روح بھی جاگ رھی ھے اور مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کردیا ھے - متوسط طبقے کے کچھہ لوگ ان کے حقوق اور مطالبات کی تائید کررھے ھیں اور اسی طرح دور جدید کے ادب میں صرف یہی نہیں کہ ان کی حالت کیا ھے بلکہ کہیں کہیں یہ بھی دکھلانے کی کوشش کی جارھی ھے کہ انہیں کیا کرنا چاھیے - 'پنڈت دیوندر ستیارتھی' نے بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کر رکھا ھے - 'ادھر 'ٹھکور' 'شرت چندر چٹرجی' اور 'پریم چند' ان برائیوں کا حل 'اصلاح' کو سمجھتے ھیں اور سرمایہ داروں اور زمینداروں سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ھیں تاکہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھہ ایک ھی گھاٹ پانی پی سکیں - کچھہ عرصے سے اشتراکیت اور انقلاب کی تحریکوں کی مقبولیت اور اصلاحی جدوجہد کی ناکامی نے ھر زبان میں ایسے ادیب پیدا کردیے ھیں جو نظام معاشی کی صحت کے لیے سرمایہ داری کی تباھی کو ضروری سمجھتے ھیں - اس ضمن میں ھم مرھٹی کی چندر لوک (چاند کی دنیا) اور بنگلہ کی 'شرمک گان' (مزدوروں کا گیت مصنفہ منصور احمد) کے نام لے سکتے ھیں —

بہر حال یہ تو ظاھر ھے کہ دور جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ھے اور غزل جیسی داخلی صنف کا زوال اور نظم جیسی واقعیاتی صنف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ھے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قایم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کرنا چاھتا ھے - اب دیکھنا یہ ھے کہ ادب کے یہ نئے رجحانات زندگی کو منزل

مقصود کی طرف لے جا رہے ہیں یا نہیں اور اگر ان میں کمی ہے تو وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے - ہم اپنی سہولت کے لیے اس دور کے کچھ بڑے شاعروں اور ادیبوں پر زیادہ وضاحت سے نظر ڈالیں گے اس اعتبار سے کہ یہ لوگ کن مختلف ادبی تحریکوں کے پیشوا ہیں —

رجعت اور تہذیب | حقیقی تہذیب پرانی بنیادوں کو تہ و بالا کر کے زندگی میں خلا پیدا کر دیتی ہے - خاندان کا شیرازہ منتشر ہوتا جاتا ہے'

دیہاتوں کی خوش اطمینانی ختم ہوتی اور شہروں کی ہنگامہ پروری ان پر حاوی ہوتی جاتی ہے - سرمایہ داری پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہوں کو بھی بند کر دیتی ہے - بچہ اگر بڑھ کر بالغ ہو گیا تو اس کی پوشش کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے - پرانی تنگناہوں میں لپٹا گیا تو یا تو اس کا دم گھٹ جائے گا یا کپڑا پھٹ جائے گا - لیکن سادہ لوح والدین اس کش مکش سے گھبرا کر کپڑوں کی قید سے اسے آزاد کرنے کو ہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں - یہی حالت ان منکرین کی ہے جو راہ ترقی کی دشواریوں سے بچنے کے لیے رجعت کی کلہاڑی سے دنیا کے پیر کاٹنا چاہتے ہیں —

طالسطائی پر تنقید کرتے ہوے 'لونن' ایک جگہ لکھتا ہے کہ " اس کی قوت تخلیقی اور جدت طبع بظاہر سرمایہ داری کے مظالم پر نکتہ چینی کرتی ہے - حکومت کے استبداد اور عدالت کی انصاف کشی پر اس کا دل غم و غصہ سے لبریز ہے - تہذیب کی فتوحات کے ساتھ جس طرح غریبوں کے خون سے دولت کے ایوان کھڑے ہوتے ہیں وہ ان سب کا جائزہ لیتا ہے - لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ بانگ دہل ہے جو یہ مجذوب تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی حمایت میں بلند کرتا ہے - طالسطائی میں مظالم کے خلاف نفرت ہے' کسی روشن مستقبل کی تمنا ہے 'ماضی' کی پابندیوں سے

آزاد ہونے کی جد و جہد ہے لیکن ساتھہ ساتھہ اس کا تصور ابھی خام ہے، شعور سیاسی کی کمی ہے اور تغیر پسندی سے جھجک ہے" —

قبل از انقلاب - فرانس اور روس کے ادبا اور مفکرین نظام زندگی کی بد عنوانیوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے لیکن جب کسی نے آگے بڑہ کر اس کے عملی سد باب کی تدبیر بتائی تو یہ حواس باختہ ہوکر تصوف اور روحانیت کے حجروں میں جا چھپے - ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور ٹھیکور کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرسکتے ہیں -

شاعر سوال کرتا ہے کہ "کوی کی کائیے' کی شلایہ ؟ - شاعر تو کیا گانے کا کیا سنائے گا ؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے : "دنیا میں جب سب لوگ بر سر کار تھے' اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر میدان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سایے میں بیٹھہ کر دن بھر بانسری بجاتا رہا - للہ اب تو اٹھہ جا -

آگ کہاں لگی ہے ؟ دنیا کو بیدار کرنے کے لیے کون صور پھونک رہا ہے - کسی کی فریاد سے فضا گونج رہی ہے ؟ کس قید خانے میں پابہ زنجیر دکھیاری مدد کی طلب گار ہے ؟

لا تعداد بے بس کے سینوں کا خون توہین انسانی کو فسل دے رہا ہے - خود غرضی درد انسانی پر ہنس رہی ہے - وہ بے زبان جو سرنگوں کھڑا ہے - جس کے اترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی داستان کندہ ہے جو جھکے جی ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلتا ہے اور پشت در پشت اس بار مصائب کو ورثے میں چھوڑ جاتا ہے — وہ قسمت کا گلہ گزار نہیں ہے' نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرتا ہے - جو کام کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے دو مٹھی اناج کے سوا کچھہ نہیں

چاہتا اور جب اس مایۂ حیات کو بھی کوئی چھین لیتا ہے ' جب کوئی فرعون اس کے اس اثاثہ پر بھی دست درازی کرتا ہے تو وہ بد بخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ہے —

اسی حسرت نصیب کو قوت گویائی بخشتا ہے - اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں امید کا دیا جلاتا ہے - اسے پکار کر کہتا ہے کہ چشم زدن کے لیے سر بلند ہو جا اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ بر اندام ہے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بزدل ہے - جیسے ہی تو جاگے گا وہ راہ فرار اختیار کرے گا - تیرے سامنے آتے ہی وہ راستے کے کتے کی طرح دم ہلانے لگے گا - خدا اس کا دشمن ہے ' وہ بے یار و مددگار ہے ' اس کی چرب زبانی پر نہ جا - وہ دل ہی دل میں اپنی ذات پر نادم ہے —

اے شاعر ' اگر تیرے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو اسے اپنا ہمنوا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر - غم و اندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور اس نصیبی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے - روٹی ' زندگی اور روشنی کی ضرورت ہے - صحت ' غم اور آزادی سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے - اے شاعر ' افلاس کی طغیانی میں ایک مرتبہ جنت کے ہوشربا نظاروں کے دروازے کھول دے - " (ماخوذ از چترا)

سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف اپنی مشہور نظم 'وسوندھر' (زمین) میں کہتا ہے :—

" یہ جہانسوز خون کی پیاسی بربریت کسی دین و آئین کی قائل نہیں اور نہ کسی رسم و رواج کی پابند ہے - اسے فکر فردا ہے اور نہ فکر امروز - اس کی زندگی سمت و ساحل سے بے خبر ہو کر دیوانہ وار بھاگ رہی ہے - نہ وہ ماضی کی طرف دیکھتی

ہے اور نہ مستقبل کی پروا کرتی ہے - 'آج' کی موجوں پر آوارگی اور حباب آسا مسرتوں کو نچاتی ہوئی وہ اس بے حقیقت ناؤ کی طرح رواں ہے جو اپنا ہر بادباں کھولے کسی راہ بے منزل کی طرف جا رہی ہو' —

لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان تعلقات کی بربادی کا آرزو مند ہو جو انسان کے لیے آتش زیر پا بن گئے ہیں وہ پیداوار کے تمام جدید ذرائع کو مٹا کر دور وحشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے - تہذیب سے خطاب' نامی نظم میں کہتا ہے : "اے نئی تہذیب' مجھے وہ پرانے دشت و جبل لوٹا دے اور اپنے اس شہر کو — اس لوہے' پتھر اور لکڑی کے مقبرے کو واپس لے لے ۔ اے انسانیت سوز تہذیب لئیم' ایک بار پھر وہ عبادت گاہ مجھے لوٹا دے جس کا سایۂ عاطفت نیکی کا گہوارہ تھا ... میں آزادی چاہتا ہوں' اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلانا چاہتا ہوں - اپنے سینے میں پھر ان کھوئے ہوئے جذبات کو جگہہ دینا چاہتا ہوں اور تمام پابندیوں کو توڑ کر اپنے دل کو اس دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں" —

ٹیگور کا کوئی ادبی کارنامہ حال اور ماضی کے اس تنازع سے خالی نہیں ہے - زمانۂ حال سے اسے سخت نفرت ہے' سرمایہ دارانہ تمدن کا وہ گلہ گزار ہے - یہ تمدن مادی مطالبات سے روح کو گراں بار ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے وجود سے انسان کو بے پروا بنا رہا ہے - زندگی ابد تک وسیع کیا ہوتی بلکہ 'آج' اور 'ابھی' کی ایک ساعت میں سمٹ رہی ہے - 'ٹیگور' یہ خوب سمجھتا ہے کہ نظام معاشی کی افراتفری نے ہی یہ ستم برپا کیا ہے - روس کی سیاحت کے اثنا میں وہ پروفیسر پیٹروف کو لکھہ چکا ہے کہ روس کی اس ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں دولت پر کسی ایک

بقے کا نہیں بلکہ پورے سماج کا قبضہ ہے - تاہم اپنے ملک کے مسائل کا
وئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا - سوا اس کے کہ لوگ جنگلوں
ر پہاڑوں میں تصوف کی الجھنوں کو سلجھاتے رہیں - امید و بیم کے دو
تضاد جذبات اس کے کلام میں جا بجا ملیں گے - انسانیت کے مستقبل پر اس
ایمان ہے لیکن تعمیر کب اور کیسے ہوگا یہ وہ نہیں بتا سکتا - یہ رنگ
ر کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے اور 'سونار تری' (سنہری کشتی) میں
س نا معلوم منزل کا پتا دریافت کیا گیا تھا شاعر اپنے آخری مجموعہ
بلاکا' میں بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہے: "جو دریاے زندگی
یں اتر چکا وہ ساحل کی پروا کیوں کرے؟ کشتی کا آسرا کیوں ڈھونڈے؟
خدا کا احسان کیوں اٹھاے؟ اس کارواں کی کوئی منزل مقصود
ہیں ' نہ وہ کہیں ٹھہرتا ہے' اور نہ کہیں آرام لیتا ہے - راہ میں
ہیں دم بھر آرام لیے بغیر وہ اس راستے پر چلتا رہتا ہے جس کا اور
ھور نہیں ملتا " —

اس کی اکثر نظمیں اس فقدان مقصد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً:
انسان کی وہ آوازیں میرے کان میں گونج رہی ہیں جو کہر آلود ماضی سے
ل کر بعید از فہم ابد کی طرف کسی نا معلوم رستے سے سفر کرتی چا
ی ہیں - اور اپنے دل میں اس آشیاں بدر پرندے کی فریاد سنتا ہوں
؛ لاتعداد پرندوں کے ساتھ اس دھوپ چھانو سے نکل کر معلوم نہیں
اں سے کہاں جا رہا ہے - اس کا یہ نغمہ فضا کو مترنم کردیتا ہے کہ یہاں
یں 'کہیں اور' کہیں اور' کسی دوسری جگہ — "

راہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شاعر کی جستجو نا کام رہ جاتی ہے
؛ وہ تصوف کے الجھیڑے میں الجھ کر انجام کار حزنیت کا شکار ہوجاتا

ہے - چنانچہ اس کی پچھلی نظموں میں سے اکثر موت 'عدم' فنا اور پیری کا نوحہ سناتی ہیں - وہ ٹیگور جس نے بنگال کی سودیشی تحریک سے متاثر ہوکر لکھا تھا کہ "اگر تیری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی تو اکیلا ہی بڑھتا چل" — جس کے ولولہ انگیز نغمے نے انقلاب پروروں کو دار و رسن پر امید کا چراغ دکھلایا تھا — "اگر رات اندھیری ہے اور کوئی راستہ نہیں دکھاتا تو اپنے سینے کی ہڈیوں کو مشعل راہ بنا اور اکیلے ہی چلا چل" — اس کا جسم ہی نہیں روح بھی بوڑی ہوچکی اور اس کا پچھلا مجموعۂ کلام اس کی بے راہ روی کا افسانہ ہے —

کبھی کبھی ٹیگور رفارمر کی صورت میں بھی نظر آتا ہے - "گورا" اور "کمدنی" نامی ناولوں میں سماج کی ناپاکیوں کو دکھانے کے بعد وہ تعلیم یافتہ طبقے سے انصاف اور اصلاح کی اپیل کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر برائیاں دور ہوسکتی ہیں —

غریبوں میں وہ نمک حلالی اور ایمان داری کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے اور امیروں کو رحم دلی اور انصاف پروری کی تلقین کرتا ہے - اپنی ایک نظم "بوڑھا نوکر" میں اس ملازم کا تذکرہ رو رو کر کرتا ہے جو لاکھہ تکلیفیں جھیل کر بھی اُف نہیں کرتا اور مالک کو خدا مانتا ہوا اس کی چوکھٹ پر مرجاتا ہے -

بہر نوع جہاں تک استعمار کا سوال ہے 'ٹیگور' اس کا مخالف ہے - بعد ازآں اس کے پیغام میں ثنویت (Dualism) پیدا ہوجاتی ہے - سرمایہ دارانہ تمدن کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں بلکہ مشینوں کے رواج کا لازمی نتیجہ سمجھہ کر اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ آگے چلوں یا پیچھے بھاگوں - اور جب ملوکیت کو فنا کرنے کے لیے اس سے عملی تدبیریں دریافت کی

جاتی ہیں تو وہ اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کرنے لگتا ہے - تاہم ٹیگور کے کلام کا بڑا حصہ ادب جدید کے لیے قابل قبول ہے اور یہ خیال بڑی حد تک غلط ہے کہ وہ عمل کا دشمن ہے - ٹیگور ہر گام پر پیام عمل سناتا ہے اور اس لحاظ سے اپنے معاصرین سے کہیں بلند اور قابل احترام ہے کہ اس کا پیغام کسی خاص دور یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں ہے - اس کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور زمان و مکان سے بالاتر ہے --

اکبر الہ آبادی مرحوم رجعت اور قدامت کے سب سے بڑے علم بردار گزرے ہیں اور ان کا طنز از آغاز تا انتہا مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا پڑا ہے - یہ ان بوڑھے والدین کے شاعر ہیں جن کا تمدن دیسی جوتی، پگڑی اور اچکن تک محدود ہے اور جن کا مذہب جھگڑوں پر چل سکتا ہے، ریل گاڑی سے اسے بعد ہے! یہ سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنزیہ نک بلندی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا - یہ کہنا لا حاصل ہے کہ یہ ادبی رجحان عام تھا جو نئی روشنی اور پرانی روش کے اس تنازع کا پرتو ہے جو اب بھی ہر ہندوستانی خصوصاً ہر مسلمان خاندان میں شدومد کے ساتھ جاری ہے - سامنتی تمدن مغربیت کے نرغے سے نکلنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں سوچتا ہے - کبھی وہ انگریزی تعلیم کا یک لخت مخالف ہو جاتا ہے اور کبھی ملازمتوں کی لالچ سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ مغرب سے اچھی اچھی چیزیں لے لی جائیں - چنانچہ ہمارے ادبا کا ایک گروہ اب اس حد تک صلح کرنے پر تیار ہے کہ مشرق و مغرب یعنی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں میں میل کرا دیا جائے - اس لچر نظریہ کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ ہنوز ہمارے ملک میں سامنتیت کے کھنڈر باقی ہیں اور صنعت و حرفت کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا جو ملوکیت سے آزاد ہوکر ہی حاصل

ہو سکتا ہے - بہر حال ' ٹیگور ' اقبال ' جوش اور اردو شہر خبردار جیسے استعمار
دشمن شاعروں نے بھی ' مشین ' اور ' مشین کے مالک ' کے امتیاز کے سمجھنے میں
غلطی کی ہے اور تقسیم کی بے عنوانی سے تنگ آکر پیداوار کے ذرایع کو مٹا
دینا چاہتے ہیں - جو غلطی سیاسی میدان میں گاندھی جی اور دوسرے
سامنتی رہنما کر رہے ہیں ' اس کا اعادہ دنیائے ادب کے یہ اکابر بھی کر رہے
ہیں - ظاہر ہے کہ ان جذبات کی مقبولیت مادی اعتبار سے دنیا کو پیچھے
لے جائیگی کیونکہ تہذیب کے مستقبل کا انحصار قدرت اور انسان کی جنگ
کے نتیجے پر ہے - اس لیے یہ نظریہ انسان کی شکست اور پسپائی کا اعلان ہے —

فاسیزم (fascism) اور اقبال —

اقبال کا نظریۂ زندگی بڑی حد تک اس تحریک سے متاثر ہے جس
کے بانی ' جمال الدین افغانی ' تھے - مشرق نے مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں
کے خلاف جو احتجاج شروع کیا اور یورپ میں نیٹشا ' برگساں اور میزنی
نے حرفتی تہذیب پر جو اعتراضات کیے اقبال ان سے بھی اثر پزیر ہوا - وہ
اسلام کے نام پر ایک تصور عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی رائے میں مسائل
زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملی جامہ پہنائے - یہاں
میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور
یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری (neo-capitalism) کے سوا
کچھہ نہیں ہے - ظاہر ہے کہ فاسیزم پر کوئی جامع بحث اس مضمون کے
احاطے سے باہر ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اپنے تجزیہ کی تائید میں بعد
از آں ثبوت پیش کروں گا —

سلطنت (State) بجائے خود کوئی ملتہا نہیں بلکہ سماج کے تعلقات انسانی
کی محافظت کا ایک آلہ ہے اور چونکہ ان تعلقات کا انحصار ذرائع پیداوار کی ملکیت

پر ہے اور وہی طبقہ سماج میں برسر اقتدار ہوتا ہے جس کے ہاتھہ میں کلید ملکیت ہے اپنا سلطنت، تھی دست طبقے کی پامالی کے لئے، طبقۂ غالب کی انجمن کارساز ہے - ارتقائے انسانی کے لئے ضروری ہے کہ زمام سلطنت اس طبقے کے ہاتھہ میں رہے جو پیداوار کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے - سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فایدہ ضرور پہنچایا کہ سامنتی سماج کی بنیاد کو فنا کر کے مشینوں کے رواج کو عام کر دیا - لیکن اس کی عمر طبیعی اسی روز ختم ہوگئی جب وہ پیداوار اور اس کی تقسیم میں ارتباط قائم نہ کرسکا - کیونکہ دور حرفت اجتماعی پیداوار کا زمانہ ہے اس لئے ضروری ہوگیا کہ پیداوار کے ذرایع پر چند لوگوں کی ملکیت نہ ہو بلکہ پورا سماج اس کا مالک اور منتظم ہو - یہ تبھی ممکن ہے جب وہ محنت کش طبقہ سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھہ میں لے جو اقتصادی قالب کو اس طریقے سے بدل سکتا ہے - سرمایہ داری انحطاط پزیر ہوتی جاتی ہے اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے وہ نئے حیلے تراشتی اور نئے معاونین تلاش کرتی ہے -

مشین نے معاشیات کو قوم و ملک کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا ہے اور اب اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت کی پابندیاں توڑدی جائیں اور مالیات و سیاسیات میں امتزاج پیدا ہو جائے - لیکن وطنی سرمایہ داروں کی جماعتیں یوں خودکشی نہیں کرسکتیں - بین اقوامیت کے چڑھتے ہوے دریا کو روکنے کے لئے وہ نئی دیواریں باندھنے لگتے ہیں - وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارا ملک یا ہماری قوم یا ہمارا مذہب یا ہماری نسل دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل ہے - اطالیہ قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام لایا ہے ! جاپانی برگزیدہ بندے ہیں، جرمن خدا کی بہترین مخلوق ہیں ! وہ اپنا فرض اسی حالت

میں ادا کرسکتے ہیں کہ آپس کی خانہ جنگیاں بند ہوں - رعایا کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار ہے یا مزدور صرف ایک حاکم کا اطاعت گزار ہے - ہیگل اور اس کے جرمن متاخرین سلطنت کو اس تصور (Idea) کی تعبیر بتاتے ہیں جس کے حصول کے لیے سماج ارتقا بالقصد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے- پارلیمینٹری نظام حکومت صرف اس حالت میں قابل قبول تھا جب تک مالیات میں عدم مداخلت (laissefaire) کے اصول پر عمل ہوسکتا تھا- لیکن اب مزدوروں کی تحریک کو کچلنے اور ساتھ ساتھ سلطنت میں یک جہتی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کو فنا کر کے ڈکٹیٹری قائم کی جائے- ڈکٹیٹر ایک انسان برتر ہے جو ہر طبقے کے ساتھ انصاف کرتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی اور نسلی تعصب سے بالا ہے - وہ سرمایہ داری کی سرکوبی کرتا ہے اور مزدوروں کو ' انتہا پسندی ' کی طرف نہیں جانے دیتا ! پھر اس کا وطن دنیا کا پیشوا ہوگا' اس لئے وہ قومی اور وطنی تہذیب کا نگہبان بھی ہے ! اشتراکیت میں وطنیت ' قومیت اور روحانیت کے لئے جگہہ نہیں ہے اور چونکہ متوسط طبقے کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے ' اس لیے وہ ہمیشہ ان کی دوہائی دیا کرتا ہے- اس طبقے کے نوجوان پرنا سیست حکومت کے پشت پناہ ہیں —

اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے - یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے - تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے - اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں - حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں-

اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل بھی ہوا تھا - بعد از آں مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ قطعاً غیر اسلامی تھا - اور ممکن ہے کہ وہ روحانی اعتبار سے مسلمان ہوں لیکن اسلام کے سماجی تصور سے انہیں کچھ زیادہ واسطہ نہ تھا - بہر حال' وطنیت کا مخالف ہوتے ہوئے بھی 'اقبال' قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح 'مسولینی' - اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی - فاسسٹوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے :

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوریت از پیام مشرق)

فاسزم اور اشتراکیت میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جہاں اول الذکر عوام کو پیدایشی خر بتاتا ہے' وہاں اشتراکیت ان کی کم فہمی کو ماحولی سمجھتی ہے اور بنا بریں اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے- فاسزم کا ہمنوا ہوکر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے-

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب   ہر دو یزداں ناشناس' آدم فریب
زندگی ایں را خروج' آں را خراج   درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
فرق دیدم ہر دو را در آب و گل   ہر دو را تن روشن و تاریک دل

(اشتراکیت و ملوکیت از جاوید نامہ)

ملوکیت و سرمایہ داری کا وہ اس حد تک دشمن ہے جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی ہوسکتا ہے - بندہ اور بندہ نواز کی تفریق

بظاہر مٹ جائے اور محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں! مشینوں کا رواج انسانیت کے لیے مضرت رساں ہے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت　　احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

درآں حالیکہ آلات خود کچھ نہیں کرتے' بلکہ وہ مخصوص حالات مروت کو کچل دیتے ہیں جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے - آلات تو مال پیدا کر دیتے ہیں' اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس کی تقسیم مناسب طریقے سے کرے - 'اقبال' مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا —

زمامِ کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہوس اندر دل آدم نہ میرد　　ہماں آتش میانِ مرزغن هست
عروس اقتدار سحر فن را　　ہماں پیچاک زلف پرشکن هست
نماند ناز شیریں بے خریدار　　اگر خسرو نباشد کوہکن هست

(از پیام مشرق)

سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو متاکر نظام معاشی کو از سر نو قائم کرنے کے لیے 'اقبال' ایک تصور عالم پیش کرتا ہے - لیکن ایک بین اقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین اقوامی طبقہ نہیں بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو 'اقبال' کی نظر میں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف بھی لوگ ہوں گے - اپنے خواب کی تعبیر اطالوی فاسیست میں دیکھ کر وہ جوش سے کہتا ہے:

رومۃ الکبرا! دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں ہیں تیرے سوز آرزو سے سینہ تاب

یہ محبت کی حرارت ! یہ تمنا ! یہ نمود !
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے ؟ کرامت کس کی ہے ؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

(مسولینی از بالِ جبرئیل)

یہ فیض 'مسولینی' کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لیے ساری دنیا کو فنا کرسکتا ہے، جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے، جو جنگ کو انسانیت کے لیے شیرِ مادر بتاتا ہے - 'اقبال' ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے - خلافت کا تصور اس کے نظریے کی تائید کرتا ہے حالانکہ 'خرانِ جمہور' میں وہ 'طبعِ سلمانی' کہاں جو اس ڈکٹیٹر کو 'مشورہ' دے سکے ـــ

مختصر یہ کہ 'اقبال' اسلامی فاسیت ہے اور اس کا ردِعمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منجے کے ہندو فاسزم کی صورت میں ظہور پزیر ہو رہا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج، اور ذات پات کی تقسیم، تقسیم عمل کا بہترین نمونہ ہے !

ادب اور قومیت

ہندو مسلم نفاق در اصل دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے اور ہم دیکھہ چکے کہ کس طرح 'ٹیگور' اور 'اقبال' اپنا تصور عالم پیش کرکے ان متضاد رجحانوں کو ظاہر

کررہے ہیں - سیاسی اغراض کی خاطر ہر دو قوم کے متوسط طبقوں میں باہم اتحاد اور امتزاج کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ بھی ادب ہند پر ایک نقش چھوڑ گئی ہے اور دونوں قوموں کے کئی ادیب خالص وطنی اور قومی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں - وہ ہندوستانیوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ خانہ جنگیوں کو بند کرکے غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنا محاذ قائم کریں - ان کے نزدیک وطن سب کچھ ہے - وہ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے کہ آئندہ حکومت کا دستور کیا ہوگا - بس انگریزوں کے جاتے ہی کوئی جادو کی چھڑی ہر معاملے کو درست کردےگی گویا سماج کی تمام برائیاں صرف ان سے وابستہ ہیں - ظاہر ہے کہ اب تک جو سیاسی تحریکیں اس ملک میں اُٹھہ اُٹھہ کر گرتی رہیں وہ اس قوم پرورانہ جذبے سے متاثر تھیں جس کے پیچھے دیسی سرمایہ دارانہ مفاد کام کررہے تھے - اردو میں 'چکبست' 'جوش' اور 'ساغر نظامی' ہندی میں 'نوین' ایک 'بھارتیہ آتما' اور 'بابو میتھلی شرن گپتا' انگریزی میں 'سروجنی نائیڈو' اور 'ہرین چٹرجی' گجراتی میں 'اردشیر خبردار' اور دکن میں 'اناگولا' اس قومی رجحان کے ترجمان ہیں - ہندومسلم تفریق کو مٹاکر ایک قوم کو جنم دینے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کرنے کا بھی سامان ہورہا ہے - چنانچہ صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی اردو والے ہندی کے اور ہندی والے اردو کے بکثرت الفاظ مستعمل کرنے لگے ہیں - تحریک اتحاد کے بعد ہی اردو میں ہندی گیتوں کی مقبولیت ہوئی اور ہندی میں مشہور شاعر 'ہری اودھ' کی تھیٹ ہندی کو قبول عام میسر آیا - ان کے چوپدے پڑھیے تو بہ اعتبار زبان وہی لطف آتا ہے جو 'آرزو لکھنوی' کی خالص اردو میں --

قومی تحریک کا سب سے بڑا شاعر شاید 'اردشیر خبردار' ہے - گجرات میں آج اس کا وہی مرتبہ ہے جو اردو میں اقبال کا اور بنگالہ میں 'ٹیگور' کا - وہ کوئی ہنگامی شاعر نہیں بلکہ قومیت کے نظریے کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اس کا مجموعۂ کلام 'درشنکا' (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے - اس کا ترانہ 'گلونتی گجرات' اقبال کے ترانے یا ڈی - ایل - رائے کے 'بنگ آمار لچھمی بھومی' سے کم مقبول نہیں ہے - وہ سخت قسم کا وطن پرست اور قوم پرور ہے - اپنی ایک نظم میں کہتا ہے —

" اے مادر وطن! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ہار تیرے تاروں سے گوندھا گیا ہے —

جو مرتے دم تک تیرے ہی نام کو بوسے دیتا ہے -
اے ماں، اُس نے تجھے پہچان کر اپنی خودی کو سمجھا ہے -

جب میں مرجاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تاکہ تجھہ پر دوبارہ قربان ہوسکوں - تیری مٹی میرے لیے مایۂ حیات ہے، کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹھی میں تمام مخلوق ہے " —

ایک دوسری نظم میں ستیاگرہ کی تبلیغ یوں کرتا ہے : " آج اپنے ساتھہ کیا کیا لوگے ؟ جرأت تلوار میں نہیں دل میں رہتی ہے - کاٹ تمہاری ہمت مردانہ میں ہے ورنہ ہر تلوار بے آب ہے - ان کند ہتھیاروں کو پھینک کر دل کو جنگ کے لیے مستعد بناؤ - ہمیں کسی کا خون نہیں بہانا ہے - حریف کے خون جگر سے ہم اپنے دل کے دیوتا کو کیوں کر ناپاک کریں - جس فتح کی تاریخ انسان کے خون سے لکھی جاتی ہے وہ بے پایاں ہے — "

ادب اور تحریک اصلاح

مغربیت نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ ہمارے ارباب حل و عقد اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھنے

لگی - یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی حد تک بے ربط ضرور ہے - چنانچہ ہندوؤں میں سماج سدھار' کی تحریک زور شور سے چل پڑی - سوشل معاملات میں کم عمری کی شادی' بیواؤں کی بدحالی اور مردوں کی تماش بینی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں - گجرات میں گووندرام نے اور بنگال میں 'ٹیگور' اور 'شرت چند' نے اس تحریک کی حمایت میں افسانے لکھے - ادھر مسلمانوں کی ہر برائی بھی چونکہ برگزیدہ ہے اس لیے 'قاضی سرفراز حسین' اور 'راشدالخیری' نے چند پیش پاافتادہ مسائل پر اکتفا کیا اور ایک عرصے تک کسی کو جرات نہ ہوئی کہ ایک تیز نشتر لے کر اس ناسور کو دکھائے جس نے سماج کے رگ و پے میں زہر ساری کر دیا ہے - اس طرف دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل توجہ ہیں اور مسلمان تعلیم یافتہ جماعت میں ایک نئے رجحان کا پتا دیتی ہیں - انگارے' افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اب ضبط ہو چکا - یہ افسانے ہماری جنسی زندگی کا مرقع تھے اور حالانکہ ان کا انداز تحریر جنسی تشدد سے متاثر تھا اور اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا جو روح یا پیٹ کی طرح محض جنس ہی کو واحد شعبۂ زندگی قرار دیتی ہے' تاہم اردو افسانہ نگاری میں یہ پہلی مثال ہے کہ ادب نے منافقانہ پابندیوں پر اپنے فرائض کو ترجیح دی ہو - دوسری کتاب 'لیلیٰ کے خطوط' ہے - افسوس کہ اس کے مصنف نے مظلوم نسوانیت کا ترجمان ایک شاہد بازاری کو بنا کر اس مسئلہ کو محدود بنا دیا اور شہری زندگی میں طوایف کی ناگزیریت کو نظر انداز کر دیا ورنہ اس کتاب کا شمار ہندوستان میں دور جدید کی اچھی تصنیفوں میں ہوتا - تاہم اس کی مقبولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طبقے کے کچھ لوگ محض

اصلاح کو ہی کافی نہیں سمجھتے اور یہ بھی دیکھنے لگے ہیں کہ ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلی کرنی ضروری ہے -

اقتصادی مسایل میں طبقاتی تصادم (Class-war) کا مطالع صاف ہوتا جاتا ہے اور واقعیت نگار ادیب اس طرف بھی متوجہ ہونے لگے ہیں - 'پریم چندر' کے تقریباً سبھی کردار اصلاح پسند (Reformist) ہیں - اس کے سامنے ایسے خوش حال زمین داروں کی مثالیں ہیں جو 'طالسطائی' کے 'قسیمتری' (Resurrection) کی طرح کسانوں میں اپنی جائداد تقسیم کر کے اپنی زندگی کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیتے ہیں - عورتیں اپنے قربوں سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش قومی زندگی کی تدوین میں حصہ لے رہی ہیں - 'سجان سنگھہ' 'پریم شنکر' اور 'ونیے کمار' اسی قسم کے نوجوان ہیں - 'سمن' 'گایتری' اور 'صوفیہ' ایسی ہی عورتیں ہیں - لیکن جب ایسے زمین دار مستثنیات میں شمار ہوتے ہیں اور اس کلیہ کو ثابت کرتے ہیں کہ اپنے حقوق سے کوئی طبقہ برضا و رغبت دست بردار نہیں ہوتا تو پریم چندر سوچ میں پڑ جاتا ہے اور وہ انقلاب کی آتش اندوزیوں سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں - طالسطائی اور ٹیگور کے نقش قدم پر چلتے ہوے وہ انقلاب اور رجعت کے دوراہے پر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہتا ہوا بیٹھہ جاتا ہے کہ اے کاش اس رستے پر چلے بغیر ہم وہاں پہنچ جاتے ! -

اصلاح کی ہر تحریک نیک نیتی لیکن تنگ نظری پر مبنی ہے - زندگی اور موت میں اتحاد نہیں ہو سکتا اور نہ ظالم و مظلوم کو ایک لڑی میں گوندھا جاسکتا ہے - اسی طرح تعلقات جنسی میں اس وقت تک توازن ' استحکام و صحت کی گنجائش نہیں جب تک زندگی کے دوسرے

مسائل سے ہم اسے الگ کرکے دیکھنے کی عادت نہ چھوڑ دیں اور ترغیبات جنسی کو شیطان کا فلبہ نہیں بلکہ ایک فطری جبلت (instinct) نہ سمجھنے لگیں —

ادب اور نقدان مقصد

پل صراط کی طرح انقلاب کا رستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے - بہت سے لوگ راہ میں تھک کر رہ جاتے اور تصوف کی خندق یا نراج کی گھاٹی میں گر پڑتے ہیں - ہندوستان ایک دورِ تغیر سے گزر رہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک گروہ لازمی طور پر داخلی کش مکش میں مبتلا ہے - اس کے لیے زندگی کی حقیقت ایک رقص شرر سے زیادہ نہیں ہے - اس کی زندگی کا کوئی معیار یا مسلک نہیں ہے - ماضی اس کے لیے بے معنی اور مستقبل لایعنی ہے - جو کچھ ہے 'ابھی' اور 'آج' کی مسرتوں میں ہے - شراب و شباب کا یہ فلسفہ پہلے بھی اس ملک میں مقبول تھا لیکن ہر جام کے ساتھ توبہ تھی اور ہر معصیت کے ساتھ احساسِ گناہ اور عفو گناہ کی امید - لیکن اب مستقبل کی تاریکی خودکشی کے رجحان کو بڑھاتی جاتی ہے اور باہمت بے راہ رَو بم پھینک کر 'کم ہمت لوگ آپ اپنی جان لے کر اور آزاد منش 'خیام' 'بائرن' اور 'آسکر وائلڈ' کی قسمیں کھا کر اس نراجی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں - دنیائے ادب میں اس کا پرتَو رومانیت اور 'ادب برائے ادب' کی صورت میں آشکار ہوتا ہے - حقائق کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر انگلستان میں 'بائرن' اور 'کیٹس' وغیرہ نے سامنتیت کے زوال کے زمانے میں اور اب ییٹس (Yeats) اور ڈی - ایچ لارنس وغیرہ نے حرفت کے زوال کے وقت اسی جذبۂ شکست کا اظہار کیا ہے - ہمارے ملک میں بھی متوسط طبقہ میدانِ کارزار سے گھبرا کر تصوف اور رومانیت کی آڑ پکڑنے لگتا ہے - ہندوستان

کا سب سے بڑا ناول نگار ' شرت چندر چٹرجی اپنے ناول چرتر ھین ' بدا خلاق) شیش پرشن (آخری سوال) اور 'شری کانت' میں ایسے ھی لوگوں کی تصویر کھینچتا ہے - بنگلہ اور هندی میں رومانیت اور ٹیگور سے اثر انداز ھوکر شاعری میں ' چھایہ واد ' یعنی اشاریت (Symlolism کی تحریک شروع هوئی اور حقیقت پرستوں کو ایک عرصے تک ان رجحانات کے خلاف بر سر پیکار رهنا پڑا - اردو کے نوجوان شاعروں میں بھی یہ ذهنیت عام هو گئی ہے اور یہ اصحاب حسن و عشق کے علاوہ دنیا کی هر چیز سے بے نیاز نظر آتے ھیں' حالانکہ نہ ان کا عشق بوالہوسی سے علحدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کا معیار حسن عالم دوشیزگی سے آگے بڑھتا ہے - ان کی حب نسوانیت دوشیزہ پرستی تک محدود ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس طرح همارے نظام زندگی میں عورت اپنی مالی ضروریات کے لئے مرد کی دست نگر ہے اسی طرح مرد اپنی شہوانی ترغیبات کے لیے اس کا غلام بن گیا ہے -

زندگی میں حسن و عشق کے لئے بڑی جگہہ ہے اور شراب و شباب کے لیے بھی - لیکن ان کے نام پر زندگی کے مطالبات سے بے پروا هونے کی کوشش رجعت پرورانہ اور لائق تعزیر هیں -

نذرالاسلام پورے هندوستانی ادب میں صرف ایک ایسا شاعر ہے جو میکسم گورکی کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے - جو انقلاب پرور ' قدامت شکن اور تغیر پسند ہے - جب ادب کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ انسان کو رلائے یا سلائے اور یا گمراہ کرے تو اُفق بنگال پر ایک ستارے کا طلوع هوتا ہے جو صراط مستقیم کا نشان ہے - مختصراً نذرالاسلام کا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ زندگی دایم و قایم ہے اور انسان لاشریک لہ اس کا مالک ہے - انسان اور قدرت کی کش مکش کا نام تہذیب ہے اور انسانیت کی ترقی

کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کر لی ہے - انسان سب سے افضل اور اکمل ہے - دین حق کا مطلب ہے ہر قسم کے ظلم کا سدباب اور اخوت و مساوات کا قیام ؛ قومیت ' سرمایہ داری ' تمیز رنگ و نسل اور تفریق مذاہب کو وہ انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے - اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور ضامن ہے —

اس لحاظ سے ' نذرالاسلام ' کو روحانیت نوازی اور داخلیت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں - جب دنیا حیات و ممات کی کش مکش میں ہے تو وہ ایسے وقت میں فلسفۂ قدرت پر غور و خوض کو غیر ضروری اور مضر مانتا ہے - اس وقت فلسفۂ قدور (Philosophy of Values) کی فکر کہیں زیادہ اہم اور مفید ہے - جب رجعت اور انقلاب بر سر پیکار ہوں تو ادب فصیل پر بیٹھ کر واقعیت (Realism) کے کیمرے سے فوٹو نہیں لے سکتا - یا تو وہ رجعت کے قلعے میں جا چھپے گا یا انقلاب کے میدان میں ہوگا اور یا تصوف و داخلیت کے خندق میں جا گرے گا - طبیعتاً وہ باغی اور سرکش ہے - حسن و عشق کی وادیوں میں گرفتار ہو کر بھی اپنی منزل کو نہیں بھولتا " پجارن ' میں عشق کی ناکامیوں کا رد عمل یوں بیان کرتا ہے : " معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں - راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟ کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اس مرتبہ اپنے غارتگر دہانے کھول دیں؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے ترانے میرے ہم سفر بن جائیں - لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو

ملکاءِ قیامت کے صور! برساؤ زہر و آتش میں بجھے ہوئے تیر! برباد کردو اِس دنیائے معصیت کو! ٹپکاؤ یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں!"

نذرالاسلام کے نزدیک دنیا ہمیشہ دو طبقوں میں بٹی رہی ہے - اور اس ظالم و مظلوم کی تفریق کو اقبال چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاری بتاتا ہے - لیکن جہاں ایک "خود گزاری" و "نالۂ نیم شبی" اور 'گنبد نیلوفری' کے تماشوں کا آسرا ڈھونڈتا ہے ' دوسرا مظلوموں کو اتحاد و انقلاب کا درس دیتا ہے :

" میں اس روز مطمئن ہونگا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ گونجے گی - اور جب میدان جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سنائی دیں گے - وہ جو ازلی باغی اور میدان جنگ سے نالاں ہے' صرف اسی روز خاموش ہوگا -" (باغی)

" وہ جو سمندر کی گہرائی میں ' آسمان کی وسعت میں ' زندگی کے ہیجان میں ' فضا ' کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے — وہ جس نے بادل کی بھٹیوں کو کلیز بنا رکھا ہے کہ جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا اور اسی کے گیت گاتا ہوں -"

(پیام شباب)

اپنے عزم راسخ کے لیے وہ کسی معاوضے کی تمنا نہیں کرتا - وہ حال کی ترجمانی کر رہا ہے تاکہ انسانیت کا مستقبل روشن ہو زمانہ اُسے یاد کرے گا یا نہیں اسے اس کی پروا نہیں ہے :

" میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں' مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں —

کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ شاعر کو قید و بند سے کیا نسبت! کسی کا مشورہ ہے کہ تو دوبارہ جیل جا کہ وہیں خوب لکھہ سکتا ہے۔ مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (داڑھی) نہ پاکر مایوسی سے اپنی داڑھی کھجانے لگتا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ گاندھی جی مجھہ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔ عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں۔ غرض کہ میری جان ضیق میں ہے —

لوگو، سنو کہ یہ دل انتقام اور درد کی آگ سے پھٹا جارہا ہے۔ تن تنہا خون نہیں بہا سکتا، اس لیے اپنے خون سے یہ نظمیں لکھہ رہا ہوں۔

مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔

تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں میری خونچکاں تحریر ان کے لیے پیام موت ثابت ہو!" سرمایہ اور محنت کے تصادم کے انجام پر سماج کی قسمت کا انحصار ہے۔ وہ طبقۂ محنت کش ہی ہے جو تقسیم کی بے انصافیوں کو دور کرکے پیداوار کے ذرایع کو انتہاے عروج پر لے جا سکتا ہے۔ شاعر اس کی فتح یابی کا ترانہ یوں گاتا ہے :

" وہ مبارک ساعت آپہنچی۔

ہتوڑی اور کدالی لیے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھہ دیتا ہے،

راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،

تمھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے،

تمھارا بارِ گناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے،

وہی — صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔

اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا۔

اونچی عمارتوں میں رہ کر اب یہ توقع نہ کرو کہ یہ خاک نشین
پیشہ تمہارے آگے سر بسجود رہے گا —

جو لوگ فرط احترام سے مادر گیتی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں
، انہیں ھی اپنا وارث بنائے گی -

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن سے لپٹ کر مٹی اپنی یگانگی
اعلان کرتی ہے -

آج بے کسوں اور مظلوموں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے آفتاب
ز پیدا ہوا ہے - اب تمام پابندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر پھینک دو -
فلک کج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے -
ہمارے سروں پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے پھول بن کر برسیں کہ
نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے —

مزدوروں کی جمعیت کو مژدہ ہو کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے
سافر ہیں - ایک کا دکھ سب کے لیے موجب اندوہ ہے اور ایک کی
ہین بنی نوع انسان کی توہین ہے —

آج دنیا کے کل بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دور بیداری
آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے!"

نذرالاسلام شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے - وہ تغیر کا حامی
ر جمود کا دشمن ہے - وہ قدیم کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے - وہ
رت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے اور شاعری کو
ں میں چھاونی کی کسبی نہیں بلکہ جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے -
ی کی شاعری ادب ہند کے رستے میں ایک نئی للکار ہے جو بتاتی ہے
آرٹ موت کا نہیں زندگی کا پروردہ اور خادم ہے - وہ اس روح کو مٹا

دے گا جو جسم کو قید سمجھتی ہے - وہ استعمار و استبداد کو فنا کرکے حسن و عشق کے صحیح جذبات سے انسان کو آشنا کرے گا -

ادب جدید کی ضرورت

اس مختصر سے سماجی تجزیے میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ادب ہند کا دور قدیم حقائق زندگی سے نا آشنا اور بالکل داخلی تھا - کوئی حل پیش کرنا تو درکنار وہ زندگی کے مسایل کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے - دور جدید زندگی سے اس حد تک بیگانہ نہیں ہے اور اس کی خدمت کا ولولہ بھی رکھتا ہے - لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے بڑی حد تک گمراہ کن ہیں -

ادب کا فرض اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم' وطن' رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو - انسانیت کے دشمنوں کی دشمنی دراصل درد انسانی کی دلیل ہے - اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے - اب اسے اس جذبۂ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ابدالاباد تک ہے اور انسان اس کا کارساز حقیقی ہے - قیامت کے معنے یہ ہیں کہ روح الاجتماع داور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کرے اور پھر اسی زمین پر ایک ایسے بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی جسمانی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچ سکے - انسانیت اور ادب کے مسلک الگ نہیں ہیں اور دونوں کی نجات کا رستہ بھی ایک ہے - وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور ان کے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کے ارتقا کی راہ میں حایل ہوں - یہ مضمون اردو کے ادیبوں کے لیے لکھا گیا ہے ' لہذا میرا

خطاب ان سے ہے —

ایک طرف پولیس کا وہ پنشن خوار داروغہ ہے جو تا عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے - اسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اسے رلانے اور سلانے میں مدد پہنچائیں - پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں سب سے بڑا دنیا دار ہے اور جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے - اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سن کر کسی مجنوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں - وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خود کشی کر کے بتیروں کی طرح تڑپ رہے ہوں -

آپ اب تک انہیں لوگوں کے لیے لکھتے رہے ہیں - کیا آپ کی آئندہ ادبی کاوشیں بھی انہیں کے لیے وقف ہوں گی؟ —

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے - زمیں دار اور سود خوار جونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں - مولوی اس پر خود گزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں - اس کی بیوی روٹیوں کے لیے عشوہ فروشی پر مجبور ہے - اس کے بچے بھوک سے تنگ آکر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں - اور وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے - وہ مال اس لیے پیدا کرتا ہے کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اسے ہتیالے جس کے لیے لغت میں 'مالک' کا لفظ تراشا گیا ہے - قید خانے کی کوٹھریوں سے بدتر جھونپڑیوں میں 'پلیگ اور ہیضے میں تڑپ کر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس حسرت میں مرجاتا ہے کہ مارواڑی کا سانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا! —

کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا کبھی ان اسباب و علل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے؟ - اگر نہیں تو آپ ادب کے لیے باعث ننگ ہیں - ایسے ادیبوں کے لیے کروپاٹکن کہتا ہے: " کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہوجاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو - اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے بےحس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے؟ "

گویا ادب آج کبیر داس کی زبان میں کہہ رہا ہے:

' کبیرا ' کھڑا بزار میں لیے لکاٹھی ہاتھ　جو گھر پھونکے آپنا چلے ہمارے ساتھ -

ہمیں ان لوگوں سے غرض نہیں جن کے دماغ روپیوں کے لیے چکلا گھر بنے ہوئے ہیں اور جو سرمایہ دار پبلشروں اور جاہل و بے درد شہریوں کے زر خرید غلام ہیں - ہمارا خطاب ان سے ہے جو تخلیق ادب کو رتبۂ پیغمبری دیتے ہیں - جو حق گو اور حق پرست ہیں اور جو سچ کہتے ہوئے کسی قسم کی پابندی سے نہیں ڈرتے -

اردو اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں - اردو اگر قومی زبان بننا چاہتی ہے تو اسے ہر قسم کے خیالات و جذبات کا حامل بننا چاہیے - وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان بننے کا استحقاق نہیں رکھتی جس نے حسن و قبح کا فیصلہ کوئی مذہبی جماعت کرتی ہو - یعنی اردو کے ادیبوں کو رواداری اور روشن خیالی کی تلقین کرنا چاہیے -

متوسط طبقے کی زندگی بند پانی کی موری ہے - عوام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور انہیں بتایئے کہ وہ اس خستہ حالی میں کیوں ہیں اور

کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں —

اردو ادب کی زن پرستی دونوں جلسوں کے لیے باعث عار ہے - پردے کی سختی اور عورت کی کم یابی نے مرد کے نقطۂ نگاہ کو یکسر Masochistic (خود اذیتی) بنا دیا ہے - سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں - جنسی مساوات کی تبلیغ ہی اس ناپاک ذہنیت کو دور کرسکتی ہے —

مولویوں اور پنڈتوں کی زبان میں گفتگو بند کیجیے - عربی و سنسکرت کو ان کے لیے اور انہیں عربی و سنسکرت کے لیے چھوڑ دیجیے - ادب کو فطری بنانے کے لیے ہندوستانی اسپرٹ ہی نہیں ہندوستانی صورت اور اسلوب بھی اختیار کیجیے —

ادب جدید کے حامیوں کی انجمن بنائیے اور اس کے آرگن شایع کیجیے تاکہ جدید خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو اور قدامت پرستوں کے اعتراضات کا جواب دیا جاسکے —

ہر سیاسی اور سماجی انقلاب کے پہلے ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے ملکی جد و جہد سے الگ اور نا آشنا ہیں تو اس کی ذمہ داری ان کے تعلیم یافتہ طبقے پر ہے جو خود بھی اوہام و تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے - اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کے ادیب بھی اپنے بنگالی اور ہندی معاصرین کے نقش قدم پر چلیں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ 'ادیب کا مشرب قومی و مذہبی تعصبات سے پاک ہے اور وہ واقعتاً انسانیت کا خادم' مصور اور پیشوا ہے —

سوچیئے کہ انسانیت کے ماضی میں آپ کے لیے کون سے اشارات پنہاں ہیں' مسایل حال کیا ہیں اور مستقبل کی راہ کیا ہے - اپنے انداز بیان

کو ایسی جلا دیجیے کہ وہ ظلم کے لیے تلوار اور مظلوموں کے لیے بیداری کا صور بن جائے —

اور آپ کا مذہب کیا ہے؟ ٹیگور سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا اور اس کا جواب دنیائے ادب کا جواب ہے!- "میرا مذہب وہ ہے جو ہر آرٹسٹ کا مذہب ہونا چاہیے - میں کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کا ترجمان نہیں ہوں - میری زندگی بنی نوع انسان اور جملہ اقوام کے لیے اور میرا پیغام ان کے ارتقا کے لیے ہے - میری روح زندگی اور انسانیت کی وحدت میں گم ہوگئی ہے اور میں مذہبی، قومی و طبقاتی پابندیوں کو توڑ چکا ہوں" —

اور آپ کا فرض کیا ہے؟ جو ہر انسان کا فرض ہونا چاہیے- کروپاٹکن کے آگے بھی یہی سوال آیا تھا اور اس کا جواب ہر ایمان دار ادیب کا جواب ہے: "اگر تمہیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی امنگوں کا احساس ہوتا ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو — یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے — تو مضبوط بنو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی سے انجام دو —

اپنے چاروں طرف زندگی کی تخم ریزی کرو- خبردار! اگر تم دھوکا دوگے، جھوٹ بولوگے، اور سازش کروگے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤگے، قعرِ پستی میں جاگروگے اور تمہاری حالت اس غلام کی سی ہو جائے گی جو اپنے آقا کو اپنا خدا ماننے لگتا ہے! اگر تمہارا رجحانِ طبع اسی طرف ہو تو یہی کرو لیکن اس حالت میں لوگ تمہیں کمزور، حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے- تمہاری طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمہیں قابل رحم سمجھیں گے — سوچو

رحم و کرم کے قابل ہو جانا انتہائی ذلت ہے - اگر خود اپنی صلاحیت کے بال و پر نوچکے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو - اس کے خلاف خود کو کمر بستہ کرو اور اگر کہیں تمہیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو — تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق کے خلاف بغاوت کر دو - جہاد کرو تاکہ ساری دنیا اطمینان کی زندگی بسر کر سکے - یقین جانو کہ اس لڑائی میں تمہیں جو روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی — "

ٹیگور کے ادبی مضامین

تاریخی ناول

(مترجمہ پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار)

انسانی معاشرے کا وہ بچپن کہاں گیا جب قدرتی واقعات اور مصنوعی انسانی خیالات بھائی بہنوں کی طرح ایک خاندان میں ایک ساتھ کھیلتے ہوے بڑے ہوے تھے - یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان واقعات و خیالات میں علحدگی کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جائے گی --

کسی زمانے میں رامائن اور مہابھارت تاریخ کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن موجودہ تاریخ انھیں اپنے زمرے میں شامل کرنے میں بہت پس و پیش کرتی ہے - وہ کہتی ہے کہ شاعری کے ساتھ تاریخ کا بیاہ ہوجانے سے اس کا بلس مت گیا ہے - اب اس کے خاندان کو دوبارہ اُبھارنا اتنا مشکل ہوگیا ہے کہ تاریخ شاعری ہی کی شکل میں اپنا تعارف کرانا چاہتی ہے - شاعری کہتی ہے "بہن تاریخ! تمہارے اندر بھی بہت کچھ جھوٹ بھرا ہے اور مجھ میں بھی بہت سی سچائیاں ہیں اس لیے ہم دونوں پہلے کی طرح میل ملاپ کرلیں -" تاریخ کہتی ہے "نہیں بہن ' اپنے اپنے حصے تقسیم کرلینا ہی اچھا ہے -" علم کے امین * نے ہر جگہ یہ تقسیمی

---

* زمین کے حدود کے متعلق جھگڑوں اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے سرکاری عہدہ داروں کو کہتے ہیں —

کام شروع کردیا ہے - حقیقت اور تخیل کی سلطنتوں میں حدبندی کے خطوط کھلیچلے پر اس نے کمر باندھ لی ہے —

تاریخ کی حد عبور کرلے کے جرم میں تاریخی ناولوں کے خلاف جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان سے ادبیات کا شہرازہ منتشر ہو رہا ہے —

اس قسم کا اعتراض صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں کیا گیا ہے ' صرف نوین بابو * اور بنکم بابو ہی مجرم نہیں ٹھہرائے گئے ہیں ' بلکہ تاریخی ناول نویسوں کا پیشوا اور امام اسکاٹ بھی اس سے چھٹکارا نہ پاسکا —

موجودہ انگریز مورخین میں فری مین صاحب کا نام بہت مشہور ہے - ناولوں میں تاریخ کی جو مٹی پلید ہوتی ہے اس پر انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے بارے میں جو لوگ کچھ بھی جاننا چاہتے ہیں انہیں اسکاٹ کا آئون ہو (Ivon hoe.) نہیں پڑھنا چاہیے —

بے شک ہمیں یورپ کی صلیبی جنگوں کے بارے میں حقیقت واقعی کا علم حاصل کرنا چاہیے لیکن اسکاٹ کے آئون ہو میں ابدی انسانی معاشرے کی دوامی سچائی کا عکس دیکھنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے - صرف یہی نہیں لیکن اس کے جاننے کی خواہش اتنی زبردست ہوتی ہے کہ یہ جانتے ہوے بھی کہ صلیبی جنگوں کے متعلق اس میں بہت سی غلطیاں ہیں ' طلبہ پروفیسر فری مین سے چھپا کر آئون ہو کے پڑھنے کی ترغیب کو نہیں روک سکتے —

اب قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا سروالٹر اسکاٹ تاریخی واقعات اور ادبیات کی حقیقت دونوں کالحاظ رکھ کر آئون ہو کو نہیں لکھ سکتے تھے ؟ - وہ لکھ سکتے تھے یا نہیں اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنا تو

---

* بابو بنکم چندر بنگالی زبان کے مشہور ناول نویس اور بابو نوین چندر تاریخی نظم نگار ہیں -

مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں تاریخ اور ادبیات کا لحاظ نہیں رکھا ۔

یہ ممکن تھا کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہ کیا ہو ' لیکن واقعہ یہ نہیں ہے ۔ پروفیسر فری مین صلیبی جنگوں کے متعلق جس قدر جانتا تھا اسکاٹ اتنا نہیں جانتا تھا ۔ اسکاٹ کے زمانے میں واقعات کی تشریح اور تاریخی حقیقتوں پر غور و خوض کرنے کا طریقہ اس قدر ترقی پر نہیں تھا ۔

مخالفین کہیں گے جب اسکاٹ لکھنے کے لیے بیٹھا تھا تو لازم تھا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر لکھتا لیکن تحقیق کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا ' ہم قطعی طور پر یہ کب جان سکیں گے کہ صلیبی جنگوں کے متعلق تمام معلومات حاصل ہو چکی ہیں ' ہم یہ کس طرح جان سکیں گے کہ آج جسے ہم تاریخ کی اٹل سچائی کہہ رہے ہیں کل نئے دلائل اس کے سر سے حقیقت کا تاج نہیں اتار لینگے ؟ جو لوگ موجودہ مروجہ تاریخ کا سہارا لے کر تاریخی ناول لکھیں گے کل کے نئے مورخین اگر ان ناولوں کی بے قدری کریں تو ہم اس کا کیا جواب دیں گے ؟

مخالفین کہیں گے کہ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جتنا جی چاہے ناول لکھو لیکن تاریخی ناول مت لکھو ۔ اگرچہ یہ خیال ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا ہے لیکن انگریزی ادب میں اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے ۔ سر فرانسس پال گریو کہتے ہیں کہ تاریخی ناول ایک طرف تاریخ کا تو دوسرے طرف کہانی کا بھی بڑا دشمن ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ناول نویس کہانی کی خاطر تاریخ پر حملہ کرتے ہیں اور پراگندہ تاریخ کہانی کو خراب کر دیتی ہے ۔ اس طرح کہانی کا سسرال اور میکا دونوں نیست و نابود ہوجاتے ہیں ۔

اس قسم کے اعتراض کے باوجود تاریخی شاعری اور ناول ادبیات میں کیوں

جگہ حاصل کرتے ہیں اس مضمون میں ہم اس کے اسباب کی وضاحت کریں گے -

سنسکرت کی ادبی کتابوں میں شاعری ایک رس بھرے جملے کو قرار دیا گیا ہے - شاعری کے متعلق اس سے زیادہ مختصر اور وسیع المعنی تعریف ہم نے کہیں نہیں دیکھی - بے شک رس کی تعریف کو سمجھانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے - جس شخص میں رس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہے اس کے لیے رس کی تعریف بے معنی چیز ہے اور جس میں نہیں ہے اسے ان باتوں کے جاننے کی ضرورت ہی نہیں —

سنسکرت کی ادبیات میں اصلی رسوں کی نو قسمیں * بیان کی گئی ہیں - لیکن بہت سے ناقابل بیان اور ملے ہوے (مرکب) رس بھی ہیں جنہیں بیان کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی —

انہیں متروک رسوں میں سے ایک کا نام "تاریخی رس" رکھا جا سکتا ہے اور یہ رزمیہ رس شاعری کی جان ہوتا ہے —

کسی خاص شخص کا دکھ سکھ اس کی ذات کے لیے ہی کیا کم ہے - دنیا کے بڑے بڑے واقعات اس کے سامنے سایے کی طرح نظر آتے ہیں - اگر اس طرح کسی خاص شخص یا اشخاص کی زندگی کے واقعات کے مدو جزر، عمل اور رد عمل ناول میں بیان کیے جائیں تو رس درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور رس کا یہ جوش ہمارے دل پر گہری چوٹ کرتا ہے - ہم میں سے بہتوں کے رنج و راحت کا دائرہ محدود ہے - ہمارے جذبات

---

* نو قسمیں یہ ہیں - (۱) شرنگار یعنی عشقیہ - (۲) ہاسیہ یعنی مضحک - (۳) کرن احساس غم پیدا کرنے والا - (۴) ویر یعنی رزمیہ - (۵) رودر یعنی غصہ پیدا کرنے والا - (۶) بھیانک یعنی ڈراونا - (۷) بی بھتس یعنی نفرت انگیز - (۸) ات بھت حیرت انگیز - (۹) شانت جس میں سکون ہو -

کی گرمی چند رشتہ داروں اور احباب تک پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے - وش ورکش * میں نگیندر' سوریہ مکھی اور کند نندنی کے عیش و کلفت اور رنج و راحت کو ہم اپنا ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان تمام تکلیفوں اور راحتوں کا مرکز نگیندر کا خاندان ہے - نگیندر کو اپنا پڑوسی تصور کرنے میں ہمیں کوی دقت نہیں ہوتی -

لیکن دنیا میں بہت کم لوگ اس بام رفعت تک پہنچتے ہیں دکھ سکھ دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے ساتھ وابستہ ہوجائیں - حکومتوں کا عروج و زوال' زمانے کے آئندہ واقعات کا سلسلہ' ان کی روز مرہ کی زندگی ہی کے کار نامے ہیں - ان کی کہانی جب گیت بن جاتی ہے تو رباب عالم اس کے سر کم ٹھیک کرتا ہے اور بجانے والے کی انگلیاں ہر تار میں ایک عجیب' پرسکون اور بہت دور تک پھیلنے والی مسلسل جھنکار کو بیدار کردیتی ہیں —

انسان کے ساتھ زمانے کی یہ رفتار ہمیں روزانہ دکھائی نہیں دیتی قوم کی تاریخ' کو بدلنے والا اس قسم کا کوئی بڑا آدمی اگر ہمارے سامنے موجود ہو تو بھی موجودہ مختصر زمانے میں وہ اور اس کے کارنامے دونوں اکٹھے نظر نہیں آسکتے - اس لیے اس قسم کے لوگوں کو ہم انہیں کے زمانے میں ٹھیک طور پر نہیں دیکھ سکتے - انہیں اگر ہم ایک خاص شخص کی شکل میں نہیں بلکہ زمانے کے ایک جز کی شکل میں دیکھنا چاہیں تو ہمیں ان سے دور کھڑا ہونا پڑتا ہے' انہیں ماضی کے پس منظر میں دیکھنا پڑتا ہے' وہ جس عظیم الشان اسٹیج کے ہیرو تھے انہیں اور اس اسٹیج کو ملا کر دیکھنا پڑتا ہے —

* مشہور بنگالی مصنف بنکم چندر چٹرجی کا ناول ہے —

ہمارا روزانہ کے دکھہ سکھہ سے دور ہوجانا یعنی جب ہم نوکری کرکے ' روکا کر ' کھا پی کر وقت گزار رہے ہوں اس وقت دنیا کے شارع عام پر جو بڑے بڑے رتھہ بان دنیا کے رتھہ کو چلاتے ہوئے جارہے ہیں ' چند لمحوں کے لیے ان کا خیال کرکے زندگی کے اس تنگ دائرے سے باہر نکل آنا ' یہی حقیقی طور پر تاریخ سے لطف اندوز ہونا ہے —

ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے کامل طور پر تخیُلی نہیں ہوسکتے لیکن جو قصے قدرتاً ہم سے دور ہیں جو ہمارے علم سے بالا تر ہیں ' انہیں کسی بہانے سے اگر ہم حقیقی واقعات کے ساتھہ ملادیں تو مصنفوں کے لیے ' پڑھنے والوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنا آسان ہوجاتا ہے - رس کی تخلیق ہی مقصد ہے - لہذا رس پیدا کرنے کے لیے تاریخی ذرائع کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے شاعر ان سے کام لینے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتے —

شیکسپیر کے انتنی اور کلیو پٹہرا ڈراما کا جو مرکزی نقطہ ہے وہ دنیا کے لیے ایک آزمودہ اور روز مرہ کی جانی بوجھی حقیقت ہے - بہت سے غیر معروف ' گمنام اور قابل اشخاص نے عورتوں کے موہ لینے والے جال میں پھنس کردین و دنیا خراب کرلی ہے اور اس طرح کی چھوٹی چیزوں کے اہم بن جانے سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے حسرت ناک مناظر سے تاریخ بھری پڑی ہے —

ہمارے روز مرہ کے دیکھے بھالے مرد اور عورت کی محبت کے زہر اور امرت بھرے کار ناموں کو شاعر نے ایک عظیم الشان تاریخی اسٹیج پر لاکر نہایت وسیع اور شاندار بنادیا ہے - ذہن کے انقلاب کے بعد مسلک کا انقلاب شروع ہوتا ہے - محبت کی کش مکش کے ساتھہ روم کے تمام لوگوں

میں پھوٹ ڈالنے والی زبردست جنگ کی تیاری ہوتی ہے - ایک طرف کلیوپیٹرا کے نشاط خانے میں غزل خوانی ہو رہی ہے اور دوسری طرف سمندر کے کنارے طبل جنگ گونج رہا ہے - شاعر نے محبت اور احساس غم کے رس کے ساتھہ تاریخ کا رس ملادیا ہے - اس لیے اس ڈرامے میں دل کو ایک حیرت انگیز وسعت مل گئی ہے —

مورخ ممسن اگر شکسپیر کے اس ڈرامے کو عالمانہ حوالوں کی روشنی میں دیکھے تو اس میں سہو زمانی (Anachronism) اور تاریخ کی بہت سی غلطیاں نظر آسکتی ہیں - لیکن شیکسپیر نے پڑھنے والوں کے دلوں پر جو جادو کردیا ہے ' غلط اور بگڑی ہوی تاریخ کے ذریعے جس تاریخی رس کی تخلیق کی ہے وہ جدید تاریخی تحقیقات کے باوجود بھی مٹ نہیں سکتا -

اسی لیے ہم نے اس سے پہلے کسی تنقیدی مضمون میں لکھا تھا کہ " ناول میں تاریخ کے مل جانے سے ایک خاص رس پیدا ہوجاتا ہے - ناول نویس صرف اسی تاریخی رس کے حریص ہوتے ہیں - تاریخی حقیقت کی انہیں کوئی خاص پروا نہیں ہوتی - اگر کوئی شخص ناول میں تاریخی رنگ و بو سے مطمئن نہ ہو اور اس میں سے پورے تاریخی اجزا کو نکالنے لگے تو یہ گویا سالن میں زیرہ ' ہلدی ' دھنیا اور سرسوں کی تلاش کے مصداق ہے - مسالے کو ملا کر جو لوگ سالن کو لذیذ بنا سکتے ہیں وہ بنائیں اور جو اسے پیس کر سالن میں ڈالتے ہیں ان سے بھی ہمیں بحث نہیں کیونکہ یہاں صرف مزے سے غرض ہے مسالا تو اس کا ایک ذریعہ ہے - یعنی ناول نویس اگر تاریخ کو جوں کا توں رکھہ کر ناول لکھیں یا اس کے اجزا ملا کر تاریخی رس پیدا کرسکیں تو انہیں اپنے مقصد میں کامیاب سمجھنا چاہیے -

اس لیے اگر کوئی رام چندر کو ادنیٰ اور راون کو اعلیٰ حیثیت

میں پیش کرے تو کیا کوئی جرم نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا - لیکن وہ جرم بلحاظ تاریخ نہیں بلکہ بلحاظ شاعری ہوگا - مقبول عام حقیقت کو ایک دم پلٹ دینے سے رس کا مزا جاتا رہتا ہے - گویا مطالعہ کرنے والوں کے سر پر ضرب سی لگتی ہے اور اس سے شاعری چست ہوکر گر پڑتی ہے —

یہی نہیں : اگر کسی جھوٹی بات کو بھی مدت سے عام لوگ سچ مانتے چلے آرہے ہوں اور اگر تاریخ اور سچائی کے لیے شاعری اس کے خلاف احتجاج کرے تو یہ شاعری کا جرم ہوگا - تصور کیجیے کہ اگر آج بغیر کسی شبہ کے یہ ثابت ہوجاے کہ شرابی اور بے اصول یادؤں کا خاندن یونانی قوم میں سے تھا اور سری کرشن بنوں میں آزادی سے گھومنے والا اور بانسری بجانے والا یونانی قوم کا ایک گوالا تھا' اگر یہ ثابت ہوجاے کہ اس کا رنگ اس کے بڑے بھائی بلدیو کے رنگ کی طرح گورا تھا' اگر یہ ثابت ہوجاے کہ جلا وطن ارجُن ایشیاے کوچک کی کسی یونانی حکومت سے یونانی شہزادی سوبھدرا کو جیت لایا تھا اور دوارکا سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا' اگر یہ ثابت ہوجاے کہ جلا وطنی کے وقت پانڈووں نے فن جنگ کے ماہر عالی دماغ یونانی بہادر کرشن کی مدد سے اپنی حکومت دوبارہ حاصل کرلی تھی اور اس کی باکمال غیر قومی سیاست' جنگی مہارت اور ایسے مذہب کا علم جس میں عمل کی بڑی اہمیت تھی اِن خصوصیات سے حیران ہوکر ہندوستان نے اسے اوتار مان لیا تھا' تو بھی وید ویاس کی مہابھارت نہیں مٹ سکتی اور کوئی نیا شاعر جرأت کرکے کالے کو گورا نہیں بنا سکتا —

ہم نے یہ باتیں سرسری طور پر کہی ہیں - نوین بابو اور بنکم بابو اپنی شاعری کی کتابوں اور ناولوں میں مروجہ تاریخ کے خلاف اتنی دور

جا پڑے ہیں یا نہیں جس سے شاعری کا رس جاتا رہا ہے ' اس کا اندازہ ان کے گرنتھوں کی خاص تنقید کے وقت ہی کیا جاسکتا ہے —

اس حالت میں ہمارا کیا فرض ہے ؟ ہمیں تاریخ پڑھنی چاہیے یا آنون ہو؟ اس کا جواب بہت آسان ہے - دونوں پڑھنے چاہئیں - حقیقت کے لیے تاریخ پڑھنی چاہیے اور لطف کے لیے آنون ہو - کہیں ہم غلطیوں ہی کا علم نہ حاصل کرلیں ' اس خدشہ سے جو شخص شاعری کا لطف نہ اٹھاے گا اس میں شئے لطیف کی کمی آجاے گی —

شاعری میں جو تاریخی غلطیاں ہمیں نظر آئیں گی ہم انہیں تاریخ میں درست کرلیں گے لیکن جو شخص صرف شاعری کی کتاب پڑھے گا اور تاریخ پڑھنے کا موقع نہ پاے گا وہ بد نصیب ہے اور جو شخص صرف تاریخ ہی پڑھے گا اور اسے شاعری کے مطالعے کا موقع نہ ملے گا غالباً یہ شخص پہلے سے بھی زیادہ بد نصیب ہے —



سخنوران ایران در عصر حاضر

از

(از جناب آقا محمد تقی "پارسا" شیرازی پروفیسر اورنگ آباد کالج)

جنبش ادیبانه و مساعی دانشمندانهٔ جناب آقا ... محمد اسحاق نوید زندگی بخشی میدهد و آیندهٔ بسیار درخشانی را بما نزدیک میکند - کم کم ذوق و شوق علمی و تشنگی و اشتهائی صادق در مشرق پیدا می شود - آهسته آهسته حاسهٔ دانش پژوهی و چشم بصیرت مشرقیان بیدار گشته رفته رفته احساس حقیقت جوئی و عاطفهٔ تحقیق طلبی آنان را تکان داده بجنبش انداخته است از پی راههٔ تقلید بیرون آمده بشاهراه تحقیق افتاده اند- این بهترین نشان درخشان و علامت نمایان بیداری مشرقیان است-

راز ترقی اروپا

ترقی اروپا از یک نقطهٔ بسیار مهمی آغاز گشته و رفته رفته بزرگ گردیده و بالاخره به تمام شئون زندگی محیط شده است —

اروپا رهین ملت آن اشخاص باهمت و حوصله مند است که با پائمردی زحمت درشاهراهٔ تحقیق و انکشاف افتاده اند و پافشاری نموده هرچیز را در جا و محل آن تحقیق و انکشاف کرده اند ' کیمیا و طبیعیات را در عالم تجزیه و مشاهده و تجربه ' جغرافیای بحری را در دریا و بری را

در کوه و صحرا ' زبان بیگانگان را در وطنِ آنان و همچنین هر چیز را از راه خودِ آن و درجا و مرکزش تحصیل و تحقیق کرده اند - سپس باهوش کافی و موشگافی آن راه مرتب ساخته اشاعت داده اند و در نمایش گاه عالم عملی گزارده اند —

پایهٔ بلند ایران شناس بزرگ و معروف استاد ادورد برون مرحوم (Edward Brown) نیاز مند معرفی نمی باشد - این استاد بزرگوار برای تحقیقات ادبیات زبان فارسی از انگلستان رهسپار ایران گردیده - کوه و بیابان را در نوردیده رو بمرکز نموده داخل محیط ادبیات زنده شده است - جلیس ادباء' انیس شعرا ' همنشین خاص و عام گشته - وضع مملکت را مطالعه کرده - باروح ادبی ' احساسات شعری ' عواطف ملی ' آداب و اخلاق و نفسیات ایرانیان آشنا شده - نه تنها ایران شناس شده بلکه متخلق به آداب ایرانیان گشته ' محفل آرا ' مهمان نواز ' ایران پرست گردیده - پس قدم در جادهٔ ادب گزاشته و قلم تحقیق را بحرکت آورده است - همیشه و هرجا از خامه وزبان او روح ' عواطف ' احساسات ایرانی تراوش میکند و با این حال تاریخ ادبیات ایران نوشته است - این است رفتار یک محقق اروپائی که از راه دور و دراز باوجود بیگانگی ادبی و اخلاقی و زبانی رو بایران میکند —

حال می رویم بر سر مطلب - اردو زبان ' مشرقی ' همسایهٔ ایران ' که یگانگیِ ادبی ' اخلاقی با فارسی زبانان دارد ' و روح ادبیات هردو یکی است ' باید برای تحقیقات ادبیات فارسی توجه مرکز کرده خود داخل محیط ادبیات زنده شود ' و خود برای تحقیق ادبیات شاهراه نزدیکی کشف کند ' نه که مانند مقلدین گمراه شده راه دور و دراز پیش گرفته

خود را گول زده و دیگران را هم فریب دهند -

بنابرین صدافرت جناب محمد اسحاق و تالیف کتاب " سخن وران عصر حاضر " آیندهٔ درخشانی را بما نزدیک میکند —

سرپرستی هندوستان از فارسی گزشتهٔ درخشانی را تربیت و پرورش داده است - آقا سعید نفیسی تاریخ و تذکرهٔ ادباء و شعراء فارسی زبانان هند را تالیف کرده اند و بسیار پسندیده است - سلسلهٔ ادبی هندوستان و ایران گسیخته شد و مسئولیت هندوستان دو چند شد (انگریزی، اردو) مگر تعلقات اردو و فارسی بحال خود باقی ماند، و هندوستان مستقیم و غیر مستقیم باز از فارسی سرپرستی کرده دست از نو از شهای ادبی نکشید - باز در همین قرن جدائی دست و زبان ادب پژوهان هندوستان ادب و زبان فارسی را در هند زنده نگاه داشته است - و فقط تاریخ همین قرن دربارهٔ ادبیات و زبان فارسی در هندوستان محتاج نگارش رسالهٔ جداگانه است - و این جا فقط به سه خدمت بزرگ اشاره می شود —

(۱) شعرالعجم - از علامهٔ بزرگ مرحوم شبلی نعمانی این اعجوبهٔ دهر در شعر عجم شناسی یکتا و بی مانند است در پنج جلد تاریخ ادبیات شعری فارسی تصنیف نموده و با کمال استادی و نکته سنجی تاریخ روحی و شعری شعراء را توضیح و تشریح نموده و عظمت روح شعری فردوسی و سعدی و حافظ را در نمائش گاه عالم ادبیات بی پرده کرده است و به روانِ قدما و متوسطین و متاخرین تر و تازگی بی اندازه بخشیده است —

(۲) جناب دکتر اقبال که با زبان فارسی مقاصد حکیمانهٔ خود را سروده اند و در عالم ادبیات یک فلسفهٔ جدیدی اضافه نموده اند - چون ایشان

در فلسفهٔ مغرب نیز أستادند و با ذوق شعری اروپائی آشنا فوق العادهٔ اشعار ایشان تجدد معنوی و فکری دارد، و زبان فارسی را آئینهٔ تفکرات جدید خود قرار داده اند، افکار ابکار ایشان که در زبان فارسی سروده اند شهر تی بارو پاهم رسیده و از زبان فارسی بزبان خارجه ترجمه شده است -
(۳) " سخن وران عصر حاضر " است که موضوع این تبصره است

قدر و قیمت سخن وران عصر حاضر

تعلقات اردو بلٔا فارسی

فارسی با شاهنشاهیِ مسلمانان به هند در آمده باهم فرمان فرمائی می کردند - سرانجام سلطنت مسلمانان رو بزوال نهاده فارسی پائداری کرده به شکل و قالب دیگر در آمده و نام نوی بخود گرفت - یعنی روح فارسی با تمام معنی (ترکیبات ، تشبیهات ، استعارات وغیرها) در قالب تازه حلول کرده باسم اردو باز دست از فرمان فرمائی نکشید - امروزه معنوان گفت در هندوستان ، هیچ زبانے مانند اردو عمومیت ندارد و شمارهٔ اردو دانان (هنود و مسلمانان و اروپائیان) از تمام زبانہاے بومی و بیگانه بیشتر است از کابل گرفته تا مندله (Mandalay) زبان اردو آلت تبادلهٔ خیالات اقوام گوناگون است - بلکه به ساحلہاے دور دست نیز دست اندازی کرده است در بیرون هند زبان این مملکت را همین زبان اردو میدانند و بس - از زبان هندی و هندوستانی تنها اردو میخواهند در جا هاےکه براے کار و بار تدریس زبان این مملکت میدهند همان اردو است - کسی بخواهد یا نخواهد ، بداند یا نداند ، کشور چین و ... راز هند میدان و جولانگاه اردو است - و آن زبان بومی که ادعاے مقابلگی با اردو می کند دائرهٔ مختصر تنگی دارد - اردو یک زبان عجیبی است شاید نظیر نه داشته باشد - مدارج ارتقاء خود را

در کمترین وقت طے کرده ' و خزانهٔ ادبیات خودرا مخصوصاً نظم ' زود معمور و آباد نموده است - نشو و زبان علمی نیز بسرعت شگفت انگریزی دارد خودرا بسر منزل خویش نزدیک می کند - اگرچه اردو هندی الوطن است و شمائل آن شباهت ظاهرئی تا می بزبان هندی دارد مگر روح آن و حرکات و سکنات از فارسی است ' و روح فارسی باتمام معنی و جمیع خصوصیات درآن حلول کرده است - اگر اردو بخواهد قطع بستگی خود از فارسی بنماید اولاً خزانهٔ ادبیات خود را بدست خویش آتش میزند ثانیاً باید بطور قهقری برگشته در عالم نشو ونمائی طفولیت در آید و این خلاف قانون فطرت است - به فرض محال در آں حال نه ادبیات نه نظم و نه لغت می ماند و اردو مفلس محض می شود - سخن کوتاه از اردو تنها یک نام باقی می ماند - نام هم (اردو) از بیرون آمده کشتنی است یا باید تبعید (شهر بدر) شود - اردو یادگار عهد زرین اتحاد مسلمانان و هنود است - روح و خیال از مسلمانان و ساخت جسم از هندی است —

بنابرین اطلاع از ادبیات عصر حاضر برائے اردو دارائے اهمیت است هر دو دورهٔ تکامل را دارند طے می کنند - هر دو اشتراک روحی دارند - بالآخره تجددات فارسی را باید بغور مطالعه کرد - هر چه برائے اردو مفید است باید اختیار نمود و هر چه زیان بخش است پرهیز ازان لازم است —

مسافرت دانشمند محترم آقا محمد اسحاق دارائے اهمیت است -

' اول ' محققانه براه راست افتاده در محیط ادبیات زنده رفته اند -

' دوم ' تنها ذوق علمی ' شوق مشاهده ' حس حقیقت جوئی محرک این سفراست -

' سوم ' سفر نتیجهٔ تحقیقی خود داده و سه جلد بزرگ ادبیات عصر حاضر فراهم و جمع آوری کرده اند —

'چهارم' ایمان اول محققی است که ادبیات زبان حال را محققانه در ایران جمع کرده و هندوستان وممالک دنیا را بآن آشنا می کند ـ

آوازهٔ چهار جلد تاریخ ادبیات ایران تالیف استاد بزرگ مرحوم ادوورد برون (Edward Brown) بگوش ادب پژوهان رسیده و بیشتر آن را خوانده اند - استاد مرحوم از آنجا که دسترس تحقیق بوده آغاز کرده' و بزمان حاضر خاتمه میدهد و زندگئی مرحوم همین جا انجام یافت - ادبیات زبان حاضر منتظر استاد و محققیء دیگر بود - در واقع این سه جلد ادبیات عصر حاضر مکمل و مکمل چهار کتاب استاد برون مرحوم است - لاکن این چهار جلد تاریخ ادبیات است و سه جلد عصر حاضر ادبیات است و تاریخ و تذکرهٔ مختصر و منهدی هم دارد - امید است آینده جنبهٔ تاریخی بیشتری پیدا کند —

کتاب "سخنوران عصر حاضر" دارائی سه جلد است - جلد اول طبع و مجلد شده زیر مطالعهٔ نگارنده است - جلد دوم زیر طبع است - و این هردو در ادبیات شعری است - و جلد سوم فقط ادبیات نثری است - هر سه جلد (نظم و نثر) ادبیات عصر حاضر است یعنی دورهٔ مشروطه (از سال ۱۳۲۵ عدل مظفری) لاکن تا هر سه جلد ملاحظه نشود آغاز حقیقیء این ادبیات نمی توان نوشت - تبصره و انتقاد کامل هم بعد از مطالعهٔ سه جلد ممکن است - کنون تنها تبصرهٔ مختصری دربارهٔ جلد اول که مطالعه شده است ذیل نگاشته می شود —

(ا) کاغذ ' طبع ' خط ' عکس ' جلد بندی آبرومندانه است - واین نیز یکی از علامتهاے نمایانِ بیداریِ مشرق است - کارکنان مطبعهٔ جامعهٔ ملیه دهلی مستحق تحسین و آفرین هستند - کتاب با سلیقهٔ خوب و اسلوب مرغوب مراحل زیبائی را طی کرده و بحد کمال رسیده است —

(۲) دارائی تقریظی است از استاد معظم جناب جمال زاده وایشان با چشم حقیقت شناس اظهار حقائق کرده اند —

(۳) دیباچهٔ خود جناب محمد اسحاق است که نظریات محققانهٔ خود را مفید و مختصر بیان نموده اند —

(۴) انتخاب قسمت اول از اشعار "سخنوران عصر حاضر" که موضوع حقیقی این تبصره است کنون تبصرهٔ مختصری نوشته و انتقادِ سرسری نموده قدر و قیمتِ ادبی کتاب به نظر ادب پژوهان می رساند —

حسنِ انتخاب

نگارندهٔ ایرانی' معلم' هر از دو سه سال یک دفعه تجدید عهد کرده رهسپارِ ایران شده و در شهر ها و ایالات گردش نموده است، و چندین بار در طهران قریب دوسال توقف داشته است و با بعضی شعرا آشنا' و با اشعار عصر حاضر با خبر- و خود در همین دورهٔ نشو و نما یافته است - نگارنده انتخاب را دیده خوبی و زیبائی آن تعجب خیز و طرب انگیز است - تعجب خیز است که چگونه یک نو وارد توانسته است با صدها ادبا و شعرا آمیزش کند و عالم ادبیات آنان را جولانگاهِ نظر محققانهٔ خود نموده و نقشهٔ روحیِ ایشان را با مشقتها برداشته باین ارزانی در عالم ادبیات نمائش دهد - ازین جهت طرب انگیز است که بعد از ملاحظه و مطالعهٔ کتاب روشن می شود که محقق باوجدان و طبع سلیم و در حسن انتخابات به احسن وجوه کامیاب است - و اسبابِ کامیابی را همه آماده کرده اند —

اول جناب منتخب در فارسی متبحر' دوم در دارالفنون کلکته استاد بزرگ فارسی' سوم محرک ذوق علمی و اشتهاے صادق است' چهارم توجه بخود ایران کردن' پنجم مشرقی و اردو زبان' ششم اشتراک اخلاقی و

ادبی' هفتم ندیده باید گفت با اخلاق عالمانه موردِ توجهٔ عموم ادباء شده ' و بواسطهٔ اشتهاے صادق شبانه روز رنج کشیده و آرام را برخود حرام کرده اند - تنها یک حسِ حقیقت طلبی بر وجود ایشان فرما بوده است -

قدر و قیمت ادبی کتاب

انقلابات سیاسی ' آزادی' فکری ' تجددی ' اخلاقی ' تمدنی ' اجتماعی' نیز ازکتاب تا اندازهٔ میتوان بدست آورد - و بالاتر از همه درجه انقلاب و تغیراتِ ادبی میتوان کشف کرد و دانست و فهمید که ادبیات فارسی راه مشی خود را تغیر داده است و از عالم تنگ و تاریک بیرون آمده در جهانِ روشن و گشاده پا گزاشته است و کم کم دارد خود را به سرِ منزل آیندهٔ خویش نزدیک می نماید - امید است بعدّ کمال رسیده در فضاے علمی یک ملت هم آهنگ و یک تودهٔ یک نواخت بار آورد —

انقلابات و تغیرات زبان فارسی (زبان شعری)

یک جهتی و یک نوائی و عمومیت زبان است - و این وجه داراے اهمیت فوق‌العادة است و باید با نظر عمیق آنرا نگریسته در اطراف آن سخن سرائی کرد - پیش ازین دوره زبان فارسی اسیر دسته بندی وگرفتار پنجهٔ ادباء و شعرا بود و طبقهٔ شعرا صاحب امتیاز و فعال ما یشاء بودند - علماے دین را مذهبی ' شعرا را شعاری ' منشیها را شیوهٔ وادباء را دابی' دولتیان را تسلطی خاصی بود - عوام یک جادهٔ ساده و راهی هموار و روشی طبیعیِ خدا دادی داشتند - زبان هم مانند مذهب سروکارش به دسته بندی کشیده بود - نشیب و فراز ' پستی و بلندی زبان به نظر خوانندگان رسید - در زمان محمد شاه (۱۲۵۰ تا ۱۲۶۴) بدستیاری چند نویسندهٔ بزرگ تا اندازهٔ خوبی زبان هموار و یک رخه گردیده بود به پائمردی" قائم مقام" و " فاضل خان

کروسی" وچند استاد دیگر ساده نویسی و مطلب نگاری بروے کار آمده بود - و به گلستانِ برگ و شاخ انبوه باغ سخن آرائی تروتازگئی نوی یافت - و این روش پیش رفت کرده در آغاز (۱۲۶۴ھ) ناصرالدین شاه و وزارت میرزا تقی خان یک دفعه جلبش خود را تیز نمود - اصطلاحات ملکیِ میرزا تقی خان ' افتتاح دارالفنون (کالج) ' آشنائی بافرنگ ' شناسائی زبان فرانسه ' همه دست بهم داده راہ تغیرات و ترقیات وسیع شد - افسوس بازهم افسوس کشته شدن مرحوم میرزا تقی خان ' چرخ ترقیات را از کار انداخت و حرکت ادبی نیز سست گردید - خلاصۂ این مطلب از موضوع بحث بیرون است - مقصود این بود که یادآوری شود که ادب جدید دورۂ مشروطه دفعتاً و ناگهانی پیدا نه شده است عوام در هر چیز خوف زده شده اند و از چهار جهت خواص بر ذهن سادۂ عوام حمله می کردند - (۱) از جهتے دورباش شاطران استبداد - (۲) از جانبے کور شو علم بردارانِ شریعت - (۳) از سمتی تلنبه گوئی ادیبان - (۴) از طرفے مشکل تراشیِ شاعران' ناچار طبیعت عوام کند و ذهن شان کور شده بود - به شنیدن و نه فهمیدن و خواندن و نه سنجیدن عادت کرده بودند بهترین تعریف عوام براے واعظ آن بود ' سبحان الله خیلے عالم است ' کسی حرفش نمی فهمد - این حرف را با سادگی براے بزرگواریِ واعظ می زدند در واقع درست می گفتند - واعظ خودش هم کلام خویش نمی فهمید گویا نافهمی هم مانند فهم محتاج استاد است و نادانی هم مثل دانائی از بزرگ بکوچک میرسد - در حقیقت چنین است عوام حق دارند رفع تهمت از خود نموده در مقام مدافعه بر آمده بگویند - درست است نافهمی و نادانی بیماری است و متعدی می باشد مگر از بزرگ بکوچک رسیده ' از بالا بپائین آمده است' عرض خاص است لاکن مرض عام شده ' آب ازسرچشمه گِل آلود است -

برائے استقلال مملکت وجودِ عوام لازم شد لهذا شعراء بزبانِ ایشان و برائے ایشان اشعار ملی و مصائب مملکتی سرودن گرفتند - هیچ مملکتی بدون پشتیبانی ء اکثریت بمقصود نمی رسد و در واقع اکثریت مالکِ ملک است و اکثریت همیشه زنده است و زبانِ اکثریت زبانی است که قابل بقا و ارتقا است -
پس باید اولاً زبان را یک جهت ساخت و همزبان با عوام شد بعد شروع بمقصود نمود - ادباء' خطبا' شعراء ایران مطلب را درک نموده با عوام یک جهت و همزبان شدند - و همزبانی اثرِ خود را کاملاً بخشید و ملتِ جاهل نادان و بے خبر به جنبش افتاد - در مملکت شعری' ملتِ حساس شعرهاے ملی را وردِ خود ساخت، ذوقِ شعري آن قوی شد و اشعار قلوب آنها را مسخر کرد --

اشعار عشقی' عرفی' ایرج میرزا' سید اشرف الدین' مانندِ برق زبان زد عام و خاص گردید - تعجب اینجا است که بهمان درجه که خواص ازین اشعار متاثر می شوند و چند درجه بیشتر عوام متالم می گردند و می فهمند این گونه اشعار بایک لهجهٔ نمکین و زبانِ ساده احتیاجات ملی' مصائب مملکتی را با احساسات ملی و عواطف قومی ذهن نشینِ عوام می کند و این بزرگ ترین مدرسه است --

طلوعِ مشروطه و آزادی' پیش آمد یک مقصود عمومی' مصائب ملی' احساسِ احتیاجاتِ مملکتی' ملت ایران را با هم متحد کرده هم زبان ساخت و زبان فارسی بایک سرعت شگفت انگیزی گریبان خود را از دست تفرقه بیرون آورده در شاهراه یک جهتی افتاد - امید است آینده یک فضائے علمی' یک محیط هموار' یک ملتِ یک ساختی را بار آورد - طلوع مشروطه زبان را آزاد و قلم را توانا ساخت - پیش آمدن یک مقصود عمومی نویسنده و

گوینده را بسیار کرد - مصائب ملی خوانندہ و شنوندہ را فراوان نمود - احساس احتیاجات مملکتی مشی زبان را تغیر داد و شعرا از مقام خدائی خود پائین آمدہ همزبانِ عوام شدند- مراعات ذهن آنها نمودہ بفهم ایشان شعر سرودند - ادیبان و گویندگان سخنان خود را عوامانہ ادا نمودند کم کم الفاظ عامیانه و بازاری راه و رخنه یافته زبان زد ادبا و شعرا شدہ زبان را سادہ و شیرین تر گردانید - عوام نیز با شوق و ذوق نزدیک آمدہ و برائے مطالب فهمی آمادہ شدند و از عالم تنگ و تاریک بیخبری بیرون آمدہ به دنیائی نوی داخل گشتند - اشعار وطنی ' سرود هائے ملی بهترین معلم ایشان شد ایشان را سر گرم و پر جوش ساخته هنگامۂ انقلاب را گرم کردند - برائے آزادی و آبادی نعرۂ " زندہ باد انقلاب " از جگر برکشیدہ رستخیز عام و محشر ملی بر پاشد - با پشت گاریِ خواص و پشتبانیِ عوام کاخ استبداد سرنگون گردیدہ سلطنت ملی شد —

وطنیات

ادبیاتِ شعری فارسی پیش از مشروطه یک دنیای پهنا ور ممتازی است و پهناوریِ آن زیادہ تر از درازی است - یعنی موضوع کوتاہ ' مضمون کم و بد بختانه مکرر است بعبارت دیگر مضمون و موضوع کم و شاعر بسیار - از اینجا است که یک موضوع کوچک خسرو شیرین ' لیلی مجنون ' فرهاد شیرین ' یوسف و زلیخا ' میدان مقابله و مبارزۂ شعرا است و شعراء بزرگ برائے یک موضوع کوچک بجان هم افتادہ اند گویا عالمِ خیال هم مثل عالمِ معیشت تنگ شدہ و میدان تنازع البقا پیش آمدہ است لاکن در حقیقت مسئله تنازع للبقا فقط برائے نان نیست اگر هست برائے جان است و جانِ شعری بالاتر از جانِ نانی است - بد بختانه بیشتر شعراء ایران برائے نان شعر می

گفتند وهر دو میدان برائے آنان تنگ بود - تمام افراد بنی آدم برائے نان جان می دهند - آدم برائے نان خام (گندم) دست از نعمتهائے بهشت کشید - اگر اولاد او برائے گندم پخته (نان) بجان یکدیگر بیفتند جا دارد - سخن کوتاه ' مضمون محدود ' استاد معدود ' نابغه کمیاب ' شاعر بسیار ' دائرۂ شعر وسیع تعریف شاعری ازان وسیع تر است وکشور شعر حد وکناره ندارد - آزادی وصلاے عام است —

هر که خواهد گو بیا و هر که خواهد گو برو

گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاه نیست

بلی ولی استاد کم است و نابغه نادر نه تنها در دنیائے شعر بلکه در هر چیز و هر جا وهمیشه نابغه کمیاب است - گویا روز گار درین باره امساک و بخل کرده است فقط وضع جغرافیائی سبب کمیابی شعراء بزرگ نیست بلکه سبب اصلی قناعت و کفایت شعاری طبیعت است - فقط چند استاد بزرگ نابغۂ دنیائے ادبیات پیش از مشروطه شدند وهمین چند تن نابغه کشور ادبیات را فتح کرده اند وهمه مستحق تکریم واحترام هستند - و دیگران هم در مرتبۂ خود خدمت کرده اند و مستحق تعریف می باشند - درین جا فقط دو نابغۂ بزرگ ذکر می شود —

فردوسی نه تنها نابغۂ ادبیات است بلکه بواسطۂ ایجاد موضوع مهم ومفیدی ' دارائے مقام بلندی است - این نابغۂ نادره ' بقاء ملت ' زبان ' آداب ورسوم ملی ' تاریخ مختصراً هر چیز ملی ووطنی را درنظر گرفته پس یک عمر جانکاهی نموده وسراپا خدمت به ابنائے وطن کرده است وملت ایران را از پامالی و تباهی نجات داده است - سعدی نیز تنها نابغۂ شعری نیست بلکه بایک طرز بلیغ ویک اسلوب شیوا اصلاحات ملی را

پیش نهاد خود نموده است و بادشاه و وزیر' رند و زاهد' جوان و پیر' توانگر و فقیر' تعلیم و تربیت' اخلاق' ظلم و عدل' عشق و جوانی' ضعف و پیری' عواطف' احساسات' مختصراً احوال ملی را در نظر گرفته با یک فصاحت ساده و بسیار مختصر موثری درپئے اصلاح برآمده است و توجه خاص و عام را بخود معطوف داشته - ایجاد این گونه موضوع در وقت ضرورت از مختصات سعدی بوده و حقیقتاً او مصلح است -

وضع جغرافیائے ایران و آب و هوا' باغها' گلها و گلستانها' و انقلابات سیاسی همیشه شاعر پیدا کرده است لاکن مخاطب دلیل منطقی می خواهد - در همین زمان حاضر باندازهٔ ماخذ درست بدست آمده است که میتوان یک کتابچه نوشت بلکه گواه تاریخی از زمان هخا منشی بدست داریم تقریباً ۳۴۰۰ پیش از میلاد عیسیٰ - از روئی ادلّهٔ تاریخی شعر قبل از اسلام در ایران موجود بوده است لاکن یک نکتهٔ مهمی دیگر هم ایرانیان قدیم در شعر ملحوظ می داشته اند و آن توافقِ اوزانِ شعری با موسیقیِ ملی است - این رعایت درین عصر حاضر کم کم دارد لحاظ می شود - امید است آینده وسیع شده اثرات مسرت انگیزی بدهد - آن هم یکے از شاه کارهائے عصر حاضر است که زبان را عمومی و یک جهت می کند و روح عوام را تکان داده آنان را برائے مبارزهٔ زندگانیِ ملی آماده می نماید - اشعار جدید به سبب هم آهنگی با موسیقی درخانه و کوچه و بازار و محافل ادب و بزمِ عیش قلوبِ عامه را جذب کرده است —

طلوع مشروطه و پیش آمدن یک مقصود عمومی' احساس احتیاجات وطنی' مصائب مملکتی هزارها موضوع مفید بدست شعراء می دهد

و یک کشور وسیع بزرگی باسم ایران ' وطن به آنها حواله می کند - کنون موضوع بسیار مضمون بے شمار است - از ینجا است که شعار این عصر همه وطنی شده است - قصیده ' غزل ' قطعه ' ترجیع بند ' رباعی ' اوزان جدیده هر کدام در یک موضوع مهمی ' یک مضمون مفیدی سروده شده است - از پیر هشتاد ساله (ادیب پشاوری) تا جوان نو خیز (حسام زاده) همه با یک کرسیء حقیقیء وطن و ابناء آن را در نظر دارند و همه موضوع تازه و مضمون نو ایجاد می کنند - سخن کوتاه کنون شاعر کم و مضمون بسیار است —

سیل شعر گوئی با جوش و خروش سرازیر شده است و راه هائے نو پوش گرفته جویائی مجراهائے طبیعی است و کنون مضمون بے حد ' موضوع بے انتها ' بزشاعر بسیار ' استاد کم و جهان ادب تشنهٔ وجود نابغه است —

جلد دوم و سوم ' سخن وران عصر حاضر ' به نظر نرسیده است و نگارنده ناچار است در حدود جلد اول تبصره بنویسد بنابرین کنون فهرست مهمی از انقلابات ادبی نوشته مقاله ختم می شود -

انقلاب ادبی زبان فارسی

(۱) یک رخی و یک جهتیء زبان -

(۲) وطنی شدن عالم نظم -

(۳) توافق با موسیقی-

(۴) راه و رخنه یافتن الفاظ و محاورات عوام در جهان نظم -

(۵) ساده گوئی-

(۶) تسلسلِ مطلب-

(۷) علل و اسباب ظاهر کردن و نتیجه گرفتن -

(۸) ایجاد موضوع و مضمون بکر منہوں وطنی -

(۹) کرسیء حقیقی -

(۱۰) اوزان نو -

(۱۱) لازم می نماید برائے برخے از مطالب مقالہ و این فہرست نمونۂ از نظم جدید نوشتہ شود لاکن کتاب ' سخنوران عصر حاضر ' خود نمونہ است —

سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ

از اڈیٹر

سر سید جامع حیثیات شخص ہوے ہیں - یہ وہ زمانہ تھا جب سوسائٹی کا شیرازہ بکھر چلا تھا - زندگی کا ہر شعبہ دبدھا کی حالت میں تھا - دو تہذیبوں کے ٹکرانے سے اس تذبذب میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس وقت ایک ایسے مخلص زمانہ شناس ' اور ثابت قدم شخص کی ضرورت تھی جو قوم کی خفتہ اور مردہ قوتوں کو جگاے ' ان اوہام اور اسقام کو دور کرنے کی کوشش کرے جو گزشتہ تمدن اور حکومت نے پیدا کردیے تھے - اور اقتضاے زمانہ کے لحاظ سے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور جدید حالات کی رو سے ان کی روش کو بدلے - سر سید نے اگرچہ زندگی کے ہر اہم شعبے کی طرف توجہ کی لیکن ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا - اور اسی کام کا ایک جز سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا - خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا ہے جو اس وقت عمل میں آرہا تھا ۔ یہ علمی سعی اردو زبان کے سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی ہے اور اس لیے اس کا ذکر اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے —

سر سید نے سنہ ۱۸۶۳ ع میں ایک تحریر اس عنوان سے کہ ' التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند " چھاپ کر شائع کی

جس کا خلاصۂ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے *" - یہ تھی اصل بنیاد سائنٹفک سوسائٹی کی - چنانچہ دوسرے ہی سال انہوں نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش کی —

۹ جنوری سنہ ۱۸۶۴ ع کو سر سید نے غازی پور میں جہاں وہ صدرالصدور تھے ' اپنے مکان پر ایک جلسے کا انعقاد کیا جس میں یورپین اور دیسی اصحاب کا اچھا خاصا مجمع تھا - یہ جلسہ سوسائٹی کے قائم کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا - اس میں لفٹننٹ کرنل گریہم نے (جو سر سید کے بڑے دوست تھے اور اس وقت غازی پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) اور سر سید نے بہت مدلل اور معقول تقریریں کیں —

سر سید کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور اب بھی تقریباً ۷۰ سال گزرنے اور مغربی تعلیم کی بکثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی وہ خیال ویسا ہی صحیح ہے کہ علوم جدیدہ کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں - مولانا حالی لکھتے ہیں کہ " انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا " - مولانا نے اس سوسائٹی کے مقاصد کو مختصر طور پر نہایت خوبی سے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :—

" جو (یعنے سائنٹفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے ' علمی مضامین پر

---

* حیات جاوید حصۂ اول صفحہ ۱۲۱

لکچر دیے جائیں ' رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوا کرے ' ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے" ابتدا ہی میں ۱۲۹ ممبر ہوگئے - جس میں ہندو و مسلمان انگریز سب شریک تھے —

اسی سال (یعنی سنہ ۱۸۶۴ ع میں) سر سید غازی پور سے تبدیل ہوکر علی گڑہ آگئے - " چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا نا ممکن تھا ' اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھ علی گڑہ لے آے - مسٹر ولیم جانکس بریملی جو اس زمانے میں علی گڑہ کے جج تھے ' سوسائٹی کے پریسیڈنٹ قرار پاے " - اور اسی وقت سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بنانے کی تجویز ہوئی اور سر سید کی کی نگرانی میں عمارت کی تعمیر شروع بھی کردی گئی - مکان کی تعمیر اور آرائش اور کتب و آلات وغیرہ پر تقریباً تیس ہزار روپے کی لاگت آئی اس کا سنگ بنیاد لفٹننٹ گورنر شمال مغرب (اے - ڈریمنڈ) نے ۳ نومبر سنہ ۱۸۶۳ ع کو رکھا تھا اور ۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ ع کو جب عمارت بن کر تیار ہوگئی تو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اس کا افتتاح ہوا - ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے پیٹرن (سر پرست) اور اے - ڈریمنڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب وائس پیٹرن قرار پاے - اولین سکریٹری لفٹننٹ کرنل گریہم ' اس کے بعد سر سید ہوے -

اگرچہ سوسائٹی کا پہلا قانون سنہ ۱۸۶۴ ع میں بمقام غازی پور بنا لیکن جب سوسائٹی کا دفتر علی گڑہ میں منتقل ہوگیا تو سنہ ۱۸۶۷ ع میں اس میں

کسی قدر ترمیم کی گئی- سوسائٹی کے اغراض اور قواعد حسب ذیل قرار دیے گئے:-

(لقب اور مقصد)

اس مجمع کا نام سائنٹفک سوسائٹی یعنے علمی سوسائٹی کہا جائے گا اور مقصد اس کا یہ ہوگا:—

(۱)-ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں-

(۲)- جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کے فہم و فراست کی ترقی متصور ہو—

(۳)- ایشیا کے قدیم مصنفین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کرکر بہم پہنچانا اور چھاپنا—

(بناوٹ سوسائٹی کی)

(۴)- سوسائٹی میں (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقاے سوسائٹی ہوویں گے اور سوسائٹی کے پیٹرن یعنے مربی اور وائس پیٹرن یعنے نائب مربی بھی مقرر ہوا کریں گے—

معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے (اول) ممبران حضوری یعنے وہ ممبر جو ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو- (دوسرے) ممبران مکاتبت یعنے وہ ممبر جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہو سکیں اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں —

تعداد غیر محدود- چندہ دو روپیہ ماہانہ-

آنریری ممبروں کی تعداد دس سے اور رفقاے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی --

صاحبان ڈریکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودھ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنریری ممبر* ہوں گے --

رفقاے سوسائٹی ایسے شخص ہوں گے جو بسبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھہ خیال نہ ہو --

کونسل مشیر کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب، ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ اردو، فارسی، عربی، ہندی میں کیا جاوے یا کن کن زبانوں یا کس زبان میں کیا جاے --

کونسل کارپرداز - ذمہ دار منتظم اور ایک کتب خانہ کا قیام --

جو عمارت سوسائٹی نے علی گڑہ میں بنائی وہ علی گڑہ انسٹیٹیوٹ کہلائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانہ کی غرض سے جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جایا کریں گے --

۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ع سے انسٹیٹیوٹ گزٹ جاری ہوا - یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار نکلنے لگا - اڈیٹر خود سرسید تھے - مولانا حالی نے اس اخبار کے متعلق جو راے لکھی ہے وہ اس قدر معقول اور صحیح ہے کہ اس کے بعض حصوں کا یہاں نقل کر دینا کافی ہے -

"اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولٹیکل معاملات پر مضامین

---

* فرانس کے گارساں دتاسی بھی سوسائٹی کے آنریری ممبر بنائے گئے -

اور نوٹ لکھتے تھے ؛ اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے - اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے ؛ اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے - اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا - اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے —

اس میں سوشل ، اخلاقی ، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے - جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی ، علاوہ اُن لیڈنگ آرٹکلوں کے ، جو وہ خود لکھتے تھے ، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہوکر چھپتے رہتے تھے - ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شایع ہوتے تھے —

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات

کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا —

... ...

ایک خاص وصف، جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھہراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دلآزاری روا نہیں رکھی - اس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لیے، جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا - اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا - کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہلکاروں پر زہر نہیں اگلا - ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی " —

یہ سب سچ ہے لیکن یہ اُسی وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا - آخر میں تو یہ "ماخوذ از پانیر" ہو کے رہ گیا تھا - لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا تو سر سید خود بڑے پُرزور مضامین لکھتے تھے —

ابتدا میں منشی محمد یار خاں اڈیٹری کا کام کرتے تھے اور منشی چکھن لال انگریزی اخبارات کا ترجمہ کرتے تھے - مولوی فیض الحسن اور

بابو گنگا پرشاد مترجم کتب تھے - اجرت پر بھی کام ہوتا تھا - کل عملہ پانسو روپیہ ماہانہ کا تھا —

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا اور آلات علمی اور کلوں کے نمونے فراہم کیے گئے اور لکچروں کا سلسلہ قائم ہوا - ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر ' نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور عملی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے —

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا سارا دار و مدار سرسید پر تھا - انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور محنت اور سالانہ چندوں اور عطیات سے سوسائٹی کو بہت کچھہ فائدہ پہنچایا - اپنا ذاتی پریس جو "تبئین الکلام" کے چھاپنے کے لیے خریدا تھا ' سوسائٹی کے نذر کردیا - جون سنہ ۱۸۶۶ ع میں جب نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال نے یہ سنا کہ سید احمد خاں نے ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انہوں نے بطور اظہار خوشنودی ایک الماس کی انگھوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ سرسید کو بھیجی - سر سید نے ایک جلسۂ عام میں یہ انگوٹھی سوسائٹی کو دے دی - اسی طرح محض سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے سرسید نے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں اور وکیلوں کو قانون پر لکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کے نذر کردیتے تھے —

گورنمنٹ اور روسا امرا اور حکام نے بھی اس کی معقول امداد کی - گورنمنٹ نے تین ایکڑ تین روڈ اور تیس پول زمین سرکاری تعمیر مکان کے لیے اور ایک باغ سرکاری علم فلاحت کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کی - مہاراجہ جودھپور نے سو روپیہ سالانہ ' مہاراجہ کپورتھلہ نے پچاس روپے ' مہاراجہ جے پور نے پچاس اور نواب رام پور نے سو روپے سالانہ

امداد مقرر کی - وائسرائے اور لفٹننٹ گورنر وغیرہ نے چندوں سے مدد کی - سرجان لارنس کو خاص توجہ تھی - مسٹر ڈریمنڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی چندے دیے - نواب کلب علی خاں نے بارہ سو روپے کی ایک نقرئی کرسی سوسائٹی کو دی مہاراجہ الور اور مہاراجہ اندور اور نواب ٹونک نے بھی عطیات دیے - مہاراجہ بنارس کو بھی اس سے خاص دلچسپی تھی- عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے دو سو روپے تعمیر چاہ کے لیے دیے - سر آکلینڈ کالون ، مسٹر سمیت کلکٹر میرٹھ اور مسٹر کیمسن ڈائرکٹر تعلیمات بھی اس کے بڑے معاون تھے - سرسید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی —

۱۵ - اگست سنہ ۱۸۶۷ع میں جب سر سید عہدۂ جج سمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر علی گڑھ سے بنارس چلے گئے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس سی - ایس - آئی کو جو اس زمانے میں علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انھوں نے بڑی توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا - لیکن سر سید بنارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور اُن کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شایع ہوتے رہے —

" سنہ ۱۸۶۷ میں سر سید بتقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علی گڑھ میں آئے اور ضلع علی گڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے ؛ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہوجائے - بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اِس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے ؛ اور

اس کی شرائط واجب العرض میں بر وقت بندوبست کے درج ہو جائیں تاکہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھہ عذر نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۹۷ ع کو سوسائٹی کے جلسے میں سر سید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع ان کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کرکے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں۔ اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کردیے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھہ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر سنہ ۹۷ ع بنام سر سید وصول ہوی اس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی" * —

۹ — مئی سنہ ۱۸۹۸ ع کو سوسائٹی نے ایک اڈریس سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سر ولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۹ — اگست سنہ ۱۸۹۸ ع کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ "اگرچہ انعام سے کچھہ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام

* حیات جاوید حصہ اول صفحہ ۱۳۷ —

میں لانا نہیں جانتا تھا' برقی قوت کی طرح دوڑ گیا - انہوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھہ گئے - خصوصاً اردو لٹریچر صرف اس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کردی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا "* —

سر سید کی دور اندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے - اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بہت بڑا کام تھا - جب سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوئی تو اس نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سر سید بھی کسی قدر مائل ہوگئے تھے کہ یہ نام بدل دیا جائے لیکن جب طریقہ و علم کاشتکاری اور علمی عجائبات کا رکھنا طے ہوگیا تو یہی نام مناسب خیال کیا گیا اور آخر تک یہی نام قائم رہا -

سائنس کے لکچروں کے سلسلے کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے عملی تجربے بھی کیے گئے اور علم فلاحت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گیہوں بویا گیا اور جب تیار ہوگیا تو جلسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا - ایک ایک دانے میں ساٹھہ ساٹھہ ستر ستر شاخیں نکلیں اور بعض میں سو سے بھی زیادہ پھوٹ کر مثل پولے کے جھاڑ کے ہوگیا تھا - پودے کا طول ۴ فٹ ۸ انچ اور بال مع تور کے ۱ انچ لمبی تھی - نو قسم کے گیہوں لندن سے منگائے گئے - خود سر سید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہنی نلی ایجاد کی اور علم فلاحت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا -

مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ اس سوسائٹی کا بہت بڑا مقصد تھا - علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ

---

* حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۳۵ -

بہت بڑا ذریعہ تھا - سر سید نے پولیٹکل اکانمی، نیچرل فلاسفی، علم آب وہوا کے ترجموں کی سفارش کی- کرنل جے ڈبلیو ہیملٹن نے پہلے ہیروڈوٹس کے تاریخ مصر کے ترجمے کی اور بعد ازاں تمام تاریخ کے ترجمے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقاموں اور شخصوں کے ناموں کے معاملے میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی کرنی چاہیے اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ہو وہی اختیار کیا جائے - انگریزی زبان کی تقلید لازم نہیں- ہندی کے حروف ٹ اور ڈ کا استعمال نہ کیا جائے- ہیئت اور جیالوجی (ارضیات) کے ترجمے کی بھی رائے دی- دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ تاریخ مصر مسمی حسن المحاضرہ مصنفہ سیوطی ہے- ہشت بہشت کا نسخہ بھی بھیجا جو ادریس بدخشی کی تصنیف ہے جس میں شاہ مراد کی وفات ۸۵۵ ہجری تک کے حالات ہیں- مصنف کے بیٹے ابوالفضل الاختری نے اسے ۹۸۲ ہجری تک پہنچایا' لیکن یہ نسخہ اصل مصنف کا تھا جو ۸۵۵ تک ہے - انہوں نے ہیرن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی رائے دی-

خود سر سید نے دو کتابوں کی تالیف کا بیڑا اٹھایا - ایک تمام اردو مطبوعہ کتب نظم و نثر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اردو - اس میں امور ذیل کی صراحت کی جائے گی —

نام کتاب - نام مصنف مع مختصر حال - زمانۂ تصنیف - کچھہ عبارت بطور نمونۂ طرز بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ —

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی —

دوسرے اردو لغات جو سر سید نے لکھنی شروع کردی تھی ' اس کا نمونہ موجود ہے جو آئندہ ہم اس رسالے میں پیش کریں گے - اس پر بعض یورپین فاضلوں نے رائیں بھی لکھیں —

یہ دونوں تجویزیں نہایت قابل قدر اور اردو زبان کے استحکام کے لیے لازم ہیں - سرسید کے صحیح ادبی ذوق اور دور بینی کا اسی ایک بات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ۶۶ برس پہلے اس چیز کا ڈول ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں —

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جن میں سے بعض کے نام جو ہمیں معلوم ہوے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں —

۱ - تاریخ مصر قدیم مولفۂ رولن -

۲ - تاریخ یونان مولفۂ رولن —

۳ - رسالۂ علم فلاحت اسکاٹ برلن —

۴ - تاریخ چین بزبان فارسی قلمی ترجمۂ پادری ایکسوس —

۵ - تزک جہانگیری قلمی —

۶ - رسالہ علم انتظام مدن (پولیٹکل اکانمی) مولفۂ ولیم سیلیر —

۷ - ایک گفتگو بر عہد لارڈ ڈلہوزی و لارڈ کیننگ مترجمۂ لفٹننٹ کرنل گریہم بزبان اردو —

۸ - تاریخ ہند مولفۂ الفنسٹن —

۹ - رسالۂ علم آلات مولفۂ تامسن —

۱۰ - رسالۂ علم طبیعات مولفۂ تامسن —

۱۱ - رسالۂ علم آب وہوا مولفۂ تامسن —

۱۲ - رسالۂ برق مولفۂ ہیرس —

۱۳ - دیباچۂ تاریخ فیروز شاہی —

۱۴ - ٹاڈ ہنٹر کی کتاب اقلیدس مترجمۂ مولوی ذکاءاللہ -

۱۵ - جغرافیہ مولفۂ پادری ولکنسن —

۱۶ - سیاست مدن (مل کی پولیٹکل اکانمی کا انتخاب) مترجمۂ پنڈت دھرم نراین رائے بہادر میر منشی اندور -

۱۷ - ترجمۂ علم مساحت مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر —

۱۸ - ترجمۂ علم مثلث مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر —

۱۹ - ترجمۂ الجبرا مبتدیوں کے لیے مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر -

۲۰ - ترجمۂ نظریۂ مساوات مولفۂ ڈاکٹر ہنٹر -

۲۱ - کال بریٹھہ اور ہاٹن کے سائنٹفک مینول یوکلڈ کا ترجمہ —

۲۲ - کال بریٹھہ اور ہاٹن کے سائنٹفک الجبرا کا ترجمہ -

۲۳ - برنارڈ سمتھہ کی ارتھمیٹک کا ترجمہ —

۲۴ - برنارڈ سمتھہ کے الجبرا کا ترجمہ -

۲۵ - کال بریٹھہ کی کتاب حساب کا ترجمہ -

۲۶ - ڈاکٹر ہنٹر کے الجبرا کا ترجمہ (کالجوں اور مدارس کے لیے) —

۲۷ - کال بریٹھہ کی Plain علم مثلث —

۲۸ - ڈاکٹر ہنٹر کی Plain co-ordiate geometry —

۲۹ - ڈاکٹر ہنٹر کا (Integral Calculus) تکمیلی احصا —

۳۰ - ڈاکٹر ہنٹر کا (Differential Calculus) تفرقی احصا —

۳۱ - ترجمہ تاریخ ایران مولفۂ سرجان میلکم —

دھلی کالج اور اس کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو زبان میں شایع کیے - یہ کام جب آج کل دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کس قدر دشوار ہوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ہوتے تھے اور نہ ان ترجموں

کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے - علاوہ اس کے عجائب خانے کے لیے سکے بھی جمع کیے - چنانچہ مسٹر تھارن هل جج سہارن پور اور مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گنج نے کچھ سکے بھیجے - ایک اشرفی عہد تغلق کی عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور نے دی —

سر سید کا قاعدہ تھا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے تھے ھاتھ دھوکے اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے ' چنانچہ سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا - " ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی ' خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی امداد پہنچائی ' اس کی عالیشان عمارت اپنے اهتمام اور نگرانی میں بنوائی ' اس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں ' لائق لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے ' قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں - غازیپور ' علی گڑھ ' بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ هندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن میں برابر لگے رہے - چنانچہ ولایت جاتے ہوے جو خط کہ انھوں نے مولوی سید مہدی علی خاں کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ " مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج ہوا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی کوشش کا واسطے شکست کردینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے - پس میں چاھتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں " * —

---

* حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۲۶ - ۲۷ —

محض سوسائٹی کی خاطر کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ ع کو مذاکرۂ علمیہ میں ایک طویل لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا —

اس سوسائٹی کے ذریعہ سے بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئیں - مثلاً تحصیلی مکاتب کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی - اسی سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے ایک عجیب خیال تھا - اس کا حال ہم آیندہ ایک علحدہ مضمون میں لکھیں گے —

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوگئیں جو اپنے اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں - سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور وہ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے - اس سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان ہے —

(اس مضمون کے لکھنے میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی مختلف جلدوں، گریہم کی لائف آف سید احمد خاں اور حیات جاوید سے مدد لی گئی ہے) —

شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا و ترقی

از

شیخ چاند صاحب ایم - اے ' ایل ایل - بی

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باضابطہ آغاز دراصل بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ عالمگیر کے عہد کے پس و پیش ایسے شعرا گزرے ہیں جن کے اشعار تذکروں میں مل جاتے ہیں - چنانچہ موسوی خاں فطرت ' خواجہ عطا ' جعفر ' بیدل وغیرہ ایسے شاعر ہیں جن سے چند شعر منسوب ہیں - اُسی زمانے (۱۱۰۵ ھ) میں اسمعیل امروہی نے ایک مثنوی " تولد نامۂ بی بی فاطمہ " * لکھی ہے - اس کے سوا بعض شاعروں کا کلام بھی دستیاب ہوتا ہے لیکن یہ دراصل ایسی کوششیں تھیں جن کا مستقل اور پائدار اثر قائم نہ ہوسکا ' اور ان شعرا نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے رائج کرنے میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں دی - شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں اُردو شاعری کے آغاز کی تاریخ عالمگیر کا چوالیسواں سنہ جلوس (۱۱۱۲ ھ) ہے - یہ وہ تاریخ ہے جس میں بقول قایم ولی نے دہلی کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ وہاں کے شاعروں کے حلقے میں اپنی ریختہ گوئی سے ہل چل ڈال دی -

---

* کتب خانۂ مولوی عبدالحق صاحب —

اور جب ۱۱۲۳ ھ میں بقول * حاتم ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو موزوں طبع شاعروں کو متاثر و متحرک کردیا - یوں تو دکنی شاعروں کے کلام سے شمالی ہند کے شاعر اس سے قبل سے واقف تھے اور شمالی ہند کے بعض شاعروں کے کلام سے اس کی شہادت بھی ملتی ہے - قائم † (قائم چاند پوری سے قبل گزرا ہے) نے اپنے مرثیہ میں قادر کا ذکر اس طرح کیا ہے -

قایم کا آج ہند میں شہرا ہوا بلند دکھن میں اس کے شعر کہو قادرا سکھیں

مخزن نکات (مولفہ ۱۱۶۸ ھ میں لکھا ہے کہ پچاس سال قبل مرزائے دکنی کے مرثیے ہاتوں ہاتھہ دکن سے شمالی ہند میں پہنچتے تھے اور عام طور سے پڑھے جاتے تھے لیکن ان کا کوئی بھی اثر نہ پڑسکا - یہ صرف ولی کے کلام کی کرامت تھی کہ اس نے شمالی ہند کے شاعروں کو ریختہ کی طرف متوجہ و مائل کردیا - اس کے مقلدین میں آبرو ' حاتم ' مضمون ' مظہر جان جاں ' احسن اللہ ' شاکر ناجی ' مصطفی خاں یکرنگ ایسے شعرا ہیں جو اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں - ولی کے تتبع میں طبع آزمائی کرنے کا ذکر ان میں سے بعض نے کیا ہے چنانچہ حاتم لکھتا ہے :-" در ریختہ ولی را استاد می داند " - آبرو کا ایک شعر ہے :—

آبرو شعر ہے ترا اعجاز گو ولی کا سخن کرامت ہے

یہ شاعرانہ تعلی ہے ولی کا ذکر کرنا ہی اس کے اثر کو تسلیم کرنا ہے —

ولی کی تقلید سے اس کے مقلدین کے کلام میں ایک حد تک ہندی کا عنصر غالب تھا - اس ہندی عنصر نے اس قدر شدت اختیار کرلی تھی کہ ایہام کا رواج ہوگیا - ایہام کی بنیاد اسی عنصر پر قائم ہوئی -

* تذکرۂ مصحفی — † حمید نے قائم کو برہانپوری لکھا ہے جو دوسرا شاعر معلوم ہوتا ہے -

بقول آزاد " سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں اس واسطے اس میں برج بھاشا اور اُس کی شاخ میں ذو معنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی - فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم - اُردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی " - ظاہر ہے کہ ایہام کا التزام ایک مصنوعی اور غیر فطری فعل تھا جس نے عام شاعری اور خصوصاً غزل کو اثر اور سادگی کے جوہر سے محروم کردیا - اس میں مضامین کے ادا کرنے سے بڑھ کر ذو معنی الفاظ کے استعمال پر شاعر کی پوری قوت اور زور صرف ہوجاتا تھا' اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کلام بے کیف اور بے لطف ہوجاتا تھا اور عام قبولیت حاصل کرنے سے محروم - اس دور کے اساتذہ کا کلام اٹھاکر دیکھیے تو شاعرانہ صناعی اور ہنر مندی پر حرف رکھنے کو جگہ نہیں لیکن سادگی اور اثر کافور ہیں' الفاظ کا ذخیرہ بافراط موجود ہے' اُن کے استعمال اور معانی کے مختلف پہلو روشن ہیں' عالم لسانیات اور محقق لغات کے لیے اُن کا کلام بیش بہا ذخیرہ ہے' لیکن کیف و لذت سے خالی ہے - اِبتداءً تو یہ طرز مقبول ہوئی لیکن بہت جلد یہ غیر فطری اِلتزام و تصنع مردود ٹھہرا - ایہام گوئی کے مشہور علم بردار حاتم کو بھی یہ روش چھوڑنی پڑی چنانچہ جب سنہ ۱۱۶۹ ھ میں اپنے کلام کا انتخاب " دیوان زادہ " کے نام سے کیا تو پرانی طرز کے کلام کو خارج کردیا اور لکھا ہے : -

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش   حاتم کو اس سبب نہیں اِیہام پر نگاہ

اِیہام گوئی کے خلاف تحریک کا آغاز در اصل اُن شعرا نے کیا جو ان ایہام گو اساتذہ کے بعد فوراً مجلس شاعری میں جلوہ افروز ہوے - اِن میں مظہر' سودا' میر' اور درد وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل

ذکر ہیں اِن کے دور میں قدیم روش شاعری یک قلم متروک ہوگئی - اس عہد کی ابتدا میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو اِیہام گوئی کا قائل تھا اور شاعری میں اس اِلتزام کو ملحوظ رکھنے پر مٹا ہوا تھا - میر کا شعر ہے :—

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اِن کے ابتدائی دور میں اِیہام کے ماننے والے موجود تھے اور اِس صنعت کو شعر کی دلچسپی اور لطف کا موجب سمجھتے تھے - اس دور کے بھی بعض شعرا نے اِس طرز میں طبع آزمائی کی ہے - سودا کی ایک غزل اِسی رنگ میں ہے لیکن اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ ابتدائی دور کے اِیہام کو علم بردار مضمون اور 'آبرو' کی طرز ہے مجھے اس سے کوئی مناسبت نہیں :

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

'آبرو' کی طرز میں ایک غزل لکھی ہے :

ہو شاد اِس غزل سے روح آبرو کی سودا
تو اس زمیں میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

میر حسن کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے ' لیکن اس نے بھی اِیہام میں طبع آزمائی کی ہے ' چنانچہ اپنے تذکرے میں اپنے چند شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں ' جن کی نسبت لکھا ہے " چند اشعار بطور قدمائے اِیہام بندان گفتہ شد "- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِیہام گوئی کا اثر کچھہ نہ کچھہ باقی تھا اور شاعر کم از کم بطور تفریح اِیہام میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اِسی زمانے میں لوگ اِس سے بیزار ہوتے جاتے تھے جیسا

کہ سودا کے اوپر کے دو شعروں سے واضح ہے - یہی وجہ ہے کہ نوجوان شعرا کے حلقے میں یہ طرز مردود ٹھہری - اس کے غیر فطری ہونے پر نظر کر کے اُس کے خلاف شاعروں نے علم احتجاج بلند کیا - سودا نے صاف لکھا ہے :

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجکو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اِیہام گوئی کی بے وقعتی میر صاحب کی رائے سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے احسن اللہ کے اشعار کے حق میں ان الفاظ میں صادر کی ہے " طبعش مائل بہ اِیہام بود ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند " -

مظہر ، سودا ، میر وغیرہ نے جب اس طرز کو چھوڑنا پسند نہیں کیا اور ایک نئی روش زیادہ وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھہ اختیار کی تو ان کو زیادہ دشواری اور دقت پیش نہیں آئی اس لیے کہ قدیم طرز سے عام بیزاری پھیل گئی تھی ، زبان بڑی حد تک بن چکی تھی ، الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود تھا ، زبان کے ابتدائی قواعد اساتذہ کے کلام سے مستنبط تھے ، فارسی عروض مدتوں پہلے اردو شاعری کا بنیادی عنصر بن چکا تھا ، نئے دور کے مذاق نے کئی الفاظ و محاورات کو متروکات میں داخل کر دیا تھا ، یہاں تک کہ کہنہ گو و مشاق بوڑھا استاد حاتم بھی اس اثر سے نہ بچ سکا - اسے بھی سنہ ۱۱۶۹ ھ میں " دیوان زادہ " نئی طرز میں مرتب کرنا پڑا - ولی کی استادی کا اثر جس کا خود اس نے اعتراف کیا ہے ، زبان و خیال کے اعتبار سے کم ہونے لگا اور رفتہ رفتہ قدیم زبان بڑی حد تک متروک اور ہند کی زبان میں طبع آزمائی شروع ہوگئی - حاتم نے لکھا ہے :

ہند کی گفتگو انوکھی ہے		چرب ہے سب اوپر یہاں کی زبان

میر حسن نے بھی قدیم زبان کے ترک کرنے اور معانی و مضامین ی پیروی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے " چوں بنیاد ریختہ از زبان کن است بنا بریں صاحب سخنانِ ایں فن و معنی شناسانِ مغز سخن طرز بانِ هر دیار را معیوب نمی دانند و پیروی معانی می کنند " - قدیم زبان یں اصلاح کا حال دیوان زادۂ حاتم کے دیباچے سے واضح ہوتا ہے کہ س طرح غیر مانوس ہندی عناصر کو خارج کرکے مروجہ زبان کے مطابق ارسی اجزا شامل کیے گئے :-

" لفظ 'در' و 'بر' و 'از' و 'واؤ' کہ فعل و حرف باشد در دیوان خود تقید دارد - دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روز مرۂ دهلی کہ مرزایان هند و فصیحان رند در محاورہ دارند ' منظور داشتہ ' سوائے آں زبان هر دیار بہ هندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف کردہ ' محض روز مرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمود ...... ایں قاعدہ (قاعدۂ متروکات) را تا کجا شرح دهد - غرض کہ خلاف محاورہ و غیر مصطلح و غلطی روز مرہ و نقصان فصاحت را دخل نہ باشد " -

حاتم کے اس بیان سے قدیم زبان میں اصلاح کا اندازہ ہوتا ہے ور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندی عنصر کم ہوتا گیا اور فارسی عربی کے جزا مستحکم ہوتے گئے - اس باب میں مظہر جان جاں نے اس قدر لو کیا کہ اس زمانے میں ان کی اردو کو اهل فن نہ ریختہ کہتے تھے ور نہ فارسی بلکہ ان کی اردو کا حال بقول سودا " کتا دھوبی کا

کہ گھر کا نہ گھاٹ کا " تھا۔ —

یہیں سے فارسی اور ہندی کے عناصر میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز ہوا - اس سلسلے میں میر کے اس بیان پر نظر رکھنی چاہیے جس میں انہوں نے ریختہ کی اقسام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس طرز کا ذکر کیا ہے جو اس دور میں رائج ہوئی - اس بیان سے یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ ریختہ گوئی نے رفتہ رفتہ کیا صورت اختیار کی اور اس دور میں آکر اس کا کیا رنگ ہوا - یہ بیان چونکہ اس دور کے ایک مشہور استاد کا ہے اس لیے ہر طرح لائق غور ہے ' میر صاحب نے لکھا ہے : —

" ریختہ کی چند قسمیں ہیں ...... پہلی یہ کہ ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی ہو مثلاً قطعۂ امیر خسرو : —

زر گر پسرے چو ماہ پارا　　کچھ گھڑیے سنواریے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

دوسری قسم یہ ہے کہ آدھا مصرعہ ہندی ہو اور آدھا فارسی جیسا کہ میر معز کا شعر ہے —

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے　　در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

تیسری قسم یہ ہے کہ فارسی کے حروف و افعال استعمال کیے جائیں - یہ قبیح ہے - چوتھی قسم یہ ہے کہ ایسی فارسی ترکیبیں لائی جائیں جو زبان ریختہ کے مناسب ہوں - یہ جائز ہے - لیکن اسے غیر شاعر نہیں جانتا ' ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ

؎ غالباً مظہر کے ابتدائی کلام کے متعلق رائے ہے ورنہ ان کا بعد کا کلام بہت پاک صاف اور شستہ و رفتہ ہے —

کے لیے نا مانوس ہوں معیوب ہیں اور اس کا جاننا بھی سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے - میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے - اگر فارسی ترکیب گفتگوے ریختہ کے موافق ہو تو مضائقہ نہیں - پانچویں قسم ایہام کی ہے کہ اس فن میں جس کا رواج شاعرانِ سلف میں تھا - اب طبائع اس صنعت میں کم مصروف ہیں لیکن شستگی سے استعمال ہوتی ہے' ایہام کے معنی یہ ہیں کہ وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے - ایک معنی قریب ہوں اور دوسرے بعید - معنی بعید سے شاعر کی مراد ہو اور قریب سے نہیں - چھٹی قسم وہ انداز شاعری ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے' یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجنیس' ترصیع' تشبیہ' صفاے گفتگو' فصاحت بلاغت' ادا بندی' خیال' وغیرہ پر منحتوی ہے'' -

ریختہ کی یہ تعریف و تحدید ممکن ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے سے بالکل صحیح ثابت نہ ہو لیکن اس قدر تو یقینی ہے کہ اس دور کے اساتذہ نے اردو شاعری کا انداز ہی بدل دیا اور اس میں وہ تمام ضروریات اور لوازمات اختیار کرلیے جو شاعری کو سنوارنے اور بنانے میں کام آتے ہیں - ان تمام التزامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کا اثر بہ شدت داخل ہورہا تھا' لیکن زبان کو غیر مانوس ترکیبوں اور لغات سے پاک کر کے ہندی اور فارسی عناصر میں توازن و اعتدال بھی پیدا کیا جا رہا تھا —

شمالی ہند میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو گنتی کے صرف چند شاعر تھے' ایہام گو بھی چند ہی تھے جس سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری ابھی

زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی، لیکن ایہام گوئی کے خلاف کوشش شروع ہوئی تو شاعروں کی تعداد میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوگیا - اس کا ثبوت ان تذکروں سے آسانی سے مل جاتا ہے جو اس دور میں لکھے گئے ہیں - سنہ ۱۱۶۵ ھ میں میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں ایک سو چار شاعروں کا ذکر کیا ہے اور سنہ ۱۱۶۶ ھ میں گردیزی نے اٹھانوے کا جن میں پچیس شاعر ایسے ہیں جو میر کے تذکرے میں شامل نہیں ہیں - سنہ ۱۱۸۸ ھ میں قدرت اللہ شوق نے دو سو اٹھاسی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور میر حسن نے قبل ۱۱۸۸ ھ ما بعد ۱۱۹۳ ھ دو سو اٹھاسی کا - شورش نے سنہ ۱۱۹۳ ھ میں تین سو چودہ شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے اس کے بعد شاعروں کی تعداد میں اس شدت سے اضافہ ہونے لگا کہ حصر و شمار آسان نہیں - اس تعداد اور تدریجی ترقی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری نے تیس چالیس سال کے عرصے میں غیر معمولی مقبولیت اور ترقی حاصل کرلی - چنانچہ اس کا ثبوت ان مجلسوں کی کثرت سے بھی ملتا ہے جن میں ریختہ گو شاعر اپنا کلام سناتے تھے - فارسی گویوں کے لیے غزلوں کو منظر عام پر لانے کا ذریعہ مشاعرے تھے اس زمانے میں کئی جگہ مشاعرے ہوتے تھے - سب سے زیادہ مشہور سالانہ مشاعرہ مرزا بیدل کے عرس کے موقع پر ہوتا تھا - اس زمانے کے شاعروں کے کلام اور دیگر تحریروں سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے * فارسی گویوں کے مشاعروں کے توڑ پر ریختہ گویوں نے مراختہ (صحبت ریختہ گویاں) کی بنا ڈالی تھی ' چنانچہ مراختے کئی جگہ ہوتے تھے - مراختۂ خان آرزو ' یہ ہر قمری مہینے کی پندرھویں تاریخ کو خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوا کرتا تھا - حاکم لاہوری نے اپنے

* ملاحظہ ہو ہجو مولوی ندرت از سودا ' رقعات آنند رام مخلص —

تذکرہ " مردم دیدہ " میں اس کا ذکر کیا ہے ' مراختۂ خواجہ میر درد ' یہ بھی ہر مہینے کی پندرہویں کو درد کے مکان پر منعقد ہوتا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو کے مراختے کا سلسلہ بند ہوا تو انہوں نے اپنے ہاں یہ صحبت گرم کی - کچھ دنوں یہ سلسلہ جاری رہا - اس کے بعد درد نے یہ محفل اپنے ہاں رچانی بند کردی اور میر تقی میر سے کہا کہ ان کے ہاں مراختے منعقد ہوا کریں ' چنانچہ میر کے ہاں یہ صحبت گرم ہونے لگی - ان کے سوا میر نے اپنے تذکرے میں چند اور مراختوں کا ذکر کیا ہے - مراختۂ میر سجاد ' مراختۂ جعفر علی خاں زکی ' مراختۂ میر علی نقی وغیرہ - مشاعروں کی ترقی پذیر کثرت اور مجالس ریختہ کی ہنگامہ آرائی پر نظر کرکے ماننا پڑتا ہے کہ فارسی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور ریختہ گوئی کا ہر طرف بازار گرم تھا —

گجرات کا باکمال شاعر اردشیر خبردار

از

(جناب اختر حسین صاحب رائے پوری)

دور حاضر کے گجراتی شاعروں میں اردشیر خبردار کا مرتبہ سب سے افضل اور بلند ہے - اس میں شک نہیں کہ اس امتیاز اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کی قومی شاعری ہے اور وہ ستیاگرہ تحریک کا نہایت ہی نازک نگاہ ترجمان ہے - لیکن ہمارے خیال میں کوئی اصلاحی تحریک کسی آرٹسٹ کے جذبات میں وہ گرمی نہیں پیدا کرسکتی جو اس کی تخئیل و قوت تخلیق کو تحریک دے سکے - اصلاح کا مقتضاء توازن ہے اور آرٹ کا منتہا خود فراموشی اور بے بسی - لہذا شاعری جب اس میدان میں قدم رکھتی ہے تو صرف بغاوت اور انقلاب کی ہمنوا ہوسکتی ہے - اصلاح اور توازن کے ساز پر اس کا نغمہ بے کیف اور بے نمک رہ جاتا ہے - اردشیر خبردار کی قومی شاعری میں وہ ولولہ اور جوش ہم نہیں پاتے جو اقبال اور نذرالاسلام کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے - لیکن اسے چھوڑ کر خبردار کے پاس جو سرمایہ رہ جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ صرف گجرات ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان اس پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے اور آج اس کا تعارف ہم کسی قومی شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ

ایک جمالیاتی آرتسٹ کی حیثیت سے کرا رہے ہیں ــ

ہندوستان میں عشقیہ شاعری نے دو مختلف راستے پکڑے - ایک ذکر تو سنسکرت شاعروں کے لیے عام طور پر اور کالی داس کے لیے خاص طور پر مخصوص ہے - کالی داس فطری حسن کا دلدادہ تھا اپنے جذبات کو حسن و جمال کا آئینہ نہیں، بلکہ حسن فطرت اور مناظر قدرت کو اپنے محسوسات کا درپن بناتا تھا - ندی نالے اور جنگل پہاڑ اپنی اپنی بولیوں میں سرگوشیاں کررہے ہیں اور کالی داس بلا تکلف انہیں قلم بند کرتا چلتا ہے - یہ وہ زمانہ تھا جب روح اور مادے کی کش مکش میں دوگونیت پیدا نہ ہوئی تھی - بعد میں ویشنو اور بھکتی تحریکوں سے ویدانت، زوجانیت، نوازی اور داخلیت کا اثر بڑھا اور شاعر نے مظاہرات کا آئینہ دار اپنی خودی کو بنایا - بذات خود قدرتی نظاروں میں کوئی کشش نہ رہی بلکہ شاعر کی ذہنی کیفیت پر ان کے نظاروں کا ردّ عمل کہیں زیادہ اہم قرار پایا - سنسکرت اور ہندی شاعری میں اس اختلاف نے بعدالمشرقین پیدا کردیا - ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کلاسک سنسکرت شاعری کا سب سے باکمال نمائندہ اردشیر خبردار ہے اور اس کی شاعری میں واردات عشق کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کے امتزاج نے بڑی خوبی پیدا کردی ہے ــ

اردشیر خبردار کی زندگی ویسی ہی ہموار و یک رنگ رہی ہے جس کی توقع ہندوستان کے کسی متوسط طبقے کے فرد سے کی جاسکتی ہے - صوبۂ بمبئی کے شہر دمن میں نومبر سنہ ۱۸۸۱ ع میں وہ ایک نامور پارسی گھرانے میں پیدا ہوا - بیشتر آرتسٹوں کی طرح اسکول کی تعلیم اسے غیر دلچسپ معلوم ہوئی اور اوایل عمر میں ہی وہ مدرسے سے

ہ ہوکر نیچ کے طور پر مطالعہ کرنے لگا - شاعری سے اسے ایک خاص
تھا اور ۱۹ سال کی عمر میں جب اس کے سو دوہے شایع ہوے تو
ت بزرگوں نے عہلک میں سے اسے گھور کر سرہلایا اور اس کے روشن
مل کی پیشین گوئی کی - اس کے بعد سے اس کے کمالات اور شہرت
برابر رقابت ہوتی آئی ہے - اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ
(Silken Pas) انگلینڈ کے اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے اور
را مجموعہ غالباً وہاں کی (Poetry Society) کی طرف سے شائع ہونے والا
اس کی قومی نظمیں گجرات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور
ہی جی بھی فرصت کے اوقات میں انہیں دھیمے سروں میں گنگنایا
ہیں! اس کی فلسفیانہ نظموں کا مجموعہ 'درشنکا' ذی ہوش لوگوں
یے سرمۂ بصیرت اور روح پرور بزرگوں کے لیے تفسیر حقیقت ہے -
حال اس کا نظریۂ زندگی صحیح ہو یا نہ ہو اس کی قادرالکلامی
م الثبوت ہے —

لیکن فلا کا سرد چنگل ویدانت اور ستھا گرہ سب کے لیے ہے - ایک
بل ہے جسے کبھی فلا نہیں اور آرٹسٹ جب تخیل کے کاغذ پر حسن
روشنائی اور عشق کے قلم سے انسانیت کے خدوخال بناتا ہے تو ابدیت
ے کی تحریر پر دایمی شہرت کی مہر لگا دیتی ہے - اردشیر خبردار
وہ نظمیں ہمیشہ شوق سے پڑھی جائیں گی جن میں وہ اپنے مخصوص
داز میں حسن کی شوخی اور عشق کی وارفتگی کی تصویر کھینچتا ہے -
یہ سچ ہے کہ اردشیر خبردار کا تغزل یاس و حرماں کے ان جذبات
نا آشنا ہے جو اردو شاعری کا ایک خاص عنصر ہے ' لیکن غور سے دیکھا
اے تو تمام ہند و ادب اس حزنیہ (تریجک) رنگ سے خالی ہے جو آرٹ

کی جان ہے - اور اسی وجہ سے ہندو شاعری کی معشوقہ ایک ایسی عورت ہے جس کا ملنا اگر آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں ہے - محرومی کی اذیت کو ہندو شاعر نہیں سمجھہ سکتا اس وجہ سے کہ جنسی معاملات میں ہندو سوسائٹی میں ایسے بدنصیب کم ہوتے تھے جو محروم و ناکام رہ جائیں —

لیکن طرب و نشاط کی یہ وارفتگی ملاحظہ ہو کہ ہر لفظ شراب میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر بند شاعر کی شادمانی کے ساتھہ رقصاں و خنداں ہے - روح (Soul) اور حس (Sense) کا اتحاد کیا کسی معمولی صناع کی کاریگری ہوسکتی ہے کہ جب "اردشیر" اپنی محبوبہ کی رفتار کا بیان کرتا ہے تو الفاظ گھنگھرو بجانے لگتے ہیں اور جب اس کی گفتار کا ذکر کرتا ہے تو بندشیں اتنی سست و سبک ہو جاتی ہیں گویا پھول جھڑ رہے ہیں گو اس کے جذبات میں وہ تنوع اور ندرت نہیں جو ٹیگور کی امتیازی شان ہے لیکن معنی آفرینی، جدت تخیل اور رنگینی بیان میں وہ اپنے ہم عصر سے آگے بڑھ جاتا ہے —

زمانۂ حال میں جب زندگی کی ہنگامہ پروری اور حرفت کی ستم رانی نے آرٹ کو پسپا کر رکھا ہے اور وہ دن دور معلوم ہوتا ہے جب وہ از سر نو تازہ دم ہو سکے گا تو یہ ملک کم از کم اس اعتبار سے دنیا کے تمام ممالک پر ضرور فوقیت رکھتا ہے کہ آج ایسے بلند مرتبہ شاعر کسی ایک ملک میں موجود نہیں ہیں - اردشیر خبردار انہیں معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہے —

یہاں ہم اس کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتے ہیں- ترجمے میں شاعر کے جذبات کو صحیح طور سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے —

معصوم کا گیت | جہاں زرِگل کے فوارے صبح و مسا چلا کرتے ہیں اور اپنے ستارہ جیسے قطروں کو ہر طرف بکھیر دیتے ہیں —

جہاں دوشیزۂ صبح خوابوں کے تانے بانے سے نور کے تار نکالتی ہے،

جہاں گلناری پردوں کے جھلملاتے ہوے سایے تل کی طرح سمٹ جاتے ہیں اور مستانہ ہوائیں مصروفِ خرام رہتی ہیں —

جہاں دوج کے چاند کی ملگجی کرنیں غش کھا کر صبحِ تاباں کے آغوش میں گر پڑتی ہیں —

وہیں، میں ہری ہری دوب پر ناچتی ہوئی دنیا والوں کو اپنے گیت سناتی ہوں —

جب آفرینش کا سوتا سوکھا ہوا تھا اور دنیا کی بساط ایک بے روح ہیولیٰ سے زیادہ نہ تھی —

جب ہر ذرہ اس شعلے کے انتظار میں دم بخود تھا جس کی لپک جانِ جہاں بن جائے گی ...

جب 'زمانہ' اپنی آنکھوں اور کانوں کو بازوؤں سے ڈھک کر خاموش و مبہوت بیٹھا ہوا تھا —

اور حقیقت خوابیدہ اس ڈور کی تلاش میں حیران تھی جو مدتوں پہلے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی —

تو — میں نے ایک رسیلا نغمہ چھیڑا اور اے لو! انہیں میرے ہر ہر نقشِ قدم پر ایک ایک عالم کروٹ لیتا نظر آیا —

میری بنسی کی ہر تان ایک چنگاری تھی جس نے رات کے دیپکوں میں جوت جگا دی —

اور سنہرے پرندوں کی طرح، مہر و ماہ نے میری مسرت کی نورانی

ؤں میں گوندھ کر دنیا کے گلے میں پہنا دی —

میری نواسنجی کے سانچے میں خلد بریں کا کالبد ڈھلا اور وہاں
برگ و شجر نے غیر فانی انبساط کا لباس اوڑھ لیا —

اور 'وقت' موسیقار کی طرح آپ اپنی خاکستر سے اٹھا کہ میرے
ر کی آرتی کرے —

اور میرے سرگم کی سیڑھیوں پر چڑھ کر 'حقیقت' میرے حضور میں
بدہ ریز ہوگئی —

میرا ہر تار نفس بہار کی دلربائیوں کے ساتھہ غزل خواں ہے - میں
لوں کے جھولے پر جھولتی ہوں' وہ میرے اشاروں پر رقص کرتے ہیں-

اور میں برشگال کی ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھہ ناچتی ہوں- کبھی
ستاں کی سرد پتیوں کے ساتھہ میں خاک بسر رہتی ہوں —

اور کبھی باد سموم کی ہم رکاب ہو جاتی ہوں —

کبھی برف کے ٹکڑوں کے ساتھہ زمین پر پھسلنے لگتی ہوں —

کبھی میں دن کی روشنی کے ساتھہ آتی ہوں اور کبھی رات کے
تھہ — وہ رات جو سہلاپوری کی ملکہ ہے —



ا تبسم

تیری مسکراہٹ بھالے کی وہ انی ہے جو فولاد کے دل و جگر میں
بھی سوراخ ڈال دیتی ہے —

وہ دھوپ چھاؤں کی پرچھائیں ہے جو ندی کے سبک رفتار دھارے
آئینہ دکھاتی ہے —

تیرا تبسم گلاب کا وہ پھول ہے جس کی پنکھڑیاں برف پر بکھر گئی ہوں -
جان من! تجھے کیا خبر کہ تیری کرشمہ گری نے 'تبسم' کا پیرایہ

اظہار اختیار کرلیا ہے —

ایک جنبش لب؟ — اور میرے خیالات کا سارا شیرازہ منتشر ہوگیا -

ایک لرزۂ تبسم؟ — میں اس کا اتنا ہی رسیا ہوں جتنا سردیوں میں سورج کی ایک کرن کا —

ہلکی سی مسکراہٹ؟ — اور میرا دل آپ اپنی خود فریبیوں کے دام کا اسیر ہوگیا —

جان من! اس شمع کی لو کو زیادہ نہ اُکسا ورنہ کس کا دیدہ ہے جو خیرہ نہ ہو جائے —

گرمیوں کی کوئی صبح تیری مسکراہٹ کی دلکشی کو نہ پاسکی سردیوں کی چاندنی کو لجاجت کا یہ انداز کب میسر ہے؟ شفق شام یا آیا کسی گل خنداں میں یہ بانک پن نہ آیا — نہ آیا —

حسن و جمال کا کوئی مجسمہ قوس قزح کی رنگینیوں کو ہونٹوں میں گھلا کر یوں فضا میں نہیں بکھیر سکتا —

تیرے تبسم کی ضیا طرازی میں میری چمک جگنو کی طرح ماند پڑرہی ہے-

للہ! ان ہونٹوں اور آنکھوں کو دوسری طرف پھیر لے جنکی ہر جنبش کے ساتھ جنت کے چراغ جلتے اور بجھتے ہیں -

تیرا تبسم میری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور پھر اس کے بغیر ہر طرف سناٹا ہوتا ہے — سناٹا اور اندھیرا! —

اگر اس دنیا میں کوئی بہشت بن سکتی ہے تو اس کی تخلیق تیرے ہی تبسم سے ہوگی! میرے سرو ناز' ایک مرتبہ اسی انداز سے مسکرا دے-

---

(۱) نظارہ

واردات محبت | کف دریا کی طرح سمک اور سفید پھولوں کی سیج سے — خواب ناز سے میری محبوبہ یوں بیدار ہوئی گویا گل

صنوبر کی ایک چوڑی لچک کر ٹہنی سے گر پڑی ہو۔

گویا سہلا پوری سے کوئی دیوی اس دنیا میں اتر آئی ہو۔ یا لیلائے شب کی گود میں بلت نور مچل اٹھی ہو اور اس کی جلوہ گستری نے زمین و آسمان کو شاداں و فرحاں کر دیا ہو —

رات سے کہو کہ بھول جائے اپنے تمتماتے ہوئے ستاروں کو اور صبح سے کہو کہ بھول جائے اپنے شبنمی اجالے کو۔

سمندر سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتا ہے اپنی بیکرانی کو، اور بہار سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتی ہے اپنی چمن آرائی کو، نہیں بھول سکتا کیا یہ پھول اپنی نازک ادائی کو، اور کب تک روئیگی زمین ان نونہالوں کو جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہو گئے —

اگر وہ بھول سکتے ہیں تو سب کچھ بھول جائیں کیونکہ دیدار محبوب کے بعد شاعر اپنے گیتوں کو بھی بھول رہا ہے —

دل نواز! یہ جو صدائے نغمہ فضا میں گونج رہی ہے —

دراصل ان لہروں کی صدائے بازگشت ہے جو تیری روح کے وسیع سمندر میں اٹکھیلیاں کیا کرتی ہیں۔

ان موتیوں کی چمک میں جو تیرے دل کی گہرائیوں میں سامان نظارہ مہیا کر رہے ہیں۔

(۴) حسن

کلی کے لوچ سے پھل رنگ و بو حاصل کرتا ھے اور سیلاب اشک میں مسکراھٹ کی سبھی اجاگر ھوتی ھے - رات کی گھری تاریکی میں دنیا ابدیت کے خواب دیکھتی ھے اور قدرت کے ارتقا میں انسان کی قوت پروان چڑھتی ھے - زندگی موت کے رتھہ پر بیٹھہ کر جہاں گشتی کرتی ھے اور کانٹوں کے آغوش میں پھول یوں کھلتا ھے جیسے رشک کے آغوش میں عشق!

اور جس طرح نور عالم سمٹ کر آفتاب میں سما جاتا ھے اسی طرح حسن کے سارے تار میری محبوبہ کے رباب میں اکٹھا ھوجاتے ھیں —

دیکھا ھے کبھی راج ھنس کو تم نے مان سرور میں تیرتے ھوے دیکھا ھے کبھی قطرہ کو گہر ھوتے ھوے ؟ برف کو پگھلتے ھوے ؟ اور یا تم نے گوگل کی پتی کی نزاکت کو غور سے دیکھا ھے ؟ کسی تیتری کے پر کبھی تمہارے ھاتھوں پر تھرتھراے ھیں ؟ شاعری کے ابدی ترانوں کی گونج کبھی روح کے ساز پر سنی ھے ؟ —

خواب میں کوئی پری کبھی تمھیں کوہ قاف اٹھا لے گئی ھے ؟ اگر ایسا ھوا ھے — تو تم میری محبوبہ کی نزاکت' ملاحت اور لطافت کا اندازہ لگا سکتے ھو — جو آب حیات سے زیادہ لطیف' کنول سے زیادہ ملیم' اور چھوٹی موتی سے زیادہ نازک ھے - میری محبوبہ جاڑوں کی چاندنی کی طرح سیمیں اور چودھویں کے چاند کی طرح خنداں و فرحاں ھے -

وہ امرت کے لب ریز پیالے کی طرح جوانی کے رس میں شرابور ھے کاش میں وہ ساغر ھوتا جس میں یہ شراب شباب ڈھالی گئی ھے تو میں اسے اپنی رگوں میں اس طرح حلول کر لیتا کہ ایک قطرہ بھی چھلک کر نہ گر سکتا -

(۳) نشاط

سلوار تنہار کے بعد میری محبوبہ گل شگفتہ کی طرح آغوش کشودہ ہو جاتی ہے -

دور سے میرے نین حریص بھونرے کی طرح اس کے رس کو چکھنے کے لیے ابروؤں کے پر تولنے لگتے ہیں -

پھر میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی ملتجی آنکھوں کی ڈور سے پتنگ کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ لوں -

لیکن یہ دیکھو وہ نہیں پڑی — اور چشم زدن میں ڈور کٹ گئی اور پتنگ پھر ہوا میں اڑنے لگی -

اپنی سہیلیوں کے ساتھہ وہ تالاب میں جل کلیل کرتی اور تھک کر کنارے پر بیٹھہ جاتی ہے -

جب وہ جوڑا کھول کر پانی میں اپنے پانو لٹکا دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عروس شام نے مشرق کی ساری رنگینیاں چرالی ہیں -

اور جب وہ اپنے گلے میں کنول کے ڈنٹھلوں کی مالا ڈال لیتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ سنگ مرمر کے ایک بت پر کیوپڈ نقش و نگار بنا رہا ہے -

جب وہ پانی میں منہ دیکھتی ہے تو گویا چاند فرش آب پر کنول کے جھولے میں جھولنے لگتا ہے -

سورج کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں عظمت ہے اور آگ کو اس لیے کہ اس میں روشنی ہے —

چاند کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں حسن ہے اور دریا کو اس لیے کہ وہ غیر فانی ہے —

بادل کو اس لیے پوجتا ہوں کہ وہ کبھی گرجتا ہے ' کبھی برستا ہے

اور کبھی کھل جاتا ہے —

اور ہوا کو اس لیے کہ وہ کبھی آندھی بن جاتی ہے اور کبھی نسیم و شمیم —

کیوں نہ ان دیوتاؤں کو چھوڑ کر ایک اپنی محبوبہ کی پرستش کروں جس میں یہ سب صفات موجود ہیں —

وہ سورج بننا چاہے تو واللہ میں آسمان بن جاؤں —

اور وہ بجلی بنے تو میں بادل بن جاؤں —

وہ کوئل بنے تو میں آم کی ڈال بن جاؤں اور وہ مرلی ہونا چاہے تو میں 'کشن' بن کر اپنے ہونٹوں سے لگا لوں —

وہ سمندر بنے تو میں ساحل ہو جاؤں —

اور وہ پھول بنے تو میں بھونرا بن کر ہمیشہ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کروں —

الہی! مجھے حیات دارین عطا کر کہ میری محبت کا چراغ ہمیشہ روشن رہے —

وہ دیکھو، وہ جان جاں، وہ بلند حیات، وہ دل کی کلی ادھر آرہی ہے - میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو سب کو اس کی ایک لغزش مستانہ پر نثار کر دیتا —

وہ آرہی ہے — ایک سرجوش لہر کی طرح جو میرے دل سے ایک میٹھے راگ کی طرح ٹکرا جاتی ہے —

میں ایک بت سنگیں تھا جسے اس کی ایک ٹھوکر نے 'اہلیا' کی طرح زندہ کر دیا —

اعجاز مسیحا پر کیوں نہ ایماں لاؤں کہ خود بھی تو ایک فسوں طراز کا جلایا ہوا ہوں —

(۴) پوجا

نہ آفتاب تھا اور نہ ماہ تاب --- ایک تیرا ہی جلوہ تھا ---

نہ سمندر تھا اور نہ ساحل --- زمین سے آسمان تک تیرے سوا کچھہ نہ تھا ۔

نہ جلوہ تھا نہ عقل --- فہم و وہم سب تیرے کرشمے تھے -

نہ پرواز تھی نہ رفعت --- فضا تیری تھی، صبا تیری تھی ---

نہ تو آسمان میں تھی اور نہ زمین میں - تو محبت کے زرین کھٹولے پر بیٹھہ کر ایتھر کی چادروں میں لہراتی رہتی تھی ---

---

(۵) بے بسی

عشق کا بندہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی جرات نہیں ہوتی کہ میں اس کی حقیقت کو پا گیا ۔

اس کی ایک آنکھہ تبسم بہ کنار اور دوسری اشک بار ہے - اس کے ایک ہاتھہ میں روشنی اور دوسرے میں تاریکی ہے ---

وہ آگ سے زیادہ گرم اور برف سے زیادہ سرد ہے - وہ زندگی ' خواب اور موت کا حسین ترین امتزاج ہے - اس کا سر بہشت بریں میں ہے تو پاؤں تحت الثریٰ میں ---

مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں محبت سے ناواقف ہوں لیکن اس کی جھلک سے تجھے پہچان گیا ہوں ---

کبھی کبھی میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا ہے اور میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ حدیث عشق کی تفسیر یہی تو نہیں ہے ---

وہ ہمارے آنسو ہیں جو آسمان پر جم کر ستارے بن گئے ہیں ---

جان من ' زمین آسمان کی دی ہوئی بارش کے معاوضے میں کیوں

نہ ہمارے آنسوؤں کی جھڑی کا منہ اوپر کی طرف پھیر دے اور ان کے ساتھ اوپر چڑھ کر میری روح جنت کی رنگینیوں میں تحلیل ہو جائے —

آفتاب صبح اس لیے طلوع ہوتا ہے کہ شام کو غروب ہو جائے —

لیکن محبت کا آتش کدہ ایک مرتبہ بھڑک کر کبھی نہیں بجھتا - ستاروں کے پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ مرجھا جائیں لیکن آسمان کا گل کدہ سدا بہار ہے —

جب مہ و انجم نوامحروم سروں میں بھاگ گاتے ہیں تو او خدائے محبت ! میں سمجھ جاتا ہوں کہ درد کی انتہا یہ ہے کہ دوا ہو جائے —

---

(۶) ہوش

ایک مرتبہ میری کشتی بھنور میں پڑ گئی ' اس کے مستول اور بادبان ٹوٹ کر پانی میں گر گئے اور لنگر بھی بہہ گیا —

کسی گم دیدہ مسافر کی طرح گمراہ ہو کر یہ ناؤ منجدھار میں یوں حیران و غلطاں چکر کاٹ رہی ہے کہ سمت و ساحل دور سے اسے دیکھ کر ہنس رہے ہیں -

اور اسی خستہ حالی میں کیا دیکھتا ہوں کہ افق پر سورج ندی سے نہا کر نکلا اور ایک سنہری کشتی بام فلک پر ہویدا ہوئی —

نہنگ آسا موجوں میں پھنس کر میری ننھی سی ناؤ تنکے کی طرح کبھی ڈوبتی ہے ' کبھی ابھرتی ہے -- کیا معلوم کہ ناخدا میری خبر لے گا یا نہیں —

آج جو میری محبوبہ اُداس ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے ریاکار بندوں کا سوگ لیا ہے —

اس کے ہونٹوں پر تبسم بے جان ہو کر تڑپ رہا ہے اور یہ محسوس

ہوتا ہے کہ آسمان پر بادل گھر تو آئے ہیں لیکن نہ وہ برستے ہیں اور نہ کھلتے ہیں — نہ ان میں بجلی تڑپتی ہے —

آہ ! مجھ غمزدہ کی جامت سونی ہو رہی ہے میری بے نور آنکھوں کا کاجل ڈھل رہا ہے —

میں نے کائنات کا ہر ذرہ چھان مارا لیکن میری مایۂ حیات کہیں نہ ملی —

میں ازل اور ابد کے سروں کو دیکھ آیا - اور تحت الثریٰ کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ گیا - آفتاب کی آتشیں زلفوں کو کمند بنا کر میں اس غار میں اترا جہاں تاریکی اور تنہائی دو بہنیں رہتی ہیں —

لیکن وہ مشام جاں کہیں نہ ملی اور میرے گیتوں کے ڈیلے ٹوٹ کر ہوا میں منتشر ہو گئے —

---

(۷) کامرانی

او مرغ خوش الحان ! تو ہمیشہ سر بلند پہاڑیوں کی سیر کرتا رہا ہے - اب نیچے اتر اور وادیوں کو بھی اپنے نغموں سے زمزمہ ریز کر دے - تو ہمیشہ عظمت و رفعت کا جویا رہا ہے —

آ ! اور میدان کی وسعت کو بھی ایک نظر دیکھ جا —

ان بدلیوں میں پانی ہے تو ان برساتی ندیوں کی اٹھتی جوانی بھی کچھ کم تسکین بخش نہیں —

آ ! میرے نغمہ گر اور اپنے میٹھے بولوں سے ان میدانوں میں امرت کی دھار بہا دے —

درد نا آشنا ساحل کو منانے کے لیے سمندر روز اس کی خدمت میں جل پریوں کے غول بھیجا کرتا ہے —

وہ کبھی ہلکے سروں میں گاتی ہیں، کبھی آنسوؤں سے اس کے پیر دھوتی ہیں، کبھی اس کی سنگ دلی پر کھیج کر چیخ اٹھتی ہیں —

یہ ساحل کبھی نہ پسیجیگا — اور ایک دن وہ آئے گا کہ مدوجزر کا طوفان اس کے بلند بلند توڑ دیگا —

پیاری، اسی طرح دریاے محبت میں طوفان اٹھنے والا ہے جو تجھے اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لیے چھپا لے گا —

محبت کے ڈینوں پر بیٹھ کر میں اندھیرے میں اڑا کرتا ہوں - میں صرف ایک گیت گاتا ہوں، میرے ساز میں صرف ایک راگ ہے، ایک تان ہے، ایک سر ہے —

میں صرف ایک خواب دیکھتا ہوں —

میں نے سب دیوتاؤں کے مندر توڑ کر ایک مندر کھڑا کیا ہے جس کا نام ہے — پریم مندر —

میرے لیے سارے الفاظ کے معنی صرف ایک لفظ میں سمٹ آئے ہیں - پریم -

---

الوداع

میرے گیت، جا اور آسمان پر وہ ساز چھیڑ کہ ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں اور تیری ایک ایک تان اس کی جگہ لے لے، حتی کہ تو سارے فلک پر چھا جائے - اب تک تو نازک پودوں کی لچک دار ٹہنیوں پر نواریز رہا اور یا میری جھونپڑی میں بیٹھ کر نوحہ خوانی کرتا رہا —

اب جا اور اس آسمانی ملک کو اپنی سحر نوائی سے مدہوش کر دے جو گوش برآواز تیرا، منتظر ہے —

بادۂ کہن

غزلیات اشرف

اشرف، ولی کے معاصرین میں خاص درجہ رکھتا ہے - ولی اور اس کے معاصرین نے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا ہے - ولی کا شعر ہے :-

اشرف کا یو مصراع ولی مجکوں ہے دلچسپ
لذت ہے دل وجاں کوں میرے پھر نگرسوں

اشرف نے بھی ولی کا ذکر کیا ہے —

کرتا ہے یو مصراع ولی صید دل اشرف
پھر مری خبر لینے وو صیاد نہ آیا

ان اشعار سے اشرف کا معاصر ولی ہونا ثابت ہے - ایک اور ثبوت ان کی معاصرت کا ہے ولی نے اپنے کلام میں سیدابوالمعالی نامی سید زادے کا ذکر کیا ہے اور بقول قایم اس کے ساتھ ۱۱۱۲ ھ میں دہلی کا سفر بھی کیا تھا - قایم لکھتا ہے —

" درسنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر ہمراہ سیدابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بشاہ جہاں آباد آمد " —

اشرف نے بھی سید معالی کے حسن و جمال کی تعریف میں ایک پوری غزل لکھی ہے اور متفرق اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے -

معالی حسن میں سب سوں بڑا ہے　　اسے دیکھن کوں کئی عالم کھڑا ہے

شفیق نے اشرف کو معاصرِ ولی لکھا ہے لیکن حمید اورنگ آبادی نے اس کو "بلا واسطہ شاگرد ولی" لکھا ہے - حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ اشرف باضابطہ شاگردِ ولی تو نہ تھا لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھایا ہے - شاید ایسا ہو - لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرف یا ولی کے کلام سے ان کے استاد و شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے - بہر حال معاصرت مسلم ہے - ولی نے ۱۱۱۹ھ میں انتقال کیا ہے لیکن اشرف فرخ سیر کے زمانے تک زندہ رہا - سید معالی کی تعریف میں اس کا ایک شعر ہے جس میں فرخ سیر کا ذکر استعارتاً کیا ہے —

جگت کے خوبرو سارے نہ ہوئیں کیوں حکم میں اس کے
دیارِ حسن میں فرخ سیر سید معالی ہے

حمید نے اشرف کو گجراتی لکھا ہے لیکن اس بیان کے سوا کوئی اور شہادت یا سند اس کے گجراتی ہونے کی نہیں ملتی ہے البتہ اس نے اپنے کلام میں گجرات کے بزرگ شاہ عالم کا ذکر کیا ہے اور ان سے عقیدت ظاہر کی ہے —

پھر اشرف کے شاہ عالم ہیں　　خلف الصدق سید اقطاب
مجھ سے عاصی کوں کئیں نہیں ہے پناہ　　مگر ان کی جناب فیض مآب

یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح ولی نے اپنے آپ کو "شاعر ملک دکن" لکھا ہے اس طرح اشرف نے گجرات کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنے شعر کی داد شاعرانِ دکن سے طلب کی ہے - حمید کے تذکرے میں اس کی غزل ہے جس کا مقطع ہے —

یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف
تمام شاعر ملک دکن، سخن کی قسم

اشرف کے حالات ابھی تک روشنی میں نہیں آے ہیں - حمید نے اس

کا نام محمد اشرف لکھا ہے لیکن انجمن ترقیء اردو کے کتاب خانے میں اس کا جو دیوان ۱۱۲۹ھ میں محمد بدیع الزماں کا لکھا ہوا ہے اس میں اس کا نام بجائے جبکہ "اشرف الموسوی المدنی الشافعی" تحریر ہوا ہے - یہ دیوان انجمن کو سورت میں دستیاب ہوا ہے - سنی المذہب تھا - اس لیے کہ شاہ عالم گجراتی سے عقیدت رکھتا تھا اس کے سوا اس کا ایک شعر ہے —

اخلاص سوں نظر کر اے صاحب بصیرت

ہر چار یار حضرت تمثیل چار قل ہے

شہیدان کربلا اور اہل بیت سے بھی خاص محبت رکھتا تھا - اس نے کئی مرثیے لکھے ہیں چند اس کے دیوان میں بھی ہیں - اس کے دیوان کے حاشیے پر رضی، صالح اور فراقی کی غزلیں ہیں - فراقی کا ذکر ولی نے اپنے اشعار میں کیا ہے - اشرف نے رضی کا ذکر کیا ہے - اس کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جن میں رضی کا ذکر ہے —

اس مصرع رضی کا اشرف ہے دل سوں بھو کا

بے غم ہمارے غم کوں کھاتا نہیں سبب کیا

یاد کر اشرف یو مصراع رضی مصحف گل کا سبق بلبل پڑے

حمید نے رضی کو معاصرِ اشرف اور شاگردِ ولی بتایا ہے - رضی، ولی کا شاگرد ہو یا نہو لیکن معاصر اشرف تو ضرور تھا اور اس طرح فراقی اور صالح بھی اس کے ہم عصر تھے —

اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پختہ گو شاعر تھا - کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے - اپنے زمانے میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی - حمید نے لکھا ہے —

طبع رنگینے داشت - شعرش در نواحِ گجرات شہرت دارد و

دیوان لطیف تصنیف نمودہ " —

اشرف کے کلام کی ایک خصوصیت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو ولی کے کلام میں بھی نمایاں ہے - ولی نے اپنے اشعار میں امرت لال ' گوبند لال' محمد یار خاں ' سید ابوالمعالی کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی ہے - اس طرح اشرف نے بھی عظمت اللہ ' ظفر خاں اور سید معالی کے حسن کی تعریف کی ہے ' سید معالی کی تعریف کا اوپر ذکر ہو چکا ہے - دو علحدہ غزلوں میں عظمت اللہ اور ظفر خاں کی تعریف لکھی ہے یہاں ایک ایک دو دو شعر نقل کیے جاتے ہیں —

عظمت اللہ بسکہ ہے پیارا　　جیوا پس کا میں اس اُپر وارا

ظفر خاں گلشن ناز و ادا　　بلبل دل اس اُپر ہے مبتلا
گرچہ ہے افغاں پسرو و ناز نہیں　　ہے ادا اس کی ادائے میرزا

انجمن کے نسخے سے اشرف کی چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں جن سے اس کی شاعری کا انداز معلوم ہوگا - (چ)

جب سجن مکھ اُپر نقاب کیا　　چشم عاشق کوں جوں سحاب کیا
جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب　　نُقل خاطر جگر کباب کیا
آشنا اس کے بحر حسن ستی　　میں اپس دل کوں جیوں حباب کیا
تب سیں ہوں غرق بحر درد و الم　　جب سیں اس شوخ نے عتاب کیا
تجھ جدائی میں چشم اشرف سوں　　جوش دریائے خون ناب کیا

قد موزوں نے اس کے کام کیا　　سرو رعنا کوں یائے نام کیا

پاے تا سر ہے بسکہ صورت ناز کس ادا سوں دیکھو سلام کیا
ساغر مست چشم ساقی سوں نشاء عشق میں مدام کیا
خضر وقت اس کوں بولنا ہے بجا جس سوں امرت بچن کلام کیا
مشرق مکھہ پہ کھول زلفاں کوں صبح کے بیچ وقت شام کیا
نیم بسمل تھا تیغ ناز ستی نگہ شوق نے تمام کیا
تب سوں ہے سرو باغ میں پابند جب سوں وو سرو قد خرام کیا
تجھہ جدائی میں خواب راحت کوں میں اپس کے اُپر حرام کیا
بسکہ اشرف اُپر ہے فضل خدا
صف عشاق میں امام کیا

اے ہوش ربا سندر مجھہ پاس تک آتے جا
رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتے جا

یوں دل ملیں ہے خواہش تجھہ گھر کی طرف آؤں
تک ناؤں بتاتے جا یا ٹھاؤں بتاتے جا

دیدار ستی اپنے محروم نہ رکھہ مجکوں
انچل کوں اٹھا مکھہ سوں تک درس دیکھاتے جا

مغرور نکو ہو توں اس حسن پہ اے ناداں
یو سب ہے فنا آخر گن بی کماتے جا

لاگی ہے نظر جن کی اے رشک پری تجھہ کوں
دو بوم کے اچھر سوں ان پاس چھڑاتے جا

کر رام اِتا مجکوں مشتاق ہو آیا ہوں
تک رام کلی مہانے یک تان سناتے جا

اے کانِ ادا سندر اشرف ہے ترا طالب
تک پیار ستی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

عشق تیرے میں بسکہ ہوں بیتاب　　بیقراری ہے دل کوں جیوں سیماب
تجھ جدائی میں خواب آوے نہیں　　گر میسر ہو بستر سنجاب
نکتۂ خال کوں وو بوجھیا ہے　　جس نے تجھ حسن کی دیکھیا ہے کتاب
تجھ جبیں پر عرق کی بوندیاں دیکھ　　شرم سوں گوہراں ہوئے ہیں آب
حسن تیرے کی جھلجھلاٹ کوں دیکھ　　پردۂ ابر میں چھپیا مہتاب
دیکھ تجھ حسن شعلہ خیز کوں شمع　　اشک سوں جل ہوی ہے گل گل آب

بیگ دی سوں خبر لے اشرف کی
تجھ پرت میں ہے بیخور و بے خواب

تجھ دھانِ کا العدم سوں غنچۂ گل ہے خجل
تجھ لب میگوں کی کیفیت انگے مل ہے خجل

عشق نے جب سوں مرے دل کے چمن میں گل کیا
بوستان عاشقی میں تب سوں بلبل ہے خجل

نغمۂ مطرب ہے از بس نشاہ بخش اس بزم میں
شیشۂ خالی نمن آواز قلقل ہے خجل

نوخطاں کے حسن کے دریا سیں ہوں میں آشنا
موج خط عنبریں سوں ان کی کاکل ہے خجل

گل رخاں کے حسن سوں از بسکہ ہے رشک ارم
سر زمین ہند سوں کشمیر و کابل ہے خجل

پیچ و تاب زلف شبرنگ پری کوں دیکھ کر
دامن دشت پریشانی میں سنبل ہے خجل

گلشن اشعار اشرف بسکہ ہے رنگیں بہار
عندلیب طالب گلزار آمل ہے خجل

ہے تجھ حسن کے وصف کا جب سوں بیاں مجھے
کھلے ہیں تب سوں اهل سخن درفشاں مجھے
لکھتا ہوں مو قلم سوں اپس ضعف کا بیاں
از بسکہ ہے تصورِ نازک میاں مجھے
رشک یمن کیا ہے دل اس رشک مہر نے
اپے عقیق لب یہ دیکھا رنگ پاں مجھے
اشرف ہوں درد عشق سوں ہمرنگ کہربا
کہتا ہے بسکہ کاہ نمن ناتواں مجھے

دیکھیا ہے جب سوں وو شہ ابروکماں مجھے　　کہتا ہے اپے تیر نگہ کا نشاں مجھے
جیوں برق جلوہ گر ہو گیا ہے سمند وار　　وو شہسوار تازی آتش عناں مجھے
عاشق کے حق میں دیکھو کیا ناز شوخ ہے　　ماریا نگاہ تیز سوں دلبر سناں مجھے
آزاد دیکھ زلف چلیپا کی موج (سوں)　　زنجیر بی کیا ہے سہی قامتاں مجھے
رکھتا ہوں آہ تیشۂ فرہاد کوہکن　　ہے جب سوں عشق خسرو شیریں زباں مجھے
دولت نہت ہے نت مرے نازک سخن میں　　سو عشق ذکر جب سوں ہے وو مو میاں مجھے
اس شمع رو کی جب سوں ہے اشرف مجھے لگن　　پروانہ ساں نہیں ہے کدھیں خوف جاں مجھے

تبصرے

ادب

دریائے لطافت ۵۹۱
نکات الشعرا ۵۹۵
دیوان تاباں ۵۹۶
حامد کے سو شعر ۵۹۷
حضرت احسن کے سوا سو شعر ۵۹۸
صہبائے ولا - جوش ولا ۵۹۸
اتالیق الصبیان ۵۹۹
مرقع سخن ۶۰۰
سلسبیل ۶۰۲
خمستان ۶۰۵
سودیشی اردو - ضروری کہانیاں ۶۱۰
منتخب افسانے ۶۱۲
لال قلعہ کی ایک جھلک ۶۱۳

تاریخ و سیر

حیات مسعودی ۶۱۴
تذکرۂ محسن ۶۱۵
انقلاب فرانس ۶۱۶

متفرقات

مدارس صوبہ متوسط و برار کا درسی سلسلہ ۶۱۹

اردو کے جدید رسالے

انیس ۶۲۰
صبح امید ۶۲۰
اولڈ علیگڈھین ۶۲۱

خاص نمبر

ہمایون کا روسی ادب نمبر ۶۲۲

تبصرے

ادب

دیباے لطافت ۵۹۱
نکات الشعرا ۵۹۵
دیوان تاباں ۵۹۶
حامد کے سو شعر ۵۹۷
حضرت احمق کے سوا سو شعر ۵۹۸
صہباے ولا - جوش ولا ۵۹۸
اتالیق الصبیان ۵۹۹
مرقع سخن ۶۰۰
سلسبیل ۶۰۲
خمستان ۶۰۵
سودیشی اردو - ضروری کہانیاں ۶۱۰
منتخب افسانے ۶۱۲
لال قلعہ کی ایک جھلک ۶۱۳

تاریخ و سیر

حیات مسعودی ۶۱۴
تذکرۂ محسن ۶۱۵
انقلاب فرانس ۶۱۶

متفرقات

مدارس صوبہ متوسط و برار کا درسی سلسلہ ۶۱۹

اردو کے جدید رسالے

انیس ۶۲۰
صبح امید ۶۲۰
اولڈ علیگیرین ۶۲۱

خاص نمبر

ہمایون کا روسی ادب نمبر ۶۲۲

تبصرے

ادب

دریاے لطافت

مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن - صفحات
مع مقدمات وغیرہ سوا چار سو - کاغذ طباعت وغیرہ عمدہ - قیمت
مجلد تین روپے غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے

یہ اردو زبان کے نامور شاعر سید انشااللہ خاں انشا کی تالیف ہے-
جس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ اور معانی و بیان سے بحث
کی گئی ہے - اس کے دو حصے ہیں - پہلے حصے میں صرف و نحو کا بیان ہے -
یہ سید انشا کی تصنیف ہے - دوسرا حصہ جس میں منطق، عروض وغیرہ
سے بحث کی گئی ہے مرزا قتیل کی تالیف ہے - پہلا حصہ کتاب کی جان
ہے - اس میں اردو کے قواعد، محاورات اور روزمرہ پر نہایت تحقیق
اور خاص اصول و ترتیب کے ساتھہ بحث کی ہے - اور تمام مسائل پر
محققانہ اور ناقدانہ روشنی ڈالی ہے - سید انشا چونکہ ہندوستان کی

مختلف زبانوں سے بخوبی واقف تھے ' دھلی (جو اس زمانے میں فصاحت اردو کا گہوارہ تھی) کی شاعری کے خاص علم بردار تھے ' اور لکھنو کے جدید دور شاعری کے بنانے میں بھی شریک تھے اس لیے ان مقامات کی زبان کے فرق اور خصوصاً دھلی کے محلے محلے کی زبان کی خصوصیات سے بخوبی واقف تھے - انھوں نے ہر محلے ' طبقے اور پیشے کی زبان کی خصوصیات اور ان کے باھمی اختلافات کو بڑی باریک نظری سے دکھایا ھے - اس کے سوا ھندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں سے بھی بحث کی ھے - اپنی تحقیق سے زبان کے ایسے قواعد منضبط کیے ھیں کہ وہ آج تک کم و بیش برقرار ھیں - کتاب کے وہ حصے خاص طور سے دلچسپ ھیں جن میں سید انشا نے کسی خاص محلے ' طبقے ' پیشے یا صوبے کے محاورہ یا روز مرہ کو فصیح یا غیر فصیح یا کسی قاعدہ کو صحیح یا غیر صحیح اور مستند یا غیر مستند قرار دیا ھے - ایسی اکثر باتیں وہ اپنے ذوق کی بنا پر لکھ گئے ھیں - بے شبہ ان میں سے اکثر آج تک وھی مروج ھیں اور تسلیم کیے جاتے ھیں جن کے حق میں انشا نے اپنے ذوق کی بنا پر فیصلہ کیا تھا ' لیکن بعض محاورے ' الفاظ اور قاعدے ایسے بھی ھیں جو سید انشا کی نظر میں غلط ' غیر فصیح یا غیر مستند تھے لیکن آج وہ صحیح ' اور فصیح اور مستند ھوگئے ھیں - یہ چیزیں لسانیات کے طالب کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ھیں - اسی طرح انشا نے بعض اساتذہ پر تنقید کی ھے - ایک اعتراض مرزا سودا پر یہ کیا ھے کہ وہ " لیک ' جھیک والے قصیدے میں کٹک بمعنی لشکر محض قافیے کی ضرورت سے استعمال کر گئے ھیں ...... - کٹک ھرگز اردو کا لفظ نہیں " - اس کے ثبوت میں ایک تو سکندر کا مارواڑی زبان کا مرثیہ پیش کیا ھے اور دوسری سند بخت سنگھ مارواڑی کی نثر سے پیش کی ھے - انشا نے یہ

عجیب بات لکھی ہے - کٹک سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں میں وہیں سے آیا ہے - قدیم اردو شاعروں نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے چنانچہ سودا اور سکندر سے تقریباً ایک سو سال قبل نصرتی نے بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے - اس کے سوا قدیم اردو لغت کی کتابوں میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے - ایسی صورت میں اس کو خالص مارواڑی زبان کا لفظ کہنا صحیح نہیں —

دریاے لطافت میں کئی ایسی باتیں موجود ہیں جن پر بحث مباحثہ اور گفتگو کی ضرورت ہے - زبان و ادب کے طالبوں کے لیے یہ بہت بڑا سرمایہ ہے ان کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے - اس سے زبان و ادب کے عجیب و غریب نکات ہاتھہ آتے ہیں —

یہ کتاب ۱۸۰۸ ع میں لکھی گئی تھی جب کہ جدید مغربی علم ادب کی پرچھائیں ہماری ادبیات پر نہیں پڑی تھیں اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو مغربی خیالات اور تحقیق و تنقید کی ہوا تک نہیں لگی تھی لیکن سید انشا کی سلامت ذوق اور باریک نظری کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے تحقیق و تنقید کا وہ راستہ اختیار کیا کہ ان کے پیدا کیے ہوے مباحث اور طریق تحقیق میں وہی تازگی اور جدت برقرار ہے —

لیکن عجیب بات ہے کہ اس قدر اہم کتاب قدردانی اور مقبولیت سے محروم رہی - اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ ہمارا ذوق ادب اتنا ترقی یافتہ نہ تھا - دوسرا یہ کہ یہ کتاب بلحاظ مطالعہ سہولت بخش نہ تھی - اس میں بعض جدتیں ایسی تھیں کہ ان سے لطف و آسانی کی بجاے الجھن اور دشواری پیش آتی تھی - مثلاً انہوں نے اپنے ولی نعمت نواب سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت سے حروف کے

نام بھی عجیب غریب رکھے تھے - الف کو وہ اقبال اور "ب" کو بخشش لکھتے تھے و علیٰ ھذا - الف بے کی سادگی کے مقابلے میں اقبال، بخشش وغیرہ ظاہر ہے کہ کس قدر دشواریاں پیدا کرتے ہوں گے اور قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہوں گے —

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے ۱۹۱۹ ع میں اس کے غیر ضروری اجزا کو حذف کرکے اور طولانی، غیر واضح اور دقت طلب عنوانات وغیرہ کو بدل کر مرتب کیا تھا اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا تھا - یہ سہولت بہم پہنچانے کے بعد بھی اس کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کتاب فارسی زبان میں ہے جس سے ہر شخص بآسانی مستفید نہیں ہو سکتا - اس کے افادے کو عام کرنے کی غرض سے انجمن نے اس کا ترجمہ کرایا ہے - ترجمہ اردو زبان کے نامور اور مستند ادیب و شاعر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے فرمایا ہے - ترجمہ نہایت سلیس، پاکیزہ اور صحیح ہے - لایق مترجم نے جگہ جگہ حواشی بھی درج کیے ہیں اور متن کتاب میں بھی توضیحی عبارتیں داخل کی ہیں جن کو مصنف کی عبارت سے ممیز کرنے کے لیے قوسین میں درج کیا گیا ہے - کتاب کے شروع میں ایک بہت تفصیلی فہرست ہے جو انڈکس کا حکم رکھتی ہے - اس کی مدد سے کتاب کے تمام مطالب و مضامین کا حال بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے اور ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے - انجمن نے یہ اڈیشن شایع کرکے سید انشا کی عالمانہ تحقیقات کو ہر اردو داں کے لیے عام کر دیا ہے —

(چ)

نکات الشعرا

تالیف میر تقی میر مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن - صفحات علاوہ مقدمہ و اشاریہ ۱۸۰ - کاغذ طباعت وغیرہ عمدہ اور دیدہ زیب - قیمت مجلد ۲روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے هیں وہ میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی اهمیت کو بخوبی جانتے هیں - یہ اردو شاعروں کے اولین تذکروں میں ہے اور چونکہ ایک مشہور ' مستند اور بلند پایہ استاد کا لکھا ہوا ہے اس لیے خاص اهمیت وحیثیت رکھتا ہے - اس میں ایک سو چار شاعروں کا تذکرہ ہے - گو یہ مختصر ہے لیکن اس میں بہت سی کام کی اور مفید باتیں ملتی هیں اور ایسے تاریخی اشارے اور ادبی نکات ملتے هیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے - میر صاحب نے بڑی تحقیق سے لکھا ہے اور شعرا کا معیاری کلام انتخاب کیا ہے اور جگہ جگہ بڑی استادانہ تنقیدیں کی هیں - یہ تذکرہ عمدہ اشعار کا انتخاب بھی ہے جس سے عام ناظرین لطف اندوز اور میر کے ذوق سے آشنا ہو سکتے هیں ' اور شاعروں کے حالات کا مجموعہ بھی ' جس سے تاریخ ادب کے شائقین مستفید ہو سکتے هیں - اور چونکہ اس میں میر نے بڑی آزادی اور بے باکی سے شاعروں کے کلام پر تنقید اور رائے زنی کی ہے اس لیے یہ تنقید کا بھی عمدہ نمونہ ہے —

اس تذکرے میں اکثر ان شاعروں کا حال ہے جن سے مصنف ذاتی ملاقات اور واقفیت رکھتا تھا ' اس لیے اس میں اکثر مستند اور محققانہ

چیزیں ملتی ہیں - مصنف نے شمالی ہند کے شاعروں کے ساتھ دکنی اور گجراتی شاعروں کو بھی لیا ہے - اس باب میں مصنف نے عزلت کی بیاض سے استفادہ کیا ہے - کہیں کہیں دکنی شاعروں کے حالات اور اسما وغیرہ میں فرو گزاشتیں نظر آتی ہیں' ان کی تصحیح حواشی میں کردی گئی ہے' جس سے تذکرہ کا پایۂ استناد زیادہ بلند ہوگیا ہے —

اس سے قبل انجمن ترقیء اردو نے اس تذکرے کو شایع کیا تھا لیکن پہلے اڈیشن میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں - یہ اڈیشن خاص اہتمام اور صحت کے ساتھہ طبع کیا گیا ہے - شروع میں مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا مقدمہ بھی ہے جو پہلے اڈیشن میں نہ تھا اور آخر میں ایک اشاریہ (انڈکس) ہے جو ہر طرح سہولت بخش ہے —

(چ)

دیوانِ تاباں

مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن - کاغذ' طباعت وغیرہ عمدہ - صفحات ۲۸۰ - قیمت مجلد ۲ روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

میر عبدالحی تاباں دہلوی محمد شاہی عہد کے شاعر ہیں - یہ وہ زمانہ ہے جس میں ایہام گوی کا زور تھا' لیکن اس کے آخر زمانہ میں ایہام گوی کے خلاف بعض شاعروں نے تحریک شروع کر دی تھی اور شاعری میں سادگی اور اس کی زبان میں اعتدال و توازن پیدا کیا جا رہا تھا - تاباں کا کلام اس دور اصلاح کی پیداوار ہے - تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ ھ اور ۱۱۶۵ ھ کے درمیان ہوا ہے گویا محمد شاہی عہد کے اثرات ابھی پورے طور پر زایل نہیں ہوے تھے - یہ پورا دیوان اسی عہد کے اخیر حصے میں تصنیف

ہوا ہے، اس لحاظ سے اس کی زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست لایق داد ہے - تاباں کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے - اس کی شاعری عام عاشقانہ مضامین اور بقول مہر "گل و بلبل" کی داستان تک محدود ہے - لیکن زبان و بیان کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے - مہر نے اپنے زمانے کی شاعرانہ زبان کا لحاظ کرتے ہوے اس کے متعلق بہت صحیح راے دی ہے —

"زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل، گلستان سخن را نازک دماغ بلبل، سمند رنگینیء فکرش با گلگون باد بہار طابق النعل بالنعل است - ہر چند عرصۂ سخن او در لفظ ہاے گل و بلبل تمام است، اما بسیار برنگیں می گفت" —

(چ)

حامد کے سو شعر

حامد علی خاں بی - اے - جائنٹ اڈیٹر رسالۂ ہمایوں زیادہ تعارف کے محتاج نہیں - ان کا کلام اور ان کے مضامین ہمایوں اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں - ان کے سو شعر کا انتخاب ادبی دنیا کے مدیر منصور احمد صاحب نے کیا ہے اور شروع میں دس صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے جس میں شاعر کی خصوصیات شاعری سے بحث کی ہے - انتخاب اچھا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے - کتابت عمدہ، طباعت رنگین ہے اور کاغذ بھی اچھا ہے، تقطیع بھی عام سو شعری انتخاب سے کسی قدر بڑی ہے - قیمت چھ آنے - ملنے کا پتا: - دفتر ہمایوں، ۲۲ - لارنس روڈ - لاہور -

(چ)

حضرت احمق کے سواسو شعر

مرتبہ مرزا ابراھیم بیگ صاحب اڈیٹر سرگزشت علی گڑھ

کچھہ دنوں سو شعری انتخابات کی گرم بازاری رھی۔ اب سوا سو کا آغاز ھوگیا ھے' مشہور کہاوت ھے سیر کو سواسیر۔ انتخاب کی یہ جدت مرتب نے شاعر کے تخلص اور اس کے رنگ شاعری کے اعتبار سے بہت خوب کی ھے۔ اکبر کے بعد ظرافت نگاری میں کئی شاعروں نے زور مارا لیکن اس کو اب تک کوئی نہیں پہنچا۔ حضرت احمق بھی ان ظرافت نگار شاعروں میں ھیں جو اکبر کے رنگ میں کہتے ھیں۔ ان کا کلام اکثر رسائل و اخبارات میں شایع ھوتا رھا ھے اس لیے وہ کسی تعارف یا تقریب کے محتاج نہیں ھیں۔ اس مجموعہ میں وہ اشعار نہیں ھیں جن میں سیاسیات پر سختی سے حملے کیے گئے ھیں۔ مرتب نے شروع میں ایک مختصر دیباچہ لکھا ھے جس میں حضرت احمق کے حالات اور "احمقیات" کا ذکر ھے۔

(چ)

---

(۱) صہباے ولا۔ (۲) جوش ولا۔

مصنفہ شاہ ابوالحسن محمد مظفر چودری۔ چھوٹی تقطیع' صفحات و قیمت علی الترتیب ۱۶' ۲۸۔ ڈیڑہ آنہ' تین آنے۔ مصنف کے پتے' سی۔اے۔وی۔ ھائی سکول الہ آباد سے مل سکتی ھے۔

صہباے ولا میں وہ چند نظمیں ھیں جو نعت وغیرہ میں مصنف نے اثناے سفر حج میں لکھی ھیں۔ جوش ولا دراصل ایک نعتیہ نظم ھے جو عہد میلادالنبی کی ایک محفل میں پڑھی گئی تھی۔ مصنف کو نعت گوئی

میں اچھا خاصا ملکہ ہے - جو لوگ نعتیہ کلام سے ذوق رکھتے ہیں - ان کے لیے یہ دو کتابچے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے —

(چ)

اتالیق الصبیان

مصنفہ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب - صفحات ۱۷۳ - قیمت ایک روپیہ چھہ آنے علاوہ محصول ڈاک - مصنف کے پتے ' نور منزل ' ڈاک خانہ راج پور ' دہرہ دوں سے مل سکتی ہے -

یہ نظموں کا مجموعہ ہے جس کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ " ۴۲ سالہ خدمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ہمالہ کے پہاڑوں میں آخری دن بسر کرنے کا ارادہ کیا اور قریب ساڑھے چار سال سے یہاں مقیم ہوں - کچھہ عرصہ یہاں رہنے کے بعد اکثر خیال ہوا کہ وقت گزارنے کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ ضرور ہونا چاہیے اور مشغلہ ایسا ہو جو دلچسپ تو ضرور ہو مگر کچھہ مفید بھی ثابت ہو " - چنانچہ یہ مجموعہ اس دلچسپ مشغلے کی پیداوار ہے - جس کے لکھنے کا مدعا یہ ہے کہ بچوں کو ہندوستان کی مختلف چیزوں سے باخبر کیا جاے - اس میں تقریباً سوا پانسو نظمیں ہیں جن کو پانچ مختلف عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے - (۱) حیوانات ' اس میں ۷۵ جانوروں کا ذکر ہے - (۲) مصنوعات ' ان کی تعداد ایک سو ایک ہے - (۳) نباتات ' ۱۷۹ - (۴) پیشہ ور ۱۶۳ - (۵) متفرق ۸ —

ہمارے ملک کے نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بوڑھے تک مختلف جانوروں ' پرندوں ' پودوں اور پھولوں وغیرہ کے ناموں سے ناواقف ہوتے ہیں ' اور ان کی خصوصیات اور خاص خاص حالات سے بے خبر - ہماری

زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو خاص ہندوستانی چیزوں پر لکھی گئی ہو۔ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب کو یہ خیال بہت خوب پیدا ہوا۔ لیکن انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں ایسی چیزوں کا بیان خواہ کتنی ہی دلآویز اور دلچسپ نظم میں کیوں نہ ہو زیادہ مفید نہیں ہوسکتا۔ نظم کی پابندیاں وضاحت و تشریح چاہتی ہیں۔ ایسی حالت میں بچوں کے لیے اکثر ان چیزوں کو جو ان کی نظروں سے نہیں گزری ہیں نظم میں بیان کرنا ناقابل فہم نہیں تو سریع الفہم بھی نہیں۔ اگر اس میں تصاویر ہوتیں تو بھی آسانی ہوتی۔ موجودہ صورت میں اس سے صرف لفظی تعریفیں معلوم ہوسکتی ہیں، لیکن اشیا وغیرہ کی اصل حقیقت سے واقفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

(چ)

مرقع سخن حصہ اول و دوم

مصنفہ ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی۔ صفحات و قیمت علی الترتیب ۸۴، ۲۰۰، آٹھ آنے، بارہ آنے۔ مصنف کے پتے، پٹنہ سٹی ڈاک خانہ بیگم پور محلہ چوراہا آغا حسینا سے مل سکتی ہے۔

ان دونوں حصوں میں مصنف نے اپنی طبع زاد نظمیں جمع کی ہیں۔ پہلے حصے میں ۴۰ نظمیں ہیں اور دوسرے حصے میں ۸۸۔ ان کے موضوعات مختلف و متنوع ہیں، لیکن زیادہ تر صوبۂ بہار سے متعلق ہیں، ان میں بھی بیشتر ایسی ہیں جو خاص خاص تقریبوں سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً کسی کے صاحبزادے کی تسمیہ خوانی، تعمیر مکان، کسی خاص غرض کے

لیے چندہ' کسی کے اضافۂ تنخواہ کی التجا' دوستوں یا ذی اثر لوگوں کی اونچے عہدوں پر ترقیاں' کسی طالب علم کا امتیاز سے امتحان پاس کرنا' کسی مسجد کی ترمیم کے لیے عرض داشت اور چندے کی اپیل' ٹی پارٹی' وداعی جلسہ' شادی اور دعوتوں کے رقعے' مبارکبادیں' تہنیتیں' کلب کے فوٹو وغیرہ وغیرہ ــ

مصنف کی غرض ان مجموعوں سے یہ ہے کہ طلبا کے نصاب میں شریک کیے جائیں' پہلے حصے کو وہ ہائی اسکول کی آٹھویں اور نویں جماعتوں کے لیے موزوں بتاتے ہیں' اور دوسرے حصے کو دسویں (میٹریکولیشن) کے لیے - مصنف ایک مشاق اور دیرینہ سال شاعر ہیں ان کا بیان ہے کہ

" راقم ۴۵ سال سے اردو کی بقا کے لیے اپنی ہستی کو فنا کر رہا ہے ــ
مجنوں بنا ہوا ہے جو یہ سر سے پاؤں تک لیلیٰ کی شکل کھینچ رہا ہے قلم مرا "

اس دیرینہ تجربے کے مقابلے میں مجال لب کشائی نہیں' تاہم باادب یہ کہنے کی جسارت کی جاتی ہے کہ یہ مجموعے طلبا کی نصابی ضرورتوں کو شاید ہی پورا کریں - نظم کے موضوعات بہت وسیع ہیں جن سے طلبا کو اپنی تعلیم کی ابتدائی منزل پر باخبر ہونا لازم ہے - اس نصابی مسئلے کا حل اب تک صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ مختلف اساتذہ کے کلام کا انتخاب کیا جاے اور اس طرح طلبا کو ہر استاد کے رنگ سے واقف کرایا جاے - اس سے طلبا میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور وہ نظم کو سمجھنے اور اس کی اصلی روح سے آشنا ہونے کی صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں - کسی ایک شاعر کا کلام پڑھانے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا ــ

(چ)

———

سلسبیل

مجموعۂ کلام جناب آل احمد صدیقی سرور ایم - اے (مالیک) سلسلۂ مطبوعات انجمن اردوے معلیٰ نمبر ا کاغذ معمولی - کتابت و طباعت اچھی - صفحات ۲۱۱ - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا - درج نہیں —

کسی قوم کے انحطاط کا اندازہ لگانے کے لیے ایک یہی مشاہدہ کافی ہے کہ اس کے افراد میں شعر خوانی اور شعر گوئی میں تمیز باقی نہیں رهتی یعنی هر شعر خواں شعر گوئی کی طرف مائل هوجاتا هے - یہ رجحان ایک خاص قسم کی ذهنیت کا پتا دیتا هے - جہاں همارے ملک میں ضبط اولاد اور ضبط نفس کی تحریکیں شروع هوچکی هیں کاش شعر و ادب میں بھی کسی قسم کا ضابطہ نافذ هو سکے اور گم کردہ راہ شاعر نما حضرات اپنے اصلی رستوں کو پہچان جائیں -

'نژاد نو' کا هر شاعر اپنا مجموعہ اس شان کے ساتھہ مرتب کرتا هے کہ ورق الٹتے هی اس کی تصویر پر نظر پڑے پھر ایک مرعوب کن مقدمہ اور 'هدیۂ محبت' هو - چنانچہ یہ صفحات بھی اُن صفات سے خالی نہیں هیں - بقول سرور صاحب ان کا " تخیل کشمیر کی بہاروں میں جوان هوا هے "- لہذا یہ هدیہ بھی انہیں بہاروں کے نام هے - ان نظموں اور غزلوں کو پڑھنے کے بعد همیں افسوس کے ساتھہ کہنا پڑا 'اے وائے بہارے اگر این مست بہارے!' نظموں کے علاوہ جن میں سے بیشتر مناظر کشمیر سے متاثر هو کر لکھی گئیں مولانا محمد علی مرحوم کا ایک مرثیہ اور کئی غزلیں بھی اس مجموعے میں شامل هیں —

شروع میں رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں ایک تعارف تحریر فرمایا هے جس کا ماحصل یہ هے کہ " سرور صاحب

اپنے کارناموں کے اعتبار سے فسانۂ عجائب سے کم نہیں ہیں" - ہمارا خیال ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صاحب صدیقی اگر ایک دوسرے کو اپنی تحریریں دکھا لیا کریں تو وہ زیادہ دلچسپ اور شگفتہ ہو جائیں - خواجہ صاحب کا پیرایہ اتنا یک رنگ و ہموار ہے کہ اسے رشید صاحب کا پیچ و خم کسی نہ کسی قدر ملنا چاہیے - اور رشید صاحب کے تحریری بھول بھلیاں میں خواجہ صاحب کی سادگی ایک نئی بات پیدا کر دے گی —

مصورانہ شاعری کے بھی خارجی اور داخلی پہلو ہوتے ہیں - یا تو شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گل کاریوں سے چمن بندی کر دے، پہاڑ کی بلندیوں کو آسمان سے ٹکرا دے، اور دریاؤں میں ایسے بھنور ڈال دے کہ ناظر سکتے میں آجائے اور سمجھ نہ سکے کہ یہ نظارہ خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں - یا پھر شاعر ان مناظر سے اثر پزیر ہو کر اپنے محسوسات کو یوں بیان کرے کہ سننے والے پر وہی کیفیت طاری ہو اور وہ ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جائے - جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کے کلام میں خارجی منظر کشی کے عمدہ نمونے ملیں گے - لیکن پیش نظر نظموں میں شاعر نے اپنے کو اُجاگر رکھنے کی اتنی کوشش کی ہے کہ تصویر کہیں نہیں رہی، صرف مصور رہ گیا اور اس کے جذبات میں وہی فرسودہ رومانی کیفیت ہے جو ہمارے اکثر رومانی نظم نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے - ان کی جوانی پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ لادے ہوئے عینک کے وسیلے سے حسن و عشق کی رنگینیوں کا جائزہ لے رہی ہے - سرور صاحب اپنے ہم عصروں کی طرح اس جوانی کے احساسات کو خوبصورت الفاظ کے پردوں میں بھی چھپا نہ

سکے - بعض ترکیبیں اور ناموزوں بندشیں جابجا نظر آتی ہیں —

" میرے دل میں بھی ابھریں سی کئی بے ساختہ نہریں" - (صفحہ ۲۷)

نہروں کی بے ساختگی یعنی چہ ؟

حباب احمریں کی شوخیاں فرش زمرد پر

ہوا وہ راز جو یوں برملا افشا نظر آیا (صفحہ ۲۸)

دونوں ہی مصرعے زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے —

عروس شعر نے پردہ اٹھایا روے روشن سے

بڑھے اہل نظر ساغر بکف شاخ نشیمن سے (صفحہ ۳۱)

گویا شاخ نشیمن پر پلچھیوں کی طرح اہل نظر اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ شاعری کی دیوی بے نقاب ہو اور یہ اس کی طرف پر پھیلائیں —

" یا میرے ذوق نظر کی آخری پرواز ہے" - (صفحہ ۴۷) نظر کی پرواز بھی ذوق نظر کی پرواز اور وہ بھی آخری پرواز! سمند ناز پر یہ تازیانہ !

" مگر لبوں پہ یہی ایک دعا نظر آئی" - (صفحہ ۹۱)

دعا نظر بھی آسکتی ہے یہ ہمیں آج معلوم ہوا -

نظموں میں صرف ایک پرواز خیال اچھی ہے اور اس میں بھی اس اس قسم کے مصرعوں کی فراوانی ہے " تمام دیدۂ حیرت بنا ہوا ہوں میں -"

غزلوں پر اصغر گونڈوی کا اثر صاف نمایاں ہے اور کہیں کہیں جگر مرادآبادی کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی ہے - ان دونوں کی غزلوں پر طبع آزمائی بھی کی گئی ہے اور نتیجہ جس صورت میں

برآمد ہوا وہ ملاحظہ ہو :

" تارے ' اچالتے ' ہیں میری گرد راہ کو" (صفحہ ۸۴)

" وہ روشنی ہو رہی ہے دل میں کہ ' مشعلیں جگمگا رہا ہوں" (صفحہ ۸۷)

" سرور بزم کو اتنا ' چھکا ' نہ دوں تو سہی ' (صفحہ ۱۰۱)

" ہزاروں لولوے لالہ لیے بیٹھا ' ہوں محفل میں -" " خرام موج سے لولوے تہہ نشیں بہتر - "

غرض غزلوں سے نظمیں پھر بھی غنیمت ہیں کہ ان کھڑ اور بے جوڑ ترکیبوں کے لیے ان میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکل ہی آتی ہے -

غزلوں میں وہی چوچلے ملیں گے جنہیں رشید صاحب نے اپنے دیباچے میں "شورہ پشت" شاعروں کے لیے مخصوص کیا ہے - ان کے عشق کی داستان ان ابواب میں تقسیم کی جاسکتی ہے -

پہلا سین : " ہزاروں لولوئے لالا لیے بیٹھا ہوں سیلوں میں " - (صفحہ ۸۱)

دوسرا سین : " زیر و زبر ہے قافلہ صبر و قرار کا " - (صفحہ ۹۴)

تیسرا سین : " پیشانیوں پہ نور حرم لے کے آئے ہیں " - (صفحہ ۰۳)

چوتھا سین : " اور بڑھتا جا رہا ہے بار سر کو کیا کروں " - (صفحہ ۱۰۹)

ڈراپ سین : " حضور حسن میں دل باریاب ہو نہ سکا " - (صفحہ ۸۷)

یہ مختصر سی روداد ہے ہماری ' شورہ پشت شاعری ' کی ' جس کا نمونہ یہ مجموعہ ہے —

(نا خدا)

خمستان

اثر صہبائی کے کلام کا مجموعہ

صفحات مع مقدمہ وغیرہ - تقریباً ۳۰۰ - کاغذ کتابت و طباعت اچھی -

قیمت ۲ روپیہ ۸ آنہ ملنے کا پتا - آزاد بک ڈپو ' سیالکوٹ ' پنجاب -

جناب اثر صہبائی پنجاب کے مقبول اور ممتاز نوجوان شاعر ہیں - خمستان ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے - اس میں غزلوں اور رباعیوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی ہیں —

مجموعہ کے آغاز میں " دنیائے ادب کے مایۂ ناز ادیب " (بقول مصنف) سید سلیمان صاحب ندوی نے جرعۂ مئے کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے اور پنڈت کیفی صاحب نے بھی اس سنت کی پابندی کی ہے - سید صاحب نے اس مقدمے میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ کی ہے کہ اہل حدیث حضرات شاعر ہوتے ہیں یا نہیں —

مجموعے کا پہلا باب ' تجلیات ' غزلوں پر مشتمل ہے اور غالباً سب سے زیادہ طویل ہے - غزل گوئی کی صنف نہایت نازک اور مشکل ہے اور یوں صنفی اعتبار سے کوئی اس پر عبور حاصل بھی کرلے لیکن خود فراموشی کا وہ جذبہ کم کو میسر ہوتا ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہے اور جس کے بغیر غزل بالکل روکھی پھیکی رہ جاتی ہے - ہمارا خیال ہے کہ اثر صاحب کی طبیعت حکمت اور فکر کی طرف زیادہ مائل ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا ضبط ہے - اس لیے اسی صنف میں انہیں جولانی طبع کا زیادہ موقع ملے گا جو اس قسم کے رجحان کے لیے موزوں ہو - غزل جس قسم کی صناعی اور خود فراموشی کی طالب ہے وہ اثر صاحب کو ودیعت نہیں ہوئی - چنانچہ غزلوں میں فی الجملہ بہت کم ایسی ہیں اور ان میں بھی ایسے اشعار کم ہیں جو دل میں اتر جائیں - ایک طرف ایسی غزل موجود ہے :—

دنیا میں ہزاروں خوشحال ہیں ' یہ دنیا عشرت خانہ ہے
اس بزم میں لیکن میرا بھی ایک درد بھرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والوں کا نے کعبہ نے بتخانہ ہے
ہاں دو ہی سہارے ہیں ان کے - یا موت ہے یا پیمانہ ہے
ہر شاخ جب ایک مستانہ ہے ہر پھول جب ایک پیمانہ ہے
توبہ ! ایسے میں توبہ ؟ جب فطرت خود میخانہ ہے
کچھہ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے اور میخانے میں
کاشانہ ہی میخانہ ہے میخانہ ہی کاشانہ ہے

اثر صاحب کی بہترین غزلوں میں سے یہ ایک ہے پھر بھی مقدمہ نگار کو بصد تکلف اس کے ہر شعر پر اصلاح دینے کی ضرورت محسوس ہوئی - کہیں کہیں " بخت واژوں " (صفحہ ۱۴) جیسی عجیب ترکیبیں ملیں گی جو الفاظ کے ترنم کے ساتھہ بگل کی آواز کا کام کرتی ہیں - اس میں شک نہیں کہ بسااوقات ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں کہ سخن شناس سوچتے رہ جائیں کہ شاعر کیا کہہ گیا :

جستجوے منزل میں بے قرار و آوارہ
میں بھی ایک منظر ہوں موجہاے دریا کا
رہرو محبت کے ہر قدم پہ منزل تھی
حسن کا تھا آینہ ذرہ ذرہ صحرا کا

زندگی سوز ہے کہ تادم زیست ختم پر آہ آتشیں نہ ہوئی
آستانے نگاہ سے گزرے مایل بندگی جبیں نہ ہوئی

کچھہ شغل زندگی کے لیے بھی تو چاہیے
تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

لیکن ایسے اشعار خال خال ہی ہیں —

دوسرا باب بعنوان 'سمن زار' نظموں پر مشتمل ہے اور یہاں شاعر

کو اپنے اس نظریۂ شباب کے پھیلانے کا خوب موقع ملا ہے جس کی تشریح وہ پہلے کر چکا ہے :

کیف آفریں ہے یاد جوانی رسوائی و رندی و بت پرستی

چنانچہ یہاں شعب و شباب کی رنگینیاں ابلی پڑتی ہیں - غزلوں سے نظمیں اچھی ہیں ' خصوصاً بہاریہ اور " محبت اور موت " خوب ہیں -

' جام صہبائی ' رباعیات کے لیے وقف ہے اور یہ اثر صاحب کا خاص میدان ہے - شاید یہ مبالغہ نہیں کہ جگت موہن لال رواں آں جہانی کے بعد امجد حیدر آبادی اور اثر صہبائی اس اقلیم سخن کے آلھا اودل ہیں -

ہماری شاعری کی بدنصیبی ہے کہ اس کا رکن اول نوحہ خوانی قرار پاگیا ہے اور ولی دکنی سے لے کر دور حاضر تک کے جس شاعر کو دیکھیے چرخ کج رفتار کو بددعائیں دیتا اور دامن و گریباں کے درپے ہوکر اپنے افلاس میں زیادتی کرنے پر تلا رہتا ہے - وجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائیٹی میں انسان کی تمنائیں قدم قدم پر پامال ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کا موقع بہت کم ملتا ہے - خصوصاً اب حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ ہمارے نوجوان زیادہ حساس ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ان کے ارادوں کی تکمیل کے تمام راستے بند ہیں اور اس کا رد عمل لامحالہ حزنیت کی صورت میں ہوگا - اثر صاحب جس اندوہ و ملال کی تلچھٹ پی رہے ہیں وہ فطری نہیں بلکہ ماحولی ہے - امید ہے کہ وہ بہت جلد اس مہلک مرض کو اپنے دامن سے جھٹک دینگے اور اس کا آئندہ مجموعہ نوحۂ غم نہیں بلکہ پیام عمل ہوگا —

کچھ رباعیات درج کی جاتی ہیں جو اثر صاحب کے مخصوص رنگ میں ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہیں -

صحرائے جہاں میں ایک فریاد ہوں میں ظلمات فلک میں برق آباد ہوں میں
جویائے سکون جاوداں ہوں یعنی ناشاد ہوں بیتاب ہوں برباد ہوں میں



جو لطف ہے جستجو میں حاصل میں نہیں لذت جو تگ و دو میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظر زندگی کہ امواج میں ہے کشتی میں نہیں ' سکوت ساحل میں نہیں



تاراج خزاں ہوں اور رقصاں ہوں میں گلہائے بہار میں پریشاں ہوں میں
لذات و علم بھی ایک معمہ ہیں اثر خوش رنج میں اور خوشی میں گریاں ہوں میں



ہو جائے عیاں جو مجھ پہ ہستی میری پھر کوئی سنے صدائے مستی میری
معبود ہوں آپ ہی عبادت کس کی ؟ ہے بے خبری خدا پرستی میری

خوب کہا —

بہ ایں ہمہ ' شاعر کہیں کہیں جذبات کے تلاطم میں بہہ جاتا اور ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ مقدمہ نگاروں کے ' مشوروں ' کے باوجود وہ کانوں کو کھٹکتی ہیں - رباعیات میں فرط بے نیازی سے کبھی کبھی مصرعوں میں ایسی تکرار ہونے لگتی ہے جو ناگوار معلوم ہوتی ہے : -

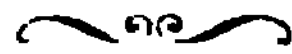
" کیوں شکوۂ روز گار اے دل اے دل
دنیا تیری ہے میں بھی تیرا ' تیرا
مرنا تو میں جانتا ہوں - ہوگا ہوگا "

' راحت کدے ' میں شاعر نے اپنی رفیقۂ حیات کی یاد میں جو قطعات کہے ہیں ان میں سے کئی بہت پر درد ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خلوص جذبات صحیح صناعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے :

سحر کے روے رنگیں سے نقاب الٹھائے جاتے ھیں
دل محزوں پہ لیکن غم کے بادل چھائے جاتے ھیں
تمھارے ھجر میں باد صبا ایک آہ غم گیں ہے
نہیں تم جلوہ گر تو پھول بھی مرجھائے جاتے ھیں
تمھارے غم ربا جلوے عیاں ھیں لالہ زاروں میں
تمھارے دل نشیں نغمے رواں ھیں آبشاروں میں
تمھارا روے رنگیں ماہ تاباں میں درخشاں ہے
تمھاری مسکراھٹ رقص کرتی ہے ستاروں میں

اثر صاحب قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے ھیں اور ان کا مستقبل روشن ہے - مشق کے ساتھہ پختگی آتی جاے گی اور اگر ان کے مشاھدے کا دائرہ وسیع ھو گا اور وہ عوام کے دکھہ اور اس کے مداوے کو سمجھہ سکے تو ان کے کلام میں وہ شگفتگی ضرور آجاے گی جس کی توقع ایک شباب پرور شاعر سے کی جاتی ہے —

(ناخدا)



(۱) سودیشی اردو (۲) ضروری کہانیاں -

(مصنفۂ قاضی عبدالصمد صاحب - کاغذ طباعت و کتابت ، فاھمت - پہلی میں ۴۰ صفحات ھیں اور قیمت چار آنے ہے - دوسری میں ۷۲ صفحات ھیں اور قیمت چھہ آنے ہے - ملنے کا پتا - مولوی محمد ادریس میرٹھی - مکتبۂ شرقیہ - دھلی)

دونوں کتابیں اسکول کی ضروریات کو مد نظر رکھہ کر لکھی گئی

ہیں اور اس لائق ہیں کہ ہمارے طلبہ انہیں بار بار پڑھیں —

سودیشی اردو سید انشا کی 'رانی کیتکی کی کہانی' اور ہندی کے مشہور شاعر ہری اودھ کی 'ٹھیٹھ ہندی کے ٹھ ٹ' کے طرز کی کتاب ہے - خوبی یہ ہے کہ فارسی اور عربی کا ایک لفظ نہ ہوتے ہوئے بھی زبان پاکیزہ اور فصیح ہے - اگر اس قسم کی کتابیں برابر اشاعت پذیر ہوا کریں تو اس تحریک کو بڑی تقویت ہوگی جو مولویانہ اردو اور پنڈتانہ ہندی کی جگہ بول چال کی زبان کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنانا چاہتی ہے -

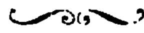
دوسری کتاب بھی بہت مفید ہے اور اسکی تالیف کا مقصد نہایت مستحسن ہے - یہ ہندوستان کے ایسے تاریخی واقعات کا مجموعہ ہے جن سے (۱) اہل ملک میں باہمی محبت اور حب وطن کے جذبات پیدا ہوں - (۲) جن سے اچھا اخلاقی سبق حاصل ہو - (۳) جن حکمرانوں کے متعلق بعض اشتعال انگیز واقعات مشہور ہیں ان کے وہ واقعات لکھے جائیں جن سے بدگمانیاں رفع ہوں —

یہ امر کتنا افسوس ناک اور باعث شرم ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں آئے دن ایسی تحریکیں اٹھا کرتی ہیں جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی جائے اور ایسی تحریریں بکثرت شایع ہوتی ہیں جن میں سے دلوں کی سیاہی کاغذ پر انڈیلی جاتی اور باہمی مناقشت کی آگ کو ہوا دی جاتی ہے ' وہاں اتحاد و رواداری کا جھنڈا برابر خاک بسر ہے اور کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں - اس قحط الرجال میں ایسی کوششیں لائق ستایش ہیں —

کیا اچھا ہو کہ ہماری قوم کے نونہال ان افتراپرداز تاریخوں کو پڑھنے پر مجبور نہ کیے جائیں جو اوائل عمر سے ان کے دلوں میں کینہ و تعصب کے

جذبات پیدا کرتی ہیں - اور اس قسم کی کتابیں ان کے ہاتھ میں ہوں جو یک جہتی اور قومیت کی روح پھونکیں !

" ناخدا "



منتخب افسانے

مترجمہ سلیم آبادی صاحب - حجم ۵۰۰ صفحات ۔ کاغذ ' کتابت و طباعت معمولی - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا هلد بک ایجنسی چت رنجن ایونیو کلکتہ '

مترجم نے مشرق و مغرب کے شہرۂ آفاق افسانہ نگاروں کے ۳۸ افسانوں کو اردو میں منتقل کیا ہے - افسانہ نگاروں یا افسانوں کے انتخاب میں کوئی خاص التزام ملحوظ نہیں ہے ۔ ترجمے کے متعلق یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ " افسانہ نگار کی اسپرٹ کو سمجھ کر اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے "- ہمارے خیال میں یہ طریقہ کسی طرح مستحسن نہیں ہے - جب تک آرٹسٹ کی لغوی اور معنوی خوبیاں برقرار نہ رہیں اس کے کمال کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا - افسانہ ایک unit ہے جس کی اسپرٹ اگر روح ہے تو پیرایۂ بیان جسم ہے - ' قالب میں ڈھالنے ' والی ترکیب سے قصہ ہی قصہ باقی رہ جاتا ہے اور لطف بیان کی تمام نزاکتیں ضایع ہوجاتی ہیں - ان میں سے کئی افسانے انگریزی میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں تامل ہے کہ ترجمہ میں اصل کے حسن کی ایک جھلک بھی موجود ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر تراجم عربی سے چھن کر اردو میں پہنچے ہیں اور اس صورت میں نگارش کی دلکشی کا باقی رہنا محال ہے ۔ ترجمے کی عبارت یک رنگ ہوتے ہوئے بھی صاف اور سلیس ہے - ایک دو قصوں کے ساتھ مصنف کا نام نہیں ہے مثلاً

شیخ حسن علی تھانہ دار - ممکن ہے یہ مترجم کی جدت طبع کے نمونے ہوں -

ملیح آبادی سے غالباً عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کی طرف اشارہ ہے جو عربی کی کئی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں - ملیح آباد میں اردو کے اور بھی ادیب ہیں اس لیے پورا نام نہ ہونے سے شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے —

بہر حال، جو لوگ انگریزی نہیں جانتے انہیں اس کتاب میں یورپ کے کاملین فن کا ایک ہلکا سا عکس مل سکتا ہے - ان داموں کتاب مہنگی بھی نہیں ہے —

" ناخدا "



لال قلعہ کی ایک جھلک

مصنفۂ - خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم دہلوی - کتابت و طباعت دیدہ زیب - حجم ۱۲۵ صفحات - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا - ساقی بک ڈپو، کھاری باؤلی دہلی -

فراق مرحوم دلی کی اس تہذیب و معاشرت کے آئینہ دار تھے جس کے خط و خال انقلاب زمانہ نے بالکل مسخ کردیے اور اب وہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے بعد اب کوئی نہیں رہا جو اس خراب آباد کی یاد تازہ کرے - دلی کی زبان لکھنے میں فراق مرحوم کو ید طولی حاصل تھا اور یہ کتاب ان کے مخصوص طرز انشاء کا بہترین نمونہ ہے - دلی یہ کتاب شرر کے شاہ کار "گزشتہ لکھنؤ" کے جواب میں پیش کر سکتی ہے - شاہد احمد صاحب مدیر ساقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی کاوش سے یہ مضامین لکھوائے اور مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کیے ورنہ یہ انمول موتی

یونہی بکھرے رہ جاتے - قدیم تمدن اور لطف زبان سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ باعث مسرت ہوگا —

" ناخدا "

تاریخ و سیر

حیات مسعودی

(نوشتۂ مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی - صفحات ۱۶۱ قیمت ایک روپیہ چار آنے)

سالار مسعود غازی (عرف بالے میاں) کا نام جس قدر مشہور اور زبان زد خلائق ہے اسی قدر ان کے اصل حالات و واقعات تاریکی میں ہیں - مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی نے جہاں تک ان کی دسترس تھی مختلف تاریخوں' کتبوں' زبانی روایتوں وغیرہ سے تحقیق کرکے ان کی تاریخ مرتب کی ہے - مسعود غازی کے حالات میں صرف ایک ہی کتاب مرأۃ مسعودی ہے' جس میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو ساقط الاعتبار ہیں- اگرچہ مولف کتاب ھذا نے اپنی تاریخ کی بہت کچھ بنیاد اسی پر رکھی ہے لیکن انہوں نے تحقیق و تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - ان تمام قدیم و جدید تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے جن میں مسعود غازی کا ذرا سا بھی حوالہ تھا - بعض کتابیں جو دستیاب نہیں ہوئیں اور جن کا نام صرف دوسری تاریخوں میں ضمناً

آگیا ہے ' اس میں مجبوری تھی - موجودہ حالات میں قابل مولف کی سعی و محنت لائق تحسین ہے —

تذکرۂ محسن

(مولفہ مولوی محمد امین صاحب زبیری - صفحات ۳۰۸ + ۲۵ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ چار آنے ' مجلد ایک روپیہ آٹھہ آنے) -

اس کتاب میں نواب محسن الملک سید مہدی علی مرحوم کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں- لکھنے والے مولوی محمد امین صاحب ہیں جن کو کچھہ دنوں نواب صاحب مرحوم کے ساتھہ رہنے کی عزت حاصل رہی ہے - اگرچہ محمد امین صاحب کے تعلق کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب کہ نواب صاحب حیدرآباد سے رخصت ہو کر بمبئی میں قیام فرما تھے - لیکن چونکہ خود محمد امین صاحب کو زمانۂ دراز تک ایک اسلامی ریاست سے تعلق رہا اس لیے وہ ریاستوں کے معاملات کو خوب سمجھتے ہیں اور انہیں حیدرآباد کے حالات و معاملات کے سمجھنے میں ذرہ بھی دقت نہیں - حیدرآباد کے بعد علی گڑہ کالج کا دور شروع ہوتا ہے اور یہیں اُن کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے - کالج کے حالات بھی لائق مولف نے بہت تحقیق سے جمع کیے ہیں یہ گویا اس وقت کے کالج کی صحیح تاریخ ہے —

اس سے قبل محمد امین صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے لیے بھی نواب محسن الملک کی سوانح عمری لکھی تھی - لیکن اب کے انہیں اتفاق سے اور کچھہ نواب مسعود جنگ بہادر کی سعی سے نیا مسالا

ہاتھ لگا ہے جس سے یہ سیرت مکمل ہوگئی ہے - آخر میں بعض ضمیمے بھی اضافہ کیے گئے ہیں اور بعض انگریزی تحریریں اور خطوط جو اعلیٰ درجے کے انگریزوں نے خاص معاملات پر نواب صاحب کو لکھے تھے بجلسہ چھاپ دیے ہیں - ان میں لارڈ ڈفرن کا خط پڑھنے کے قابل ہے —

نواب صاحب میں بعض ظاہری اور باطنی ایسی خوبیاں تھیں جو اب شاذ و نادر پائی جاتی ہیں - چونکہ وہ مختلف حیثیتوں کے جامع تھے- اُن کا تعلق ملک اور خصوصاً مسلمانوں کی زندگی اور بہبودی سے تھا اس لیے اُن کی زندگی بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے- مولوی محمد امین صاحب نے اپنے اس فرض کو بڑی خوبی اور محنت سے انجام دیا ہے —



انقلاب فرانس

مصنفہ باری صاحب - صفحات ۱۰۷ - قیمت درج نہیں - کتابت و طباعت اچھی - ملنے کا پتا - اردو بک اسٹال لوہاری گیٹ - لاہور —

انقلاب فرانس تاریخ عالم کا نہایت اہم واقعہ ہے اور سنہ ۱۷۸۹ ع عصر جدید کی آفرینش کی تاریخ کہی جاسکتی ہے - آج دنیا میں مساوات، اخوت اور آزادی کے جو پرچم لہرا رہے ہیں اس کی ابتدا اول اول وہیں سے ہوئی - زیر نظر کتاب میں مصنف نے پہلے تو نشاۃ ثانیہ سے لے کر لوئی پانزدھم کے عہد حکومت تک کا ایک سرسری سا جائزہ لیا ہے - بعد ازآں استبداد کا خاکہ پیش کرکے امکانات انقلاب پر بحث کی ہے - اس ضمن میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا صحیح ہو یا غلط لیکن ہم ان کی انقلاب کی تعریف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ بادی النظر میں انقلاب

اور بغاوت میں کوئی امتیاز نہیں سمجھتے درآں حالیکہ ان دونوں میں بعد مشرقین ہے - کروپاٹکن اپنی تاریخ انقلاب فرانس میں اس تاریخی روش (Process) کی یوں تشریح کرتا ہے : شہروں اور دیہاتوں کی بھکھری بغاوتوں سے بھی انقلاب کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے- وہ خوفناک سے خوفناک جماعتی لڑائیوں یا حکومت کی تبدیلیوں سے زیادہ دور رس ہے - انقلاب نام ہے چشم زدن میں ان اداروں کے نیست و نابود ہوجانے کا جو صدیوں سے قائم تھے اور جن کی بنیادوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بڑے بڑے سورما رفارمر بھی لرزتے تھے - انقلاب نام ہے اس عہد کے سیاسی' اقتصادی اور سماجی ایوانوں کے زمین دوز ہو جانے کا - انقلاب تعلقات انسانی اور سماجی اداروں کی قدیم بنیادوں کو تہس نہس کرکے نظام زندگی کا ایک نیا ڈھانچا کھڑا کرتا ہے - پھر اس کے اصول رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلتے جاتے اور آنے والی نسلوں کے لئے تمدنی' اقتصادی اور سیاسی ترقی کی نئی شاہراہیں کھول دیتے ہیں - اس لحاظ سے انقلاب فرانس کی نوعیت بالکل مختلف ہے --

مصنف یہ بتلانے میں کامیاب ہوے ہیں کہ انقلاب کی تحریک کس ماحول میں نشو و نما پارہی تھی - لیکن انقلاب کی قیادت کن ہاتھوں میں تھی اس کے سپاہی کون تھے' اس کے مطالبات کیا تھے' اور وہ کیوں نہ پورے ہوے - ان اہم سوالات کا جواب اس کتاب میں ملے گا —

یہ فرانس کا سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب - (Bourgeois democratic Revolution) تھا - یعنی یہ سامنتی شکنجوں سے آزاد ہونے کے لیے حرفتی سرمایہ داری کی کامیاب سعی تھی - ہر حکومت کا دارومدار کسی خاص طبقے کے اقتصادی مفاد پر ہوتا ہے اور اس کے استوار ہونے کی ضمانت اس طبقے کے فروغ پر ہے - جب کوئی نیا طبقہ اپنے تاریخی فرایض کو پورا کرنا

چاہتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت وقت کو ایسی تشکیل دے کہ وہ اس کے ارادوں میں ہارج نہ ہو - فرانس میں مشینوں کے رواج اور صنعت و حرفت کے آغاز کے بعد یہ ناگزیر تھا کہ فرسودہ نظام حکومت بدل جائے تاکہ اس کی پوش یا افتادہ یا بلندیاں متوسط طبقے کی راہ میں حایل نہ ہوں - اس مہم میں وہ صرف اس وقت فتحیاب ہوتا ہے جب کہ عوام اس کے دوش بدوش استبداد سے لڑیں - جب ان کی امداد سے متوسط طبقے نے سامنت سے نجات حاصل کی تو مساوات' اخوت اور آزادی کے معنے بدل گئے - پھر سرمایہ داروں میں ان ارکان ثلاثہ کے مطلب یہ سمجھے جانے لگے کہ آزادی ہو مگر ظلم کرنے کی- اخوت ہو لیکن صرف ظالموں میں- اور مساوات ضرور ہو لیکن عالم بالا میں- لیکن یہ بھی ایک ناگزیر نشان راہ تھا کیونکہ اس زمانے میں وہ شتراکی انقلاب ممکن ہی نہ تھا جس کے سرگرم موئید باری صاحب معلوم ہوتے ہیں- مارکس اور لینن نے اپنی کتابوں میں جابجا اور خصوصاً "پیرس کمیون" میں اس کا اعتراف کیا ہے —

بہرحال یہ مسئلہ ایک بسیط مقالہ کا حاجت مند ہے اور ہم صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتے ہیں کہ اس کتاب کے حدود کو دیکھتے ہوئے اس میں معلومات کا نہیں تو دلچسپی کا کافی مواد موجود ہے- طرز تحریر خطیبانہ ہونے ہوئے بھی دلکش ہے - کتابیات میں حسب ذیل کتابوں کا اندراج ضروری تھا —

(۱) انقلاب فرانس از ہالینڈ روز (۲) انقلاب فرانس از میڈلن (۳) انقلاب فرانس از مالیٹ (۴) انقلاب فرانس از کروپاٹکن (۵) انقلاب فرانس میشلے (۶) انقلاب فرانس از اولارد (۷) انقلاب فرانس از کارلائیل —

" ناخدا "

متفرقات

اردو پرائمری مدارس صوبۂ متوسط و برار کا درسی سلسلہ

(عطر چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز اینڈ پبلشرز لاہور)

اس سلسلے میں اردو کا قاعدہ اور پہلی چار کتابیں شامل ہیں - یہ سب کتابیں عمدہ کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہیں - قاعدے میں ابھی اصلاح کی بہت کچھ گنجائش ہے - موجودہ صورت میں بچوں کے لیے کوئی سہولت نہیں پائی جاتی - اعراب کے لگانے میں بھی کوئی خاص اصول مد نظر نہیں رکھا گیا -

باقی چار کتابیں تعلیمی اور ادبی لحاظ سے بہت مناسب اور معقول ہیں - زبان ایسی رکھی گئی ہے جو اس صوبے کے بچوں کے لیے غیر مانوس نہیں - بعض اسباق ایسے داخل کیے گئے ہیں جن کا تعلق خاص صوبۂ برار سے ہے اور یہ اس سلسلے کے لیے ضروری تھا - علاوہ ادبی اور اخلاقی مضامین کے عام معلومات کے مضامین بھی کافی تعداد میں ہیں - موقع موقع سے عکسی اور رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں - خاں صاحب خواجہ لطیف احمد صاحب بی - اے نے جن کی تمام عمر تعلیم و تعلم میں گزری ہے، اس سلسلے کو مرتب کیا ہے - اس کی ترتیب و تالیف میں خواجہ صاحب نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے —

اُردو کے جدید رسالے

انیس

(اڈیٹر شرار بی - اے صاحب - سالانہ قیمت - دو روپے آٹھ آنے - ایلچپور ، برار)

یہ ماہانہ رسالہ ایلچپور برار سے شایع ہوتا ہے - مضامین مختلف قسم کے اور دلچسپ ہوتے ہیں - اس علاقے میں ایک ایسے رسالے کی بہت ضرورت تھی - اهل برار کو اس اردو رسالے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے ' وہاں ابھی اردو کا چرچا ہے اور اس کی ترقی اور اشاعت کے لیے ہر طرح کی سعی درکار ہے --

---

صبح امید

(اڈیٹر مدن گوپال متل صاحب بی - اے - سالانہ قیمت تین روپے - مقام لدھیانہ)

یہ ماہانہ رسالہ جو ابھی لدھیانہ سے نکلنا شروع ہوا ہے ' ہونہار معلوم ہوتا ہے - سرورق پر "علمی ادبی اور تعلیمی" رسالہ لکھا ہے اور اس مقصد کے نباہنے کے لیے قابل اڈیٹر نے مفید اور دلچسپ دونوں قسم کے مضامین جمع کیے ہیں —

اوراق میگزین

(ایڈیٹر سعید محمد خاں صاحب بھوپالی - کراؤن سائز اردو کے ۴ اور انگریزی کے ۴ صفحات - کاغذ طباعت و کتابت اچھی - سالانہ قیمت - ۱۲ روپے)

سعید محمد خاں صاحب پہلے بھی یہ اخبار نکالتے تھے اور اب علی گڑھ اور وہاں کی جمعیت کی خدمت کے ارادے سے از سر نو اس کی اشاعت شروع کی ہے - پیش نظر نمبر اس جریدہ کا (experimental) یعنی تجرباتی نمبر ہے گویا یہ ایک 'مجاس' ہے جس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہے کہ اتنے خریدار فراہم ہونے ہیں یا نہیں جو اسے کفیل بالذات بنا دیں - اگر ایسا ہوا تو فبہا ورنہ احتمال اس کا ہے کہ ایک "Longing tearfuladieu" 'پر حسرت اور اشک فشاں الوداع' کے ساتھ وہ ہم سے رخصت ہو جائے گا - تاہم وہ اخباری برادری کے لیے ایک نیا پیمانہ چھوڑ جائے گا جس کے ذریعے وہ اپنی مختصر سی تیملی کا جائزہ لے سکے گی —

اگر اخبار کا معیار آئندہ بھی وہی رہے گا جو اس نمبر کا ہے تو ہم ابھی سے مایوس ہو چکے - اداریہ کی انگریزی میں پوپ اور ڈرائیڈن کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے - یہ برا نہیں ہے کہ جہاں اردو میں اب بھی طلسم ہوش ربا اور فسانۂ عجائب کی پیروی کرنے والے حضرات موجود ہیں کیوں نہ انگریزی کا وہ دور زندہ کیا جائے جب ایک ایک جملے میں سو سو بل اور ہر ہر بل میں ہزاروں پیچ ہوتے تھے —

انگریزی کے چار صفحات میں سے ڈیڑھ صفحہ اُن شقوں کے لیے وقف ہے جو بعض حکام نے ایڈیٹر صاحب کے خطوط کے جواب میں ارسال کی تھیں - یہ علی گڑھ کی سنت دیرینہ ہے جس کے متعلق کچھ کہنا سوء ادب سمجھا جائے گا —

شعبۂ اردو ایک قصیدہ سے شروع ہوتا ہے جو نواب صاحب بھوپال کی تعریف میں ہے - پھر کچھ خطوط اور 'کھلندڑے پن' کی باتیں ہیں - ایک دو رخی تصویر ہے جس میں سے ایک طرف کچھ لمدام علیگ صاحبان کا گروپ ہے اور دوسری طرف ایک کارٹون ہے —

اگر واقعتاً یہ جریدہ علی گڑھ کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے تو اس کا پیرایہ زیادہ متین اور سنجیدہ ہونا چاہیے - اسے ان بنیادی مسائل کو پیش کرنا چاہیے جن پر علی گڑھ کی موجودہ ممات اور آئندہ حیات کا دار و مدار ہے -

(نا خدا)

ہمایوں کا روسی ادب نمبر

مئی سنہ ۳۵ ع - مرتبہ بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن)

حجم - معمولی نمبروں سے کچھ زیادہ —

روسی ادب سے ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کی روز افزوں دلچسپی اس ذہنیت کا پرتو ہے جو نظام زندگی کے انتشار کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے - بےکاری اور افلاس کی گراں باری ادب کو رومانی فضا سے نکال کر حقیقت نگاری کی طرف آنے کے لیے مجبور کر رہی ہے —

اس لیے جب ہم نے سنا کہ پنجاب کا ممتاز ماہ نامہ 'ہمایوں' ایک روسی ادب نمبر نکال رہا ہے تو ہمیں خوشی ہوئی اور ہم اس کی اشاعت کے منتظر رہے - لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ادارہ نے اس کی ترتیب میں کاوش سے کام نہیں لیا - ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں

کہ پورے روسی ادب کا احاطہ ایک آدھ سو صفحات کے رسالے میں کیسے کیا جا سکتا ہے۔ طالسطائی، دستوویسکی، گورکی یا کسی بھی قابل ذکر ادیب کے تعارف کے لیے اتنا بڑا نمبر مشکل سے کافی ہوتا۔ چاہیے یہ تھا کہ روسی ادب کے ہر دور کا ایک مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا اور ہمیں یقین تھا کہ پیش نظر رسالہ میں کم از کم دور قدیم اور دور جدید پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہوگی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ روسی ادب پر کوئی تنقیدی مضمون نہیں ہے اور جو ایک 'طائرانہ نگاہ' ہے بھی تو اس کی حیثیت ادیبوں کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے گوشوارہ سے زیادہ نہیں! پھر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس ادبی نمبر میں 'بولشیوک روس کا پس منظر' 'لینن خدا کے حضور میں' اور 'روسی تاریخ کے مشہور سنین' کی اشاعت کا کیا موقع و محل تھا، بلا بریں' بولشیوک روس کا پس منظر جس مطالعے اور تحقیق کا محتاج ہوگا اُس مضمون کے احاطے سے باہر ہے۔

یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ نمبر پورے روسی ادب کے لیے وقف ہے یا جدید روسی ادب کے لیے۔ اگر کلاسک ادب کی مثالیں دینا منظور تھیں تو دستوویسکی یا پشکن کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر طرز جدید کو نمایاں کرنا تھا تو گورکی، رومینانف، بیبل یا ایرن برگ کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے مثالوں کے انتخاب میں بھی خوش ذوقی سے کام نہیں لیا گیا —

مختصر یہ کہ اس نمبر کی ترتیب جلدی میں کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل ترجمے قلم برداشتہ ہوئے ہیں اور وہ بھی ایک ہی قلم سے۔ اس قلم کی گل‌فشانی ملاحظہ ہو:

" جنگ کی ستم آفرینیوں کی یاد '

اور اس کے ہر ایک صید بسمل کا تصور '

وابستہ کردیتا ہے میرا رشتۂ ہمدردی '

مرتے ہوے نوجوان دوست اور پیاری بیوی سے زیادہ اہم ہستی کے ساتھہ"۔

ایک تو ترجمہ در ترجمہ اور پھر یہ الجھی ہوئی تحریر — ستم بالاے ستم ہے —

رسالے کے آخر میں ایک دلچسپ فروگزاشت ملے گی - ایک نظم اور ایک اشتہار ساتھہ ساتھہ چھپے ہیں — جن میں سے نظم کا عنوان ہے 'عشق انوکھی ریت ہے پیارے' جواب برآمد 'صرف پاپیوں کے لیے'! مضامین اور اشتہارات ایک صفحے پر نہ چھاپے جائیں تو اچھا ہو —

اُمید ہے کہ ادارۂ ہمایوں اپنے آئندہ فرانسیسی ادب نمبر میں ایسی خامیوں کا اعادہ نہ ہونے دے گا —

" نا خدا "

اردو

حصہ ۶۰	اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ ع	جلد ۱۵



انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)



اردو

فہرست مضامین

بابت اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱ -	سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ اردو لغات کا نمونہ	اڈیٹر	۶۲۵
۲ -	سوویت روس کا ادب	جناب اختر حسین صاحب رائے پوری- بی - اے آنرز (علیگ) ساھتیا النکار	۶۳۹
۳ -	ٹیگور کے ادبی مضامین	جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار	۶۸۱
۴ -	آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار	جناب مولوی محمد عبد الرزاق صاحب راشد ایچ - سی - یس مددگار معتمد فینانس حیدرآباد دکن	۷۰۴
۵ -	فرنچ اکاڈمی	جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لیٹ (پیرس)	۷۱۶
۶ -	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۷۳۴



سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ اردو لغات کا نمونہ

از

اڈیٹر

[یوں تو سر سید مرحوم کا اردو زبان اور ادب پر بہت بڑا احسان ہے لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں خالص اردو ادب کی خدمت کا بھی تہیہ کیا تھا - اس ضمن میں اُن کے پیش نظر دو چیزیں تھیں - ایک " اردو لٹریچر کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا ' جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں ' نام ' اُس کے مصنف کا حال ' تصنیف کا زمانہ ' طرز بیان اور مختلف مقامات سے اُس کی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہو گا " - معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہ آئی - دوسری اردو لغات - اس کے چند ورق انھوں نے بطور نمونے کے لکھے تھے جو اُس وقت علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہو گئے تھے - یہ دونوں کتابیں وہ سائنٹفک سوسائٹی کے لیے لکھنا چاہتے تھے - چنانچہ سوسائٹی کی طرف سے ۹ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع کو جو اڈریس سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر صوبہ جات شمال مغرب کی خدمت میں

پیش کیا گیا تھا اُس میں یہ بھی تھا کہ منجملہ اُن کتابوں کے جو اردو زبان میں سوسائٹی تیار کررہی ہے یہ دو کتابیں بھی ہیں جو سوسائٹی کے لائف آنریری سکرٹری سید احمد خاں تیار کررہے ہیں -

سید صاحب مرحوم کو اپنی زبان سے بڑی محبت تھی - یہی نہیں کہ اُن کی تصانیف و تالیفات جن کی تعداد بہت کثیر ہے اس زبان میں ہیں بلکہ ادبی اور علمی مضامین کو فصاحت اور سلاست سے ادا کرنے کی بنیاد انہوں نے ڈالی ہے اور جب کبھی اردو پر آنچ آئی تو وہ فوراً اس کی حمایت کے لیے کمر بستہ ہوگئے —

سر سید کی دور اندیشی اور ادبی ذوق قابل داد ہے کہ انہوں نے ۶۸ برس پہلے اردو ادب کی تاریخ اور اردو لغات مرتب کرنے کا خیال کیا - ہر زبان کے لیے جو ادبی ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے مستند اور جامع لغات کا ہونا لازم ہے - اس نمونے سے جو یہاں درج کیا جاتا ہے معلوم ہوگا کہ انہوں نے کس انداز پر اس لغات کا ترتیب دینا تجویز کیا تھا - ہر لفظ کے متعلق یہ بتایا ہے کہ وہ اسم ہے یا صفت، ضمیر ہے یا فعل، ظرف زمان ہے یا ظرف مکان، مونث ہے یا مذکر - ہر لفظ کے مختلف معنی اور اُن کے فروق بھی لکھ دیے گئے ہیں - فعل ہے تو یہ بھی بتادیا ہے کہ لازم ہے یا متعدی اور متعدی ہے تو بیک مفعول یا بدو مفعول - لفظ سے جو محاورے بنے ہیں وہ بھی تشریح اور حسب موقع سند کے ساتھ بیان کردیے ہیں - ایک خاص بات یہ ہے جو ہماری متداولہ لغات میں نہیں پائی جاتی کہ لفظ کی تعریف و تشریح بھی کردی ہے - ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اہل لغت مترادفات لکھ دیتے ہیں اور تعریف سے گریز کر جاتے ہیں - البتہ ایک کمی ضرور

پائی جاتی ہے کہ لفظ کے اشتقاق اور اصل سے بحث نہیں کی گئی - یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے ' اصل زبان میں اس کی کیا صورت تھی اور کیا مفہوم تھا اور اردو میں آکر اس کی صورت اور مفہوم میں کیا تغیر ہوا - یہ ایسا مشکل اور تحقیق کا کام ہے کہ اس زمانے میں بھی لغت کی جو کتابیں تالیف ہوئی ہیں وہ بھی اس سے عاری ہیں - حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک شخص کا کام نہیں اس کے لیے ایک جماعت کی متحدہ کوشش درکار ہے] —

الفاظ کے اختصار کے لیے جو حروف مفرد معین کیے گئے ہیں ان کی تشریح



اسم - س	لفظ خطاب - ل خ
مذکر - م	ضمیر متکلم - ض م
مونث - ث	ضمیر حاضر - ض ح
مصدر - مد	ضمیر غائب - ض غ
لازمی - لا	ضمہ اور کسرہ اور واؤ اور یاے معروف } ف
متعدی - مت -	
متعدی ایک مفعول سے زائد - مت مت	ضمہ اور کسرہ اور واؤ اور یاے مجہول } ل
صفت - ص	
مفرد - د	ظرف زمان - ظ ز
جمع -	ظرف مکان - ظ م

الف ۱۱ ب

الف - س - م - پہلا حرف حروف تہجی کا - بمعنی نفی مثلاً اکارت یعنی بیکار - الونا' بےنمک - اکال' * عدم قحط - مگر پچھلے دونوں لفظ بہت کم بولے جاتے ہیں -

آب - س - م - پانی - یعنی ایک رقیق سیال جسم جو بادلوں سے برستا ہے اور دریاؤں اور چشموں اور سوتوں میں اکٹھا ہوتا ہے -

آب دار - س - م } وہ شخص یا وہ عورت
آب داری - س-ث } جس کے ذمہ پینے کے پانی کا انتظام ہو -

آب دار خانہ - س - م - وہ مکان جس میں آب دار پانی رکھتا ہے -

آب خورہ - س - م - ایک خاص صورت کا چھوٹے منہ کا مٹی کا برتن جس سے پانی پیا جاتا ہے اگر اسی صورت کا برتن اور کسی چیز کا ہو تو اس چیز کا نام لینا چاہیے مثلاً - تانبے کا آب خورہ - پیتل کا آب خورہ - چاندی کا آب خورہ -

آب حیات - س - م - (۱) وہ پانی جس کا ذکر کہانیوں میں ہے کہ جس کے پینے کے بعد موت نہیں آتی - (۲) بادشاہوں اور امیروں کے پینے کے پانی کا نام جو نیک فال سمجھ کر لیا جاتا ہے -

آب خاصہ - س - م - خاص بادشاہوں اور امیروں کے پینے کا پانی -

آب حیوان - س - م - آب حیات - (۱) (ذوق)
"جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر تو ہرگز
نہ پیتا آب حیواں ڈوب مرتا آب حیواں میں"

آب شور - س - م - (۱) سمندر (۲) کھاری پانی -

آب شورہ - س - م - (۱) مٹھاس گھول کر لیموں نچوڑا ہوا پانی - (۲) شورہ کا ٹھنڈا کیا ہوا پانی -

آب بقا - س - م - (۱) آب حیوان (ذوق)
"کہانیاں ہیں حکایات خضر و آب بقا
بقا کا ذکر ہی کیا اس جہان فانی میں"
(۲) حیات ابدی جو دوسری زندگی

* اکال کے معنی ہندی میں قحط کے ہیں - اس سے بگڑ کر اردو میں کال ہوگیا ہے - لیکن اکال کے معنی عدم قحط کے نہیں آتے (اڈیٹر) —

ا ا ب

میں ہوتی ہے -

آب پاشی - س م - باغ میں اور کھیتوں میں کنوئیں سے یا نہر یا تالاب سے پانی دینا-

آبی - ص - (۱) جو چیز پانی سے علاقہ رکھے

(۲) پانی کے رنگ کے مانند - یعنی ہلکا نیلا رنگ -

آبی روتی - س - ث - ایک قسم کی خمیری تنوری روتی جس میں صرف پانی پڑا ہو- دودھ اور گھی نہ پڑا ہو -

آب - س - ث - (۱) صفائی اور براقی - مثلاً موتی کی آب -

(۲) رونق و چمک مثلاً - کپڑے کی آب - کھانے کی آب -

(۳) کاٹنے والے ہتیار کے لوہے کی چمک اور سختی اور تیزی مثلاً - تلوار کی آب -

آب دار - ص - (۱) رونق دار مثلاً آب دار سالن- آب دار کپڑا -

(۲) صاف اور براق مثلاً - آب دار موتی -

ا ا ب

(۳) سخت اور تیز مثلاً - آب دار تلوار -

آب داری - س - ث - بمعنی آب - موتی کی ' کپڑے کی ' کھانے کی ' تلوار کی آبداری -

آب کار - س - م - کلال یعنی شراب بنانے یا بیچنے والا -

آب کاری - س - ث - شراب یا اور نشے کی چیزوں کے بیچنے یا بنانے کا پیشہ -

آباد - س - (۱) بسا ہوا - دلی آباد ہے یعنی بسی ہوئی ہے - شہر آباد ہے یعنی بسا ہوا ہے- گھر آباد ہے یعنی بسا ہوا ہے اور اس میں لوگ رہتے ہیں (درد)

"بستے ہیں تیرے سایہ میں سب شیخ وبرہمن
آباد ہے تجھہ سے ہی تو گھر دیر وحرم کا"

(۲) بسا یا ہوا - جب کہ فاعل سے مرکب ہو - مثلاً شاہجہاں آباد - یعنی شاہجہاں کا بسایا ہوا -

(۳) دعائیہ مثلاً آباد رہو - یعنی

ا ا ب

مال و دولت گھر بار اولاد سے بھر
پور رہو - خانہ آباد ، دولت زیادہ -
خانہ آباد - (درد) -
"کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ
خانہ آباد تونے گھر نہ کیا"
آبادی - س ث - (۱) بستی - یعنی وہ
جگہہ جہاں لوگ جمع ہوکر رہتے
ہیں - ج - آبادیاں - آبادیوں
(۲) فعل ایک جگہہ رہنے کا مثلاً -
دلی میں آبادی ہوتی جاتی ہے -
آباد ہونا - صد - لا - بسنا - یعنی ایک
جگہہ جمع ہوکر رہنا -
آباد کرنا - مت - بسانا - آباد کروانا -
مت مت - بسوانا - گھر کا آباد
ہونا - لوگوں کا اس میں رہنا
دل کا آباد ہونا - طمانیت سے ہونا -
باغ کا آباد ہونا - سر سبز و
شاداب ہونا - مسجد کا آباد
ہونا - آراستہ رہنا اور کثرت
سے نمازیوں کا نماز پڑھنے کو آنا -
آب تاب - س - ث - رونق - شان و شوکت -

ا ا ب

محسوس چیزوں پر بھی بولا
جاتا ہے مثلاً - نہایت آب تاب
سے فوج آراستہ ہے - غیر
محسوس پر بھی بولا جاتا ہے
مثلاً - نہایت آب تاب کی
گفتگو کی -
آبرو - س - ث - عزت - حرمت -
یعنی ادب اور تعظیم کے مستحق
ہونے کا خیال -
آبرو ریزی - س - ث - بے عزت کرنا -
یعنی وہ فعل جو ادب اور تعظیم
کے استحقاق کے برخلاف ہو -
آبائی - ص - موروثی - باپ دادا سے
پہنچی ہوئی - مگر بہت کم بولا
جاتا ہے -
آبگینہ - س - م - شیشہ - کانچ کا ظرف جو
ایک خاص صورت پر نہایت باریک
بنایا گیا ہوتا ہے پیٹ بڑا اور
چھوٹا اور گردن پتلی - گفتگو
میں کبھی یہ لفظ نہیں بولا جاتا -
صرف اشعار میں آتا ہے -

ا ا ب

آبلہ - س - م - پھپولا - آدمی کے بدن پر جو گول برجی دار دانہ اٹھہ آتا ہے اور جس میں صرف سفید پانی سا بھرا ہوتا ہے - آبلے - جب کہ فعل لازمی کے ساتھہ ہو مثلاً - آبلے پڑ گئے ' آبلوں - جب کہ مضاف ہو یا فعل متعدی کے ساتھہ ہو مثلاً - آبلوں کا پھوٹنا - (غالب)

" اهل تدبیر کی وا ماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں "

آبنوس - س - م - ایک قسم کا درخت جس کی لکڑی نہایت سیاہ اور وزنی ہوتی ہے -

آبنائے - س - ث - پانی کا گلیارہ - یعنی پانی کا کم عرض رستہ جس سے ایک بڑا سمندر دوسرے بڑے سمندر سے مل جاوے -

آب نے - س - ث - حقہ کی نے جو پانی میں کھڑی رہتی ہے -

آبدست - س - ث - پیخانہ پھرنے کے بعد پانی سے دھونا -

ا ا پ

آپ - ل - ع - (۱) اگر مخاطب بزرگ اور قابل تعظیم و ادب ہو تو اس لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے (غالب)

" بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں کے حال دل اور آپ فرماویں کے کیا "

(۲) اسی لفظ سے مساوی درجہ کے مخاطب کو بلکہ اپنے سے کم درجہ کے مخاطب کو بھی خطاب کیا جاتا ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ جب مخاطب بزرگ اور قابل ادب ہے تو اس کے ساتھہ تعظیم کے اور لفظ بھی بولے جاتے ہیں اور مساوی درجہ اور کم درجہ کے مخاطب کے ساتھہ وہ لفظ نہیں بولے جاتے مثلاً - آپ جو فرماویں وہی ٹھیک ہے - آپ جو کہیں وہی ٹھیک ہے - مساوی درجہ کے ایسے شخصوں میں جن میں دوستی اور ارتباط کم ہے اکثر اسی لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے -

(۳) کبھی کم درجہ کے ایسے مخاطب کو جو اس خطاب کے لایق نہیں ہے بطور طنز کے اس لفظ سے خطاب

ا ا پ

کرتے ھیں۔ کبھی اس خطاب کے لائق مخاطب کو طنزاً اس سے خطاب کیا جاتا ھے اور الفاظ ما بعد اور لہجہ لفظ اس پر دلالت کرتا ھے مثلاً۔ آپ بھی خوب ھیں۔

آپ - س - بمعنی خود - بجائے ذات اور نفس کے بولا جاتا ھے اور تاکید کا فائدہ دیتا ھے - مثلاً - میں آپ جاؤں گا - وہ آپ گیا تھا - تم آپ جاؤ -

آپ ھی آپ } خود بخود - یعنی اپنی ھی
آپ سے آپ } ذات سے بغیر دوسرے سبب کے مثلاً - آپ ھی آپ خفا ھوتے ھو - خدا آپ ھی آپ موجود ھے - یہ کام آپ سے آپ ھوجاوے گا -

آپ میں آنا - ص - ھوش میں آنا -

آپ میں نہ ھونا - ص - ھوش میں نہ ھونا -

(مومن)

" ھم تا سحر آپ میں نہیں تھے
کیا جانے رھے وہ کس کے گھر رات "

آپ میں - حقیقت میں خطاب ھے مگر خاص ایسی حالت میں بولا جاتا ھے جب کہ کسی پورانے دوست کو دفعتاً دیکھیں یا شبہ میں پڑنے کے بعد پہچانیں

(ظفر)

" دیکھ صحرا میں مجھے ازل تو گھبرا یا تھا قیس "
پھر جو پہچانا تو بولا حضرت من آپ ھیں "

آپا - س - بمعنی ذات - نفس - مثلاً - ایسا خفا ھوا کہ آپ * ھی سے نکل پڑا (آھی)

اتنا بڑھ بڑھ کے بات مت کیجے
اپنا آپا سنبھالیئے حضرت

آپا دھاپی - س - ث - اپنے اپنے کام میں یا اپنی اپنی فکر میں بے تحاشا مصروف ھونا اور دوسروں کی سدھ نہ لینا -

آپا - س - ث - بڑی بہن -

آپس - س - (۱) چند شخصوں میں کسی خاص قسم کا علاقہ ھونا برادری کا ' رشتہ داری کا ' محبت کا ' پیشہ کا ' مذھب کا ' کسی ایک رائے اور ایک خیال کے ھونے کا - (۲) بمعنی ایک دوسرے کے جب کہ لفظ میں - کے ساتھ مرکب

* کاتب کی غلطی معلوم ھوتی ھے - آپے ھونا چاھیے (اڈیٹر) -

ھو -(مومن)

" کہہ ہے چھیڑنے کو میرے گر سب ھوں میرے بس میں

لڑا دوں ملنے کسی معشوق اور عاشق کو آپس میں "

آپس داری - بمعنی رشتہ داری - برادری-

آتو - ف - س - ث - وہ عورت جو لڑکیوں کو

پڑھاتی ھے -

آتا - س - م - پسے ہوئے گیہوں . اور اگر

کوئی اور اناج پسا ہوا ھو تو اُس

کا نام بھی لیا جاوے گا مثلاً - جو کا

آتا - چاولوں کا آتا -

آتھہ - س - م - اکائیوں میں کے ایک عدد

کا نام ھے جو چار کا دوگنا اور دو کا

چوگنا ھوتا ھے اور جو صحیح عدد

سات کے بعد آتا ھے -

آتھہ - ص - جب کہ اپنے معدود کے ساتھہ

مرکب ھو اور اس کی تعداد بتاوے

مثلاً - آتھہ مرد - آتھہ عورتیں -

آتھہ روپئے -

آتھواں - ص - م - } (۱) صفت اس
آتھویں - ف - ص - ث } معدود کی جس

سے یہ عدد پورا ھوتا ھے اور جو سات

کے بعد آتا ھے مثلاً - آتھواں گھوڑا

یعنی وہ گھوڑا جو سات گھوڑوں کے

بعد ھے -

(۲) درجہ - مرتبہ - خواہ باعتبار

ترقی کے ھو خواہ باعتبار تنزل کے

مثلاً - فلاں شخص امتحان میں

آتھواں رہا -

آتھویں - ل - ص - م - بمعنی آتھواں جب

کہ اپنے موصوف کے ساتھہ ھو مثلاً -

آتھویں دن آنا - آتھویں درجہ

پر منتخب ھوا -

آتھوں - ص - آتھہ کے ہر ایک معدود کا

کسی صفت میں شامل ھونا مثلاً -

آتھوں نے مارا - یعنی ہر شخص

ان آتھہ میں کا مارنے میں

شریک تھا -

آتھواں حصہ - س - م - کسی چیز کا ایک

حصہ جب کہ اس کو آتھہ

برابر حصوں میں تقسیم

کیا ھو - ایک کو جو آتھہ

پر تقسیم کیا جاوے اس کا

خارج قسمت -

آتھہ آتھہ آنسو رونا - صد - لا - بہت رونا -

اا ٹ   اا ث   اا ج   اا ح   اا خ

آٹھ آٹھ آنسو رولوانا - صد - مت - (۱) بہت سا رولوانا - (۲) ایسی تکلیف اور رنج پہونچانا جو بہت سے رونے کا باعث ہو -

آٹھوں گانٹھ کمیت - ص - ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مطلب میں نہایت ہوشیار ہو - اور جس طرح بنے اپنا مطلب نکال لے اور اس کو ہاتھ سے نہ جانے دے -

آثار - س - م - ج - نشانیاں - علامتیں -

آثار - س - م - د - بنیاد کا یا دیوار کا عرض -

آج - س - م - د - وہ دن جو کہ موجود ہے (درد)

محتسب آج تو میخانہ میں تیرے ہاتھوں
کون سا دل ہے کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا "

آج کل کرنا }
آج کل بتانا } صد - لا - امروز فردا کرنا یعنی کسی وعدہ کے پورا کرنے کو ٹالنا -

آج کل - ظ - ز - (۱) قریب زمانہ گزرا ہوا یا آئندہ - جب کہ اس لفظ کا ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو ان دونوں لفظوں میں واؤ کبھی نہیں آتی -

(۲) جلدی - یعنی تھوڑے دن اور بحذف حرف عطف یا حرف تردید کے بمعنی آج اور کل کے بولنا غلط ہے -

آحاد - س - م - ج - بمعنی اکائیاں - دس سے کم صحیح عددوں کا نام

آخر - س - م - د - وہ جو سب کے بعد ہو خواہ زمانہ میں اور خواہ ترتیب میں اور معقول ہو یا محسوس -

آخرش }
آخر کار } س - م - د - بمعنی آخر - مگر اس کا استعمال صرف معقولات پر ہے -

آخری وقت - س - م - د - وہ وقت کہ جب موت بہت قریب ہو -

آخرت - س - ث - د - قیامت یعنی وہ دن جو اس دنیا کے فنا

ا ا غ

ہونے کے بعد ہوگا اور جس میں
لوگوں سے ان کے اعمال کا
حساب لیا جاوے گا -

آخور - س - ث - د - وہ کوڑا کرکٹ
اور ناقص گھاس جو گھوڑوں
کے اگاڑی ' پچھاڑی میں جمع
ہو جاتی ہے -

آخور کی بھرتی - س - ث - د - ہر چیز جو
ناقص اور ناکارہ ہو -

آداب - س - م - ج - (۱) وہ طریقہ
جس سے دوسروں کی بڑائی
ظاہر کی جاتی ہے -
(۲) کسی کام کے کرنے کے طریقے
جیسے نماز کے آداب - کھانے
کے آداب -

آداب - س - م - د - (۱) ہر بات کو
سلیقہ سے اور اچھی طرح کرنا (ذوق)
"میں نہ تڑپا جو دم ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مد نظر عشق کا آداب مجھے"
(۲) وہ فعل جو کسی بڑے کو
دیکھتے ہی کیا جاتا ہے جیسے
سلام یا مجرا - اور جب کہ کسی

ا ا د

بڑے کے سامنے زبان سے یہ لفظ
کہا جاتا ہے تو گویا اُس کو مطلع
کیا جاتا ہے کہ میں آپ کی تعظیم
ادا کرتا ہوں اور بجائے سلام
کے بھی مستعمل ہوتا ہے -

آداب بجالانا - ص - د - لا - یعنی وہ فعل کرنا
جس سے اس شخص کی جو
مستحق تعظیم کا ہے تعظیم
ادا ہوتی ہے - مغلیہ سلطنت
میں جب بادشاہ کے سامنے
کوئی حاضر ہوتا تھا تو
چوبدار نہایت خوش
آوازی سے پکارتا تھا آداب
بجالاؤ جہاں پناہ بادشاہ
سلامت ' عالم پناہ بادشاہ
سلامت - پہلے جملے سے یہ
مراد ہے کہ وہ فعل کرو جس
سے تعظیم ادا ہوتی ہے اور
باقی جملے دعائیہ ہیں -

آدم - س - م - د - اس انسان کا نام
ہے جو سب سے اول پیدا ہوا اور
جس کی ہم سب اولاد ہیں -

اا د

آدم زاد- س - م د - بمعنی انسان -
آدمی - س - م - د - بمعنی انسان یعنی
آدم کی اولاد - ج - آدمی -
فعل لازمی کے ساتھ - ج - آدمیوں
فعل متعدی کے ساتھ - مثلاً دس
آدمی آے- دس آدمیوں نے مارا-
آدمیت - ص - ث - د - وہ نیک اخلاق
اور عادات جو انسان میں سب
سے اعلیٰ مخلوق ہونے کے سبب
سے اس میں ہونے چاہئیں -
آدھا- ص- م } دو برابر حصوں میں کا
آدھی- ص- ث } ایک مثلاً آدھا دن- آدھی
رات - آدھا کپڑا - آدھی
روٹی - اور حالت ترکیب
میں پہلے الف کی مد اور
آخر کا الف بولا نہیں جاتا
جیسے کہ ادہ کچرا -
آدھوں آدہ - ص - برابر کے دو حصے -
آدھا سیسی - س - م - سر کا ایک مرض
ہے جس کے سبب سے آدھے
سر میں درد ہوتا ہے جس

اا ر

کو درد شقیقہ کہتے ہیں -
آر - س - م - د - آریں - ج - بیلوں
کے ہانکنے کا ایک آلہ ہے جو ایک
پتلی گول لکڑی یا چھڑی میں لوہے
کی نوک کانٹے کی صورت کی
لگا لیتے ہیں اور چلنے کے لیے بیل
کے پٹھے میں یا دم کے پاس چبھوتے ہیں -
آراستگی } صد - لا - کسی چیز کا اپنے
آراستہ ہونا } ضروری لوازمات سے مہیا ہونا-
آراستہ - ص - کوئی چیز جو اپنے ضروری
لوازمات سے مرتب ہو-
گھوڑا ' باغ ' مکان ' آراستہ ہے
آراستہ کرنا - صد - مت - کسی چیز کے
ضروری لوازمات کا مہیا
کرنا ' مکان کو ' باغ کو '
گھوڑے کو دل کو آراستہ کرو -
آرام - س - م - د - (۱) ایسی حالت
جس میں کچھ تکلیف روحانی
یا جسمانی نہ ہو - (آفتاب)
"عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے"

ا ر	ا ز

(مہر) "ہوتا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا مہر
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو"
(۲) نیند - آرام میں ہیں - یعنی
سوتے ہیں - (مہر) -
"عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا"
(۳) بیماری سے اچھے ہونے کی یا
اس میں تخفیف ہونے کی حالت -
اب تو آرام ہے یعنی بیماری میں
تخفیف ہے - اب آرام ہے یعنی صحت ہے -
آرام گاہ - س - م - د - امیروں کے سونے
کی جگہہ -
آرایش - س - ث - (۱) کسی چیز کے
اپنے ضروری لوازمات سے آراستہ
ہونے کی حالت -
(۲) اسباب اور سامان آرایش -
(۳) کاغذ کے پھولوں کے تختے
اور پہاڑ اور چمن اور درخت
اور روشنی کے کنول وغیرہ جو
ساچق اور برات میں ساتھہ
لے کر چلتے ہیں -
آرزو - س - ث - دل کی خواہش کسی
چیز کے ہونے یا نہ ہونے کی جس کا
ہونا یا نہ ہونا مشکل ہو یا اختیار
میں نہ ہو (درد) -
"ہم تجھہ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھہ آرزو کریں"
آرزو کرنا - صد - لا } کسی چیز کی
آرزو کروانا - صد - مت } خواهش کرنا یا
خواهش کروانا -
آرسی - س - ث - د - آرسیاں - ج -
بحالت مبتدا ہونے یا موصوف
ہونے کے - آرسیوں - ج - اضافت
کی حالت میں - کانچ کا بنا ہوا
گول یا مستطیل چھوٹا سا پرکالہ
جس میں منہ دیکھتے ہیں اور
جس کے ایک طرف پارہ کی
قلعی ہوتی ہے اور جس کو کسی
چیز کے چوکھٹے میں جڑ دیتے ہیں
اور گول پرکالہ کو اس طرح
چاندی یا سونے میں لگاتے ہیں
کہ ہاتھہ کے انگوٹھے میں بطور
انگوٹھی کے پہنا جاوے -
آرسی مصحف - س - م - ہندوستان کے
مسلمانوں کی بیوقوفی

ا ا ر ا ا ر

کی ایک رسم ھے کہ جب
نکاح ھو چکتا ھے اور دولہہ
اِس مکان میں جاتا ھے
جہاں دولہن ھوتی ھے
تو اول دولہہ اور دولہن
کے سر پر ایک لال کپڑا
ڈال کر اور دونوں کے
سر ملا کر ان کے سامنے
قران میں سے سورۂ اخلاص
کھول کر رکھتے ھیں اور
ایک آرسی رکھتے ھیں
تا کہ دولہہ اور دولہن
اول سورۂ اخلاص کو
ایک ساتھہ دیکھیں اور
پھر اسی وقت ایک ساتھہ
آئینہ میں دولہہ اپنی اور



سوویت روس کا ادب

از

جناب اختر حسین صاحب رائے پوری - بی - اے آنرز (علیگ)- ساھتیا النکار

روسی ادب کی خصوصیات | قبل از انقلاب کے روسی ادب کی کئی خصوصیات اس قدر نمایاں ھیں کہ اس کے موجودہ دور کی تہ پانے کے لیے ان پر ایک نظر ڈالنا ضروری ھے —

سب سے زیادہ توجہ کش وہ حقیقت پسندی ھے جو پشکن سے لے کر گورکی تک ھر ادیب پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئی ھے - اور وہ بھی ایک متفکرانہ سنجیدگی کا پہلو لیے ھوے جس میں مزاح و تفریح کی کوئی گنجائش نہیں ھے - سماجی ماحول کے متعلق ایک ناقدانہ انداز ھے جس کی تلخی کم کرنے کے لیے کہیں ایک زیر لب تبسم بھی نظر نہ آے گا - اور اگر 'گوگول' کبھی ھنستا بھی ھے تو اس کی ھر مسکراھٹ کے پیچھے آنسو کی ایک بوند چھلک آتی ھے —

بعد ازاں جو چیز قابل توجہ ھے وہ روسی ادب کی عالمگیری شان ھے - اس کا پیغام کسی ایک ملک یا کسی ایک طبقے کے لیے نہیں ھے اور نہ اس میں کسی قسم کا ملکی یا ملی تعصب ھے - روسی ادب وسیع النظر اور تاثیر پذیر ھے - انسانیت کے دکھ درد کو وہ زمان و مکان سے بالاتر ھوکر دیکھتا ھے - اور بڑی غیر جانب داری سے اس کا حال سناتا ھے - وہ کشادہ دل اور

عالی ظرف ہے اور انسان کی کم زوریوں کو حقارت سے نہیں دیکھتا - اس کی ہم سایہ زبانوں کے ادب میں عموماً جو ایک اوچھا پن اور تنگ نظری ملے گی ' روسی ادب اس سے قطعاً معرا ہے - انگریزی زبان کے نامور ادیب مثلاً تھیکرے' الیٹ یا گالسورذی اپنی شخصیت کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتے اور اس وجہ سے باہر انہیں کوئی نہیں پوچھتا - اس کے برعکس طالسطائی یا دستو ویسکی سے جو زبانیں بے بہرہ ہیں وہ غیر ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں —

روسی ادب کی عمر زیادہ نہیں ہے' اس لیے اس میں خود اطمینانی یا بے حسی کے آثار نہیں ملیں گے - بلا کا حساس ہوتے ہوے بھی وہ حد درجہ منکسر ہے - اور یہی خوبی اس کی عالی ظرفی کو بر قرار رکھتی ہے - تجسس و تلاش کا شوق کم نہیں ہوتا اور فرد یا جمعیت کو سمجھنے کی کوشش میں وہی سرگرمی باقی رہتی ہے —

روسی ادب کی عورت اپنی یورپین بہنوں سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے - اس میں ایک قوت عمل ہے جو بسا اوقات مرد کو بھی نصیب نہیں ہوتی - خواہ سماج کا ماحول اس ذوق عمل کو گمراہی کی طرف لے جاے بہ ایں ہمہ عورت بذات خود ایک شخصیت رکھتی ہے اور نیکی یا بدی میں مرد کی رہنمائی کرتی ہے —

روسی ادب کا مرد قوت عمل اور قوت فیصلہ سے بڑی حد تک عاری ہے - ہر ناول اور افسانے میں وہی ایک کردار نظر آے گا جو حقیقت کی بے سود تلاش کے بعد رستے میں پانو توڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور روسی ادب بجاے اس کے کہ "ہم کیا کریں" کا جواب دے بجاے خود معمہ بن کر ناظر سے بھی سوال کرنے لگتا ہے! روسی ادب میں "ہم کیا کریں" کے مسئلے نے جو اہمیت حاصل کرلی تھی اس کا ثبوت اس امر سے ملے گا کہ یکے بعد دیگرے کئی شخصوں نے اسی عنوان سے

کتابیں لکھہ کر کوئی نہ کوئی حل پیش کرنے کی کوشش کی - تر جنیف؛ دستوئیسکی؛ گورکی وغیرہ سب اس پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر میں ان کا ہر ہیرو ماحول سے سر ٹکرا کر یہی دوامی سوال کرتا ہوا خود کشی کر لیتا ہے یا تارک الدنیا ہوجاتا ہے - روسی کردار کا یہ جیس بیس صرف تاریخ روس کے پس منظر سے سمجھہ میں آسکتا ہے - زار اور اس کا سامنتی نظام مغربی و ملکی سرمایہ داری کے بھنور میں پھنس کر پوچھہ رہا تھا کہ ہم کیا کریں اور روسی ادب اس کش مکش سے نکلنے کی کوئی راہ تلاش کر رہا تھا - انقلاب روس اسی سوال کا جواب تھا —

روسی کردار کے اس نکمے پن کو زیادہ مضحکہ خیز بنانے والی چیز اس کی بحث پسندی ہے - علم دوست طبقے (Intelligentsia) کا فرد بے اطمینانی کی حالت میں بڑا چرب زبان ہوجاتا ہے اور ترجنیف · دستوئیسکی یا گورکی کے کردار ہمیشہ دھنوا دھار تقریریں کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جن کا قصے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - گپ بازی کا یہ شوق اتنا عام تھا کہ ترجنیف جب بیلنسکی سے ملا تو دونوں متواتر چھہ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور جب اُنہیں یاد دلایا گیا کہ کھانے کا وقت گزر رہا ہے تو بیلنسکی نے متحیر ہوکر کہا کہ "بھئی واہ ابھی ہم نے یہ بھی طے نہیں کیا کہ خدا ہے یا نہیں ہے اور کھانے کا وقت ہوگیا ! " - نہلزم اسی بے کاری اور گپ بازی کا سیاسی اظہار تھا —

روسی ادب کی آخری اور نہایت اہم خصوصیت اس کا حزن و یاس ہے - منزل کی تلاش میں اسے جس ناکامی اور محرومی کا سامنا کرنا پڑا اس کا رد عمل حسرت و حرماں کی صورت میں آشکار ہوتا ہے - کسی زبان کے ادب میں غم و اندوہ کی یہ گہرائیاں نہ ملیں گی اور یہی روسی ادب کی جان ہے - لیکن جب قصہ ختم ہوتا ہے تو کوئی تکان محسوس نہیں ہوتی - یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اندھیرا ہے

اور منزل تو منزل راہ کا بھی نشان نہیں ملتا' لیکن ذوق تجسس باقی رہتا ہے —

بیسویں صدی کے آغاز کی ادبی تحریکیں

بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے کلاسکل حقیقت پسندی کا زوال شروع ہوچکا تھا اور جو جدید حقیقت پسندی اس کی جگہہ لے رہی تھی اس میں چیخوف کی اثر پرستی (Impressionism) اور گورکی کی رومانیت نے ایک نئی بات پیدا کردی تھی - اس دور کی ادبی تحریکوں میں یہ نیم رومانی‌نیم اثر پرست حقیقت نگاری اور اشاریت (Sy-mb-olism) سب سے زیادہ اہم ہیں - نہلسٹ جماعت کی پسپائی' سامنتی نظام کے انتشار اور حرفتی فلسفۂ زندگی کے مقابلے میں زمین داری زاویۂ نگاہ کے دیوالیہ پن کے ردعمل کا یہ نتیجہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ تصوف اور باطنیت کو مقبولیت حاصل ہو اور ادب میں موجودیات سے چشم پوشی برتنے کا رجحان پیدا ہوجاے - رفتہ رفتہ اس نے فلسفۂ زندگی کی شکل اختیار کرلی اور سنہ ۱۸۹۰ ع سے ۱۹۱۰ ع تک یہ رجحان ادب پر غالب رہا - زبان کی صفائی' بیان کی ندرت' طالسطائی کی واقعیاتی تفصیلات کی جگہہ دستوویسکی کی داخلی منظر کشی اور ایک ایک لفظ میں کئی کئی معنی پیدا کرنے کی کوششیں بنظر استحسان دیکھی جانے لگیں - انقلاب روس کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا اور اس کی ہنگامہ آرائیوں سے بچنے کے لیے اشاریاتی ادیب اغلاق و ابہام کی فضا پیدا کر رہا تھا - نثر میں آندرے بیلی' اینڈریف اور سولوگب اور نظم میں الیکزینڈر بلوک اسی جمالیاتی اور صوفیانہ رجحان کی ترجمانی کر رہے تھے - ان کے کرداروں کی بے راہ روی اور حزنیت زیادہ بڑھ گئی ہے' ماحول نے ان کی انفرادیت کو سلب کرلیا ہے اور ان کی بیچارگی کسی طرح ختم نہیں ہوتی - تاہم اشاریت نے نئے نئے اسالیب بیان پیدا کیے' طرز نگارش کو کلاسکل تکلفات کے بندھنوں سے آزاد کیا اور فی‌الجملہ ادب کے قالب کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا —

چیخوف اور گورکی کی قیادت میں حقیقت پسندی اشاریت کے اشراف پسندانہ میلانات کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی - لیکن چیخوف، کپرن اور بونن وغیرہ کی جد و جہد صرف پس منظر اور پیرایۂ بیان تک محدود ہے - اب بھی وہ سماج کے مظلوم طبقوں کی حالت کا مرقع پیش کرتے ہیں لیکن ان میں سے گورکی کے سوا کوئی کسی روشن مستقبل کا خواب نہیں دیکھتا - سب کے کردار اندھے ہیں اور ایک اندھیری دنیا میں بھٹکتے پھر رہے ہیں - صرف ایک گورکی کا نظریۂ حیات رجائیت پرورانہ ہے اور اس کے آوارہ کردار انسانیت کی نجات کو قرین قیاس سمجھتے ہیں - حقیقت نگاروں میں بھی اکثر اشاریاتی طرز انشاء سے بے حد متاثر ہیں اور زمیاتن، الکسی طالسطائی وغیرہ کی تحریروں میں یہ اثرات بہت نمایاں ہیں۔

بہ ایں ہمہ سنہ ۱۹۰۵ ع کے ناکام انقلاب کے بعد کچھ عرصے تک اشاریت اور حزنیت کا زور بہت بڑھ گیا اور اس کا مشاہدہ ہم اس امر سے کر سکتے ہیں کہ گورکی اب اتنا مقبول نہیں رہا جتنا اس واقعے سے پہلے تھا ۔

یہ رد عمل انقلابی اثرات کے فروغ کے ساتھ کم ہوتا گیا اور سنہ ۱۱ یا ۱۲ ع کے بعد ایک مرتبہ پھر ادب کے روح و قالب کو لغوی بندھنوں سے آزاد کرنے کی تحریک زور پکڑنے لگی - ادب اور زندگی کو وابستہ کرنے کی کوششوں کے ساتھ اشاریت کے رجحانات کے خلاف صدائیں بلند ہونے لگیں - استقبالیت (Futurism) کے علم برداروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ انسان جس طرح نہ ماضی کے لیے زندہ ہے اور نہ حال کے لیے اسی طرح ادب کو بھی مستقبل کا جویا اور پیامبر ہونا چاہیے - اور چونکہ جدید کی آواز کو سننے اور سمجھنے کے لیے قدامت کے نشانوں کو یکسر مٹا دینا ضروری ہے لہذا ادب کے مضامین کو ہی نہیں بلکہ اسالیب کو بھی یک قلم تبدیل کر دینا چاہیے - چنانچہ میکو ویسکی کی سرکردگی میں استقبالیت

پرستوں نے کلاسکل اور اشاریاتی طرز کی مخالفت بڑے شد و مد سے شروع کر دی۔ میکو ویسکی کی عجیب و غریب بندشوں اور بعید از فہم جدت طرازیوں نے ادبی حلقوں کو حیرانی میں ڈال دیا - وہ اور اُس کی پیروی میں اُس کے چیلے یہ کہنے لگے کہ صرف و نحو ایک طائفہ ہے اور 'فعل' اس کا بہلت ماسٹر ہے - اگر فعل کا استعمال نہ کیا جائے تو یہ طائفہ درہم برہم ہوجائے گا - چنانچہ وہ ایسی زبان میں نظمیں کہنے لگا جنھیں پڑھ کر لینن نے کہا کہ " باوجود صد کوشش میں تین سطروں سے زیادہ نہ پڑھ سکا اور اس دوران میں بھی برابر اونگھتا رہا " - اس کے باوجود استقبالیت زندگی کے دوش بہ دوش چلنے کی آرزومند تھی اور روسی ادب کی رو کو بدل دینے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے —

ادھر انقلاب کی آہٹ سنائی دینےلگی تھی اور کلی اشاریت پرستوں اور اکثر استقبالی و موجودیاتی ادیبوں کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ عنقریب زندگی کے ہر شعبےکی طرح ادب بھی دو متضاد حصوں میں تقسیم ہوجائےگا اور انھیں انقلاب پروروں یا انقلاب دشمنوں میں سے کسی ایک کا ساتھ لازمی طور پر دینا ہوگا —

سوویت ادب کا پہلا دور — سنہ ۱۷ ع سے سنہ ۲۱ ع تک

بولشیوکوں کے ہاتھ میں عنان حکومت آتے ہی اکثر ادیبوں نے روس کو خیرباد کہا جن میں کپرن بونن اور اوز بیلوشوف جیسے نامور اہل قلم تھے - سولوگب اور میلق لستیوم نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور اپنے تاریک گوشوں میں حسن و حقیقت کی گتھیاں سلجھاتے رہے - اشاریاتی ادبا میں بلوک اور بیلی نے ایک خاص روحانی شان کے ساتھ جس میں قومیت کو بھی کچھ دخل تھا انقلاب کا خیر مقدم کیا - پرانے حقیقت نگاروں میں گورکی' الکسی طالسطائی' رمیاتن ' الیا ایرن برگ نیز استقبالیت پسند طبقہ میکو ویسکی اور پازنین کی

رہنمائی میں جدید نظام کی تائید پر آمادہ ہوگیا —

اس دور کو ہم دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں - نئی مالی پالیسی (Nep) کے پہلے کے چار سال انتہائی آلام و مصایب میں گزرے - بولشیوکوں کو انقلاب دشمنوں کے نرغے کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی تمام تر توجہات خانہ جنگی اور بیرونی دست اندازی کی طرف مبذول رہیں - متواتر چار سال تک عوام کو قحط ' فاقے اور وباؤں سے دو چار ہونا پڑا - تقریباً تمام ادبی رسائل اور چھاپے خانے بند ہوگئے اور علمی و ادبی زندگی کو ایک وقتہ موت کا مقابلہ کرنا پڑا - کتابوں کی اشاعت یک لخت بند ہوگئی اور مصنفوں کے لیے بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا - گورکی کے دست کرم کے باوجود انہیں مہینوں ایک چھٹانک آٹے پر گزر کرنا پڑا - تاہم ' انقلاب نے ادب کے لیے نئے امکانات پیدا کر دیے تھے - پرانی تہذیب کی عفونت میں ادب کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ ایک عرصے سے بیچارگی کی حالت میں انسانیت کو خود کشی کی راہ پر چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا - اب وہ لوگ بھی جو اصولاً مادیت کے مخالف تھے ' انقلاب کے حواریوں میں اس خیال سے شامل ہوگئے کہ انسان اپنی انفرادیت کو ماحول کی غلامی سے نجات دلا سکے گا - فرد و جماعت کی کش مکش کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کے اتحاد سے زندگی مکمل ہوتی جائے گی - روح پروروں کو اس میں دست غیب دکھائی دیا اور قوم پرست پیشین گوئی کرنے لگے کہ روس بنی نوع انسان کا نجات دہندہ اور ' مسیحا ' ہوگا - حکومت نے انقلاب دشمنوں کی حمایت کے علاوہ ہر ادبی تحریک سے رواداری کا رویہ اختیار کیا - اسی وجہ سے ناقابل برداشت مادی تکالیف سے بے پروا ہوکر ادیب اور شاعر اپنے جذبات کا اظہار آزادی سے کرنے لگے - اشاعت کا اور کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ سب چائے خانوں اور میکدوں میں جمع ہوکر اپنے ادبی کارناموں سے ایک دوسرے کو محظوظ

کرتے تھے اور ان کے مداح پوسٹروں میں انہیں لکھہ کر چوراھوں اور پلوں پر چسپاں کر دیا کرتے تھے —

نظم انقلاب کی حمایت میں سب سے پہلی آواز الیکزینڈر بلوک نے بلند کی جو اشاریت پسندوں کا قاید تھا - اس کی نظم " ۱۲ " (Twelve) نے قدیم و جدید کے درمیان ایک وسیلہ قایم کردیا - اس کا موضوع یہ ہے کہ سرخ فوج کے ۱۲ سپاھی آزادی سے لوٹ مار کرتے پھر رہے ھیں - وہ سب ایک روشن اور بہتر مستقبل کے جویا ھیں اور اس کے لیے سب کچھہ قربان کر سکتے ھیں - اس طرح بلوک نے عیسیٰ کے ۱۲ حواریوں کو مجازاً ۱۲ سپاھیوں کی شکل میں پیش کیا تھا جو انقلاب یا 'مسیحا' کی سرکردگی میں دنیا کو سرمایہ داری کی ناپاکیوں سے نجات دلا رہے ھیں —

بلوک کا نظریہ یہ تھا کہ مسیحا کی آمد کے پہلے بدامنی اور طوائف الملوکی کا ھونا ناگزیر ہے اور دنیا کو خوش ھونا چاھیے کہ یہی اس کی نجات کے آثار ھیں - وہ ترنم ' طنز اور رومان کا استاد تھا اور اس کی انقلابی نظموں میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ھیں اور زور بیان نے ان میں بڑی تاثیر پیدا کردی ہے - وہ سنہ ۱۸۸۰ ع میں پیدا ھوا اور ۴۱ سال کی عمر میں اس دنیا سے سدھارا - چار سال کے دوران میں اس نے " ۱۲ " کے علاوہ صرف ایک طویل نظم لکھی جس کا عنوان Scythians ہے - یہ دونوں نظمیں بیحد مقبول ھوئیں اور غیر متعصب انقلابی اسے ادب جدید کی تحریک کا علمبردار ماننے لگے - " ۱۲ " کے ایک بند کا ترجمہ یہاں دیا جاتا ہے —

" جچی تلی رفتار کے ساتھہ وہ آگے بڑھتے جاتے ھیں
کون چھپا ھوا ہے وھاں ؟ خیر چاھتا ہے تو باھر نکل آ !
یہ ھوا ہے جو سرخ پھریرے کو اس طوفانی مد و جزر میں سر

بتلاتے ہوئے ہے —

روح کو منجمد کر دینے والی برفانی آندھیوں کا مقابلہ کرتا ہے —

کون چھپا ہوا ہے وہاں ؟ قریب آ ! ایک بھوکی اور بھیگی بلی کا نہتی ہوئی نکل کر عقب میں شامل ہو گئی —

او بھیگی بلی ، قدم تیز کر ! ورنہ یہ سنگین تجھے گیند کی طرح اچھال دیگی —

دنیائے قدیم اور بھیگی بلیو ، جلد چلو ورنہ یہ دُرّہ تمہارے لیے تیار ہے —

تر ، تر ، تر ! وہ صدائے بازگشت ہوا میں پھیل گئی جسے سن کر خاک بسر مکانات چونک پڑتے ہیں اور برف کے وسیع ہیولے پر طوفان رقص کرنے لگتا ہے " !

بعد از انقلاب کی روسی شاعری پر بلوک کے بعد گمیلیف (Gumilev) کا سب سے زیادہ اثر پڑا جو حقیقت نگاری کو ہر قسم کی رومانیت سے پاک کرنا چاہتا تھا خواہ وہ اشاریاتی ہو یا انقلابی - جذبات کی شدت ، بیان کی شگفتگی اور منظر کشی کی وضاحت میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا - گمیلیف صنعت کا بڑا قایل تھا اور اس نے ایک ادارۂ اصلاحیہ قایم کر رکھا تھا جہاں وہ نو آموز شاعروں کو درس دیا کرتا تھا - شوکت الفاظ کے علاوہ گمیلیف جس خصوصیت کا حامل ہے وہ روسی شاعری میں تنہا اسی کا حصہ ہے - اس میں جاں بازی اور مردانگی کا ایک خاص جذبہ ہے - وہ شاعری میں ہی نہیں زندگی میں بھی جوکھم کا جویا رہا اور بالآخر ۳۵ سال کی عمر میں کسی رجعت پرورانہ سازش کی شرکت کے الزام میں قتل کر دیا گیا - یہ امر صرف اس لیے افسوس ناک نہیں کہ اس وقت اس کے شاعرانہ کمالات اوج پر تھے اور وہ ' پرولیٹیرین ' شاعری کے ارتقا میں بڑی مدد پہنچا رہا تھا - بلکہ اس لیے کہ یہ الزام سراسر بہتان تھا - گمیلیف نے اپنی کئی نظموں میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے وہ پر سکون موت ہرگز نصیب نہ ہو جو

وصیت نویس اور ڈاکٹر کی موجودگی میں آتی ہے " - اس کی تمنا بر آئی اور یہ کہتا ہوا مر گیا :

" میں نے جو کچھہ حاصل کیا اور جو آرزوئیں ابھی تشنۂ تکمیل ہیں نیز اپنی ہر خوشی ' ہر غم اور ہر حماقت کا خمیازہ میں ایک قطعی اور آخری موت کی صورت میں ادا کروں گا اور یہی ہر انسان کی شان ہونی چاہیے " ـــ

یہاں ہم تخیل پرور (Imaginist) یزنین کا ذکر کر سکتے ہیں جو اپنی آوارہ گردی اور آزاد منشی کے لحاظ سے اپنے تمام ہم عصروں سے مختلف ہے - وہ دیہاتی شاعری کی تمام خصوصیات کا حامل تھا - اس کے پیش نظر دیہاتوں کی وہ خود اطمینانی تھی جو حرفت کے رواج کے ساتھہ ختم ہو رہی تھی - یزنین کی بے راہ روی میں ایک طفلانہ معصومیت تھی جس کی وجہ سے وہ عوام میں بہت مقبول تھا - لوگ اسے " آوارہ شاعر " کے نام سے یاد کرتے تھے اور جب ہر شاعر سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ انقلاب اور مزدوروں کی حمایت میں قصیدے لکھے تو اس وقت ڈاکوؤں اور طوائفوں کے علاوہ کوئی اس کا دادرس نہ تھا - ماحول اور شخصیت کی کش مکش اس کے لیے جان لیوا ہو گئی اور اس نے ۳۰ سال کی عمر میں پھانسی لگا کر خود کشی کرلی - روسی ادب کے لیے یہ سانحہ بڑا ہنگامہ خیز تھا - یزنین کی حرماں پسندی پر سب نے بیک آواز نفرین کی - اس حادثے کے نفسیاتی پہلو کو صرف ٹراٹسکی سمجھا - اس نے لکھا کہ " ہمارے عہد کو عشق و عاشقی سے کوئی مناسبت نہیں - یزنین بلند ۂ عشق تھا ' نرم دل تھا اور طالب دوست تھا - لیکن انقلاب ' تباہی اور غارتگری کا پیامبر ہے - اسی تضاد نے اس نوجوان شاعر کی شمع زندگانی گل کر دی " - یزنین انقلاب کے دوش بدوش چلنے کی سعی کرتا تھا کیونکہ تخیل پروروں کا گروہ ایک داخلی ضبط کے ساتھہ ہمیشہ سماجی انقلاب کا موید رہا تھا - چنانچہ اپنی ایک نظم میں وہ کہتا ہے :

"مجھے سب کچھ منظور ہے — میں ہر چیز کو اسی صورت میں قبول کرتا ہوں۔ میں اس نئی راہ پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں اپنی روح کو اکتوبر کے انقلاب کے سپرد کرتا ہوں — صرف اپنی پیاری بانسری میں کسی کو نہ دوں گا" -

آٹھ سال کی جد و جہد کے بعد بھی وہ اس نئی راہ پر نہ چل سکا ' انقلاب اس کی بانسری کے بھی در پئے ہوگیا اور وہ یہ کہتا ہوا مرگیا :

" وہ کون سی منحوس ساعت تھی ' جب میں نے اپنے گیتوں میں کہا تھا کہ میں عوام کا دوست ہوں؟ نہیں اب میری شاعری کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اچھا ہو کہ اب یہ مجھے رخصت دے دیں کیونکہ میری زندگی کا بھی کوئی مصرف نہیں -

نو جوانو ' پھولو پھلو کہ تم ایک نئی زندگی کا ترانہ سناؤ گے اور ایک نئی طرز ایجاد کرو گے - یہ صرف میرا نصیب ہے کہ میری روح تن تنہا اس نا معلوم ملک کا سفر کرے گی — وہ روح ہمیشہ کے لیے پامال ہو چکی" —

سرکاری نقادوں کی ملامت یزنین کے سر سے قبول عام کا سہرا نہ اتار سکی کیوں کہ وہ سیدھے سادے الفاظ میں انسان کے مصائب کا دکھڑا سنا دیتا ہے - استقبالیوں کی شوریدگی اور اشاریت پسندوں کی ویراں طلبی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی —

ان لوگوں سے زیادہ استقبالیت کے سر گروہ میکوویسکی نے جدید روسی شاعری کو متاثر کیا - اشاریاتی تحریک نے عروض و بیان کو بدلنے کی جو کاوشیں کی تھیں میکوویسکی اور اس کے رفیقوں نے اسے انتہا کو پہنچا دیا - " ادب کی فوجوں کے نام —٬ فرمان نمبر (۱) " نامی نظم میں اس نے استقبالیت سے مطالبہ کیا کہ " کلاسک ' جمالیات ' حسن و عشق اور جملہ سرمایہ دارانہ رجحانات کے خلاف بغاوت کی جائے اور بحر و قوافی پر تھوک دیا جائے - شاعری کو انقلاب کا نقارچی ہونا چاہیے - سڑک ہماری کونچی ہے اور چوراہا ہماری دفتی! مشین' کان اور

شہروں کے شور و غوغا سے ہمیں ترنم کا درس لینا چاہیے!" چنانچہ ان لوگوں کی قدامت دشمنی جنون کی حد تو پہنچ گئی۔ اور وہ قدیم رسومات کا مضحکہ اڑانے کی فکر میں رہنے لگے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ وہ شریفوں کو چڑھانے کے لیے اپنے چہروں کو رنگ کر سر عام گھوما کرتے تھے! استقبالی شاعری گویا منظوم پوسٹر بازی تھی اور مکوویسکی ایک خطیب تھا جو ڈراونے اور بھیانک الفاظ کے استعمال سے خاص حظ حاصل کرتا تھا۔ دہریت اور انقلاب کی حمایت کے ساتھ ہر قسم کی قدامت کی مخالفت نے اس گروہ کو سرکاری حلقوں میں ممتاز بنا دیا اور انہیں نشر و اشاعت کے لیے سرکاری امداد بھی ملنے لگی۔ تاوقتیکہ مزدوروں میں سے ادیب اور شاعر پیدا نہ ہوں، حکومت ان علم دوستوں کو پرچائے رکھنا چاہتی تھی جو اس کی مصلحتوں سے قریب تر تھے۔ ان "ہم راہیوں" (Fellow-Travellers) میں بہت کم لوگ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر تھے اور یہ امر ان لوگوں کے لیے ناپسندیدہ تھا جو ہر چیز کی طرح انسان کے جذبات کو بھی حکومت کی ملک سمجھتے تھے۔ وہ کہیں کو دیکھ سکتے تھے کہ دنیائے ادب ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو۔ اب وہ کہنے لگے کہ شعر و ادب میں بھی ڈکٹیٹری کی ضرورت ہے۔ خانہ جنگی کے سدباب کے بعد ان کی ہنگامہ پروری رنگ لانے لگی۔

سنہ ۱۷ع کے انقلاب کا تقاضا تھا کہ سماج کی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ تہذیب و تمدن کی تشکیل بھی نئے انداز میں ہو اور اس غرض سے تمام سرمایہ دارانہ اثرات کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ شعر و ادب کو بھی 'پرولیٹیرین' جامہ پہنانے کا مطالبہ ہونے لگا اور انتہاپسند انقلاب دوستوں پر بھی یہ الزام لگایا جانے لگا کہ یہ لوگ سماجی انقلاب اور ادبی انقلاب میں ارتباط قائم نہیں کر سکتے۔ کمیونسٹ ادب کو کمیونسٹ

انقلاب کے استحکام کی ضمانت قرار دیا گیا اور ہر اس ادیب کا قلم چھیننے کی فکر ہونے لگی جو کسی قسم کی بھی رجعت پروری سے کام لیتا تھا —

" پرولیٹیرین " تہذیب کی داغ بیل ڈالنے کے لیے سرکاری رہنماؤں کی سرپرستی میں 'پرولٹ کلٹ' (پرولیٹیرین کلچر کا مخفف) نامی ادارہ قایم کیا گیا جس کی نگرانی میں متعدد رسائل و جرائد کمیونسٹ ادب کی اشاعت کی غرض سے شائع ہونے لگے - ساتھ ساتھ اپنے ادبی نظریوں کو عام کرنے کی غرض سے اس دائرے نے کئی انجمنیں بنائیں اور حکومت سے وافر مالی امداد ملنے کی وجہ سے انہیں اپنے ارادوں میں ایک حد تک کامیابی ہونے لگی - یہ حلقہ موضوعات و میلانات پر تو اثر ڈال سکا لیکن جہاں تک طرز بیان کا تعلق تھا وہ ان چار شاعروں سے منسلک رہا جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے - مزدور شاعروں کو فن شاعری کے سبق دینے کے لیے کئی اسکول کھولے گئے اور ان سے چیستان کے جو دفتر شائع ہوے ان کا متحمل کوئی صاحب ذوق نہ ہوسکتا تھا - سوویت حکومت کا ملک الشعرا دمین بدنی تعمیر پسند (Constructivist) مزدور شاعری کا استاد ہے - اس کی حیثیت ایک مشاق تک بند سے زیادہ نہیں ہے اور وہ محض اس سبب سے سرکاری حلقوں میں مقبول ہے کہ ہمیشہ اُن کی قصیدہ سرائی اور ان کے مخالفوں کی ہجوگوئی کے لیے تیار رہتا ہے - ان سب میں صرف 'کازنین' ایک ایسا شاعر ہے جو محنت اور مزدور کے گیت گاتے ہوے بھی اپنے کلام میں ایک وسعت اور ندرت رکھتا ہے جو اس کے دوسرے رفیقوں کو نصیب نہیں ہے - بہر حال ' پرولٹ کلٹ تحریک اور استقبالیوں میں سال ہا سال تک یہ تنازع رہا کہ انقلاب کی نمائندگی کا حق کسے حاصل ہے - پرولٹ کلٹ والے پارٹی کی ماتحتی کے بھی قائل نہ تھے اور اس سے الگ رہ کر اپنا کام کرنا چاہتے تھے - لینن اور ٹراٹسکی نے اس رجحان کی سخت مذمت کی اور سنہ ۲۳ کے لگ بھگ

یہ تحریک عارضی طور پر کم زور پڑگئی —

اس کے یہ معنے نہیں کہ ادب کو حکومت وقت کا تبلیغی ادارہ بنانے کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا - اسی زمانے میں کمیونسٹ پرولیٹیرین اور غیر کمیونسٹ غیر پرولیٹیرین (جو 'ہم راہی' کے نام سے یاد کیے جاتے تھے) کی کشاکش دور تک پہنچ گئی - جھگڑے کی بنا یہ تھی کہ مزدور بحیثیت ایک طبقے کے اپنی الگ تہذیب بنائیں گے یا ان کا نصب العین یہ ہوگا کہ ہر قسم کے طبقاتی عناصر کو مٹا کر ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالیں جو تمام بنی نوع انسان کے لیے ہو اور کسی ایک عہد یا ایک جماعت کے لیے مخصوص نہ ہو - اس بحث کی اہمیت دوررس تھی کیونکہ اگر زمانۂ حال کا منشا یہ قرار پائے کہ مزدور اپنی تہذیب پیدا کر سکتا ہے تو لازمی طور پر اس کا دار و مدار سرمایہ دارانہ تہذیب کی تباہی پر ہوگا اور نئی تہذیب ہرگز اس کے کسی عنصر کو قبول نہ کریگی - لیکن اگر مدعا یہ ہے کہ غیر طبقاتی سماج کے ساتھ غیر طبقاتی ادب کو جنم دیا جائے تو وہ نچوڑ ہوگا قدیم و جدید ادب کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا - اسی مسئلے کو لے کر 'محافظین' (On guards) اور 'ہم راہین' میں تنازعہ ہوتا رہا اور ہر دو فریق اپنے کو انقلاب کی مصلحتوں کا محافظ بتلاتے رہے - پرولٹ کلٹ والوں نے علی الاعلان یہ کہنا شروع کیا کہ ادب کو پارٹی کا ایک صیغہ بنا دینا چاہیے اور اس پر مزدوروں کا احتساب بٹھانا چاہیے تاکہ غیر پرولیٹیرین ادیبوں پر پابندی لگائی جاسکے —

یہ اختلاف اس قدر شدید ہو گیا کہ بقول ایک مصنف کے " اگر ادب جیسی آوارگی پسند شے کے علاوہ اور کسی فن میں یہ تنازع ہوتا تو ہر فریق پر حفظ امن کے لیے مقدمہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی - " ترانسکی، بخارن، لونا چارسکی وغیرہ سربرآوردہ کمیونسٹ قائدوں نے ان سرپھرے مزدور پرستوں

کی سخت تعزیر کی - ٹراٹسکی نے ادب اور پارٹی کے تعلقات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا: " ادب کو اپنے وسائل سے آپ اپنی راہ تلاش کرنا چاہیے - پارٹی مزدور جماعت کی رہنمائی کر سکتی ہے لیکن تاریخ کی بنیادی روشوں پر اس کا اختیار نہیں چل سکتا - کئی معاملات میں پارٹی براہ راست اور حکماً راہ دکھاتی ہے - بعض اداروں میں وہ صرف تعاون کرتی ہے اور بعض میں اس کا فریضہ اتنا رہ جاتا ہے کہ مشورہ دے کر الگ ہو جائے - آرٹ کی دنیا پارٹی کے احکام کی پابند نہیں ہو سکتی - پارٹی کو اس کی محافظت کرنا چاہیے اور وقتاً فوقتاً اس کی مدد سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے لیکن یہ بھی بالواسطہ ہی ہو سکتا ہے براہ راست نہیں ہو سکتا " - لینن نے تو یہاں تک کہا کہ " ہر آرٹسٹ کو اپنے مسلک کے مطابق آزادی سے تخلیقی کام کرنے کا حق ہے ' خواہ وہ اچھا ہو یا برا " - بخارن نے ایک تقریر میں کہا کہ " پرولیٹیرین ادب کا شائق ہونے ہوئے بھی میرا دعویٰ ہے کہ اسے تباہ کرنے کی ایک صورت یہی ہو سکتی ہے کہ آزاد اور غیر پابند مقابلے کے اصول کو مسترد کر دیا جائے - وہ ادب کبھی نہیں پنپ سکتا جو حکومت کے جبر یا کرم کا دست نگر ہوتا ہے " —

سنہ ۲۵ ع میں کمیونسٹ پارٹی کے اجلاس میں اس مسئلے پر غور ہوا اور محافظین کی تحریک کثرت رائے سے مسترد ہو گئی - پارٹی نے اپنے فیصلے میں کہا کہ " اب تک مزدور مصنفین نے اپنی برتری کا ثبوت نہیں دیا اور پارٹی اعتراف کرتی ہے کہ اس کوشش میں ان کی اعانت اس کا فرض ہے - لیکن پارٹی یہ بھی اعلان کرتی ہے کہ تہذیبی وراثت اور ادب کے ماہروں کی تضحیک کو وہ قابل نفرت اور لایق سرزنش تصور کرتی ہے - اس کی رائے ہے کہ مختلف ادبی حلقوں میں آزاد مقابلے کی ضرورت ہے " —

گویا پارٹی نے عارضی طور پر ان لوگوں کو تھوڑی سی آزادی دے دی

جو بد قسمتی سے مزدوروں کے گھر پیدا نہ ہوے تھے یا انقلاب کے پہلے سے لکھتے آ رہے تھے - اس کے سوا ان کا گناہ اور کچھہ نہ تھا کیونکہ وہ انقلاب کی حمایت میں ہمیشہ سرگرم رہے تھے -

اس طرح سوویٹ شاعری کا دور اول ختم ہوا اور اس نے کوئی قابل ذکر شاعر پیدا نہ کیا - یہ سچ ہے کہ جذبات کو نکاس کی راہ مل جانے کی وجہ سے شاعر حشرات الارض کی طرح پیدا ہو رہے تھے اور خیال کیا جاتا ہے محض کہ روس خاص میں ان کی تعداد ۴۰ ہزار سے کم نہ ہوگی- لیکن ابھی ان میں کوئی سلیقہ پیدا نہ ہوا تھا - پارٹی کے مذکورہ بالا اجلاس میں یہ بتایا گیا تھا کہ " کسی مزدور مصنف کی کتابوں کی مانگ نہیں ہے اور مجبوراً انہیں ترازو پر تول کر کوڑیوں کے مول بیچنا پڑتا ہے " --

دوسرا دور- از سنہ ۲۱ ع تا سنہ ۲۶ ع

نثر کا ارتقا --

یوں تو نثر نگاری کا نیا دور سنہ ۲۱ ع سے شروع ہوا لیکن یہاں ہم ان ادیبوں پر ایک سرسری نظر ڈال سکتے ہیں جو انقلاب کے پہلے سے لکھتے آرہے تھے اور جو اب اپنی اپنی طرز پر نئے دور زندگی کی تائید کرتے ہوے آئندہ کے لیے ایک نئی شاہ راہ بنا رہے تھے -

ان میں میکسم گورکی کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو سوویٹ ادب کا خالق اور نگہبان کہا جا سکتا ہے - یہاں ہمیں گورکی کی ان سرگرمیوں کا ذکر نہیں کرنا ہے جو تعلیمی اور تہذیبی نوعیت رکھتی ہیں ' حالانکہ ایک انقلابی ادیب کی بہ نسبت انقلابی ادب کے سرپرست کے اعتبار سے اس کی حیثیت زیادہ مسلم ہے - معلوم ہوتا ہے کہ گورکی اپنی تخلیقی صلاحیت انقلاب کے آتے آتے صرف کر چکا تھا - گورکی کے متعلق مرسکی کی یہ راے بڑی حد تک صحیح ہے کہ وہ دیکھہ سکتا ہے ' سمجھہ نہیں سکتا! گورکی اپنی آپ بیتی اور یاد داشت میں خارجی دنیا کی

تصویر جس حسن و خوبی سے کھینچتا ہے اس کی مثالیں ھیوگو اور طالسطائی کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتیں مگر وہ انسان کے نفس و باطن کو نہیں سمجھ سکتا اور اس وجہ سے اس کی کردار نگاری بےجان سی رہ جاتی ہے - لیکن مارکسیت میں نفسیات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور اسے وہی خارجیت مطلوب ہے جسے گورکی کا طرۂ امتیاز سمجھنا چاہیے - اور اسی وجہ سے اسے عوام میں اور نو آموز ادیبوں میں قابل رشک مقبولیت حاصل ہے - گورکی نے انقلاب کے بعد 'تماشائی' مقناطیس اور 'شعلہاے دگر' کے نام سے تین ناول لکھے جو اس کی پرانی کتابوں سے کسی طرح بہتر نہیں ہیں - تاہم اس نے اپنی راہ سے ہٹ کر کوشش کی ہے کہ ان کا ماحول ویسا تاریک اور مایوس کن نہ ہو جو عام طور پر اس کے ناولوں میں پایا جاتا ہے —

الکسی طالسطائی سنہ ۲۲ میں سوویت روس کا حامی بنا اور اس کے بعد اس نے جو ناول اور افسانے لکھے وہ بڑی حد تک سطحی ہیں - انشا پردازی میں الکسی اپنا ثانی نہیں رکھتا اور جب تک وہ اپنے طبعی رجحان پر چلتا ہے اس کے ناول واقعہ نگاری' بے تکلف طرز بیان اور خود ساختہ قوت کی وجہ سے ایک امتیازی شان رکھتے ہیں - لیکن طبعاً وہ کسی پابندی کا خوگر نہیں ہے اور اپنی مخصوص فضا سے نکلتے ہی راہ بھٹک جاتا ہے - اسی وجہ سے مزدوروں اور مشینوں کے متعلق کوئی قابل قدر چیز لکھنے میں وہ کامیاب نہ ہوسکا اور انقلاب کے ھنگامے میں گم سا ہوگیا - حال ہی میں اس نے "وہ رات جو گزر گئی" کے نام سے ایک ناول لکھا ہے جس کا انگریزی ترجمہ عنقریب شایع ہونے والا ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ الکسی کا شاہکار ہے اور بڑی تلاش کے بعد اسے اپنی انتاد کے مطابق کوئی موضوع مل گیا ہے —

اشاریاتی تحریک کے سلسلے میں بیلی کا نام آچکا ہے جو اس اسکول کے

نثر نگاروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور اس نے دور جدید کی روسی نثر کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے - صرف و نحو کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہوئے بھی وہ الفاظ میں ترنم پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے - اس کی مذہبی اور روح پرور طبیعت کسی طرح مادی اشتراکیت سے ناتا نہ جوڑ سکی اور اگر انقلاب سے اسے کوئی ہمدردی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ یہ دنیا کے نام اس کے وطن کا ایک خاص پیغام ہے - بیلی کے ناول (Kotik Lataev) کو روسی زبان میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے - اس میں انسانیت کے ارتقائی منازل ایک تمثیل کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں جس کا آغاز ایک بچے کی زبان سے کرایا گیا ہے جو اپنی ماں کے پیٹ میں بیٹھ کر خارجی دنیا کے متعلق عجیب و غریب تخیلات قایم کر رہا ہے -

زمیاتن نے اپنے لیے روسی ادب میں ایک خاص جگہ پیدا کرلی ہے اور حالانکہ سوویت حکومت نے اسے مردود قرار دے دیا بایں ہمہ اس کی ترتیب پسند (Formalist) طرز انشا نے نئے لکھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا - زمیاتن پرانا انقلاب پرور ہے لیکن وہ ادب کی نشو و نما کے لیے آزادیء ضمیر کو ضروری سمجھتا ہے - گوگول کی ایسی کامیاب پیروی اب تک کوئی مصنف نہ کرسکا اور اس کے چھوٹے افسانے طنز ملیح کے بہترین نمونے ہیں - وہ سوسایٹی کے فحش پہلوؤں کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور چھوٹے شہروں کی تنگ و تاریک فضا کو بے نقاب کرنے میں اسے ملکہ حاصل ہے - متروک اور عامیانہ الفاظ کے استعمال میں اسے بڑی مہارت ہے - اس کے جس ناول پر ارباب وقت کا عتاب نازل ہوا اس کا عنوان ہم (We) ہے- روس میں اشاعت کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے یہ ناول انگریزی میں امریکہ میں شایع ہوا تھا - اس میں ایچ - جی - ویلز کے سائنٹفک رومان کی طرز پر کمیونسٹ دنیا کا خاکہ اڑایا گیا تھا اور دوران بیان میں اس نے سیاسی طنز کی شکل اختیار کرلی ہے - اس کتاب کی اشاعت کے کئی سال بعد جب مشہور انگریز ناول نویس

الڈس ھکسلے کی مقبول عام تصنیف Brave New World شائع ہوئی تو کئی لوگوں نے ان دونوں کتابوں کی مشابہت کی طرف اشارہ کیا - 'ہم' میں زمیاتن نے پانچ سو سال بعد کی دنیا کا تصور پیش کرتے ہوئے' بڑے لطیف انداز میں روس کی موجودہ نوکر شاہی کا خاکہ اڑایا ہے - حکومت کا ایک اہل کار کہتا ہے : " آزادی اور گناہ باہم اس قدر منسلک ہیں ' جیسے ہوائی جہاز اور اس کی رفتار - اس لیے اگر آزادی چھین لی جائے تو گناہ کا کوئی اندیشہ نہ رہے گا" -

" دو میں سے صرف ایک چیز مل سکتی ہے — خوشی بغیر آزادی یا آزادی بغیر خوشی- زمانۂ قدیم کے احمقوں نے آزادی کو ترجیح دی اور پھر صدیوں تک برضا و رغبت غلامی کرتے رہے " —

ظاہر ہے کہ یہ طنز مطلق العنان ڈکٹیٹروں کے لیے ناقابل برداشت تھا اور اسی وجہ سے زمیاتن کو روس چھوڑ کر پیرس میں سکونت اختیار کرنا پڑی - اس واقعے کی تفصیل بعد میں آئے گی —

بیلی کے علاوہ جدید نثر نگاری نے ریمیزوف سے سب سے زیادہ اثر قبول کیا - گورکی ' الکسی یا زمیاتن نے ادب کے حلقے کو بہت زیادہ وسیع کیا اور ان دونوں نے اسالیب بیان میں ایسی ندرتیں پیدا کیں جنھوں نے زبان کے قالب کو بدل دیا - ریمیزوف کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کی زبان شہریوں کو سکھاتا ہے ان کی بلاغت و فصاحت کو دیہاتوں کے سر نہیں موڑھتا - علاوہ بریں اس کے ناول یا قصے کردار نگاری کے اعتبار سے نہیں بلکہ طرز بیان کے اعتبار سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں- کیونکہ اس کے نزدیک ادب حقیقت کا ترجمان نہیں ہے بلکہ اس کی ایک تشبیہی اور تمثیلی تصویر ہے - اس اصولی اختلاف کی وجہ سے کمیونسٹ اسے ناپسند کرتے ہیں - لیکن اس کا طرز انشا نئے مصنفوں کے لیے ایک نشان راہ ہے اور اس کا کامیاب اتباع سوویت نثر نگاری کا کمال

سمجھا جاتا ہے —

یہ سب وہ لوگ ہیں جو انقلاب کے پہلے سے لکھتے آرہے تھے اور ان کی حیثیت سوویت نثر کے معلموں کی ہے ' خالقوں کی نہیں - در حقیقت ' دور جدید کا آغاز سنہ ۲۰ ع کے بعد سے ہوتا ہے - خانہ جنگی ختم ہوچکی تھی اور اب بولشویک اپنے تعمیری لایحۂ عمل کی طرف متوجہ ہو رہے تھے - ہر طرف تعلیمی ادارے قایم کیے جا رہے تھے اور علم و ادب کو عام فہم بنانے کے لیے نئے نئے رسائل و جرائد شایع ہونے لگے تھے - فوجی خدمت سے وہ نوجوان سبک دوش ہو رہے تھے جو کمیونسٹ ہونے کے ساتھ کچھ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے - ان کی آنکھوں کے آگے روس ایک نئے دور سے گزر رہا تھا اور خانہ جنگی کی تباہ کاریوں سے وہ ذاتی طور پر آشنا تھے - جذبات مشتعل تھے ' مشاهدات خود اظہاری کے لیے بے تاب تھے اور مضامین کی کمی نہ تھی - ان تغیر پسند ادیبوں نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ' لکھنے کے نئے انداز سکھا دیے تھے - اس وجہ سے اس دور کے ابتدائی چار سالوں میں بے شمار ناول اور افسانے شائع ہوتے رہے - ان سب کا واحد موضوع ' انقلاب اور رد انقلاب ' ہے - لیکن اس انتشار اور افراتفری میں اپنے مشاهدات اور جذبات کو ترتیب دینے کی فرصت کسی کو نہیں ہے ' اور نہ کوئی واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے - سب کا منشا یہ ہے کہ سینما کے کیمرے کی رفتار سے اپنے احساسات اور تجربات کو قلم بند کرلیں - اس وجہ سے وہ بڑے ناولوں سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ کوئی وسیع پس منظر پیش نہیں کر سکتے اور چھوٹے چھوٹے افسانوں یا حکایتوں پر اکتفا کرتے ہیں - انداز بیاں میں زور یا اثر کی کمی نہیں ہے اور شدت احساس کی وجہ سے تازگی بھی موجود ہے ' تاهم اس زمانے کا ادب ایک ایسی عمارت کے مشابہ ہے جس کا ہر حصہ اپنی جگہ پر مکمل ہے لیکن وہ بذات خود مجموعی طور پر نامکمل ہے - ربط اور نظم

نہ ہونے کی وجہ سے ان تصنیفوں کا بیشتر حصہ بے معنی اور لا یعنی ہے - ان کی حیثیت سرگزشتوں سے زیادہ نہیں ہے - تاہم اس دور نے کئی ایسے مصنف پیدا کیے جو باکمال ہیں اور ان کی تحریریں فنی اعتبار سے کئی خوبیاں رکھتی ہیں - اگر بعد میں بھی ان کی صلاحیت کو فروغ کا ایسا ہی موقع ملتا اور حکومت تنگ نظری سے کام نہ لیتی تو یہ لوگ یقیناً ادب جدید کو نیا رنگ روپ دیتے —

دور جدید کے ان علم برداروں میں سب سے پہلے بیبل (Babel) کا نام آتا ہے - خانہ جنگی کے دوران میں وہ ایک سرخ رسالے میں لڑ چکا تھا اور مہم سے لوٹ کر اس نے اپنے تاثرات کو ' سرخ رسالہ ' کے نام ہی سے قلم بند کیا - اس کتاب کی اشاعت اس امر کی شاہد ہے کہ فی الحقیقت ایک ایسا ادیب پیدا ہو گیا ہے جو انقلاب کے ہیجانات کو ایک نئے انداز میں بیان کر سکتا ہے - بیبل گورکی کی رومانی دور بینی کے ساتھ انسان کی ذہنیت اور نفسی کیفیت پر بھی نظر رکھتا ہے - اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ نہایت مہیب اور خوفناک واقعات کو وہ چند جملوں میں یوں بیان کر جاتا ہے گویا یہ آئے دن کی باتیں ہیں - اس کی تحریر میں ایک خاموش تیکھاپن ہے اور وہ بیک وقت نفرت اور درد کے جذبات کو متحرک کر سکتا ہے - مقابلے اور تناقض کے استعمال سے وہ اپنی تحریر کو اور بھی اثر پذیر بنا دیتا ہے - ' سرخ رسالہ ' میں ایک طرف فحاشی ظلم اور بیدردی کے ہولناک مناظر ہیں اور دوسری طرف ایک پر سوز رومانی فضا ہے - ان دونوں کے تضاد کو وہ طنز زیادہ نمایاں کردیتا ہے جو از ابتدا تا آخر ماحول کی تاریکی پر ملگجی سی روشنی ڈال رہی ہے - قتل کے ایک واقعے کو وہ کیسی سادگی اور بے حسی سے بیان کرتا ہے : " میری کھڑکی کے ٹھیک سامنے کچھ قزاق ایک سپید ریش یہودی کو جاسوسی کے الزام میں قتل

کر رہے تھے - بوڑھا چیخ رہا تھا اور آزاد ہونے کی بے سود کوشش بھی کرتا جاتا تھا - یہ دیکھ کر گولنداز 'کردیا' نے اس کے سر کو اپنی بغل میں دبا لیا - یہودی کا گلا رندھنے لگا اور اس نے اپنے پانو پھیلا دیے - 'کردیا' نے اپنے بائیں ہاتھ میں ایک خنجر لیا اور اس ہوشیاری سے بوڑھے کو ذبح کیا کہ اس پر خون کا ایک چھینٹا نہ پڑا " —

'پلنیاک' روسی ادب میں ایک طرز جدید کا موجد ہے - اس کے ناولوں میں کوئی قصہ نہیں ہوتا - بیان کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اور وہ بھی بالکل بے ترتیب - کچھ کہتے کہتے بیچ میں وہ ایک جملۂ معترضہ لا کر پھر اس کی تفصیل میں چلا جاتا ہے - اس میں تعمیری استعداد کا فقدان ہے اور اس کے ناولوں کو تاریخی اور فلسفیانہ تشریحات کہنا زیادہ صحیح ہوگا - لیکن وہ قدیم و جدید اور مشین اور کرگھے کے تقابل میں انتہائی تخلیقی قوت کا ثبوت دیتا ہے اور اس کا انداز بیان نہایت شگفتہ اور دلکش ہوتا ہے - ذہنی اعتبار سے وہ مشرقی اور روسی ہے - اسی لیے انقلاب سے اس کی ہمدردی ایک آزادانہ قومی رنگ لیے ہوے ہے - سنہ ۲۵ ع کے پہلے اس نے جو کچھ لکھا وہ ادب جدید کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے اور اس میں بھی Third metropolis, Bare year, Ivan & Maria بہت مقبول ہیں - اس دور کا اختتام Mahcgany نامی افسانے پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حکومت کی نظروں سے گر گیا اور دوبارہ اس کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے آرٹ کو بالاے طاق رکھ کر ایک درباری بھاٹ بن جانا پڑا - آگے ہم ان واقعات پر روشنی ڈالیں گے —

'اوینانف' (V. Ivenov) اور بیبل میں ایک حد تک مشابہت ہے - دونوں اختصار پسند ہیں - دونوں بے حس کیمروں کی طرح ماحول کی تصویر پیش کر دیتے ہیں - دونوں غیر متوقع مواقع پیدا کرتے ہیں اور ان کے ارد گرد رومانی

فضا پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اویناف انسان کو بھیانک ہیجانات کا کھلونا سمجھتا ہے ۔ اس کی راے میں انسان کے رویہ میں کوئی معقولیت نہیں ہوتی - وہ ماحول کا غلام ہے اور اس کا عمل عقل کا نہیں بلکہ عارضی احساسات کا تابع ہے ۔ اجتماعی مناظر کو وہ بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے خصوصاً اس وقت جب کہ افراد تمیز و شعور سے بیگانہ ہوں اور اندھوں کی سی حرکتیں کر رہے ہوں ۔ اس حزنیتی فلسفۂ زندگی نے اس کے انتہائی واقعیاتی ناولوں پر بھی تاریکی و تباہی کا پردہ ڈال دیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ نقاد اویناف کے اس ' رجعت پرورانہ ' رجحان کو بنظر پسندیدگی نہ دیکھ سکتے تھے ۔ اس کا شاہکار ایک چھوٹا افسانہ Child ہے اور اس کی کتابوں میں Armoured Train اور Mystery of Mysterie کو خاص شہرت حاصل ہے ۔

' فیدن ' کو اپنے ہم عصروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ ناول میں ایک مسلسل قصہ بیان کر سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ واقعات کا نفسیاتی تجزیہ پیش کر سکتا ہے اور ان مسائل کی بنیادوں تک پہنچتا ہے جو انقلاب کی وجہ سے زندگی میں انتشار پیدا کر رہے ہیں ۔ اس کا موضوع خاص اس امر کی تشریح ہے کہ انقلاب نے علم دوست طبقے کو بڑی کشاکش میں مبتلا کردیا ہے۔ واقعات کو دلچسپ اور پر اسرار بنانے کے لیے وہ بڑی جدتیں کرتا ہے۔ مثلاً اس کے مشہور ناول Cities & years کا آغاز اس کے انجام سے ہوتا ہے۔ اپنے ناولوں میں وہ بڑی خوبی سے مواقع پیدا کرتا ہے لیکن اس کا انداز بیان اس زور و قوت سے خالی ہے جو اس زمانے کی عام خصوصیت ہے۔

ناولوں کو از سر نو رواج دینے میں لیونانف کا بڑا ہاتھ ہے ۔ وہ ہمیشہ شہر اور دیہات کی کش مکش کو بیان کرتا ہے۔ اس پر دستوویسکی کا اثر بہت نمایاں ہے اور نفس انسانی کے تاریک پہلوؤں کی تشریح پر اسے بڑی قدرت حاصل ہے ۔ اس کے کرداروں میں انفرادیت ہوتی ہے اور قدیم روسی ادب کی دردمندی

سے وہ بے حد متاثر ہے - وہ کسی مسلک کی تبلیغ نہیں کرتا - اس کی نظر میں زندگی ایک ندی ہے جو روانی کے سوا کسی قاعدے کی پابند نہیں ہو سکتی - اس کی بہترین تصنیف Thief ہے جس کا شمار بیسویں صدی کے بہترین روسی ناولوں میں ہوسکتا ہے - اس کا ایک کردار لیونا‌ف کی ترجمانی کرتا ہوا کہتا ہے : - "زندگی کے راز کو ہم نہ سمجھ سکیں - زندگی کی لذت اتنی لطیف ہے کہ اسے انسان چکھتا ہے اور بغیر محسوس کیے ہوے مر جاتا ہے" - لیونا‌ف کو زندگی سے بے انتہا محبت ہے اور اس کے انداز بیان کی جولانی اس کے ناولوں میں ایک مابہ الامتیاز خوبی پیدا کر دیتی ہے —

مذکورہ بالا ناول نگار اس کش مکش کو ظاہر کرتے ہیں جو انقلاب کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں پیدا ہو گئی ہے - ان میں روز مرہ کی زندگی کے علاوہ وہ حالات نہ ملیں گے جن میں تیزی سے تغیر پیدا ہو رہا ہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ سوویت ادب اس دنیا سے بے پروا رہا جو انسان کی ذات اور گھر سے تعلق رکھتی ہے - متعدد ادیبوں کی نظر ان چیزوں پر پڑتی ہے جن میں تباہی اور غارتگری کے وہ رومانی مناظر نہ ملیں گے - وہ سماج کے معمولی مسائل کو ایمان داری اور غیر جانب داری سے لکھ دیتے ہیں - اِس قسم کے ناولوں کو اُس وقت مقبولیت ہوئی جب خانہ جنگی سے مشتعل جذبات کی گرمی کم ہونے لگی تھی —

ان میں رومینا‌ف کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو Without cherry blossoms اور Three Pairs of Silk Stockings کی وجہ سے انگریزی خوانوں میں بہت مشہور ہو چکا ہے - وہ سوویت روس کے انسان جدید کا مرقع پیش کر کے بتاتا ہے کہ شادی، محبت، جنس وغیرہ کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ کس سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے - ایک طرف وہ ہیجانات ہیں جو مدت دراز کی غیر فطری پابندیوں سے آزاد ہونے کے بعد سخت قسم کی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور دوسری طرف کمیونسٹ

اخلاق کا سخت مطالبہ ہے۔ رومیناف سماجی برائیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے بالکل نہیں جھجکتا لیکن اس کی حقیقت نگاری چرب زبانی کی حد کو پہنچ گئی ہے جس کی وجہ سے اس کا ماحول کسی ناظر کے دل میں ہمدردی پیدا نہیں کر سکتا۔ رومیناف کا طرز تحریر بے نمک ہے اور فنی اعتبار سے اس کے ناول واقعات کے گوشوارے کی حیثیت رکھتے ہیں —

سوویٹ روس کا سب سے مقبول اور با کمال مزاحیہ نگار زوشینکو ہے۔ انسان کی منافقت، ذلت اور بےحسی کو بے نقاب کرنے میں کہیں کہیں وہ گوگول اور چیخوف کا ہمدوش ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ نہایت ہی لطیف انداز میں انسان کی کمینہ خصلتوں پر چوٹ کرتے ہوئے یکایک اس کا دل حزن و ملال سے بھر آتا ہے۔ بظاہر اس کے ناول ظرافت کے عمدہ نمونے ہیں اور لوگ انہیں بہت پسند کرتے ہیں لیکن مزاح کی کھال کو ذرا کھرچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کرب و غم سے اس کا سینہ چاک ہے اور انسانیت کی نجات پر اسے مطلق بھروسا نہیں۔ زوشینکو عمداً عامیانہ روز مرہ کا استعمال کرتا ہے اور فحش واقعات کو وہ اتنی وضاحت اور صحت سے بیان کرتا ہے کہ کوئی اخلاق پرست اس کا ایک صفحہ پڑھنے کی تاب نہیں لاسکتا۔ زوشینکو کی سب سے آخری کتاب (Restored youth) ہے جس پر ایک عرصے سے سوویٹ پریس میں بحث ہو رہی ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ہر سوشل ادارے پر ایک غیر واضح مگر شدید طنز ہے۔ بعض خوش اعتقادوں کا گمان ہے کہ اس نے ادب اور سائنس کا امتزاج کر کے ایک نیا نمونہ پیش کیا ہے۔ سوویٹ نقادوں میں تخیل کی جو عام کمی ہے اسے دیکھتے ہوئے قرین قیاس یہی ہے کہ یہ موجودہ سماجی حالات کی ہجو ہے —

سنہ ۲۵ ع سے لے کر سنہ ۲۷ ع تک ہم سوویٹ ادب میں ایک نئے رجحان کو بہت نمایاں پاتے ہیں۔ اب طالسطائی کی واقعیت' گورکی کی رومانیت'

چیخوف کی بے حسی اور گوگول کے طنز کے ساتھہ — شخصیت اور ماحول کا تنازع از سر نو ادب کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے - کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ انسان کی ظاہری و باطنی دنیا کی کش مکش تمام روسی ادب کا مرکزی موضوع ہے - ماحول کا تقاضا ہے کہ سماج کے مفاد کے لیے فرد اپنی مسرت اور آزادی کو قربان کر دے لیکن فرد اس مطالبے کے خلاف بغاوت کرتا ہے - اور اس کشاکش کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ فرد فنا ہو جاتا ہے اور ماحول کو زیادہ تاریک بنا جاتا ہے - سوویت ادب اب تک صرف غیر شخصی تضاد کو پیش کرتا رہا تھا - قدیم و جدید' انقلاب اور رجعت ' دیہات اور شہر ' مزدور اور علم دوست — انہیں کے تضاد کو ہر مصنف بیان کرتا ہے اور اس کے نزدیک فرد کے محسوسات کوئی حقیقت نہیں رکھتے - ہم کہہ چکے ہیں کہ مارکسی نظریے میں انسان کی داخلی کیفیت کے لیے کوئی جگہہ نہیں ہے اور اس وجہ سے سوویت روس میں نفسیاتی ناول ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ سوویت ادب ' کلاسکل روسی ادب کی عالمگیری اپیل سے محروم ہے اور یہ حیرت کا مقام ہے کہ جو انقلاب تاریخ عالم کا سب سے اہم واقعہ سمجھا جاتا ہو اس کی ادبی تصویر کوئی بین الاقوامی حیثیت نہیں رکھتی - کسی قسم کا فلسفیانہ اور نفسیاتی مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی سطحی ہے اور اس میں کوئی گہرائی اور نکتہ رسی پیدا نہیں ہوتی —

اوپر ہم ان ' ہم راہین ' کا ذکر کر چکے ہیں جو کلاسکل ادب کی خوبیوں کو اپنانے کی کامیاب کوشش کر رہے تھے- اس سلسلے میں ہم ناول نگار یوری الیشا اور شاعر پیسترنک کو نہیں بھول سکتے جو ادب میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں- ان کا زاویۂ نگاہ یکسر داخلی ہے اور وہ بیشتر اپنے انفرادی احساسات کا ہی اظہار کرتے ہیں - ان دونوں کا خیال ہے کہ کسی اجتماعی سماج میں بھی فرد کی

اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا اور سماج کی غایت یہی ہے کہ اس کے دکھہ درد کا مداوا تلاش کرے - کمیونسٹ نقاد ان کی ذہنیت کو سرمایہ دارانہ بتاتے ہیں لیکن یہ لوگ ان کی عیب چینی سے بے پروا ہوکر ذاتی افکار و مصائب پر غور کرتے رہتے ہیں - الیشا کا ایک کردار اس کے شاہکار (Envy) میں کہتا ہے " ہمارے قریب نہ آؤ ' ہماری رہبری کی زحمت نہ کرو ' ہمیں لالچ نہ دو — کیونکہ ہماری محبت ' نفرت اور دکھہ سکھہ میں تم کوئی اضافہ نہیں کرسکتے — اور ان کے علاوہ زندگی میں رہ کیا جاتا ہے " - اپنے اس ناول میں الیشا بڑی دلیری سے جمعیت کے ان مظالم کا ذکر کرتا ہے جو فرد کی زندگی اجیرن کردیتے ہیں —

بلوک ' یزنین اور میکوویسکی کی وفات کے بعد پیسترنک ' روس کا سب سے اچھا شاعر سمجھا جاتا ہے - اس کا مشاہدہ بہت صحیح ہوتا ہے اور اپنے جذبات کے اظہار میں وہ جس جوش و خروش سے کام لیتا ہے وہ صرف اسی کے لیے مخصوص ہے - سیاسی اور سماجی جھگڑوں سے وہ اپنے آپ کو الگ رکھتا ہے اور اس کی تحریر اس خطیبانہ رنگ سے پاک ہے جو ہر انقلابی شاعر کے کلام میں رچا ہوا ہے - مختصر بیانی کی اس نے خاص مشق کی ہے ' وہ دو چار سطروں میں بڑے بڑے نکتے بیان کرجاتا ہے - انقلاب کا حامی ہوتے ہوئے بھی وہ فی الحقیقت تغزل پسند شاعر ہے اور اس کی بعض عاشقانہ نظموں کا شمار روسی شاعری کے شاہکاروں میں ہوتا ہے —

اسی سلسلے میں فیدوف اور شیلخوف کا ذکر کیا جاسکتا ہے - فیدوف کے (Rout) اور شیلخوف کے (Quiet Flows the Don) کا شمار بہترین سوویٹ ناولوں میں ہوتا ہے - یہ دونوں طالسطائی کی واقعیت کے پیرو ہیں - شیلخوف قزاقوں کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہے اور اس کا بیان بڑے حسن اور خوبی سے کرتا ہے - وہ

انقلاب دوستوں اور انقلاب دشمنوں کی کردار نگاری میں غیر جانب داری سے کام لیتا ہے اور اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح خواہ مخواہ یہ دکھانے کی کوشش نہیں کرتا کہ ہر کمیونسٹ نیکی کا فرشتہ اور ہر غیر کمیونسٹ شیطان ہوتا ہے —

یہ امر قابل غور ہے کہ نظام زندگی کے انتشار کے باوجود سوویت ادب کے شاہکار اسی زمانے میں لکھے گئے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سنہ ۲۷ ع کے قریب سوویت ادب کی بازہ رک گئی - اس کے بعد مطلق العنانی اور تنگ نظری کا جو دور شروع ہوا اس نے ایک عرصے کے لیے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا جو اس مختصر سی مدت میں پیدا ہو چلی تھیں - سنہ ۲۷ ع کے بعد ہر مسئلے کی طرح ادب کے متعلق بھی حکومت کی پالیسی بدل گئی اور رفتہ رفتہ وہ آزادی چھن گئی جو دو سال پہلے دی گئی تھی - بات یہ ہے کہ عین اسی زمانے میں لینن کا انتقال ہو گیا اور کچھ روز بعد تراتسکی نظر بند کرکے روس سے نکال دیا گیا - استالین کی سر کردگی میں جو گروہ حکومت پر قابض ہوا وہ آرٹ کو اپنا صیغۂ تبلیغ بنانا چاہتا تھا - اب جب کہ تمام دنیا میں شاعری کا انحطاط انتہا کو پہنچ چکا ہے اگر سوویت روس میں شاعری کو فروغ حاصل نہ ہو تو کوئی حیرت نہیں - لیکن جس ملک میں پلنیک' زمیاتن' بیبل' الیشا اور شیلخوف کے مرتبے کے ادیب موجود ہوں' اس کی نثر سے بہت سی توقعات قایم کی جاسکتی ہیں - ہم ابھی دیکھینگے کہ کس طرح ان کی صلاحیتوں کو پسپا کر دیا گیا —

اس دور کی بہترین تصنیفوں میں زمیاتن کے We بیبل کے Red cavalry الیشا کے Envy شیلخوف کے Quiet Don فیدیف کے Rout لیونوف کے Thief اور پلنیاک کے Bare Year کا نام لیا جاسکتا ہے —

پنج سالہ پروگرام اور ادب -

یوں تو لینن کی موت تراتسکی کے اخراج اور استالین کے بر سر اقتدار ہوتے

ہی سنہ ۲۹ ع کے بعد تنگ نظر مارکسسوں نے " ہم راہیں " کے خلاف تحریک شروع کردی تھی۔ انقلاب دشمنی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ تمام چھاپے خانے اور اخبارات حکومت کی نگرانی میں کام کرتے تھے ' اور ان میں اس قسم کی تحریریں شائع نہ ہوسکتی تھیں ' لیکن ان کو رہیلوں کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ طرز بیان میں کلاسکل انداز اختیار کیا جائے ' ماحول پر کوئی فلسفیانہ یا نفسیاتی بحث کی جائے ' یا انقلاب کے پس منظر میں انسان کے احساسات کا ذکر کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ادب مزدوروں کے فورمین اور کسانوں کے اتواری معلم کا فریضہ انجام دے۔ چنانچہ سنہ ۲۹ ع کے بعد ہی ان ہم راہی ادیبوں پر اعتراضات کا ڈونگرا برس پڑا جو انقلاب دوستی کو اس تنگ دایرے میں محدود نہ کرنا چاہتے تھے۔ ' پرولت کلت ' کے نام لیوا پھر اپنے حجروں سے نکلے اور انہوں نے ' پرولیٹیرین مصنفوں کی انقلابی انجمن ' (Raap) کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ سنہ ۲۸ ع میں سوویت حکومت نے سوشلسٹ سماج کی تعمیر کی غرض سے پنج سالہ پروگرام پر عمل شروع کیا اور حکم دیا کہ ادب کو اس پروگرام کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اس سرکاری انجمن نے اپنے اعلان میں لکھا کہ ' سوویت ادب کا فرض منصبی فقط یہ ہے کہ پنج سالہ پروگرام اور طبقاتی جنگ کا آئینہ دار ہو۔ یعنی دیہاتوں کی اجتماعیت ' حرفتی ترقی ' امیر زمین داروں کی مخالفت اور سرخ افواج کی تنظیم میں — ادب کو حکومت کی حمایت کرنا چاہیے۔ ادبی تصنیف کی قدر و قیمت کا بڑا معیار یہ قرار دیا گیا کہ وہ کس حد تک پنج سالہ پروگرام کی تکمیل میں مدد پہنچاتی ہے —

اگر سوویت حکومت چاہتی ہے کہ ' میگنی تورسک میں دنیا کا سب سے بڑا بجلی گھر بنائے ' تو ہم چاہتے ہیں کہ ادب اس بجلی گھر کا ' ڈایمنو ' بن جائے !

" حکومت نے اس انجمن کو ادب کا ڈکٹیٹر مقرر کردیا اور اس کے احتساب نے

جیسی مکروہ صورت اختیار کرلی اس کی چند مثالیں ذیل میں دی جائیں گی - جو ادیب اس انجمن کی پالیسی کی تائید نہ کرتا اس کی کتاب نہ چھپ سکتی تھی اور اخبارات میں وہ رجعت پرور کے نام سے یاد کیا جاتا تھا - ایک کتاب کی اشاعت سے اس بنا پر انکار کر دیا گیا کہ اس میں تین سال پہلے کے واقعات کا تذکرہ تھا - ادیبوں کے گروہ کارخانوں اور کھیتوں میں مشینوں کی کارگزاری ملاحظہ کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے - جب پرولیٹیرین ادب کی نشو و نما یوں بھی نہ ہو سکی تو دس ہزار کسانوں اور مزدوروں کو تخلیق ادب کا حکم دیا گیا! مزدوروں کی طرح شاعروں اور ادیبوں میں بھی ' مقابلہ ' کا رواج ہو چلا - یعنی کسی شاعر کو ہدایت ہوتی تھی کہ ایک ہفتے میں تیل کے کنویں یا مشین کے سلنڈر یا پانی کے نل پر نظم لکھ دے - اسی قسم کے مقابلوں میں سے کسی ایک میں جب کسی شاعر نے لکھا کہ " سرمایہ دار معشوقوں کی پنڈلیاں ہمارے پانی کے نلوں کی طرح سڈول نہیں ہیں " تو تحسین و مرحبا کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں اور اس تک بند کا شمار سوویت روس کے نورتنوں میں ہونے لگا!

مختصر یہ کہ زراعت و حرفت کی طرح ادب کو بھی ' منظم ' کرنے کی کوشش ہونے لگی اور نتیجہ جس صورت میں برآمد ہوا اس کا ذکر آگے آئے گا —

میکوویسکی بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس ادبی انجمن میں شامل ہو گیا تھا لیکن اس کے تشدد نے اس کی زندگی دوبھر کردی اور سنہ ۳۲ ع میں وہ خودکشی کر کے مرگیا - اس زمانے میں وہ متفقہ طور پر روس کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا - استالین کے حواریوں نے اس کی خودکشی کے اسباب پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنا چاہا کہ اس کی سماجی یا ادبی سرگرمیوں سے اس حادثے کا کوئی تعلق نہ تھا - اس کے یہ معنے ہوے کہ اس کی موت کا اس کی زندگی سے کوئی

تعلق نہ تھا یا اس کی زندگی اور اُس کی ادبی اور سماجی سرگرمیاں دو مختلف چیزیں تھیں —

پولونسکی جو بذات خود بولشیوک تھا، روس کا سب سے ذہین اور نکتہ رس نقاد سمجھا جاتا تھا - لیکن وہ ادب کو پانچ سالہ پروگرام کے جوے میں جوتنا نہیں چاہتا تھا اور حکومت کی ادبی پالیسی کا مخالف تھا - 'راپ' نے اس کی ایسی شدید مخالفت کی کہ وہ عام طور پر انقلاب دشمن سمجھا جانے لگا اور اسی صدمے میں اس کی جان جاتی رہی --

بیبل نے اپنے افسانوں میں جس بے باکی سے سرخ افواج کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا تھا؛ وہ 'راپ' کے خداوندوں کو کیوں کر پسند آسکتی تھی - لہذا اسے قلم ہاتھ سے چھوڑ دینا پڑا اور اب ایک عرصۂ دراز سے روس کا سب سے بلند مرتبہ نوجوان ادیب بالکل خاموش ہے - بیچ میں وہ روس چھوڑ کر سکونت کی غرض سے فرانس چلا گیا تھا —

زمیاتن کے ناول 'ہم' کا ذکر اوپر آچکا ہے - یہ کتاب سنہ ۲۱ ع میں انگریزی میں شائع ہوئی تھی اور اس کے بعض اقتباسات روسی میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے تھے - اس وقت کسی نے انہیں رجعت پرور نہ کہا - سات سال بعد زمیاتن کے احتجاج کے باوجود کسی بیرونی اخبار نے اس کا ترجمہ شائع کر دیا اور 'راپ' والوں کو موقع مل گیا کہ زمیاتن کو بدنام کریں - انہوں نے زمیاتن سے مطالبہ کیا کہ اپنی انقلاب دشمنی کے لیے معافی مانگے اور نیک چلنی کی ضمانت دے - زمیاتن نے اس جبر کے آگے سرخم کرنے سے انکار کر دیا اور اسے مجبوراً روس چھوڑ کر چلا جانا پڑا —

ورنسکی جس نے 'پرولٹ کلٹ' کی شدید مخالفت کی تھی اور ادب کی آزادی کا قائل تھا، روس سے نکال دیا گیا - اس نے سوویت ادب کے ارتقا میں

بڑا کام کیا تھا —

مشہور ناول نگار ' پلنیاک ' Mahogony نامی افسانے کی وجہ سے حکومت کا معتوب ہو گیا اور اسے اس وقت تک طرح طرح سے اذیتیں پہنچائی گئیں جب تک وہ اپنے ناول Volga Flows into Caspian میں تبدیلی کرنے کے لیے تیار نہ ہوا اور اب اسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے معیار سے کتنا گر گیا ہے —

گورکی کو بھی ان محتسبوں سے پناہ نہ ملی الیکزینڈر کون اس کی سوانح حیات میں لکھتا ہے : " راپ ' والوں نے کھلے بندوں یہ کہنا شروع کیا کہ گورکی کسی مزدور کے گھر پیدا نہیں ہوا اور اس وجہ سے مزدوروں کی کردار نگاری نہیں کر سکتا - وہ ماضی کے متعلق لکھتا ہے اور ہمیشہ سرمایہ داروں کے ساتھ مغربی ممالک میں زندگی بسر کرتا رہا ہے " - صرف استالین کی دوستی اسے ان کی دست درازی سے بچا سکی —

مشہور مزاحیہ نگار کیتیف اس لیے مطعون ہوا کہ وہ زندگی میں حسن و مسرت کے آثار پاتا تھا - اس کے بعد اس کی کتابیں پادریوں کے پند و نصائح کی طرح خشک ہو گئیں - سوویت ملک الشعرا دمین بدن اس لیے ذلیل کیا گیا کہ وہ اسلوب کی آزادی چاہتا تھا —

ان سب سے عجیب و غریب واقعہ رومیناف کے ساتھ پیش آیا - کسی انگریزی اخبار نے اس کی پرانی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے اس زمانے میں لکھ دیا کہ حالانکہ ان میں سوویت زندگی کے تاریک پہلوؤں پر بڑی بے باکی سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن حکومت نے کوئی اعتراض نہ کیا - راپ والوں کو تو ایک بہانہ چاہیے تھا ' انہوں نے کہا کہ رومیناف نے ایسی کتابیں کیوں لکھیں کہ دوسروں کو ہم پر انگشت نمائی کا موقع مل گیا ! رومیناف کا کوئی استدلال پیش نہ گیا اور جب تک اس نے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی نہ مانگی اس کی گلو خلاصی نہ ہوئی -

پانچ سالہ پروگرام کی تائید میں جو قابل ذکر ناول لکھے گئے ان میں لیوناف کے Sot گلیڈ کوف کے Power شیلخوف کے Upturned Soil کٹیف کے Forward, O time! اور پلنیاک کے Volga Flows into Caspian کا نام لیا جا سکتا ھے ' گو کہ ان سب کی حیثیت سرگزشتوں سے زیادہ نہیں ھے - یہ دیکھہ کر افسوس ہوتا ھے کہ ان ھونہار ادیبوں کی تخلیقی قوت نسبتاً انحطاط پذیر ہوگئی ھے - ان میں جو کتابیں دلچسپ ھیں ان کا سرکاری لایحۂ عمل سے زیادہ تعلق نہیں ھے —

سوویت ادب کا تیسرا دور — سنہ ۳۲ ع کی اصلاح

چار پانچ سال کے تجربے کے بعد ثابت ہوگیا کہ سرکاری احکام آرٹ کی تخلیق نہیں کر سکتے اور اگر یہ صورت حال زیادہ دنوں تک باقی رھی تو روس سے فنون لطیفہ کا نام و نشان مٹ جائے گا - مصنفین ادبی انقلاب کی انجمن کی چیرہ دستیوں سے نالاں تھے اور عوام مہملات کے ان دفتروں سے اپلدھن کا کام لینے لگے تھے جو ناولوں اور افسانوں کے نام سے پنساریوں کی دکانوں میں بکا کرتے تھے - آخرکار گورکی کی کوششیں کارگر ہوئیں اور استالین کو اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا - پس سنہ ۳۲ ع میں کمیونسٹ پارٹی نے بیک جنبش قلم ' راپ ' یعنی انجمن انقلاب ادبی کو بند کردیا اور اس کے سرغناؤں کو باندھ کر سائبیریا روانہ کر دیا - اس عرصے میں اس نے کم و بیش ۳۰ ہزار کتابیں شائع کی تھیں جو تقریباً سب نذر آتش کر دی گئیں - انجمن کے ۳۰ لاکھ اعلانات اور اشتہارات ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے گئے اور سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا کہ اس زمانے کی تصنیفوں کا تین چوتھائی حصہ اس قابل نہ تھا کہ کوئی صاحب مذاق اسے آنکھہ اُٹھا کر دیکھے ! ادبی ڈکٹیٹری کے علمبرداروں کی ملامت کی گئی اور تمام سوویت مصنفین کو دعوت دی گئی کہ پورے ملک میں ایک واحد انجمن

Union of Soviet Writers قائم کریں اور اس میں شریک ہوکر اپنے رجحان کے مطابق سوشلسٹ واقعیت کی طرف رجوع کریں —

یہ فیصلہ سنہ ۲۵ ع کے فیصلے کا اعادہ ہے — اس فرق کے ساتھ کہ پہلے ہر مصنف نہج کے طور پر کام کر سکتا تھا لیکن اب وہ اس انجمن کا رکن ہونے پر مجبور ہے - انجمن کی اجازت بغیر کوئی کتاب شائع نہیں ہو سکتی - اس لئے سنہ ۳۲ - ۲۸ ع کے مقابلے میں بہت زیادہ آزادی ہوتے ہوئے بھی انجمن کی اطاعت ضروری ہے - اس کے بعد ادبی و علمی مسائل میں گورکی کی رائے سب سے زیادہ وقیع ہوگئی اور اس کے اِشارے پر فنی اعتبار سے کلاسکل ادب کی پیروی کی تحریک زور پکڑ رہی ہے - زبان کی صفائی اور بیان کی پاکیزگی کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے اور پرولیٹیرین ہنگامہ پروروں کی فحش نگاری اور عامیانہ پسندی کا زور کم ہو رہا ہے - انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اب اس کے مسائل پر غور و خوض کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے - اسی وجہ سے نفسیاتی اور فلسفیانہ ناولوں کی مقبولیت بڑھنے لگی ہے - تین سال پہلے دستوویسکی یا جیمز جائس کا دم بھرنا انقلاب دشمنی کی دلیل تھی لیکن اب ان کا مطالعہ عین سعادت ہے - نظر برآں امید ہو چلی ہے کہ عنقریب سوویت روس کے اس دور کی پھر تجدید ہوگی جس نے سنہ ۲۱ ع سے لے کر سنہ ۲۷ ع تک ایک نیا نشان راہ قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی —

ہم نے دیکھا کہ سوویت ادب کے مختلف ارتقائی منازل حسب ذیل ہیں :

سنہ ۲۱ - ۱۸ ع — استقبالیت اور دوسری انقلاب دوست تحریکوں سے کام لینے کی کوشش : نظم کا رواج اور نثر کا فقدان —

سنہ ۲۴ - ۲۱ ع — سوویت نثر کا ارتقاء اور پرولیٹیرین رجحانات کا زور - ' ہم راہیں ' اور پرولیٹیرین اسکولوں کا تنازع —

سنہ ۲۷ - ۲۵ ع — ادبی آزادی کا اعلان اور پرولیٹیرین اسکول کی سرزنش —

سنہ ۳۲ - ۲۷ ع — ادب پنج سالہ پروگرام کا صیغۂ تبلیغ - پرولیٹیرین ادبی انجمن کا استبداد اور تشدد —

سنہ ۳۲ ع — 'سوشلسٹ حقیقت نگاری' انسداد اور ادبی پارٹی بندیوں کا خاتمہ —

ڈراما | انقلاب نے روسی اسٹیج میں نئی جان ڈال دی - ایک تو روس کے لوگ یوں نہیں تماشوں کے بڑے شائق ہوتے ہیں اور پھر سال ہا سال کی محنت کے بعد کئی ماہرین فن نے روسی اسٹیج کو بام ترقی پر پہنچا دیا تھا - اب اسٹیج کی تبلیغی قدر و قیمت نے سوویٹ حکومت کو فوراً اس طرف متوجہ کیا - ساتھ ساتھ، انقلاب کی ہنگامہ آرائیوں کو فراموش کرنے کے لیے لوگ تفریح کا سامان ڈھونڈ رہے تھے اور اس حال میں اسٹیج کا فروغ لازمی تھا - چنانچہ جب کچھ تنگ نظر بولشیوکوں نے اس بنا پر ماسکو آرٹ تھیٹر کو بند کرنا چاہا کہ اس سے انقلاب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو لینن نے ان لوگوں کو ڈانٹا اور کہا کہ یہ کیا کم ہے کہ وہاں جا کر لوگ اپنے مصائب کو بھول جاتے ہیں —

انقلاب کے زمانے میں روسی اسٹیج میں تین رجحان بہت نمایاں تھے - ایک اسکول استانیسلاوسکی کا تھا جو نفسیاتی واقعیت کو انتہا تک پہنچا چکا تھا - دوسرا تھیروف کا جمالیاتی اسکول تھا - میئر ہولڈ تعمیر پسندی کا علم بردار تھا اور اس کے نزدیک ڈراما نگار یا ایکٹر کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے - ڈائریکٹر ہی سب کچھ تھا اور ان دونوں کو اپنے اشاروں پر نچا سکتا تھا - جس طرح ادب سے انفرادیت کے تمام اثرات مٹائے جارہے تھے اور نفسیات یا جمالیات کو ناپسند کیا جا رہا تھا، اسی طرح اسٹیج پر میئر ہولڈ کی تعمیر پسندی کا بر سر اقتدار ہونا ناگزیر تھا - ۱۶ سال کے متواتر تجربوں کے بعد ابھی سنہ ۳۲ ع میں

ارباب حکومت کی سمجھہ میں آیا کہ لوگ تھیٹر کو مدرسہ نہیں بلکہ تفریح گاہ سمجھتے ہیں اور وہاں وعظ سننے نہیں بلکہ حظ حاصل کرنے جاتے ہیں —

فنی اعتبار سے تکمیل کو پہنچ جانے کے باوجود روسی استیج تمثیلی ادب کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہے - انقلاب سے پہلے کی روسی تمثیلوں میں بڑی حرکت ' تماشے اور قصے کی کمی ہوتی تھی - وہ زیادہ تر خیالات اور کیفیات کا اظہار کرتی ہیں - تماشائیوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی ہے کہ استیج پر انہیں کوئی ' تماشا ' نہیں دکھایا جاتا - سوویت استیج کو اب بھی یہ دقت محسوس ہوتی ہے اور عوام کے مطالبے کا پاس رکھنے کے لیے مجبوراً بیرونی و ملکی کلاسکل ناولوں کو استیج کرنا پڑ رہا ہے - طالسطائی گوگول ' ہیوگو اور اناطول فرانس کے ناولوں کو ڈرامائی جامہ پہنایا جا رہا ہے اور بالآخر تعمیر پسندی کی جگہ وہی قدیم واقعیت لے رہی ہے - اب ڈائرکٹر کے فرائض بھی ڈراما نگار کی ترجمانی اور ایکٹر کی ہدایت تک محدود رہ گئے ہیں -

سوویت تمثیل نگاروں کو ہم تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں - پہلا گروہ ان علم دوستوں کا ہے جو انقلاب کے پہلے سے لکھتے آرہے ہیں اور رومانی یا استقبالی جذبے کا اظہار کرتے ہیں - ان کی تصنیفوں میں زمیاتن کا Flea بیبل کا Maria اویناف کا Armovred Train کوٹیوں کا Squaring the Circle باگھاف کا Days of the Turbins اور الیشا کا Conspiracy of Feelings بہت مشہور ہیں اس گروہ کا شاہکار غالباً لنز کا Outlaw نامی ڈراما ہے —

دوسرا گروہ کسان اور مزدور ڈراما نگاروں کا ہے جن میں میکوویسکی کے Mystery - bovhe اور تریتوکوف کے Roar, china ! نے بڑی شہرت حاصل کی —

تیسرا گروہ نوجوان علم دوستوں کا ہے جنہوں نے انقلاب کے بعد لکھنا شروع کیا - ان کی تمثیلوں میں افینوگنوف کے Fear کرشوں کے Bread اور پوگودین کے

My Friend نے بڑا نام پیدا کیا —

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ان میں سے کوئی ڈراما ایسا نہیں جس کی حیثیت عارضی نہ ہو - سنہ ۳۴ ع میں حکومت کی طرف سے بہترین تمثیلوں کے لیے ایک انعامی مقابلے کا اعلان کیا گیا جس میں ۱۲ سو ڈراما نگاروں نے حصہ لیا - نتیجہ بہت ہی مایوس کن تھا کیوں کہ کوئی ڈراما پہلے انعام کے قابل نہ سمجھا گیا اور دوسرا انعام دو آدمیوں میں اور تیسرا تین آدمیوں میں بانٹا گیا - ثالثوں میں استانیو نسکی اور میئر ہولڈ جیسے ماہرین فن تھے - انہوں نے اپنے فیصلے میں کہا کہ " ہم جس عظیم‌الشان دور زندگی سے گزر رہے ہیں اس کے صنعتی رتبے کا اظہار کرنے والا ایک بھی ڈراما اب تک نہ لکھا جا سکا " - چنانچہ کسی ایسے ڈراما نگار کا انتظار اب بھی ہو رہا ہے جو لوگوں کے شوق ، اسٹیج کی ضروریات اور نئے ماحول کا ایک ایسا امتزاج پیش کر سکے جو فنی اعتبار سے بھی بلند پایہ ہو —

سوویت ادب کی خصوصیات

روس کا ادب جدید جن مختلف دوروں سے گزر رہا ہے ان سب کی کئی خصوصیات اس قدر مشترک ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا —

سب سے بین فرق وہ ہے جو کلاسکل اور سوویت ادب کے درمیان ایک امت لکیر کھینچ دیتا ہے - سوویت ادب میں اس حیص بیص ، اس یاس و حرماں ، اس بے راہ روی اور تزلزل کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے - تاریکی چھنتی جاتی ہے اور مستقبل کا راستہ صاف ہوتا جاتا ہے - اس کی تباہی یقینی ہے جو اجتماعی ماحول سے اپنے کو الگ رکھنا چاہتا ہے - حرفتی ماحول سامنتی فضا کی جگہ لے رہا ہے اور نیکی و بدی کا قدیم تنازع ایک نئی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے - فرد کے داخلی اور نفسی تجزیے پر کسی کی آنکھ نہیں پڑتی - قدیم واقعیت اور اشاریت کی جگہ رومانی و نفسیاتی واقعیت نے لے لی ہے - زبان و بیان کے تکلفات بالائے طاق رکھ

دی گئی ہیں جس سے تخیل اور مشاہدے میں نئی تازگی آگئی ہے - مضامین کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے لیکن طرز نگارش میں پستی آتی جاتی ہے —

ادب زندگی سے قریب تر ہو گیا ہے اور وہ سماجی مسائل سے سر تا سر لبریز ہے - لیکن جمالیاتی اور فنی عناصر کے فقدان کی وجہ سے اس میں اخباروں اور سرگزشتوں کا رنگ زیادہ ہے - مصنفوں اور ناظروں میں یکانگت بڑھتی جاتی ہے - روس کے سوا دنیا کے کسی گوشے میں یہ نہیں ہوتا کہ مصنف اپنے ناولوں کے پس منظر کے صحیح مطالعے کے لیے بذات خود دیہاتوں اور کارخانوں کی خاک چھانتا پھرے اور ناظر اسے اپنے حالات سے باخبر کرنے کے لیے گھر لے جاکر مہمان بنائے - یہ کہیں نہیں ہوتا کہ گورکی اور بیبل کے مرتبے کے ادیبوں پر مزدور اور کسان آزادی سے رائے زنی کریں اور اپنے ڈیپوٹیشن بھیج کر انہیں بتائیں کہ تمہاری کتابوں میں یہ نقائص رہ گئے ہیں - سوویت روس کا ادب یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں خرید و فروخت کی بازاری جنس نہیں ہے - یہ مبالغہ نہیں ہے کہ روس میں سب سے خوش حال طبقہ مصنفوں کا ہے اور وہاں کتابیں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور کسی کتاب کی قیمت چند پیسوں سے زیادہ نہیں ہوتی - اس سے سوویت ادب کی تعلیمی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے —

سوویت ادب میں وہ عالم گیری شان نہ ملے گی جو قدیم روسی ادب کا طرۂ امتیاز ہے اب تک وہ اپنے کو وقتی مسائل اور جغرافئی حدود سے بالا تر نہ کر سکا - یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اصولاً قومیت کا مخالف ہوتے ہوئے بھی اس کی نوعیت قومی ہی ہے - اور چونکہ اس کے موضوعات یکسر ماحولی ہوتے ہیں اس لیے دوسروں کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں ہو سکتی —

ہر ملک کی طرح روس میں بھی ان دنوں شاعری کا معیار پست ہے - اس وجہ سے اور بھی زیادہ کہ وہاں آرٹسٹ پر کئی طرح کی سماجی پابندیاں

عاید ہوتی ہیں —

سوویت ادب کو اپنا 'ہیرو' نہیں ملا ہے کیوں کہ ہنوز وہ انسان جدید کے صحیح خد و خال نہیں بنا سکا ہے - غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ روس ابھی ایک درمیانی دور سے گزر رہا ہے - سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر وہ سوشلسٹ نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور وہاں کا باشندہ ذہنی اعتبار سے سوشلسٹ ہونے پر بھی مادی اعتبار سے اب تک نیم سرمایہ دارانہ حالات میں زندگی گزار رہا ہے- ممکن ہے کہ کچھ عرصے کے بعد انسان جدید کی شکل و صورت زیادہ واضح ہو جائے لیکن اس وقت تک سوویت ادب میں سراسیمگی کی یہی کیفیت باقی رہے گی —

سوویت ادب کا سب سے اہم اور لاینحل مسئلہ یہ ہے کہ کسی اجتماعی سماج میں فرد کی حالت کیا ہوگی - چنانچہ سوویت ادب کا ہر شعبہ اب اس طرف متوجہ ہونے لگا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ فرد کے دکھ درد کو سمجھنے اور نئے حالات سے اس کی شخصیت کو منطبق کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگا ہے-

سوشلزم اور ادب کا مستقبل

کسی سوشلسٹ سماج میں فرد کا مستقبل کیا ہوگا اس کا فیصلہ اس سوال کے جواب پر منحصر ہے کہ وہاں آرٹ اور ادب کا مستقبل کیا ہوگا - بلا شبہ ادب کے موضوعات اور رجحانات کا تعین سماجی ماحول کرتا ہے لیکن اس کے اسلوب اور قالب کی تشکیل آرٹسٹ کی شخصیت کرتی ہے - یہی وجہ ہے کہ آج انہیں کلاسکل ادیبوں سے فن اور طرز انشا کا سبق لینے کی تلقین کی جا رہی ہے جو اپنے میلانات کے اعتبار سے 'رجعت پسند' ہیں - جو فن کار اس وجہ سے برے سمجھے جاتے ہیں کہ وہ درباروں اور محلوں کے خوشہ چیں تھے ان کے شاہکاروں کی نمایش کی جاتی ہے' اس فخر کے ساتھ کہ سوشلزم نے آرٹ کو بھی عوام کی ملکیت بنا دیا ہے —

اس تضاد کی وجہ کیا ہے ؟ ایک طرف ہم مارکس کو شیکسپیر اور بالزاک

کی تصنیفوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور یہ سنتے ہیں کہ لینن صرف کلاسکل ادب سے محظوظ ہوتا تھا اور گوئیٹے ' طالسطائی اور پشکن کا رسیا تھا - دوسری طرف جب ہم سوویت روس کے سرکاری نقادوں کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ کلاسکل ادب کو فنا کردینا چاہیے ' زبان کی لطافتوں اور بیان کی نزاکتوں کو مٹا دینا چاہیئے ' ادیبوں کو سرخ افواج کے سپاہیوں کے ساتھہ قواعد کرنا چاہیے تو ہم حیرانی میں پڑجاتے ہیں کہ جانبین میں کون ' اصولی نقایص ' کے مرتکب ہیں !

سماج کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ادب اس کی زندگی کا ایک شعبہ ہے '' اس لیے اس کا فرض ہے کہ اس کے دکھہ درد کو سمجھے اور بتائے کہ اس کے اسباب کیا ہیں - لیکن سماج اس مطالبے کو منوانے کے لیے فضا پیدا کرتا ہے اور اپنے تاثرات کو ادیب کی روح میں منتقل کرتا ہے - یہ پوری روش داخلی ہوتی ہے- کوئی حکومت یا جماعت جبراً و حکماً ادب کو اپنی خدمت کے لیے مجبور نہیں کرسکتی- سائنس درختوں کو نشتر دے کر پھل پیدا کرا سکتا ہے لیکن یہ پھل بد مزہ ہوتے ہیں - ممکن ہے کہ مصنوعی ترکیبوں سے حسب ضرورت بچے پیدا کرائے جاسکیں لیکن ممکن نہیں کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہوں - اسی طرح جبر و تشدد سے کوئی تخلیقی کام نہیں کرایا جا سکتا - پھر وہ انقلاب جو اس دعوے کی بنا پر ادب کی امانت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ وہ تہذیب کو ہر قسم کے تعصبات سے پاک کردے گا ' اب اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ 'پرولیٹیریٹ' تہذیب کی تدوین کے لیے اپنی خدمات وقف کردے ! بلکہ یہ بھی کہا جانے لگا کہ پرولیٹیریٹ ادب کی تخلیق صرف مزدور ادیب کرسکتے ہیں - ظاہر ہے کہ ہر مزدور پرولیٹیرین ہے عام اس سے کہ اس کا سیاسی یا اقتصادی زاویۂ نگاہ رجعت پرورانہ ہی کیوں نہ ہو - لیکن اصولاً مارکسی صرف وہ ہے ' عام اس سے کہ وہ مزدور ہو یا نہ ہو جو اپنے فلسفۂ زندگی کے

اعتبار سے مارکس کے اصولوں کا پیرو ہے - پھر ادب سے جو زیادہ سے زیادہ مطالبہ ہو سکتا تھا وہ یہ تھا کہ وہ مارکسی نصب العین کی حمایت کرے، جس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ وہ کسی ایک ملک کے قومی اور وقتی مسائل کے لیے اپنے کو وقف کردے - بلکہ اس کے معنے صرف یہ ہوسکتے ہیں کہ وہ ایک عالمگیر انقلاب اور غیر طبقاتی سماج کے مسائل کی طرف اپنے کو متوجہ کرے -

آج نہیں توکل سوشلسٹ سماج کو اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ مذہب کے عدم وجود میں انسان کے روحانی سکون کے لیے کیا کیا جاے - اور اس کا جواب ایملن ایک مکالمے کے دوران میں سوویٹ حکومت کے صدر کیلینن کو یہ ایں الفاظ دے چکا ہے : " آرٹ کے علاوہ انسان نے کوئی ایسا ادارہ پیدا نہیں کیا جو مذہب کی جگہہ لے سکے، اور جب مارکسی نظام زندگی کا مقتضا یہ ہے کہ بے چینی کے تمام اسباب مٹ جائیں، قدرت کے چہرے سے اسرار کا پردہ اٹھہ جاے اور انسان کبھی ہیجان یا احساس سے کام نہ لے بلکہ عقل کا غلام ہو جاے — تو بنا بریں، آرٹ کے مستقبل پر غور و خوض کی اہمیت بہت زیادہ ہوجاتی ہے - آرٹ کے تمام موضوعات کی تہہ تک پہنچ کر دیکھیے کہ ان کی سوت ایک ہے — اور وہی فطرت اور سماج اور سماج وفرد کے تضاد کو ظاہر کرنا - یہ تضاد جتنا کم ہوتا جاے گا، آرٹ کا دائرہ اتنا ہی سمٹتا جاے گا - ان مسائل کے حل کی ایک صورت یہی ہو سکتی ہے کہ سماجی ضروریات کو خطرے میں ڈالے بغیر ادیبوں کو جتنی زیادہ آزادی دی جا سکتی ہے، دی جاے اور تجربے و مشاہدے کے نئے امکانات پیدا کیے جائیں - انقلاب کے زمانے میں آرٹ پر پابندیاں لگانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کی کامیابی کے بعد اسے زیادہ سے زیادہ آزادی مل سکے -

اس کے یہ معنے نہیں کہ انہیں صفحات میں ادب اور زندگی، پر ہم نے جو نظریہ قایم کیا تھا اب خود ہی اس کی تردید کر رہے ہیں - ان دونوں مضمونوں

میں جو ارتباط ہے اسے مارکسی اصول کا خالق اصغر ایلنگلس ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے: " میں یہ نہیں کہتا کہ شاعری جانب دارانہ نہ ہو کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے - ٹریجیڈی کا خالق اسکلیس اور کامیڈی کا جلم داتا ارسٹو فینز — یہ دونوں بڑی حد تک جانب دار تھے اور یہی حال دانتے و سرونٹس کا ہے - لیکن میرا خیال ہے کہ یہ رجحان تحریک اور مواقع سے پیدا ہونا چاہیے' اسے عمداً اجاگر کرنا غیر ضروری ہے - شاعر کا یہ فرض نہیں ہے کہ جس سماجی تفریق کی تصویر پیش کر رہا ہے اس کا تاریخی حل پیش کرے - میرے خیال میں اشتراکیت کے موید ادیبوں کا فرض محض اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ واقعات کو ایمان داری سے اس طرح قلم بند کریں کہ ان سے متعلق رسمی فریبوں کا قلع قمع ہو جائے - اس سے سرمایہ داری کی امید پروری کی بنیادیں ہل جائیں گی اور اس سے پتا چل جائے گا کہ زمانہ فنا کا سرد چنگل اس کے لئے بھی تیار کر رہا ہے " —

کتابیں :

1. Literature and Russian Revolution by Trotsky
2. Soviet Russian Literature by Heb Struve
3. Art and Literature in Soviet Russia by Joseph Freeman
4. Contemporary Russian Literature by D. S. Mirsky
5. An anthology of Soviet Leterature : introduction : by Reavey and Slonim
6. Artist in Uniform by Max Eastman
7. Soviet Literteture by Felinsky

ٹیگور کے ادبی مضامین

ادب کی تخلیق

از

جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار

جس طرح کسی ڈوری کو شکر کے قوام میں لٹکا دیا جائے تو مصری کے ذرات ڈلیوں کی شکل میں اس کے چاروں طرف لپٹ جاتے ہیں اسی طرح ہمارے متفرق دلی جذبات بھی اگر کسی ڈوری کا سہارا پائیں تو وہ اس کے ارد گرد ایک شکل اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں - گمنامی سے منظر عام پر آنے اور انفرادی حیثیت سے اجتماعی حیثیت حاصل کرنے کے لیے ہمارے دل میں ایک لگن لگی ہوئی ہے - اتنا ہی نہیں! ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ تھوڑا سا اشارہ ملتے ہی ہمارے بہت سے جذبات فوراً شکل اختیار کر لیتے ہیں، گویا غیر مشکل جذبات کسی سلسلے میں منضبط ہونے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں - دن کا وقت ہمارے کام کا وقت ہوتا ہے، اس وقت عقل کا سنگین پہرہ رہتا ہے، وہ ہمارے دماغ کے دفتر میں فضول خیالات کو جمع ہونے سے روکتی ہے اور ہمارے کام خراب نہیں ہونے دیتی - اس کی حکومت میں ہمارے جذبات صرف عملی جامہ پہن کر بالکل باقاعدہ طور پر خود کو نمایاں کرنے پر مجبور ہوتے ہیں - فرصت کے اوقات میں بھی ہمارے دماغ کا یہی طرز عمل ہوتا ہے - غالباً کسی پھول کی خوشبو کے پھوٹنے

میں ماضی کی یاد ہمارے تصور کو آئینہ دکھانے لگتی ہے - جوں ہی ایک خیال آتا ہے ' اس کے سہارے کتنی ہی باتیں شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہیں اور ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا - ان تمام کوششوں کا مقصد خود اظہاری کے سوا کچھہ نہیں ہے - جذبات کی حکومت میں اس قسم کی کوشش کا اور چھور نہیں ملتا --

جب تشکیل کی یہ کوشش کامیاب ہوجاتی ہے تو اسے برقرار رکھنے کی جدو جہد ہونے لگتی ہے - کٹھل کے درخت پر موسم میں پھل تو بہت سے نکلتے ہیں لیکن جو پھل ان چھوٹی ڈالیوں میں نکلتے ہیں جن کے ڈنٹھل نازک ہوتے ہیں وہ نمو سے پہلے ہی گر پڑتے ہیں —

ہمارے جذبات کی بھی یہی کیفیت ہے - جو جذبات کسی طرح اس قسم کی ڈوری کا سہارا لیتے ہیں وہ پوری طرح نمو حاصل کرلیتے ہیں - اُن کے چھوٹے چھوٹے اجزا مکمل حسن و خوبی کے ساتھہ نشو و نما پا جاتے ہیں - اُن کی ہستی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے لیکن جن جذبات میں ضبط و نظم قایم کرنے کے لیے بہت تراش خراش کی ضرورت پیش آتی ہے وہ بہت جلد سرد پڑجاتے ہیں —

بعض درخت اس قسم کے بھی ہوتے ہیں کہ ان میں کلیاں لگتے ہی مرجھا جاتی ہیں ' ثمرے کا انتظار نہیں کراتیں - اسی طرح اس قسم کے دل بھی ہوتے ہیں جن میں جذبات صرف آتے جاتے رہتے ہیں لیکن شکل اختیار کرنے کا پورا موقع نہیں پاتے - حساس دلوں میں جذبات کامل طور پر نمایاں ہوتے ہیں کیونکہ ان میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے - اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے جذبات فنا بھی ہو جاتے ہیں لیکن بہت سے اپنا مقصد بھی حاصل کرلیتے ہیں —

درختوں کے جو پھل کامل طور پر نشو و نما حاصل کرچکتے ہیں وہ یہ سوچتے ہیں کہ شاخوں میں لگے رہنے سے ہمارا مقصد پورا نہیں ہوسکتا - ہم پک

کر، رسیلے ہو کر، رنگ و بو سے بہرہ مند ہوکر اور گٹھلیوں میں سخت ہوکر، درخت کو چھوڑ کر زمین کی سیر کریں گے - زمین پر اگر ہم ٹھیک جگہ پر نہ گر سکے تو ہماری ہستی کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا - اسی طرح حساس دل میں جب جذبات تشکیل پاتے ہیں تو وہ بھی یہی سوچا کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اچھا موقع ملا تو انسان کا ئنات کے دل کی زمین پر نئے وجود اور دوامی زندگی کا کھول کھِلنے کے لیے ہم نکل پڑیں گے - جذبات کے پیدا ہونے، پھر اُن کے نشو و نما پانے اور اس کے بعد باہر نکل کر اچھی زمین حاصل کرنے کے اگر یہ تینوں موقعے مل جائیں تو انسان کے دلی جذبات کا مقصد پورا ہو جاتا ہے - جذبات ایک ذی روح کی طرح انسان کو اسی کامیابی کی تاکید کرتے رہتے ہیں اسی لیے انسان انسان کا خموشی سے آپس میں میل ہو رہا ہے - اپنے جذبات کے بوجھ کو ہلکا کرنے اور انہیں دوسروں کے دلوں پر منعکس کرنے کے لیے ایک دل دوسرے کی تلاش میں ہے - عورتیں اسی لیے گھاٹوں پر جمع ہوتی ہیں، دوست دوست کے پاس دوڑتے آتے ہیں، چٹھیاں آتی جاتی ہیں! اسی لیے مجلسوں اور انجمنوں، تقریروں اور تحریروں کا بازار گرم ہوتا ہے - یہی نہیں بلکہ اس کے لیے لوگ باہم دست و گریباں بھی ہو جاتے ہیں - انسان کے جذبات اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اندر ہی اندر انسان کو پیہم تاکید کرتے رہتے ہیں، انسان کو تنہا نہیں رہنے دیتے اور اسی کی تحریک سے تمام دنیا کے لوگ خاموش ہوکر یا بول کر مسلسل اس قدر بکواس کر رہے ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں - یہ سب بکواس کتنی کتھا کہانیوں میں، کتنی افواہوں کتنی چٹھیوں میں، کتنی مورتیوں اور کتنی تصویروں میں، کتنی نثروں اور نظموں میں، کتنے کام کاج میں، کتنی عجیب آرائشوں میں، کتنی قسم کی شکلوں میں، کتنے کارآمد اور فضول جلسوں میں انسانی دنیا کے اندر بکھری شکلوں میں نمایاں ہو رہی ہے - اگر ہم

اسے دل کی آنکھوں سے دیکھیں تو حیران ہونا پڑتا ہے —

تمام انسانی معاشرہ اسی کوشش میں مصروف ہے کہ ایک انسان کے دل کے جذبات دوسرے انسان کے دل کی ملکیت بن جائیں- اسی تحریک کے ذریعے ہمارے جذبات قدرتاً ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو نہ صرف حساس لوگوں کی بلکہ عام لوگوں کی بھی ملکیت بن جاتی ہے - عام طور پر یہ غیر محسوس طریقے سے ہوا کرتا ہے- غور کرنے پر غالباً سبھی لوگ اس بات پر متفق نظر آئیں گے کہ جب ہم کوئی بات اپنے کسی دوست سے کہتے ہیں تو وہ بات اپنے آپ کو اس دوست کے دل کے موافق گھڑ لیتی ہے - ہم ایک دوست کو جس طرح خط لکھتے ہیں ٹھیک اسی طرح دوسرے دوست کو نہیں لکھ سکتے - ہمارے جذبات کسی خاص دوست سے یگانگت کرنے کی پوشیدہ تحریک کے ذریعے اُس کے رجحانات کے ساتھ بہت کچھ مطابقت پیدا کر لیتے ہیں - دراصل ہماری بات کہنے والے اور سننے والے دونوں کے میل ہی سے بنتی ہے —

یہی سبب ہے کہ ادبیات میں ادیب جن کے سامنے اپنے مضامین پیش کرتا ہے غیر محسوس طریقے پر اپنے مضامین کو ان کی فطرت کے موافق بنا لیتا ہے - " داشو رائے " کی " پانچالی " صرف داشو رائے یا داشرتھی ہی کی نہیں ہے - جو سماج اُس " پانچالی " کو سنتا ہے اسی سے متاثر ہو کر یہ " پانچالی " لکھی گئی ہے- اس لیے اس پانچالی میں صرف داشرتھی ہی کے من کی بات نہیں پائی جاتی' اس کے ذریعے ایک خاص زمانے کی ' خاص جماعت کی محبت ' نفرت ' عقیدت ' ایمان اور رجحان وغیرہ خود بخود نمایاں ہوتے ہیں —

اس طرح مصنفوں میں سے کسی نے کسی دوست کو' کسی نے کسی فرقے کو' کسی نے کسی سوسائٹی کو اور کسی نے ہر زمانے کے انسان کو اپنی بات سنانی چاہی ہے - اور جو اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں ان کی تصنیفوں میں خاص طور پر اُس

دوست کا ' فرقے کا ' سوسائٹی کا یا اس انسان کائنات کا کچھہ نہ کچھہ تعارف پایا جاتا ہے - اس قسم کا ادب نہ صرف مصنف کا بلکہ ان لوگوں کا بھی تعارف کراتا ہے جن کے لیے وہ لکھا گیا ہے —

عالم اشیا میں جب کوئی چیز اپنے ماحول کی مناسبت سے ٹھیک جگہ پاتی ہے تب اپنے گرد و پیش کی موزونیت سے وہ دایم و قائم ہو جاتی ہے - ادبیات کا بھی یہی حال ہے - جو چیز ایک جگہ پر قائم ہو جاتی ہے وہ نہ صرف اپنا تعارف کراتی ہے بلکہ اپنے اطراف کی اشیا کا بھی تعارف کراتی ہے کیوں کہ وہ صرف اپنی وجہ سے نہیں بلکہ اطراف کی چیزوں کے سبب سے عمر دراز حاصل کر رہی ہے —

اب ادبیات کی اسی ابتدائی مثال پر غور کیجیے - اس کی دو ایک مثالیں اور دی جاتی ہیں —

نہ معلوم کتنی مرتبہ برسات کے بادل ' بگلوں کی قطاریں ' پانی برسنے کے بعد تپتی ہوئی زمین کی خوشبو ' اور نہ معلوم کتنے پہاڑوں ' جنگلوں ' ندیوں' نالوں' شہروں اور گانووں سے اوپر سے اساڑہ کی گھنگور گھٹاؤں کی آہستہ خرامی شاعر کے دل میں نہ معلوم کتنے دنوں تک کتنے جذبات کو پیدا کر تی رہی ہے اور احساس حسن کے لذت آگیں درد کا ساز چھیڑتی رہی ہے اور کس کے دل میں ایسا نہیں ہوتا - دنیا تو دن رات ہمارے دل کے ساز کو چھیڑتی رہتی ہے اور اسی سے ہمارے دل کے تاروں سے کچھہ نہ کچھہ آواز نکلتی ہی رہتی ہے —

ایک دن کالی داس کے دل میں بھی غیر مبہم آوازیں ایک ڈوری کا سہارا لے کر ' ایک کے بعد دوسری اکٹھی ہو کر ' صاف طور پر نظر آنے لگیں اور انہوں نے ایک خوبصورت اور باقاعدہ شکل اختیار کرلی - بہت دنوں کے بہت سے جذبات کی تصویریں کالی داس کے دل میں اسی بہترین موقع کے انتظار میں گھومتی پھرتی

تھیں آج وہ تصویریں یکش * کے فراق کی کہانی کی بنیاد " میگھہ دوت " کے هر جز میں " مندا کرانتا " † کے هر بند میں جمع هو گئی هیں - آج وہ تصویریں ایک کے ساتھہ سب اور سب کے ساتھہ ایک هو کر دوامی بن گئی هیں —

ستی لکشمی کہلے سے همارے دل میں جو جذبات پیدا هوتے هیں اُن سے هم اچھی طرح واقف هیں - هم میں سے هر ایک نے اس طرح کی کوئی نہ کوئی عورت ضرور دیکھی هے جسے دیکھہ کر عصمت کی اهمیت نے همارے دل کو کچھہ نہ کچھہ متاثر کیا هے - خانہ داری کے معمولی کاموں میں هم نے بہتری کی جس مقدس شکل کو اکثر دیکھا هے اس منظر کی یاد همارے دل میں دھندلے سایے کی طرح گھومتی رهتی هے —

کالی داس نے کمار سنبھو (کالی داس کی ایک نظم) کی کہانی کے سہارے ستی عورتوں کے بارے میں ان تمام جذبات کو جو هوا میں اڑتے پھرتے تھے ' حیرت انگیز طریقے سے اکٹھا کر کے قابل احساس بنا دیا هے - گھر گھر میں وفادار عورتوں کی جس سخت ریاضت کی جھلک گھر کے کاموں کی آڑ میں نظر آتی هے وہ مندا کنی ‡ کی لہر سے دھلے هوے دیودار کے جنگل کے سایے میں همالیہ کی چٹان پر بیٹھی هوئی دیوی کی ریاضت کی تصویر میں ابدی زمانے تک نمایاں هو اٹھی - جسے هم عشقیہ نظم کہا کرتے هیں وہ بھی همارے دل میں زمانۂ قدیم سے موج زن ایک جذبہ هے جو کسی بہترین موقع کا سہارا لے کر نکل پڑتا هے - جس طرح " ودیا پتی " کا یہ مصرع هے : —

---

* کُبیر (دولت کا دیوتا) کے خادموں کی ایک قوم کا نام جو اس کی دولت اور اس کے باغوں کی حفاظت کرتے هیں -

† مندا کرانتا سنسکرت کی شاعری کی ایک بحر کا نام هے -

‡ جنت کے ایک دریا کا نام جسے جنتی گنگا بھی کہتے هیں -

بھرا بادر ماہ بھادر شونیہ مندر مور

بھادوں کا مہینہ ہے، بادل چھائے ہوئے ہیں لیکن میرا گھر سونا ہے - بھادوں کے مہینے میں جب آسمان بادلوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے تو سونے گھر میں جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ نہ جانے کتنے دلوں کے اندر کتنے دنوں تک چپ چاپ چکر لگاتی رہی ہے - جونہی اظہار کے لیے اسے کوئی مناسب بحر مل گئی تو سمجھنا چاہیے کہ دلوں کا وہ غبار کوئی شکل اختیار کر رہا ہے -

ہوا میں پانی کے ذرات تو اڑتے ہی رہتے ہیں لیکن جب وہ پھولوں کی سرد پنکھڑیوں کو چھوتے ہیں تو منجمد ہوکر اس کی شکل میں نظر آتے ہیں - آسمان میں بھاپ یا پانی کے نہایت باریک ذرات اُڑتے پھرتے ہیں جو نظر نہیں آتے لیکن جب یہی ذرات پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں تو بادلوں کی شکل میں اکٹھے ہوجاتے ہیں اور جب وہ زور سے برستے ہیں تو ندی نالے بہہ نکلتے ہیں - اسی طرح عشقیہ نظم میں بھی صرف ایک ہی جذبہ موتی کی طرح چمک اٹھتا ہے اور شاعری کی بڑی بڑی کتابوں میں جذبات کا عظیم الشان اجتماع آبشار کی شکل میں رواں ہوتا ہے - اصل بات یہ ہے کہ بھاپ یا پانی کے ذرات کی طرح پوشیدہ جذبات بھی شاعر کے تخیل کے ساتھ ٹکراتے رہتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب و غریب حسین شکل میں نمایاں ہوجاتے ہیں -

موسم برشکال کی طرح انسانی معاشرے میں بھی کبھی کبھی ایسا وقت آتا ہے جب ہوا میں جذبات کے ابخرات کثرت سے اُڑتے پھرتے ہیں - چیتنیہ (بنگال کے ایک مہاتما) کے بعد بنگال کی یہی حالت تھی اور اس وقت فضاے آسمانی محبت کے رس سے بھری ہوئی تھی اس لیے اس زمانے میں جتنے شاعر تھے سب نے اسی رس کے ابخرات کو جمع کر کے کیسی بے مثل زبان اور کتنی نئی نئی بحروں میں کس قدر قوت اور زور سے برسایا تھا -

انقلاب فرانس کے وقت بھی انسانی محبت کے جذبات کی اونچی اونچی ترنگیں بڑے زور سے اٹھی تھیں جنھوں نے مختلف شاعروں کے دل کے ساتھ مل کر کہیں احساس غم اور کہیں بغاوت کے سر میں خود کو مختلف شکلوں میں مسلسل نمایاں کیا تھا - اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانوں کا دل جن بہت سے پوشیدہ جذبات کو نمایاں کرتا رہتا ہے اور جو معمولی تکلیف ، معمولی فکر اور معمولی کاروبار میں انسان کائنات کے وسیع دل کی دنیا پر منڈلاتے رہتے ہیں ، یہی جذبات مختلف شاعروں کے مختلف تخیلات کا سہارا لے کر ہر انسان کے سامنے طرح طرح سے صورت پذیر ہوجاتے ہیں اور جذبات کی انھیں شکلوں کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوتی ہے اور اس خوشی کی کیا وجہ ہے ؟ یہی کہ اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے انسان ہمیشہ سے کوشاں ہے - اسی لیے جس جگہ وہ کسی طرح کی یکسانیت میں اپنی کسی قسم کو فروغ پذیر پاتا ہے وہاں اس کی یہ دوامی کوشش کامیاب ہوجاتی ہے اور اس لیے اسے بہت خوشی ہوتی ہے - صرف ادبیات ہی کی نہیں بلکہ حکمت اور فلسفے کی بھی یہی حالت ہے - علم حکمت کے تمام سوالات اور تمام جذبات پوشیدہ شکل میں ہر انسان کے دل میں موجود ہیں - کسی حکیم کی ذہانت جب ان سوالات اور جذبات میں سے کسی ایک کے مجموعے کا احاطہ کرلیتی ہے تو اس کی شکل اور اس کا مطالعہ ہمارے لیے صاف ہوجاتا ہے - اور ہم اپنے ہی دل کے تخیلات سے بنا ہوا عکس ان میں دیکھتے ہیں - تاریخ لوگوں میں روایت کی شکل میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب کسی مورخ کی ذہانت اسے ایک ڈوری میں باندھ لیتی ہے تب عرصۂ دراز کی پوشیدہ تاریخ کی شکل ہمارے سامنے نمایاں ہوجاتی ہے —

ادبیات کے نقادوں کے لیے قابل غور مضمون یہی ہے کہ کسی شاعر کے تخیل میں انسان کے دلی جذبات کی کسی خاص شکل نے اپنے صورت انگیز جلوے

کو حسن کے ذریعے نمایاں کیا ہے - کالی داس کی تشبیہ اچھی ہے یا اس کی زبان رسیلی ہے ' یا " کمار سمبھو " کے تیسرے باب میں حسن بیان ہے یا " شکنتلا " کے چوتھے ایکٹ میں جذبات غم کی کثرت ہے ' یہ تنقید کافی نہیں لیکن کالی داس کی شاعری کی تمام کتابوں میں دل انسانی کی ایک خاص شکل نمودار ہوئی ہے - شاعر کے تخیل نے اضافہ و ترک کے قواعد کے ذریعے انسان کی دلی دنیا میں کن پوشیدہ جذبات کو ایک خاص حسن سے نمایاں کیا ہے ؟ نقادوں کے لیے یہی امر قابل غور ہے -

کالی داس نے دنیا میں پیدا ہو کر بہت کچھ دیکھا ' غور کیا ' برداشت کیا ' تخئیلی اور تخلیقی کام کیا اس کے اس غور ' مطالعہ اور تخیل کی زندگی کے ذریعے انسان کی بے انتہا شکلوں میں سے ایک خاص شکل ہی ہمارے سامنے نمایاں ہوئی ہے - نقاد خود فیصلہ کریں کہ یہ کونسی شکل ہے ؟ اگر ہم میں سے ہر ایک غیر معمولی شاعر ہوتا تو اپنے دل کو یوں سنوارتا کہ اس میں جذبات کی ایک بے مثل شکل نظر آتی - اور اس طرح یہ بے انتہا اور مختلف جذبات کی بے مثل شکلیں ایک ہو کر ایک غیر محدود شکل میں نظر آتیں - لیکن ہم میں ویسی قابلیت نہیں - ہم اپنا خیال ٹوٹی پھوٹی زبان میں ادا کرتے ہیں ' ہم اپنے آپ کو اچھی طرح نہیں جانتے - جس چیز کی ہم حقیقت بتاتے ہیں وہ یا تو حقیقی سچائی نہیں ہوتی یا دس آدمیوں کی صرف بار بار اعادہ کی ہوئی چیز ہوتی ہے - اسی لیے ہم نے اپنی تمام زندگی میں کیا دیکھا ' کیا سمجھا ' کیا پایا ؟ ہم اسے مکمل اور واضح طور پر نہیں بتا سکتے ' اور نہ شاعر اسے کامل طور پر بتلا سکتے ہیں ' کیونکہ ان کی زبان بھی اکثر مقامات پر صاف ' سچی اور خوبصورت نہیں ہوتی - اپنی فطرت کے عمیق مطالب کو صاف طور پر ظاہر کرنے میں ان کی کوشش بھی ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتی - لیکن جہاں ان کی

کوششیں رک جاتی ہیں وہاں ان کوششوں کے علاوہ ایک خفیہ عالمگیر تحریک سے تمام رکاوٹوں اور دھندلکوں میں سے دل کی ایک شکل " جسے ہم پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں مگر نہیں پکڑ سکتے " خود بخود کبھی معمولی اور کبھی زیادہ شدت سے نمایاں ہوا کرتی ہے - جو دوربین ہیں وہ شاعر کی شاعری میں اسی کامل شکل کو دیکھتے ہیں اور وہی ادبیات کے حقیقی نقاد ہوتے ہیں —

ان سب باتوں کے کہنے سے ہمارا یہ مطلب ہے کہ ہمارے جذبات کی تخلیق تخیل محض نہیں ' دنیا کی اور چیزوں کی طرح یہ بھی ایک زبردست قانون کا تابع ہے - روشنی کے جس اضطرار کو ہم بیرونی دنیا کے تمام ذرات میں دیکھتے ہیں وہی ایک اضطرار ہمارے دلی افعال میں جاری و ساری ہے - اس لیے جن آنکھوں سے ہم پہاڑ ' جنگل ' ندی ' ریگستان اور سمندر کو دیکھتے ہیں ' ادب کو بھی انہیں آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا ' یہ ہمارا یا تمہارا نہیں ہے بلکہ تمام کائنات کا ایک جز ہے —

اگر ہم اس طرح دیکھیں تو ادبیات کی صرف اچھائی یا برائی کا خیال کر کے خاموش نہیں بیٹھا جائے گا ' بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کی نشو و نما کا طریقہ اور اس کے وسیع علت و معلول کے رشتے کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہو جائے گی - ہم اسے مثال کے ذریعے صاف کرنے کی کوشش کریں گے —

" دیہاتی ادب " نامی مضمون میں ہم نے لکھا ہے کہ ملک کے عوام میں پہلے پہل کئی جذبات چھوٹی چھوٹی نظموں کی شکل اختیار کرتے ہیں - اس کے بعد کوئی شاعر انہیں چھوٹی چھوٹی نظموں کو ایک بڑی نظم کے رشتے میں منسلک کر کے ایک شاندار شکل میں منتقل کر لیتا ہے - مہادیو پاربتی کی کئی کہانیاں جو کسی پران (دیو مالا) میں نہیں ہیں ' رام اور سیتا کے کئی افسانے جو اصلی رامائن میں نہیں ملتے ' دیہات کے گویوں اور افسانہ کہنے والوں کی زبانوں سے

دیہات کے چوپالوں میں ٹوٹی پھوٹی بحروں اور گنوارو بولیوں کے ذریعے نہ معلوم کتنے عرصے تک شایع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب کوئی درباری شاعر کسی جھونپڑی کے صحن میں نہیں بلکہ ایک شان دار اور مہذب مجلس میں اپنی نظم سنانے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے تو وہ انہیں دیہاتی کہانیوں کو اپنا بنا کر خوبصورت اور مصفیٰ بحروں اور بلیغ زبان میں پیش کر کے عظیم الشان بنا دیتا ہے۔ پرانی چیزوں کو نئی بنا کر' اور متفرق چیزوں کو یک جا کر کے دکھانے سے تمام ملک اپنے دل کو حسین اور مصفیٰ شکل میں دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کے راستے میں ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ "مکند رام" کی "چنڈی"، "گھن رام" کا "دھرم منگل"، "کیتکی داس" کا "منسار بھاسان"، "بھارت چندر" کا "ان دامنگل" اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ یہ سب بنگال کے چھوٹے چھوٹے دیہات کی ادبیات کو ایک عظیم الشان ادب میں منتقل کرنے کی کوشش ہے۔ اس طرح دیہاتی ادب اپنی زندگی کو ایک شان دار ادب میں ضم کر کے اس پھول کی طرح فنا ہو جاتا ہے جس کی ہستی پھل کے وجود کے لیے باقی نہیں رہتی —

"پنچ تنتر"، "کتھا سرت ساگر"، "انگلینڈ کے آرتھر کی کہانی" اور اسکینڈے نیویا کا "ادبیات ساگا" اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں عام مروجہ چھوٹی چھوٹی باتیں ایک ہی جگہ شان دار شکل میں نمایاں طور پر منتقل ہوگئی ہیں —

اس طرح الگ الگ بکھرے ہوئے جذبات کے ایک شان دار شکل میں منتقل ہو جانے کی کوشش نے حیرت انگیز ارتقا حاصل کیا ہے مثلاً یونان میں "ہومر" کا کلام اور ہندوستان میں رامائن اور مہابھارت۔

"ایلیڈ" اور "اوڈے سی" میں بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں آپس

میں مل کر ایک ہو گئی ہیں، یہ کُلیہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے - جس وقت قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا رواج نہیں تھا اور جس وقت گویے نظمیں گاتے ہوے پھرا کرتے تھے، اس وقت کسی چھوٹی سی نظم کا مختلف اوقات میں مختلف انسانوں کے ذریعے ایک شاندار شکل میں منتقل ہو جانا کوئی تعجب نہیں ہے - لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جس چوکھٹے میں یہ شاندار نظمیں جڑی گئیں ہیں وہ ایک ہی شاعر اعظم کا بنایا ہوا ہے - کیونکہ ان نظموں میں جو کچھہ اضافہ ہوا ہے وہ اس چوکھٹے کی ترتیب کے مطابق یکسانیت لیے ہوے ہے -

متھلا کے ودیا پتی (هندی کا ایک شاعر) کے گانے کس طرح بنگالی نظم کے پد (قطعات) بن گئے؟ اس بات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح قانون قدرت کے مطابق ایک چیز دوسری شکل میں آجاتی ہے - بنگالی زبان میں ودیا پتی کے جو مروجہ پد ہیں وہ ودیا پتی کے نہیں کہے جا سکتے - ان بنگالی پدوں میں شاعر کا اصلی رنگ بہت کچھہ مفقود ہے - رفتہ رفتہ بنگالی گویوں اور سننے والوں کے ذریعے شاعر کی زبان، معنی اور حتیٰ کہ رس میں بھی تبدیلی ہو گئی ہے اور وہ ایک نئی چیز بن گئی ہے - گریرسن نے ودیاپتی کے جو اصلی پد شایع کیے ہیں ان میں سے دو چار ہی بنگالی پدوں سے مطابقت رکھتے ہیں زیادہ حصہ مطابقت نہیں رکھتا - پھر بھی مختلف اوقات اور مختلف لوگوں کے ذریعے تبدیلیوں کے باوجود بھی ان پدوں میں بے تعلقی نہیں پائی جاتی - اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اصلی سر ایک مرکز پر قایم رہ کر تمام تبدیلیوں کو اپنے میں ضم کرنے کے لیے تیار رہا ہے - اسی سر کے سبب سے ان پدوں کو ہم ودیاپتی کے پد کہتے ہیں اور ابتدا سے انتہا تک تبدیلیوں کی وجہ سے انھیں بنگالی ادب کہنے میں ہمیں کسی پس و پیش کی ضرورت نہیں -

اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھہ میں آسکتی ہے کہ پہلے پہل بہت سے لوگوں

میں جو گانے مروج ہوتے ہیں وہ ایک نظم میں منسلک ہو جاتے ہیں اور جب وہ نظم عوام میں ایک عرصے تک گائی جاتی ہے تب اس پر مختلف زبانوں میں مختلف لوگوں کا اثر پڑا کرتا ہے - وہ نظم ملک کے چاروں طرف سے اپنے تدویلی اجزا خود بخود جذب کر لیتی ہے - اسی طرح آہستہ آہستہ وہ نظم تمام ملک کی ملک ہو جاتی ہے - اُس میں تمام ملک کے اندرونی احساسات کی تاریخ' فلسفہ' اخلاقیات اور مختلف اسالیب عمل خود بخود مل جاتے ہیں - جو شاعر ابتدا میں اس کی بنیاد رکھتا ہے اس کی حیرت انگیز قوت ہی کی بدولت ان کا اجتماع اس نظم میں ممکن ہو جاتا ہے - وہ اس ترکیب سے اس کی بنیاد رکھتا ہے' اس کا خاکہ اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ وہ ایک عرصے تک تمام ملک کو اپنے کام میں مصروف رکھ سکتا ہے - ہم یہ نہیں کہتے کہ اتنے زمانے تک اتنے لوگوں کے اثرات سے اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوتی تاہم اصلی خاکے کی شان اس میں بھی باقی رہتی ہے —

راماین اور مہابھارت اور خاص کر مہابھارت اس امر کی شاہد ہے - اس طرح وقتاً فوقتاً ایک پوری قوم جس نظم کو کسی شاعر کی شاعری کی بنیاد کا سہارا لے کر بناتی ہے حقیقت میں اسی کو نظم اعظم (مہا کاویہ) کہا جاتا ہے —

اس نظم کا ہم گنگا' برہم پترا وغیرہ دریاؤں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں - ابتدا میں پہاڑ کے بہت سے پوشیدہ غاروں میں سے بہت سے جھرنے ایک جگہ مل کر ایک بڑی ندی بنا لیتے ہیں - اس کے بعد جب وہ ندی اپنے راستے پر چل نکلتی ہے تو بہت سے ملکوں کی معاون ندیاں اس کے ساتھ مل کر اپنی ہستی کو اس میں ضم کر دیتی ہیں —

لیکن ہندوستان کی گنگا' مصر کا نیل اور چین کا یلگ سی کیانگ وغیرہ بڑے دریا دنیا میں چند ہی ہیں - یہ تمام دریا ماں کی طرح ایک صوبے سے دوسرے صوبے کی پرورش کرتے ہوئے بہتے ہیں - ان میں سے ہر ایک دریا قدیم تمدن کی

پرورش کر رہا ہے —

اسی طرح ہمارے ادب معروف میں نظمہائے اعظم صرف چار ہی ہیں - ایلیڈ، اوڈےسی، راماٹن اور مہابھارت - فن عروض کے اصول موضوعہ کے لحاظ سے رگھوونش، بھاروی، ماگھ، ملٹن کے پیرڈائز لاسٹ، والٹیر کے ہارنڈ وغیرہ کو نظم اعظم کے درجے میں جگہ دی جاتی ہے - اس کے بعد آج کل کے مطابع کے زمانے میں نظمہائے اعظم کے بننے کا امکان جاتا رہا ہے —

راماٹن کی تخلیق سے پہلے رام کی زندگی کے بارے میں جو تمام قدیم افسانے ملک کے عوام میں مروج تھے ان کا اب تلاش کرنے سے بھی پتا نہیں چلتا - لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اُن میں راماٹن کی تخلیق کے اشارات موجود تھے —

ہمارے ملک میں جو جو بہادر لوگ اوتار مانے گئے ہیں انہوں نے دنیا کی بھلائی کے لیے کوئی نہ کوئی غیر معمولی کام کیا تھا - راماٹن کی تخلیق سے پہلے ملک میں رامچندر کے بارے میں اسی طرح کی روایتیں ضرور مروج تھیں - وہ اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے جنگل میں گئے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی کا اغوا کرنے والے کو مار کر اپنی بیوی کو حاصل کیا تھا - اگرچہ ان واقعات سے ان کی زندگی کی عظمت ثابت ہوتی ہے لیکن جس غیر معمولی فلاح عوام سے انہوں نے لوگوں کا دل موہ لیا تھا، راماٹن میں صرف اس کا ایک عکس نظر آتا ہے —

ہندوستان پر آریوں کے فتح حاصل کرنے سے پہلے جن غیر آریوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کو شکست دے کر اس ملک پر قبضہ کیا تھا وہ بالکل غیر متمدن نہیں تھے، وہ آریوں سے آسانی سے مغلوب نہیں ہوے - وہ آریوں کے ہون میں رکاوٹیں ڈالتے تھے - ان کی کھیتی کو نقصان پہنچاتے تھے اور راہب اعظم جن جنگلوں کو صاف کرکے آشرم بناتے تھے وہاں جاکر دنگا فساد کرتے تھے —

جنوبی علاقے کے کسی دشوار گزار مقام پر اس غیر آریائی قوم کے شاہی

خاندان نے بے انتہا طاقت ور بن کر ایک بڑی خوش حال حکومت کی بنا ڈالی تھی - اسی حکومت کی بھیجی ہوی فوج نے جنگلوں سے نکل کر آریوں کی آبادی کو تنگ کر رکھا تھا —

رامچندر نے بندروں یعنی ہندوستان کے قدیم باشندوں کی فوج لے کر بہت دنوں کی محنت اور عقلمندی سے غیر آریائی قوم کی عظمت کو مٹا دیا تھا - اسی سبب سے ان کی عظمت کے گیت آریوں میں ہر جگہ گائے جاتے تھے - جس طرح "شک" قوم کے جبر و ظلم سے ہندوؤں کو نجات دلا کر راجا بکرماجیت نے عظمت حاصل کی تھی، اسی طرح غیر آریوں کی قوت کو کچل کر جنھوں نے آریوں کو چھٹکارا دلایا تھا رہ بھی عوام کے نزدیک ہر دلعزیز اور قابل عزت ہوگئے تھے -

اس وقت چاروں طرف یہی خیال پیدا ہو چکا تھا کہ ان مظالم کی کون بیخ کنی کرے گا - وشوامتر نے بچپن ہی میں رامچندر میں آثار قابلیت دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ یہی شخص آریوں کو غیر آریوں کے مظالم سے بچا سکے گا - وشوامتر کی حوصلہ افزائی اور تعلیم نے رامچندر کو بچپن ہی سے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ دشمنوں کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے لگے تھے - وہ ایام طفولیت ہی سے اس کی اطلاع دے رہے تھے کہ وحشی راجا "گوہ" کے ساتھ دوستی کر کے کس طرح دشمن پر فتح یابی ہوگی —

اس وقت گائیں، مال اور کھیتی مقدس چیزیں خیال کی جاتی تھیں - راجا جنک اپنے ہاتھوں سے کھیتی کیا کرتا تھا - اسی کھیتی کے ہل کے ذریعے ہی آریا ہندوستان کی زمین کو رفتہ رفتہ اپنی بنا رہے تھے - اِسی ہل کے ذریعے وہ جنگلوں کو کھیتوں میں تبدیل کر رہے تھے اور راکشس اُن کے اسی کام میں رکاوٹیں ڈالتے تھے —

قدیم بڑے آدمیوں میں راجا جنک آریا تہذیب کے علم بردار ہوے ہیں -

مختلف روایتیں اس کی تائید کرتی ہیں کہ ہندوستان میں زراعت کی ترقی کے لیے انہوں نے خاص محنت کی - انہوں نے اپنی لڑکی کا نام بھی " سیتا " رکھا تھا، جس کے معنی اس نالی کے ہیں جو بیج ڈالنے کے لیے ہل سے بنائی جاتی ہے- انہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ جو بہادر آدمی کمان توڑ کر غیرمعمولی طاقت کا مظاہرہ کرے گا اسی کو میں اپنی لڑکی دوں گا- اُس پر آشوب زمانے میں انہیں ایک غیر معمولی طاقتور انسان کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی - طاقتور دشمن کے مقابلے میں جو مرد کھڑا ہو سکے گا اس کے انتخاب کا یہی ایک ذریعہ تھا —

وشوامتر نے رام چندر کو غیر آریا کے مغلوب کرنے کے لیے مستعد بنا کر راجا جنک کی آزمائش گاہ میں پیش کر دیا تھا، جہاں انہوں نے کمان توڑ کر خود کو اس کام کا اہل ثابت کر دیا —

اس کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی بھرت کو راج پاٹ دے کر اپنا عہد پورا کرنے کے لیے جنگل کو چلے گئے - بھردواج، اگستیہ وغیرہ رشی جو دکن کے دشوار گزار علاقوں میں رہتے تھے اور جو آریوں کی نو آبادیات قائم کرنے میں مصروف تھے، ان سب کی صلاح سے وہ نامعلوم جنگلوں میں غائب ہو گئے —

انہوں نے وہاں بالی اور سگریو نامی دو رقیب بھائیوں میں سے ایک کو مار کر دوسرے کو اپنی جماعت میں شامل کر لیا اور بندروں کو اپنے قبضے میں لے کر انہیں فنون جنگ سکھائے اور ایک زبردست فوج بنا لی- اسی فوج کے ذریعے انہوں نے بڑی دانائی سے دشمنوں میں پھوٹ ڈال کر لنکا کو برباد کر دیا - یہ راکشس فن تعمیر میں بڑے ماہر تھے - یدھشٹر نے جو عجیب و غریب شاہی محل تعمیر کرایا تھا اس کا میر عمارت 'مے' نامی راکشس ہی تھا - مندروں کے بنانے میں غیر آریوں کی فنی مہارت آج تک قابل قدر خیال کی جاتی ہے - کئی لوگ انہیں قدیم مصریوں کی نسل بتاتے ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے -

جو کچھہ بھی ہو " سونے کی لنکا " کی جو روایت عوام میں مشہور ہو گئی تھی اس کی کچھہ نہ کچھہ اصلیت ضرور تھی - یہ راکشس غیر مہذب نہیں تھے اور فن تعمیر میں تو آریوں کے مقابلے میں زیادہ ماہر تھے —

رام چندر نے دشمنوں پر فتح تو پائی مگر ان کی سلطنت پر قبضہ نہیں کیا - دبھی شن ان کا دوست بن کر لنکا پر حکومت کرنے لگا - انہوں نے " کشن کندھا " کی حکومت بندروں کو دے کر ہمیشہ کے لیے انہیں اپنے قابو میں کرلیا - اس طرح رام چندر نے آریوں کے ساتھہ غیر آریوں کا میل کر کے آپس میں لین دین کا سلسلہ قائم کر دیا - یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ غیر آریا رفتہ رفتہ آریوں نے معاشرے میں مل گئے اور اس طرح ہندو قوم کی تخلیق ہوئی - اِس ہندو قوم میں دونوں قوموں کے رسم و رواج ، خیالات ، اور عبادت کے طریقے وغیرہ سب کچھہ مل گئے اور ہندوستان میں امن قائم ہو گیا —

رفتہ رفتہ جب آریا اور غیر آریا کا ملاپ کامل ترقی کر گیا اور آپس میں مذہب اور علم کا تبادلہ ہو گیا تب رام چندر کی پرانی کہانی ہر جگہ مختلف جذبات اور شکلیں اختیار کرنے لگی - اگر کسی دن ہندوستانیوں اور انگریزوں کا میل ملاپ ہو جائے تو کیا کلائیو کی تعریف کے گیت گانے کی کوئی ضرورت باقی رہے گی؟ یا غدر کے زمانے کے اوٹرام جیسے جنگ پروروں کی کہانیوں کو زندہ رکھنے کی کوئی خواہش رہ سکے گی —

جس شاعر نے ملک میں رام چندر کی مروجہ سوانح عمریوں کو نظم اعظم میں منسلک کر دیا اس نے غیر آریا کے قابو میں کرنے والے واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور رام چندر کے سوانح حیات کے مکمل نمونے کو وسیع شکل میں نمایاں کر دیا - غالباً یہ درست نہیں ہے کہ شاعر نے اسے نمایاں کیا ، رام چندر کی قابل

پرستش یاد رفتہ رفتہ مختلف زمانوں اور مختلف حالات کے تحت عوام کی پرستش کے لیے مفید بن رہی تھی - شاعر نے اپنی جدت سے اِسے یک جا کر کے صاف طور پر نمایاں کر دیا - اس وقت عوام کی پرستش کا مقصد پورا ہو گیا —

لیکن ایسا نہیں ہے کہ پہلے شاعر (والمیکی) نے جو شکل دی تھی وہ بدلی نہ ہو - رامائن کے پہلے شاعر والمیکی نے رام چندر کو ہندو سماج کے فرائض کا اوتار بنا کر دکھایا ہے جس میں گھریلو زندگی ' اہمیت رکھتی ہے - بیٹے ' بھائی ' شوہر ' دوست ' برہمنی مذہب کے محافظ اور آخر میں راجا کی شکل میں والمیکی نے رام کو قابل پرستش ثابت کر دیا - انہوں نے صرف اپنی بیوی کی رہائی کے لیے ہی راون کو قتل کیا اور صرف رعایا کی خوشنودی کی خاطر اُسے چھوڑ دیا - اور شاستر کے مطابق اپنے فطری جذبات پر قابو حاصل کر کے سماج کی حفاظت کا نمونہ عملی شکل میں دکھا دیا - ہماری خاندانی زندگی کے تمدن میں قدم قدم پر جس ایثار ' خود گزاری اور ضبط نفس کی ضرورت ہوتی ہے رام چندر کی زندگی میں یہ سب کچھ تکمیل کی حد تک پہنچ گیا ہے اسی وجہ سے رامائن ہندو سماج کی نظم اعظم بن گئی ہے —

سنسکرت کے پہلے شاعر نے جب رامائن لکھی اس وقت اگرچہ رام کی سوانح عمری میں مافوق الفطرت الوہیت کا جز شامل ہو چکا تھا تب بھی والمیکی نے رام کو انسان کامل کی شکل میں پیش کیا ہے —

لیکن اگر مافوق الفطرت الوہیت کو تھوڑی سی بھی جگہ مل جائے تو پھر اسے روکنا مشکل ہے - وہ رفتہ رفتہ بڑھتی ہی جاتی ہے - اس طرح رام نے آہستہ آہستہ الوہیت کا درجہ حاصل کر لیا —

اس وقت رامائن کے اصلی سر میں ایک اور تبدیلی ہوئی - " کرتی واس" (بنگالی شاعر) اور " تلسی داس " (ہندی کا شاعر) کی رامائنوں میں بھی

اس کی شہادت ملتی ہے —

رام کو جب ہم ایک دیوتا تصور کرتے ہیں تب اُن کے کارناموں کی کچھہ اہمیت نہیں رہتی - اس لیے رام کی زندگی کو شان دار بنانے کے لیے صرف ان کی سوانح عمری کافی نہیں ہوسکتی - ایسے حالات میں جن جذبات کے ذریعے دیوتا کی زندگی انسان کو پیاری معلوم ہوتی ہے وہی جذبات نظم میں زور پکڑ جاتے ہیں —

یہی جذبہ دیوتاؤں کی عنایات کا موجب خیال کیا جاتا ہے - " کرتی واس" اور " تلسی داس " کے رام بھی اپنے پرستاروں پر شفقت کرنے والے رام ہیں - وہ انتہائی مجرموں کو بھی نجات دے دیتے ہیں ' وہ نیچ ذات کے " گوہ " سے دوست کہہ کر بغل گیر ہوتے ہیں - جنگل کے بندروں کو محبت سے برکت عطا کر دیتے ہیں - عابد ہنوسان کی زندگی کو عبادت سے باعظمت بنا کر اُسے شاد کام بنا دیتے ہیں - " دبھی شن " اُن کا پرستار ہے - راون بھی اُن کی دشمنی کی وجہ سے ان کے ہاتھہ سے مارا جاکر نجات حاصل کرتا ہے - رامائن میں یہ سب پرستش ہی کے جلوے ہیں —

ہندوستان میں ایک وقت عوام میں یہ لہر دوڑ گئی تھی کہ صرف عالموں ہی کو خدا نہیں ملتا ' اُسے پانے کے لیے تنتر منتر اور خاص طریقوں کی ضرورت نہیں ہے ' صرف مخلصانہ عبادت کے ذریعے ادنیٰ درجے کے انسان بھی اسے پا سکتے ہیں - گویا اس عقیدے نے ایک دم نئی ایجاد کی طرح ہندوستان کے لوگوں کو مسخر کرلیا تھا - یہ بڑی مسرت جب تمام ملک میں پھیل گئی تھی تب جس ادب کی تخلیق ہوئی تھی اس میں یہی نظر آتا ہے کہ عوام نے ایک بڑی چیز حاصل کرلی ہے - " کال کیتو " ' " دھن پتی " ' " چاند سوداگر " وغیرہ معمولی لوگ ہی اس کے پیشوا تھے - برہمن ' چھتری ' عالموں اور زاہدوں ہی کا نہیں بلکہ

سماج میں جو لوگ ادنیٰ اور نیچ سمجھے جاتے ہیں خدا ان کا بھی خدا ہے - ادب اس بات کی مختلف طرح سے اشاعت کر رہا تھا - " کرتی واس " کی رامائن میں بھی اسی جذبے کا اظہار کیا گیا ہے - خدا جاہلوں اور وحشی بندروں کا بھی دوست ہے - چھوٹی سے چھوٹی مخلوق کی خدمت بھی اس کے پاس نامقبول نہیں ہوتی - مجرم راکشسوں کو بھی وہ مناسب سزا دے کر نجات دیتا ہے - یہی جذبات " کرتی واس " اور " تلسی داس " میں نشو و نما پا کر ہندوستان میں رامائن کی کہانی کی روکو گنگا کی شاخ بھاگیرتھی کی طرح ایک خاص راستے کی طرف لے گئے ہیں —

رامائن کی کہانی کی جس رو کا ہم ساتھ دیتے آرہے ہیں اسی کی ایک شاخ زمانۂ حال کی "میگھنا دبدھ" (بنگالی نظم کی ایک کتاب) میں نظر آتی ہے - اس نظم نے اسی پرانی کہانی کا سہارا لے کر بھی " والمیکی " اور " کرتی واس " کی رامائنوں سے ایک مختلف شکل اختیار کر لی ہے —

ہم اکثر کہا کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھ کر ہم جس ادب کی تخلیق کر رہے ہیں وہ خالص چیز نہیں ہے اس لیے گویا وہ ادب ملکی ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہے !-

لیکن جس چیز نے کسی قسم کی دوامی خصوصیت حاصل کر لی ہے اور اب اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے ' ایسی کوئی خالص چیز اس زندہ دنیا میں موجود نہیں ہے —

انسانی سماج میں جذبات کے ساتھ جذبات کا میل ہوتا ہے اور اسی میل کے ذریعے نئی نئی عجیب چیزیں پیدا ہوتی ہیں - ہندوستان میں اس طرح کتنے جذبات کا میل ہوا ہے اور ہمارا دل کتنی تبدیلیوں میں سے گزرا ہے کیا اس کی کوئی حد ہے ؟ تھوڑے ہی دن ہوے جب مسلمان ہمارے ملک کے بادشاہ تھے - کیا انہوں نے ہمارے دل پر کوئی اثر نہیں چھوڑا ؟ کیا ان کے ' سامی ' (Sematic)

جذبات کے ساتھہ ہندی جذبات کا قدرتی ملاپ نہیں ہوا - ہماری صنعت و حرفت' ہمارا ادب' لباس' موسیقی اور مذہبی رسوم میں مسلمانوں کا اثر شامل ہوگیا ہے - دل کا دل کے ساتھہ اس طرح میل نہ ہونا ناممکن ہے' اور اگر ایسا ہو کہ صرف ہمارا دل اثر قبول نہ کرے تو ہمارے لیے یہ بڑی شرم کی بات ہوگی —

یورپ سے جذبات کی ایک رو چلی آرہی ہے جو قدرتی طور پر ہمارے دلوں کو متاثر کر رہی ہے اور اس رو کے تسلسل سے ہمارا دل بیدار ہو رہا ہے - اگر ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے تو گویا ہم اپنے دلی احساسات کے ساتھہ ناانصافی کریں گے -

اس طرح مشرقی اور مغربی جذبات کے میل سے جو چیز پیدا ہورہی ہے کچھہ دیر کے بعد ہم اُسے صاف طور پر دیکھہ سکیں گے —

اگر یہ سچ ہے کہ یورپ کے نئے جذبات کے اثرات سے ہمارا دل بیدار ہورہا ہے تو ہم اپنے ادب کو ان جذبات سے غیر متاثر ثابت کرنے کی ہزار کوشش کیوں نہ کریں یہ ناممکن ہے کہ ہمارا ادب اس نئی شکل کو اختیار کر کے اس حقیقت پر پردہ ڈال سکے - اب اسی پرانی چیز کا بار بار اعادہ کسی طرح نہیں ہوسکتا - اور اگر ہو تو ہم اس ادب کو نقلی اور بناوٹی کہیں گے —

" میگھناد بدھ " نظم کی صرف بحر اور طرز تحریر ہی میں نہیں بلکہ اس کے جذبات اور رس میں بھی ایک بالکل نئی تبدیلی نظر آتی ہے - یہ تبدیلی بذات خود اس کا احساس رکھتی ہے - اس تبدیلی میں ایک طرح کی سرکشی پائی جاتی ہے - شاعر نے ردیف و قافیہ کی زنجیر توڑدی ہے اور بہت دنوں سے رامائن کے متعلق ہمارے دل میں جذبات کا جو سلسلہ چلا آرہا تھا اپنی سرکشی سے اسے بھی توڑ ڈالا ہے - اس نظم میں رام اور لچھمن کی نسبت راون اور میگھناد (راون کا بیٹا) کو بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہے - مذہبی عقائد کا خوف' جو ہمیشہ باریکی سے صرف اسی بات کا

خیال کیا کرتا ہے کہ کون سی چیز کہاں تک اچھی ہے اور کہاں تک بری ہے ' ایثار ' انکسار اور ضبط نفس سے شاعر کے دل کو متاثر نہیں کر سکا - وہ ایک زبردست قوت کے مہیب مناظر ہی میں اپنی مسرت محسوس کرتا ہے جس کے چاروں طرف اعلیٰ مدارج ہیں- راون کے محلوں کی چوٹیوں نے بادلوں کو روک لیا ہے ' اس کے رتھوں ' گھوڑوں اور ہاتھیوں سے زمین کانپ اٹھی ہے ' اس نے اپنی طاقت سے دیوتاؤں کو شکست دے کر ' ہوا آگ اور اندر کو اپنا محکوم بنا لیا ہے ' وہ مذہب یا طاقت کی کسی قسم کی روک کا قائل نہیں ہے ! اتنے دنوں کا جمع کیا ہوا سامان شان و شوکت برباد ہو کر مٹی میں مل رہا ہے ' ایک معمولی بھکاری رام چندر کے ساتھ جنگ کرنے میں اُس کے اپنی جان سے زیادہ عزیز بھتیجے ' پوتے اور دوسرے رشتہ دار ایک ایک کر کے مر رہے ہیں ' ان کی مائیں قاتلوں پر لعنتیں بھیج بھیج کر بین کر رہی ہیں ' اس کے باوجود جو اٹل طاقت اس مہیب تباہی کے بیچ میں بیٹھی ہوئی ہار ماننا نہیں چاہتی ' شاعر نے اسی مذہب کے باغی اور فریبی کی شکست اور موت پر ایک لمبی آہ کھینچ کر اپنی نظم ختم کر دی ہے - اُس قوت کو جو تمام چیزوں کے آگے سر نیاز خم کرتی ہے شاعر نے دل ہی دل میں بہت حقیر سمجھا ہے اور اختتام پر اُس کی شاعری کی دیوی نے اپنے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی مالا اُس سرکش قوت کے گلے میں پہنا دی ہے جو کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتی —

یورپ کی طاقت اپنے عجیب و غریب آلات حرب اور عدیم المثال دنیاوی شان و شوکت کی شکل میں بام ترقی پر پہنچ کر ہمیں مبہوت بنا رہی ہے - اس کی برق خاطف ہمارے خمیدہ سروں پر سے چمکتی اور گرجتی ہوئی چلی جا رہی ہے - اِس کی تعریف کے راگ کے ساتھ موجودہ زمانے میں رامائن کی کہانی کا ایک نیا تار اندر ہی اندر بج اُٹھا - کیا کسی خاص شخص کی وجہ سے اس تار

میں حرکت پیدا ہوئی ؟ نہیں بلکہ تمام ملک میں یہی تحریک پھیلی ہوئی ہے - خواہ کم زور ہونے کی وجہ سے ہم اسے نہ مانیں تب بھی قدم قدم پر ہم اِسے تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہیں - اسی سبب سے رامائن میں بھی ہم اِس کے سر کو نہ روک سکے --

رامائن کی کہانی کی مثال دے کر ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ادب میں جذبات کی جو تخلیق ہو رہی ہے اس کے قیام اور روانی کا میدان نہایت وسیع ہے - ظاہرا طور پر اس تخلیق کا کوئی سبب نظر نہیں آتا - چیت کے مہینے میں زور کی بارش بھی ہمیں اتفاقی معلوم ہوتی ہے لیکن اس بارش نے بہت دور مغرب سے آکر سیکڑوں اسباب کی وجہ سے کہیں آسانی سے برس کر اور کہیں مشکلات میں سے گزر کر ہماری زمین کو سیراب کیا ہے - جذبات کی روانی بھی اسی طرح جاری ہے - یہ روانی چھوٹے بڑے کئی اسباب کی وجہ سے فرداً فرداً ایک ہو کر اور پھر اس ایک سے سیکڑوں تک پہنچ کر پھیلتی جاری ہے - متعدد انسانوں کا دل اپنے پوشیدہ اور بار آور قاعدوں کے ذریعے خود کو کامل طور پر نمایاں کرکے عجیب و غریب دلی جذبات کی تخلیق کی تمام دنیا میں اشاعت کر رہا ہے —

جب ہم مصنف کا بہت قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں تب اس کے ساتھ اس کی تصنیف کا تعلق ہمارے نزدیک نہایت اہم ہو جاتا ہے - اس وقت ہم سمجھتے ہیں کہ گویا گنگوتری (گنگا کا منبع) ہی گنگا کی تخلیق کر رہی ہے - اسی وجہ سے دنیا کی تمام نظموں کے مصنف کا گویا پتا ہی نہیں لگتا - جو تمام نظمیں خود بخود اپنی تخلیق کررہی ہیں اور جن کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا اِنہیں کی مثال دکھاکر ہم نے تخلیق جذبات کی وسیع قدرت کی طرف آپ کے دل کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے—

——— * ———

آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار

از

جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب راشد ایچ - سی - یس
مددگار معتمد فینانس حیدرآباد دکن

اپریل سنہ ۱۹۳۵ ع کے رسالۂ اردو میں " اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار " کے عنوان سے جناب پنڈت برج موہن دتاتریا صاحب کیفی دھلوی کا ایک مضمون شایع ہوا ہے جو اردو صحافت سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے - اس میں شک نہیں کہ جناب پنڈت صاحب نے اس مضمون کی نگارش میں بڑی کاوش فرمائی ہے اور فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے کہ اردو اخبارات کے احوال کا خاکہ مکمل نہیں کہچ سکا ہے - ایک جناب پنڈت صاحب ھی پر کیا موقوف ہے کسی اہل قلم کے لیے بھی آسان نہیں ہے کہ مواد فراہم کیے بغیر اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرسکے اور مواد فراہم کرنے میں بہت سی مشکلیں درپیش ہیں تاہم جو واقفیت زیر بحث مضمون میں بہم پہنچائی گئی ہے قابل قدر ہے —

جناب کیفی صاحب نے اپنے مضمون میں ساٹھہ اخبارات کے کوائف درج کیے ہیں - یہ کوائف جدول کی شکل میں ہیں - قارئین مضمون کے معلومات میں یقیناً اضافہ ہوتا اگر یہ معلوم ہوسکتا کہ ان کوائف کا ماخذ کیا ہے - ممکن ہے کہ یہ سب اخبارات جناب پنڈت صاحب کو دستیاب

ہوئے ہوں لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ تحریر فرماتے کہ ان سب اخبارات کے نسولے ان کے ہاں موجود ہیں- بہر کیف یہ جدول مکمل نہیں ہے اور بعض مقامات پر اس کے اندراجات بھی صحیح نہیں ہیں جس کے سبب سے صحافت کے مورخ کو آئندہ غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے اس لیے راقم الحروف اپنی معلومات کی حد تک ضروری تصحیح کو فرض سمجھتا ہے - ازراہ کرم قارئین کرام پہلے پنڈت صاحب کا مضمون اور اس کے بعد ذیل کی گزارشات ملاحظہ فرمائیں —

سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۷۸۱ میں شایع ہوتا بتایا گیا ہے - یہ صحیح نہیں ہے - گورنمنٹ ہند نے دہلی کی فتح کے بعد یہ ضروری سمجھا تھا کہ سرکاری کاروبار کی اطلاع اہل ہند کو دی جانی چاہیے - یہ ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں پر اخبارات سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے تھے اور کمپنی بھی ایڈیٹروں کو سخت سزا کا مستوجب خیال کرتی اور ان کو بعض اوقات جلا وطن کر دیتی تھی - اس لیے اول اول بعض حکام کی سرکاری تحریرات کے ذریعے اطلاعیں دی گئیں بالآخر سنہ ۱۷۶۴ ع میں انڈین گزٹ جاری کیا گیا - اس کی اشاعت ہفتہ واری ہوتی تھی (ملاحظہ ہر دی بنگال اینول سنہ ۱۸۵۳ ع - انڈین ڈیلی میل سنہ ۱۸۳۱ ع) - سنہ ۱۷۷۶ ع میں یہ سب سے بڑا جریدہ تصور کیا جاتا تھا - سنہ ۱۸۲۲ ع یہ سے اخبار ہفتے میں دو بار اور سنہ ۱۸۳۰ ع میں تین بار شایع ہونے لگا - کچھ مدت کے بعد روزانہ ہو گیا - یہ لبرل خیالات کا موئد تھا اور اس کے مضامین کا لب و لہجہ سنجیدہ اور شریفانہ ہوتا تھا —

دوسرا روزانہ اخبار " ہرکارہ " تھا - اس کے مضامین دوسرے اخبارات میں نقل کیے جاتے تھے - بنگال کرانیکل خصوصیت کے ساتھ اقتباسات شایع کرتا تھا - سنہ ۱۸۵۳ ع کے بنگال اینول سے معلوم ہوا کہ صرف شہر کلکتہ میں ذیل کے اخبارات اور رسالے شایع ہوتے تھے —

(۱) روزانہ — دی بنگال ھرکارہ اینڈ کرانیکل - دی انڈین گزٹ - دی کلکتہ کوریر - دی جان بل —

(۲) ھفتے میں سہ بار — دی انڈین گزٹ - دی بنگال کرانیکل - دی انڈین رجسٹر -

(۳) ھفتے میں دو بار — دی کلکتہ کوریر - دی کلکتہ گزٹ —

(۴) ھفتہ وار — گلشن نوبہار - دی لٹرری گزٹ - دی اورنٹیل آبزرور دی - بنگال ھیرالڈ - دی ریفارمر - دی فلانتھراپسٹ - دی انجھلھر - دی گیانا ناش - دی سماچار درپن —

(۵) ماھوار — دی کلکتہ منتھلی جرنل - دی بنگال اسپورٹنگ میگزین - دی کرسچین ایتنلی جرنل - دی کرسچین آبزرور —

(۶) دوسرے مہینے شایع ھونے والے — دی ایسٹ انڈین یونائٹیڈ سروس جرنل -

(۷) سہ ماھی — دی کلکتہ میگزین اینڈ ریویو - دی بنگال آرمی لسٹ —

(۸) سالانہ — دی بنگال ایٹول — دی آلمنک - دی رجسٹر اینڈ ڈائرکٹری —



جدول سے متعلق تصریحات حسب ذیل ھیں :—

دور اول ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک

فوائدالناظرین ابتدا میں ماھوار رسالہ تھا - فرانسیسی مستشرق دتاسی نے اس کا ذکر اپنے خطبے میں کیا ہے (جو رسالۂ اردو کے کسی پچھلے نمبر میں چھپ گیا ہے) یہ رسالہ سنہ ۱۸۴۲ ع میں جاری ہوا تھا چار سال کامیابی سے چل کر اس نے سنہ ۱۸۴۶ ع میں ھفتہ وار اخبار کی صورت اختیار کی —

قران السعدین سنہ ۱۸۴۵ ع میں جاری ہوا اس کی ایک جلد میری نظر سے گزری ھے - جناب پنڈت صاحب نے اس کا سنہ اجراء ۱۸۴۶ ع بتایا ھے معلوم نہیں اس کی بناء کیا ھے - اس اخبار کی دو جلدیں

مولانا حسرت موہانی صاحب کے پاس موجود ہیں اور اس کے ایک پرچے کا کچھہ اقتباس مولانا احسن مارہروی نے اپنی تاریخ نثر اردو میں دیا ہے —

صادق الاخبار | اس نام کے تین اخباروں کا پتا چلا ہے - ایک دھلی سے جاری ہوا جس کے مالک سید محمد صادق تھے اور جو سنہ ۱۸۵۵ع میں جاری ہوا اور دوسرا بہاولپور سے سنہ ۱۸۱۷ میں نکلا جس کے ایڈیٹر مولوی محمد اشرف صاحب "بزمی" تھے - یہ اخبار مطبع صادق الانوار میں چھپتا تھا - پنڈت دوارکا ناتھہ اس کے مہتمم مطابع تھے - تیسرا صادق الاخبار معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں فارسی میں نکلتا تھا سنہ اجراء مجھے معلوم نہیں ہے لیکن قیاس ہے کہ یہ ۱۸۴۴ع یا سنہ ۱۸۴۵ع میں نکلا ہوگا اس کا حوالہ احسن الاخبار بمبئی مطبوعہ ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۸۴۷ع میں اس طرح آیا ہے : —

"صادق الاخبار کے ایڈیٹر صاحب نے رفتہ رفتہ اپنے اخبار کو اردو زبان کا اخبار بنا دیا ہے سمجھہ میں نہیں آتا کہ انہوں نے فارسی زبان سے کیوں رابطۂ الفت منقطع کر دیا شاید اخبار کے خریداروں نے تقاضا کیا ہوگا کہ فارسی زبان ترک کردو اور اردو زبان میں اخبار جاری کرو اس کے علاوہ تو اور کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی"۔

اس تیسرے صادق الاخبار کے ایڈیٹر جمال الدین تھے- اس کا مختصر حال اس شہادت سے معلوم ہوا ہے جو اخیر بادشاہ دھلی کے مقدمے میں کشن سنگھہ نامی گواہ نے دی ہے - گواہ کا بیان حسب ذیل ہے : —

"جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے اس اخبار کا نام صادق الاخبار یا سچی خبریں تھا- دھلی شہر میں اور باہر اس کی دو سو کاپیاں نکلتی تھیں - جب کبھی ضروری خبریں مل جاتی تھیں تو خاص

طور پر بھی نکلتا تھا ورنہ ہفتہ وار نکلتا تھا۔ بلا تفریق ذات ہر خواندہ فرقے میں اس کی اشاعت تھی۔ یہ دہلی میں بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا اور جو مضامین جن میں سے اکثر انگریزی اخبارات کا ترجمہ ہوتے تھے اس میں شائع ہوتے تھے دیگر اخبارات کے مقابلے میں اس کی اشاعت بہت تھی "۔ (ملاحظہ ہو مقدمے کے گیارھویں دن کی روداد ۹ فروری سنہ ۵۸ ع) —

احسن الاخبار بمبئی سے ۹ نومبر سنہ ۱۸۴۴ ع کو نکلا جناب پنڈت صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے غالباً اس لیے کہ یہ فارسی کا اخبار تھا۔ لیکن چونکہ اس میں بعض اردو اخبارات مثلاً دہلی گزٹ، صدر الاخبار، صادق الاخبار، کریم الاخبار کے حوالے آے ہیں اس لیے اس کا مختصر حال شاید بے محل نہ ہوگا۔

احسن الاخبار کی پانچ جلدیں بابتہ سنہ ۴۴ تا ۱۸۴۸ع نواب عابد یار جنگ مرحوم مہتمم مکہ مسجد حیدرآباد کے کتب خانے سے مولانا حسن نظامی صاحب دہلی لے گئے یہ جلدیں میں نے دیکھی تھیں۔ اس اخبار سے پتا چلتا ہے کہ سنہ ۴۵ع میں مولوی کریم الدین مولف تذکرۂ شعرا نے مطبع رفاہ عام قائم کیا اور ایک اخبار کریم الاخبار کے نام سے جاری کیا۔ رسالۂ گل رعنا بھی اسی مطبع سے سنہ ۴۵ع میں نکلا۔ یادش بخیر گل رعنا کے نام کے ساتھ ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ دو تین سال ادھر ادبی حلقوں میں یہ بحث چھڑی تھی کہ ہندوستان کا اولین رسالہ کونسا تھا۔ اس مبحث پر دو مضامین میری نظر سے گزرے۔ ایک الہ آباد کے رسالے ہندستانی میں "ہندوستان کا ایک قدیم رسالہ" کے عنوان سے جناب اظہار الحق صاحب علیگ نے لکھا ہے اور دوسرا خود جناب پنڈت کیفی صاحب کا لکھا ہوا ہے جو ادبی دنیا کے نوروز نمبر میں شائع ہوچکا ہے۔ جناب کیفی صاحب نے "محب ہند" کو اولین اور جناب اظہار الحسن صاحب نے 'خیر خواہ ہند" کو قدیم ترین

رسالہ تصور کیا ہے - اگر رسالے کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں نثر اور نظم دونوں موجود ہوں یا صرف نثر یا نظم ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "گل رعنا" بھی ایک رسالہ تھا جس میں شعرا کا کلام ' شعرا کے مختصر حالات اور فن سخن کے متعلق بعض مضامین شائع ہوتے تھے- اس لحاظ سے یہ تصور کرنا بیجا نہ ہوگا کہ گل رعنا ہی هندوستان کا اولین اردو رسالہ تھا جو سنہ ۱۸۴۵ ع میں نکلا تھا - مولوی کریم الدین صاحب اس کے ایڈیٹر تھے- انہوں نے سنہ ۴۵ ع میں اپنے مکان پر ایک مشاعرے کا اعلان کیا تھا اور ہر مہینے یا ہر دو ہفتے کے بعد مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور انہیں مشاعروں کا کلام گل رعنا میں چھپتا تھا - ۲۵ جولائی سنہ ۴۵ ع کے احسن الاخبار میں یہ درج ہے کہ " مطبع رفاہ عام سے مشاعرہ کا اعلان کیا گیا چنانچہ ۲۸ جمادی الثانی کو محفل ارباب کمال و مجلس اصحاب ذوق و حال نہایت اهتمام کے ساتھہ منعقد ہوی - شعرا نے اپنی اپنی نکتہ سنجیوں سے حاضرین کو مستفید فرمایا " —

غرض احسن الاخبار ہر ہفتہ بمبئی سے نکلتا تھا لیکن اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہونے کے باوجود بیشتر دهلی و قلعۂ معلی کی خبریں صحت کے ساتھہ شائع کرتا تھا - دهلی میں اس کے نامہ نگار موجود تھے - ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس اخبار سے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں : —

جلد ۴ - نمبر ۲۹ مورخہ ۲۵ - جون سنہ ۱۸۴۷ ع - مرزا اسد اللہ خان بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا - معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جاے کہ یہ معززین شہر میں سے ہیں یہ جو کچھہ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے - عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی

اجازت نہیں دیگا " —

جلد ۴ - نمبر ۱۷ مطابق ۲ ماہ جولائی سنہ ۱۸۴۷ ع - مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا - مرزا صاحب کو چھہ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی - اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھہ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جاے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپیہ زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے - جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں سواے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے - اُمید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جاے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہوجاے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جاے یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے با کمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے ایسے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جاے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے —

اردو گائڈ | کلکتے کا بہت مشہور روزانہ اخبار تھا سنہ ۱۸۵۸ ع میں نکلا تھا - کبیرالدین احمد اس کے مالک اور عزیزالباری اڈیٹر تھے - مطبع مظہر العجائب میں ٹائپ میں چھپتا تھا - بارہ روپے سالانہ اس کا چندہ تھا - اس کی ایک جلد نواب نصیر حسین خیال مرحوم نے مجھے عنایت فرمائی تھی لیکن اس کا حال لکھنے نہ پایا تھا کہ اسے وہ اپنے ساتھ لے گئے —

اودھ اخبار | سنہ ۱۸۵۸ ع میں نہیں بلکہ سنہ ۱۸۵۹ ع میں جاری ہوا ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۵۸ ع کو مطبع نول کشور قایم ہوا اور جنوری سنہ ۱۸۵۹ ع

سے اسی مطبع میں 'اودہ' اخبار چھپنے لگا - یہ اخبار آج تک جاری ہے اس کے سنہ اجرا کی تحقیق ایڈیٹر صاحب سے کی جا سکتی ہے - پہلے روزنامہ ۱۲ صفحے پر نکلتا تھا اور سالانہ پچاس روپے چندہ تھا —

دور دوم سنہ ۱۸۶۰ع سے سنہ ۱۸۶۹ع تک

اخبار انجمن اودہ ۰ وسوم بھارت پتریکا کا سنہ اجرا مجھے بھی کوشش کے باوجود معلوم نہ ہو سکا - معلوم نہیں جناب پنڈت صاحب کو اس اخبار کا حوالہ کہاں سے ملا ہے —

یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ع فرو ہونے کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں چند احباب مل کر ایک انجمن قایم کرتے تھے جس کے جلسے کبھی ہفتہ وار کبھی ماہوار اور کہیں مہینے یا ہفتے میں دوبار ہوتے تھے - ان جلسوں میں کسی علمی ادبی عنوان پر مضمون پڑھا جاتا تھا' اصلاح تمدن پر مباحثے کیے جاتے تھے اور قومی اصلاح کی تجویزیں پیش کی جاتی تھیں - انہیں مضامین اور جلسوں کی رودادیں ہفتہ وار اخبار یا ماہوار رسالے کی شکل میں چھپتے تھے - انجمن کا نام ہی اخبار کا نام ہوتا تھا - اس قسم کا بہت سا لٹریچر ہماری غفلت سے ضایع ہو گیا ہے دو چار پرچوں کے نام جو مجھے معلوم ہیں اُن کا احوال یہ ہے : —

انجمن ہند لکھنؤ سے ہفتہ وار ۱۲ صفحے پر پندرہ روپے چندے کے ساتھ اسی نام کے مطبع سے سنہ ۱۸۶۲ع میں نکلا - سرورق پر یہ شعر درج تھا : —

تیرے کرم سے انجمن اخبار یا خبیر ہر بزم و انجمن میں ہو مطبوع و دلپذیر

اس کے ایڈیٹر منشی چندن لال اور پرنٹر منشی پیارے لال تھے —

۲ انجمن اسلامی	یہ کلکتہ سے نکلتا تھا ۱۰ صفحے حجم تھا - بارہ روپے قیمت سالانہ - ٹائپ میں چھپتا تھا - جنوری سنہ ۱۸۹۳ع کو اس کا پہلا نمبر شایع ہوا —
انجمن پنجاب لاہور	۱۶ صفحے حجم اشاعت ہفتہ وار' تیرہ روپے چندہ - پیرزادہ محمد حسین ایڈیٹر - جنوری سنہ ۱۸۷۰ع سے جاری ہوا —

اسی طرح انجمن رفاہ گونڈے سے' انجمن مناظرہ دھلی سے' انجمن شاہ جہاں پور' شاہ جہان پور سے' انجمن مذاکرۂ علمیہ پٹنہ سے شایع ہوتے تھے —

آگرہ اخبار	اب بھی نکلتا ہے - خواجہ یوسف علی صاحب کی ادارت میں سنہ ۱۸۹۵ع میں نہیں بلکہ یکم جنوری سنہ ۱۸۹۹ع کو جاری ہوا تھا -

چندہ سالانہ نو روپے - ۸ صفحے حجم - مہینے میں تین بار - اس کا ایک پرچہ ۷ جنوری سنہ ۱۹۳۳ع کا میرے ہاں موجود ہے جس کے مقالۂ افتتاحیہ میں موجودہ ایڈیٹر خواجہ صدیق حسین صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ " بحمد اللہ آگرہ اخبار اپنی سلامت روی اور صحیح نمایندگی کے ساتھ قوم و ملک کی بوجوہ اتم اور حکومت کی بوجوہ احسن خدمات انجام دیتا ہوا آج پینتیسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے " —

علی گڈہ انسٹیٹیوٹ گزٹ	اس نام سے سنہ ۱۸۹۶ع میں اخبار نہیں نکلا - صحیح نام اخبار سائنٹفک سوسائٹی ہے - اس کی پہلی جلد مجھے

بحسن توسط جناب ہارون خاں صاحب شیروانی' جناب حاجی اسمعیل خاں صاحب دتاولی کے کتب خانے سے دستیاب ہوئی تھی - اس کے ایڈیٹر ابتداء میں محمد اسمعیل صاحب تھے - بعد کو سر سید نے خود ادارت کی - اس اخبار کے حالات تفصیل کے ساتھ مولانا حالی نے اپنی گراں قدر تصنیف حیات جاوید میں لکھے ہیں - کوئی آٹھ دس سال سے بند ہو گیا تھا - اب علی گڈہ کے ہفتہ وار اخبار سر گزشت سے معلوم ہوا کہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈہ کی توجہ سے یہ اخبار پھر زندہ ہوا ہے —

روھیلکھنڈ گزٹ | اس کا صحیح نام روھیلکھنڈ اخبار ہے - ھفتہ وار مطبع خورشید ہند میں یہ اخبار چھپتا تھا اور اس کا سالانہ چندہ ۱۵ روپے تھا -

ریاض الاخبار | خیرآباد سے سنہ ۱۸۶۹ ع میں نہیں بلکہ سنہ ۱۸۷۴ ع میں نکلا - ہر دسویں روز ۱۶ صفحے کے حجم کے ساتھہ نکلتا تھا - مطبع لمعۂ رخشاں میں چھپتا تھا —

دور سوم سنہ ۱۸۷۰ ع سے سنہ ۱۸۸۴ ع تک

اخبار انجمن پنجاب | اس کے ایڈیٹر سید قمرالدین تھے - ۱۶ صفحے حجم تھا - دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھہ ھفتہ وار شایع ہوتا تھا - قیمت سالانہ تیرہ روپے تھی —

اخبار عام | گوپی ناتھہ کی ادارت میں - اور اخبار نورالانوار عبدالعزیز کے اهتمام سے نکلا —

کوکب ہند | سنہ ۱۸۶۹ ع میں پادری کریون صاحب نے جاری کیا - اس کا پہلا نام شمس الاخبار تھا - امریکن مشن کے چھاپے خانے میں طبع ہوتا تھا -

ناصرالاخبار | سید نصرت علی خاں قیصر نے نکالا - قیصر علوم مشرقی و مغربی میں کافی دست گاہ رکھتے تھے ان کو سلطان روم نے تمغۂ مجیدی اور خان کا خطاب عطا کیا تھا - ناصرالاخبار کے پرچے روم و مصر تک جاتے تھے - یہ ہر عشرہ میں نکلتا تھا - ۲۰ صفحے حجم اور (۱۵) روپے چندہ نصرت المطابع دھلی میں طبع ہوتا تھا —

مرقع تہذیب | اس کے ایڈیٹر پہلے چراغ علی تھے - پندرہ روزہ اخبار تھا، سالانہ قیمت چھہ روپے تھی، کچھہ عرصے کے بعد ماهوار شایع ہونے لگا اور لالہ بہاری لعل ایڈیٹر مقرر ہوئے —

مہر درخشاں — سنہ ۱۸۷۵ع میں نہیں بلکہ سنہ ۱۸۸۴ع میں ناصرالدین صاحب کی ادارت میں جاری ہوا —

جریدۂ روزگار — مدراس کا نہایت مشہور اخبار تھا - یہ بیان کہ یہ حیدرآباد سے نکلا صحیح نہیں ہے - بارہ صفحے اس کا حجم تھا اور ۱۲ روپے ۱۰ آنے اس کی قیمت - غیر مستطیع اصحاب سے نو روپے چھہ آنہ چندہ لیا جاتا تھا ابتدا میں ہر دوسرے روز شایع ہوتا تھا - کچھہ دنوں بعد ہفتہ وار ہوگیا - سید مہر تقی شاہ قادری آفندی اس کے ایڈیٹر تھے —

سفیر ہند دہلی — جنوری سنہ ۱۸۷۴ ع میں نکلا - سنہ ۱۸۷۲ ع سنہ اجرا صحیح نہیں بتایا گیا ہے آٹھہ صفحے اس کا حجم تھا اور یہ پندرہ روزہ تھا - اس کا سالانہ چندہ ۲ روپے تھا —

نیر اعظم — سنہ ۱۸۷۷ ع میں جاری ہوا آج کل بھی نکل رہا ہے —

مہر نیمروز — اس کے ایڈیٹر محب اللہ صاحب اور مظہر العجائب کے ایڈیٹر غلام دستگیر صاحب تھے —

دور چہارم سنہ ۱۸۸۰ ع سے سنہ ۱۸۸۴ ع تک

تجارت الاخبار — اس کے ایڈیٹر متھرا پرشاد تھے - قیمت نو روپے 'ہفتہ وار ۱۶ صفحے - پہلا پرچہ یکم مئی سنہ ۱۸۸۰ ع کو نکلا —

امرتسر کے اخبار سفیر ہند کو مشہور پادری رجب علی نے نکالا تھا - ہفتہ وار ۱۶ صفحے حجم - قیمت سالانہ ۱۳ روپے —

خیر خواہ عالم — دہلی سے نکلتا تھا شاہزادہ مرزا عبدالغنی اس کے ایڈیٹر تھے - سنہ ۱۸۷۲ع میں جاری ہوا عجب نہیں کہ اس کے ایڈیٹر وہی شاہزادے ہوں جنہوں نے "ادبی دنیا میں" ارشد گورگانی کے نام سے شہرت حاصل کی -

ابتدا میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کو انہیں سے تلمذ حاصل تھا —

اخبارات مندرجۂ جدول کی تصحیح میں نے بیشتر سرکاری رپورٹوں اور دتاسی کی تقریروں کی بناء پر کی ہے اور سنین کو صحت کے ساتھہ درج کرنے کی کوشش کی ہے - تاہم ایک آدھ سنہ کے درج کرنے میں ممکن ہے مجھہ سے غلطی ہوئی ہو ، اگر کسی اہل قلم کو میری تصحیح میں شکوک ہوں تو امید ہے کہ از راہ کرم مجھہ سے مراسلت فرمائی جائے گی —



فرنیچ اکاڈمی

از

[جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لیٹ (پیرس)]

(ماہ دسمبر میں فرنیچ اکادمی کا سہ صد سالہ جشن پیرس میں خاص اهتمام اور دھوم دھام سے منایا جائے گا - اس لیے اس نمبر میں اس عظیم الشان علمی مجلس کا ذکر خیر کرنا مناسب خیال کیا گیا - اس سے قبل اس رسالے (بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۵ع) میں فرنیچ اکادمی پر ایک مضمون شایع هو چکا هے - وہ زیادہ تر تاریخی تھا - اس مضمون میں اس کے ادبی کارناموں خاص کر فرانسیسی لغات کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا گیا هے) — اڈیٹر

اس سال فرانس میں " فرنیچ اکاڈمی " کی سہ صد سالہ یادگار منائی جائے گی - فرانس کی اجتماعی زندگی میں اس ادارے کو بہت اهمیت حاصل هے - اجتماعی اداروں میں زبان ایک خاص حیثیت رکھتی هے - قوم کی ذهنی ترقی کا دارومدار اسی پر هے - یورپ کی اور دوسری اقوام کے مقابلے میں فرانسیسی لوگوں نے اس حقیقت کو سب سے پہلے سمجھا اور اپنی زبان کی ترقی و بقا کے لیے عملی قدم اٹھایا - " فرنیچ اکاڈمی " فرانسیسی قوم کی اسی کوشش کی یادگار هے - اس ادارے کی بدولت فرانسیسی زبان میں صحت و صفائی کی خوبیاں پیدا هوئیں

جو اس کو یورپ کی اور دوسری زبانوں سے ممتاز کرتی ھیں —

جس طرح یورپ کے ھر ملک نے نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا اثر قبول کیا اسی طرح فرانس بھی اس کی ھمہ گیری سے نہ بچ سکا - پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یہاں اھل نظر کی ایک ایسی جماعت پیدا ھوگئی تھی جو قرون وسطیٰ کی ذھنیت کے خلاف تھی اور زندگی کو رسم و رواج کی تاریکی سے نکال کر علم و بصیرت کی روشنی میں لانا چاھتی تھی - اس تحریک کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ قدیم علم و فن کو زندہ کیا گیا اور یورپ کے تمام ممالک میں ان کی نقل کرنے کی کوشش ھونے لگی - قدیم علوم و فنون سے روشناس ھونے کے بعد یورپ کی ھر قوم میں انفرادیت کا جذبہ پیدا ھوا - حالانکہ " مسلک انسانیت " (Humanism) کی تحریک مسیحیت کی طرح عالمگیر تحریک تھی اور رنگ و نسل کے امتیاز سے بالا تر سمجھی جاتی تھی لیکن قومیت نے اسی کے بطن سے جنم لیا - انسان کی اجتماعی زندگی کا یہ خاصہ ھے کہ وہ اپنی ضروریات کو اکثر اوقات اس قسم کے مواقع اور ذرائع سے پورا کرلیتی ھے جن کا بادی النظر میں اس سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ھوتا - نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے جہاں یونانی و لاطینی علوم و فنون کی نشر و اشاعت کی اس کے ساتھہ یورپ کی ھر قوم میں اپنی زبان اور اپنے ادب کے احترام کا جذبہ بھی پیدا کردیا - فرانسوا اول نے یونانی اور لاطینی علوم کی ترویج کے لیے سنہ ۱۵۳۰ ع میں " کالج ڈے فرانس " (College de France) کی بنیاد رکھی - اس کے جانشینوں کے زمانے میں فرانس کے ارباب فکر کو یہ احساس ھوا کہ قدما کے کارناموں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائے - اب تک یورپ کے ارباب علم کی زبان لاطینی تھی لیکن آھستہ آھستہ قومی احساس کے ظہور اس کی بنیادیں دن بدن کمزور ھورھی تھیں - اعلیٰ خیالات کی ترجمانی وھی زبان کرسکتی ھے ، جس میں صحت اور صفائی کے اوصاف موجود

ہوں - فرانسیسی زبان شروع شروع میں کلاسکی ادب کو اپنانے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی - چنانچہ فرانس کے ارباب فکر نے اپنی زبان کو سدھارنے کی طرف توجہ کی تاکہ اس کی قوت اظہار بڑھے اور مطالب کو ادا کرنے کی قابلیت پیدا ہو - اس زبان کے فرانسیسی شاعرانتوان دے بائف (Antone de Baif) نے فرانسیسی میں شعر کہنا شروع کیا - سب سے پہلے اسی نے اپنی زبان میں قدما کے " میٹرک " (Metric) طریق عروض کو رائج کیا - اس نے سنہ ۱۵۶۷ ع میں ایک انجمن قایم کی جو اس کے احباب اور ہم مشربوں پر مشتمل تھی - اس انجمن کا مقصد فرانسیسی زبان کو شعر و سخن کے لیے موزوں بنانا قرار پایا - اس کا نام "اکادمی فرانسیس" رکھا گیا - اس انجمن میں شعرا کے علاوہ ماہرین موسیقی بھی شریک تھے جن میں ژوشاں یتبودے تورلی خاص کر قابل ذکر ہے - وہ اپنے زمانے میں سب سے بڑا فن موسیقی کا ماہر سمجھا جاتا تھا - اس نے انتوان دے بائف کی ہمت افزائی کی اور تعاون عمل کا وعدہ کیا - اس کی رسائی طبقۂ امرامیں تھی - چنانچہ اس نے بعض عمائد کو اس انجمن میں شریک کرلیا تاکہ ان کے ذریعے سے مالی امداد ملتی رہے - آہستہ آہستہ ملک کے اہل علم اس انجمن کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی رکنیت میں اضافہ ہونا شروع ہوا - یہ پودا ایک سچے اور صاحب تخیل شاعر کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا - یہ اس کی نیت اور خلوص کا پھل تھا کہ وہ خوب سرسبز ہوا - انجمن کے قیام کے صرف تین سال بعد سنہ ۱۵۷۰ ع میں چارلس نہم بادشاہ فرانس کی اس کو سرپرستی حاصل ہوگئی - شاہی قدردانی کے باعث ملک کے ممتاز شعرا اور ادیب اس انجمن میں شریک ہوگئے اور اس کی ایک حیثیت قائم ہوگئی - ان ارکان میں دورا، رونسار اور امادی شامل ہیں - شاہی دلچسپی تھوڑے دنوں بعد کم ہونا شروع ہوئی چنانچہ درباریوں اور امرا نے بھی انجمن کی طرف سے بے رخی اختیار کی -

انتوان دے بائف کا انتقال ہوچکا تھا؛ اس کے جانشینوں میں کوئی ایسا نہ نکلا جو اس کا سا جوش اور خلوص رکھتا ہو - انجمن کی مالی حالت خراب ہوگئی؛ ایک ایک کرکے اس کے ارکان علحدہ ہونے لگے- اس بگڑی حالت کو سنبھالنے والا پیبراک (Pibrac) ہے - مجسٹریٹی کے فرائض کی انجام دہی کے باوجود اس کی طبعیت کو شعر و ادب سے لگاؤ تھا - وہ انجمن کا پرانا رکن تھا - ہنری سوم کے دربار میں بھی اس کا رسوخ تھا - اس کے اثر سے بادشاہ نے پھر انجمن کی طرف توجہ کی اور اس کی سرپرستی قبول کر لی - حکم ہوا کہ انجمن کے اجلاس شاہی محل میں منعقد ہوا کریں - شعرا کے علاوہ ارباب علم و فضل بھی اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے - اخلاق و فلسفہ کے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں - اس عہد کے مشہور شاعر اور ادیب رونسار نے ایک جلسے میں " اخلاقی خوبیاں بہتر ہیں یا ذہنی " کے موضوع پر بڑی معرکتہ الآرا تقریر کی - شاہی سرپرستی نے حاسدوں کی جماعت پیدا کر دی - انجمن کو طنز کا شکار بنایا گیا - مخالفین اسے " محل والی اکاڈمی " کہہ کر پکارنے لگے - انجمن کے ارکان کو جو قرب سلطانی حاصل ہوا وہ مخالفوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا - خود بادشاہ پرفقرے چست کیے گئے کہ سلطنت تباہ ہو رہی ہے اور بادشاہ سلامت صرف و نحو اور فلسفہ کی موشگافیوں میں مشغول ہیں سنہ ۱۵۸۴ ع میں پیبراک کے انتقال پر انجمن کا اثر اور رسوخ کم ہوگیا اور وہ پھر کس مپرسی میں پڑ گئی - اہل علم اور اہل دولت دونوں کی بے رخی کے باعث کوئی اس کا نام لیوا نہ رہا اور بظاہر انجمن کا خاتمہ ہو گیا - اس قسم کے اداروں کا تعلق شخصیت سے اس قدر گہرا ہو جاتا ہے کہ جب وہ نہ رہے تو اس کے ارکان میں محرک عمل مفقود ہو جاتا ہے —

لوئی چہاردہم کے عہد حکومت میں زمانے نے کروٹ بدلی - " محل والی اکاڈمی " کا ذکر کسی نے حسرت و افسوس کے ساتھ رشیے لیو سے کیا - اس کی

ہمہ گیر طبیعت قومی زندگی کے ہر پہلو کی اصلاح چاہتی تھی - علم و فن کا وہ قدردان تھا - اس کی دلی خواہش تھی کہ جس طرح فرانس کی سیاست کا سکہ یورپ میں رائج ہے اسی طرح علم و ادب میں بھی اس کا ملک پیچھے نہ رہے - وہ چاہتا تھا کہ ملک کے ذہنی اور علمی کارناموں کا سہرا بھی اس کے سر رہے - اس کے مخالف کہتے ہیں کہ وہ قومی زندگی کے ہر شعبے پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا اور علم و فن کی سرپرستی کے ذریعے ملک کے اس طبقے کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا جس میں غور و فکر کی صلاحیت تھی - بہر حال اس کی نیت کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا فرانسیسی ہے جس نے اپنی قوم کا وقار یورپ کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک قائم کر دیا اور فرانسیسی تہذیب و تمدن کی نقالی پر یورپ کی دوسری اقوام فخر کرنے لگیں —

رشے لیو کو اطلاع ملی کہ کونرار (Conrart) کے یہاں جو اپنے زمانے کا مشہور ادیب تھا، پیرس کے ارباب علم و فن کا مجمع رہتا ہے - اس نے اس کی سرپرستی شروع کی اور ہر قسم کی مدد دینے لگا تاکہ اہل علم کی ایک مجلس قائم ہو جائے - سنہ ۱۶۳۴ ع میں باقاعدہ اس مجلس کی حیثیت سرکاری طور پر تسلیم کر لی گئی اور سرکاری میزانیہ میں اس کے لیے ایک رقم متعین کر دی گئی - جس طرح رشے لیو نے سیاسی نراج کو دور کر کے مرکزی حکومت کو مستحکم کیا اسی طرح ملک میں جو لسانی نراج پھیلا ہوا تھا اس کے الجھاوے کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھانا چاہا - اس نے غیر معمولی دلچسپی سے انجمن کے وقار کو ملک میں قایم کر دیا - انجمن کا نام "اکادمی فرانسیس" رکھا گیا جو شروع سے اس کا اصلی نام چلا آرہا تھا - یہ نام تجویز کرنے میں غالباً یہ مصلحت ہوگی کہ اس کے ذریعے علم و فن کے میدان میں قومی خدمات کے سلسلے کو ماضی کے ساتھ جوڑا جائے - رشے لیو ایک علمی شخص تھا - اکادمی کی بنیادوں کو ہمیشہ کے لیے

مستحکم کرنے کی اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اس ادارے کے ' دوسرے سرکاری اداروں کی طرح ' قواعد وضوابط ہوں تاکہ اس کا انتظام بہتر ہوسکے اور یہ نہ سمجھا جاے کہ یہ مجلس چند شاعروں اور ادیبوں کی خوش وقتی کا ایک مشغلہ ہے - رشیے لیو کے وضع کردہ ضوابط اکاڈمی کا دستور اساسی کہلاتے ہیں - اُس وقت سے لے کر آج تک اسی دستور کے مطابق اس کی تمام کارروائیاں عمل میں آتی ہیں - قواعد کی رو سے تین عہدہ دار مقرر کیے گئے (۱) ناظم (۲) چانسلر اور (۳) معتمد - ان تینوں کے فرائض متعین کیے گئے تاکہ انتظام میں سہولت ہو - اول الذکر اور ثانی الذکر کا انتخاب مدت معینہ کے لیے اکاڈمی کے ارکان کرتے تھے اور معتمد عمر بھر کے لیے مقرر ہوتا تھا تاکہ روز روز کے جدید انتخابات سے انتظامی تسلسل میں جو رخنہ پڑنے کا اندیشہ تھا اس کا تدارک ہو سکے —

اب اکاڈمی کی حیثیت ایک سرکاری ادارے کی ہو گئی - محل شاہی (لوور) میں اس کے اجلاس ہونے لگے - اب گویا وہ مملکت کی عظمت میں دوسرے سرکاری اداروں کی طرح برابر کی شریک ہوگئی - دربار شاہی سے تعلق کی وجہ سے ملک کے ممتاز لوگ اس کے رکن منتخب ہونے کے لیے سعی و جہد کرنے لگے اور اسے سرمایۂ افتخار سمجھنے لگے - چنانچہ اکاڈمی کے ابتدائی زمانے کے ارکان میں طبقۂ امرا کی نمائندگی زیادہ نظر آتی ہے - فرانسوا شارپانتئے کا زمانۂ نظامت نہایت کامیاب رہا - رشیےلیو کےبعد کو لبیر نے بھی اکاڈمی کے معاملات میں شغف ظاہر کیا - شارپانتئے متعدد مرتبہ عہدۂ نظامت کے لیے منتخب ہوا - چونکہ اس کا دربار شاہی میں بہت اثر تھا اس لیے اکاڈمی کی حالت دن بدن بہتر ہوتی گئی اور اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا - اب اکاڈمی کو ملک کے تمام معاملات میں دلچسپی پیدا ہوئی - اگر بادشاہ نے کہیں فتح حاصل کی تو اکاڈمی کے ارکان جشن منانے میں دوسرے اداروں سے پیش پیش نظر آتے تھے اگر کسی صلح نامہ پر دستخط

ہوے تو اس کا چرچا اکاڈمی کی اجلاسوں میں سننے میں آتا تھا - اگرچہ اکاڈمی کے معاملات میں بادشاہ کو بہت کچھہ اثر حاصل تھا لیکن ارکان کے انتخابات پوری آزادی سے عمل میں آتے تھے - رشے لیو کے ضوابط میں یہ تھا کہ رکن کے انتخاب کےبعد شاہی توثیق حاصل کی جاے - اسی طرح بادشاہ کو حق حاصل تھا کہ اگر کسی رکن کا چال چلن اور رویہ قابل اعتراض اور اکاڈمی جیسے ادارے کے ارکان کے شایان شان نہ ہو تو وہ اس رکن کو رکنیت سے علحدہ کر دے - اکاڈمی کی تاریخ میں بادشاہ نے ان حقوق کو بہت کم استعمال کیا - سواے چند کے اس کی مثالیں نہیں ملتیں - اکاڈمی کے انتخابات میں جب قاموسیوں (Ency Clopaedist) کا اثر بڑھنا شروع ہوا تو اس وقت یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں بادشاہ اپنے ان حقوق کو استعمال نہ کرے - چنانچہ بعض موقعوں پر اس نے ایسا کیا —

قاموسی اپنے عہد کی سیاسی و معاشری زندگی کے بڑے نقاد تھے - قوم کا کوئی ادارہ ایسا نہ تھا جس سے وہ مطمئن ہوں - ہر جگہ انہیں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی تھی - خاص کر لوئی چہاردہم کی مطلق العنانی پر انہوں نے اعتراضات کیے کہ ایسی بلند حوصلگی سے کیا حاصل کہ رعایا قحط سے پریشان اور ملک قرض کے بوجھہ سے دب جاے - یہ سچ ہے کہ دربار ورسائی کی نقل یورپ کے دوسرے درباروں میں ہوتی تھی اور فرانسیسی تہذیب و تمدن کا طوطی یورپ کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بولتا تھا لیکن عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی - درباری چمک دمک اور شاہی حوصلہ مندیوں کا خمیازہ انہیں بیچاروں کو بھگتنا پڑتا تھا - قاموسیوں میں والٹیر ' ددرو ' روسو اور دالمبیر (D' Alambert) کی ذہنی صلاحیت اور شخصیت کا اثر اب ملک و قوم نیز اکاڈمی پر نظر آتا ہے - لوئی پانزدہم کے زمانہ میں قاموسی اثر اور زیادہ بڑھا - چنانچہ اس کی روک تھام کے لیے بادشاہ نے اکاڈمی کے چانسلر نیور نے

کو لکھا کہ " اکادمی فرانسے براہ راست میرے ماتحت ہے اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ ہر رکن پر اکادمی کے قواعد کی پابندی لازم کی جاے - اکادمی میں انعامی مقابلے کے لیے جو تصانیف پیش کی جاتی ہیں ان کے متعلق ضرورت اس کی ہے کہ ارکان پورے غور و خوض کے بعد اپنا فیصلہ صادر کیا کریں ورنہ اکادمی کو اس ذلت کے لیے آمادہ رہنا ہوگا کہ اس کے فیصلے جو جلد بازی سے کیے گئے ہیں ، ٹھکرا دیے جائیں۔ ارکان پر لازم ہے کہ وہ جو موضوع تقاریر کے لیے پسند کریں وہ ایسے ہوں کہ قومی رسم و رواج کے منافی نہ ہوں اگر ارکان اکادمی کوئی قابل اعتراض موضوع منتخب کریں گے تو ہم اپنی مرضی سے اسے رد کردیں گے " —

اب اکادمی اور دربار میں ناچاقی شروع ہوئی اور دن بدن بڑھتی گئی اس لیے کہ قاموسیوں کا اثر بڑھنا شروع ہوگیا تھا - مندرجۂ بالا فرمان اس وقت شائع ہوا جب کہ قاموسیوں نے رکنیت کے انتخابات میں پے درپے کامیابیاں حاصل کیں - دیوکلو کے انتقال پر قاموسیوں کی تحریک کا بانی مبانی دالمبیر (D' Alambert) اکادمی کا رکن منتخب ہوا - اس کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ بادشاہ کو اس کا انتخاب رد کرنے میں تامل ہوا - دالمبیر نے آہستہ آہستہ اکادمی پر، ذاتی قابلیت سے، اپنا سکہ بٹھا لیا - اور تھوڑے ہی عرصے بعد وہ معتمد مقرر ہوگیا - ملک کی عام فضا ایسی ہوگئی تھی کہ بادشاہ قاموسیوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا - اگرچہ ان میں سے بعض کو قید و بند کے مصائب برداشت کرنا پڑے - قاموسیوں میں سے جب 'دے لیل' اور 'سوار' کا انتخاب ہوا تو بادشاہ نے اسے ناجائز قرار دیا - اکادمی کے ناظم نیور نے ، جو بادشاہ کا خاص آدمی تھا ، یہ تجویز پیش کی کہ ارکان اکادمی کا از سر نو انتخاب ہو اور کسی طرح 'دالمبیر' کی معتمدی کو ختم کیا جاے لیکن جدید انتخابات میں بھی قاموسیوں نے اکثریت حاصل کرلی اور دالمبیر کی معتمدی برقرار رہی - آئندہ بیس سال تک اکادمی

کے درو بست کا وہ مالک رہا اور بادشاہ کی اس نے ایک نہ چلنے دی - جدید انتخاب سے قبل ایک شاہی اعلان شائع ہوا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں : —

" میں اپنی اکاڈمی کے انتخابات کو نہایت غور و فکر سے دیکھتا ہوں - میں اس جماعت میں ان لوگوں کو ہرگز شامل ہونے دینا نہیں چاہتا جو مروجہ معاشری رسوم پر عمل نہیں کرتے - وہ لوگ جو مذہب یا ریاست کے مخالف ہیں اور اس کا اظہار تقریر و تحریر کے ذریعے کر چکے ہیں ' ان کا اس جماعت میں شامل ہونا مجھے ہرگز گوارا نہیں " لیکن اس فرمان کا کوئی اثر مترتب نہ ہوا - ہوا وہی جو زمانے کی رفتار کا تقاضا تھا - لوئی سیز دہم نے بھی اکاڈمی پر اپنا اقتدار جتانا چاہا لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوا - ایک مرتبہ اس نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ وہ اکاڈمی کے معاملات میں براہ راست دخل اندازی کرے گا لیکن اس کے مشہور شہزادہ بوور (Beauvau) نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا اور اسے باور کرا دیا کہ اس کے دخل دینے سے کوئی مفید مطلب نتیجہ حاصل ہونے کی کوئی توقع نہیں - مطلق العنانی پر بھی بعض پابندیاں عاید ہوتی ہیں ' وہ پابندیاں رائے عامہ کی جانب سے عاید کی جاتی ہیں جو قید و بند سے آزاد رہتی ہے —

اگرچہ لوئی چہاردہم فرانس کے بادشاہوں میں اپنی مطلق العنانی اور خود سری کے لیے مشہور ہے لیکن وہ بہ نسبت اپنے جانشینوں کے زیادہ روشن خیال تھا - اگرچہ والٹیر کو اس کے زمانے میں جلا وطن کیا گیا لیکن قاموسیوں کے مسلک کے بعض دوسرے اصول کو گوارا کرنے میں اسے تامل نہ تھا - قاموسیوں کی تحریک انسانی ضمیر کے احترام اور انفرادی آزادی کے اصول پر مبنی تھی - نظری حیثیت سے بادشاہ اور حکومت کو ان اصولوں پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن جب انکا اطلاق مروجہ مذہب ' معاشرت اور حکومت پر کیا جاتا تھا

تو وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ تاہم لوئی چہاردہم کے عہد حکومت میں اکاڈمی کے معاملات میں دخل اندازی کو مناسب نہیں خیال کیا گیا۔ ایک دفعہ اس نے اکاڈمی کے ناظم موسیو داسٹے کے ذریعے ارکان اکاڈمی کو یہ پیغام کہلا بھیجا تھا ہے " مجھے یہ بات پسند ہے کہ اکاڈمی اپنے ارکان کا انتخاب کرتے وقت صرف ان کی قابلیت کو ملحوظ رکھے " - وہ اور رشے لیو برابر اس کے کوشاں رہے کہ ملک کے قابل ترین افراد اکاڈمی کی رکنیت میں شامل ہو جائیں۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ رشے لیو کا اثر اکاڈمی پر نہایت گہرا تھا۔ ارکان اکاڈمی انہیں لوگوں کو اکثر اوقات منتخب کرتے تھے جن کی تائید میں رشے لیو ہوتا تھا۔ بہرحال اصولی حیثیت سے ارکان کو آزادیء رائے بدرجۂ اتم حاصل تھی ـــ

لوئی چہاردہم کے انتقال کے بعد زمانے نے کروٹ بدلی - خاندان شاہی اور طبقۂ امرا کی بجائے عوام میں فاموسیوں کا اثر بڑھنا شروع ہوا جو شروع میں حقارت آمیز لہجے میں " فلسفی " کہلاتے تھے - چونکہ فاموسیوں کی جماعت اپنے سامنے ایک معین نصب العین اور جوش عمل رکھتی تھی اس لیے آہستہ آہستہ ملک کی ذہنی زندگی پر اس کا غلبہ مسلم ہو گیا - ان کی سعی و جہد نے ملک میں ذہنی انقلاب پیدا کر دیا جو تھوڑے عرصے بعد سیاسی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا - یہ لوگ روح عصر کے ترجمان تھے اور زمانے کو بہرحال افراد پر فوقیت حاصل ہے جو اس کی شاہراہ پر محض تھوڑی دیر کے لیے مسافر کی حیثیت سے آتے اور گزر جاتے ہیں ـــ

رشے لیو نے اکاڈمی کے اخراجات کے لیے ایک رقم مقرر کردی تھی تاکہ " اس کی ضروریات کی کفالت ہو سکے اور جلانے کی لکڑی، موم بتیاں اور نقل نویسوں کی اجرت کا انتظام ہو جائے جو لغت کی نقلیں تیار کرتے تھے " یکم اکتوبر سے ۳۰ مارچ تک اکاڈمی کا اجلاس دوشنبہ اور پنجشنبہ کے روز ۳ بجے سے لے کو

۵ بجے تک ہوا کرتا تھا اور یکم اپریل سے لغایتہ ۳۰ ستمبر ۲ بجے سے ۹ بجے تک ہوتا تھا - سات ہزار پونڈ اکادمی کے متفرق اخراجات کے لیے اور چھ ہزار چار سو پونڈ سالانہ ارکان اکادمی کو الونس کے طور پر دیئے جاتے تھے - رشے لیو کے ضوابط کی دفعہ ۲۷ اور ۲۸ میں اکادمی کے نظام عمل کی تصریح کی گئی تھی - یہ لازمی قرار دیا گیا تھا کہ اکادمی کے اجلاسوں کے دن ارکان میں سے ایک اپنا مقالہ پڑھے یا کسی علمی موضوع پر تقریر کرے - مقالے کی جانچ کے لیے کمیٹی مقرر ہوتی تھی - کمیٹی اپنی رپورٹ پیش کرتی تھی اور غلطیوں کو واضح کرتی تھی - بعض ارکان اکادمی کو اس قسم کی جانچ ناگوار تھی - کورنئی (Corneille) جیسے شخص کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ " اس عمر میں پھر اسکول کی بنچوں پر بیٹھیں " - دفعہ ۲۴ میں اکادمی کے ایک نہایت اہم مقصد کی صراحت کی گئی ہے - وہ دفعہ یہ ہے :- " اکادمی کا اصلی کام یہ ہے کہ ہماری زبان (فرانسیسی) کے صرف و نحو کی تدوین کرے ، اس میں صفائی ، سلاست اور علوم و فنون کے مطالب کو ادا کرنے کی پوری قابلیت پیدا ہو - نیز ضروری ہے کہ اکادمی ایک فرانسیسی زبان کی لغت ، ایک رسالہ خطابت پر اور دوسرا شاعری پر تیار کرے " —

سنہ ۱۷۱۲ ع میں اکادمی کی جانب سے صرف و نحو پر ایک کتاب شائع ہوئی جو شاہی احکام کے مطابق ملک کے تمام مدارس اور کلیات میں رائج کی گئی - پھر اس کی نظر ثانی پر اکادمی نے تقریباً ۲۰ سال صرف کیے اور یہ قاعدہ بن گیا کہ زبان کی آئے دن کی تبدیلیوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ہر ۲۵ سال کے بعد صرف و نحو پر نظر ثانی کی جائے - لیکن اس قاعدے پر عمل نہ ہو سکا - بجائے سب ارکان کی شرکت کے اس کام کو صرف ایک شخص ' ابے رینئے دے مارے ' کے سپرد کیا گیا جو اپنے زمانے کا مشہور نحوی گزرا ہے - اس نے صرف و نحو پر ایک جامع کتاب مرتب کی - یہ کام ایک شخص کے سپرد اس وقت ہوا جب کہ اکادمی

کے جلسے میں ایک رکن نے یہ تجویز پیش کی کہ " صرف و نحو کی بحث نہایت خشک ' دشوار اور غیر دلچسپ ہوتی ہے اس لیے یہ بہتر ہے کہ بجائے اس کے اکاڈمی کے اجلاسوں میں ادبی تنقید کی طرف توجہ کی جائے " لیکن یہ تجویز نا منظور ہوئی - غرض کہ کئی سال تک اکاڈمی کے اجلاس صرف و نحو کی بحث کے لیے وقف ہو گئے ' لیکن دراصل صرف پانچ چھ ارکان نے اس کام میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا - کئی سال کے بحث مباحثوں کے بعد بالآخر اکاڈمی اس نتیجے پر پہنچی کہ " صرف و نحو کی تدوین اس نوعیت کا کام نہیں ہے کہ سب ارکان سے اس میں دلچسپی لینے کی توقع کی جائے " -

۱۳ جولائی سنہ ۱۶۳۷ع کو اکاڈمی نے فیصلہ کیا کہ فرانسیسی زبان کی لغت لکھنی چاہیے جس میں مختلف ادیبوں اور شعرا کے کلام کی مثالیں مستند طور پر پیش کی جائیں - ہر لفظ کی تحقیق میں سند پیش کی جائے تا کہ الفاظ کے معنی متعین ہوں اور زبان میں صحت پیدا ہو - لغت کی تدوین کا خیال اس لیے اور بھی پیدا ہوا کہ صرف و نحو کی بحثیں مفید مطلب ثابت نہیں ہوتیں اور ارکان ان سے اُکتا گئے - یہ خیال کیا گیا کہ لغت کا کام ایسا ہے کہ سب ارکان اس میں ہاتھ بٹا سکیں گے اور ہر شخص کو اس میں اپنی قابلیت کے جوہر ظاہر کرنے کا موقع ملے گا - جس وقت یہ تجویز پیش اور منظور ہوئی اس وقت والیندسون اکاڈمی کے ناظم اور موسیو داسئیے معتمد تھے - لغت کا کام جوش کے ساتھ شروع ہوا - ہر لفظ کی تحقیق پر ارکان طول طویل تقریریں کرتے اس کام میں اتنی تاخیر ہونے لگی کہ بعض طنز نگاروں نے اکاڈمی کے ارکان کی سست رفتاری پر پھبتیاں چست کیں - ابتدا میں کام بہت سست رفتار سے ہوا لیکن سنہ ۱۶۵۲ع میں اصل تجویز کے منظور ہونے کے پندرہ سال بعد شاپلین کی سرکردگی میں کام کی رفتار تیز ہوئی - مشہور ادیبوں ' انشاپردازوں اور شعرا کے کلام میں سے مثالیں اور سندیں

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالی گئیں - کام اس قدر پھیل گیا کہ اس کا سنبھالنا مشکل اور سمیٹنا ضروری ہوگیا - بالآخر اکاڈمی نے یہ تجویز منظور کی کہ سلسلہ کو نظر انداز کیا جائے - تجربے نے بتایا کہ تدوین لغت کا کام بھی اس نوعیت کا نہیں ہے کہ سب ارکان اس میں دلچسپی لیں یا اس کے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں - بالآخر موسیو دے 'ووز یلاس' اور 'موسیو فارے' کے ذمے یہ کام کیا گیا اور انہیں اس کے لیے اسٹاف دیا گیا - بطور الاونس دونوں کے لیے اکاڈمی نے ۲ ہزار پونڈ سالانہ مقرر کردیے تا کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کی طرف سے بے فکر ہو کر ہمہ تن کام میں مصروف ہو جائیں - ہر چہار شنبہ کو ہفتے میں ایک مرتبہ لغت کا کام ارکان کے سامنے پیش ہوتا تھا اور اس پر بحث مباحثہ ہوتا تھا - 'ووز یلاس' کے انتقال پر موسیو میزیرے نےلغت کے کام کو اپنے ذمے لیا - وہ سنہ ۱۶۷۲ع تک حرف ایس (S) تک پہنچے - ساتھ ساتھ گشتی طور پر لغت کی نظر ثانی کا کام ارکان کے ذمہ کیا گیا - ہر ممبر کے پاس کاغذات زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ رہتے تھے پھر اس کے بعد دوسرے ممبر کے پاس بھیجے جاتے تھے - 'کو لبیر' کے زمانۂ وزارت میں کام کی رفتار بہت تیز ہوگئی اس لیے کہ وہ اسے جلد از جلد ختم کرانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ہر قسم کی امداد کی تا کہ سہولت ہو - سنہ ۱۶۷۳ ع میں حروف تہجی کے لحاظ سے فرانسیسی زبان کے سب الفاظ کی فہرست تیار کی گئی - یہ اس لیے کیا گیا کہ لغت کی تدوین الفاظ کے مادے کے لحاظ سے کی گئی تھی اور یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے - بعض ارکان نے یہ تجویز پیش کی کہ تدوین حروف تہجی کے لحاظ سے از سر نو کی جائے لیکن چونکہ اور بہت وقت صرف ہوتا ' یہ تجویز رد ہو گئی - مادے کے لحاظ سے الفاظ کی ترتیب میں یہ قباحت تھی کہ اگر کسی لفظ کے معنی دیکھنا ہوں تو اس کے ساتھ اور دوسرے بہت سے غیر متعلق الفاظ دیکھنا پڑتے تھے جس کے باعث بہت وقت ضائع جاتا تھا سنہ ۱۶۷۴ ع میں بادشاہ کی طرف سے اعلان کیا گیا

کہ اکاڈمی کی لغت کے علاوہ ملک میں اور کوئی لغت طبع نہ کی جائے - مطبعوں اور کتب فروشوں کو خاص کر تاکید کی گئی کہ اکاڈمی کی لغت کے علاوہ وہ نہ کسی لغت کو چھاپیں اور نہ فروخت کریں - یہ حکم ۲۰ سال تک نافذ رہے گا تاکہ اس وقت تک اکاڈمی کی لغت شائع ہو جائے - اکاڈمی کی لغت شائع ہونے سے قبل اکاڈمی کے ایک رکن نے جو 'مہزیرے' کے ساتھ لغت کے کام میں شریک تھا اپنی ایک علحدہ لغت شائع کر دی - اس کا نام میلوریٹر تھا - اکاڈمی کی جانب سے بادشاہ کی خدمت میں استغاثہ پیش کیا گیا کہ میلوریٹر نے اکاڈمی کے بعض کاغذات کی نقلیں حاصل کر کے اپنی لغت تیار کرلی ہے - یہ صریح سرقہ ہے اور اس کی قرار واقعی سزا دینی چاہیے - چنانچہ اکاڈمی نے یہ تجویز بادشاہ کے پاس بھیجی کہ میلوریٹر کو رکنیت سے محروم کر دیا جائے اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو منتخب کیا جائے- ناظم اکاڈمی نےاکاڈمی کے کاغذات سےمقابلہ کرکے ثابت کیاکہ میلوریٹر نے ناجائز طور پر نقلیں حاصل کیں - لیکن میلوریٹر با اثر شخص تھا - سیاست میں شرکت کے باعث دربار میں ایک جماعت اس کی پشت پناہ موجود تھی - خود اکاڈمی کے چانسلر موسیو تیلئے اس کے طرف دار تھے اور اسے بری الذمہ کرنا چاہتے تھے- بادشاہ کا بھی منشا یہی تھا کہ اس کو انتہائی سزا نہیں دینی چاہیے - چنانچہ بادشاہ نے یہ مفاہمت کرادی کہ میلوریٹر کو اکاڈمی کی رکنیت سے برطرف نہ کیا جائے اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کا انتخاب عمل میں نہ آے لیکن میلوریٹر کو چاہیے کہ وہ آئندہ کبھی اکاڈمی کے اجلاسوں میں شرکت نہ کرے - اس مفاہمت کے مطابق میلوریٹر کی کرسی خالی رہی اور اس کے انتقال پر دوسرے رکن کا انتخاب کیا گیا - میلوریٹر نے اکاڈمی کے خلاف رسالے شائع کیے اور ارکان کی بے توجہی اور غفلت کو طشت از بام کیا —

شاہی فرمان میں اس کی وضاحت کی گئی تھی کہ لغت تمام تر سرکاری خرچ سے

طبع ہو گئی- اس کے منافع میں سے ایک تہائی شاہی خزانے میں' ایک تہائی میں اکاڈمی اور باقی تہائی میں پیرس کا اسپتال اوتل دیو (Hotel -Dieu) شریک ہوں گے- میزیرے کے انتقال پر ریلیے دیمارے (Regnier Desmaras) نے نہایت گرم جوشی کے ساتھہ لغت کے کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا - اس کے ساتھہ کورنئی اور باربئے اوسون نے بھی بہت محنت سے کام میں ہاتھہ بٹایا - غرض کہ لغت کا پہلا ایڈیشن ۲ جولائی سنہ ۱۶۹۴ ع کو شائع ہوا اور اس کا نام "لغت اکاڈمی فرانسیے" (Dictionaire be l' academie Francaise) رکھا گیا - جب اس کا نسخہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے ارکان اکاڈمی کو ان کی سالہا سال کی جانفشانی کی داد اور مبارک باد دی - لغت کا ایک ایک نسخہ بادشاہ اور ملکۂ انگلستان کی خدمت میں بھی بھیجا گیا —

لغت کے کام کے خاتمے پر گویا اکاڈمی کے سر سے ایک بڑا بوجھہ ہلکا ہوگیا - تھوڑے دن تک ارکان اس شش و پنج میں رہے کہ اب کیا کام شروع کریں - لیکن لغت کے شائع ہونے کے فوراً بعد یہ محسوس کیا گیا کہ جلد اس کی نظر ثانی کی ضرورت ہے - چنانچہ سنہ ۱۷۰۰ ع میں نظر ثانی کا کام اعلیٰ پیمانے پر شروع کیا گیا - اس دفعہ لغت کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق کی گئی - بہت سارے نئے الفاظ شامل کیے گئے اور مثالوں اور سندوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا - پہلے ایڈیشن کی تیاری کے وقت اسناد کو نظر انداز کیا گیا لیکن دوسرے ایڈیشن کو مکمل بنانے کی ہرممکن کوشش کی گئی- دوسرا ایڈیشن ۲۸ جون ۱۷۱۸ع میں شائع ہوا- مزید نظرثانی کے بعد تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۷۴۰ع میں منظر عام پر آیا - اب اکاڈمی نے اور سب کاموں کو چھوڑ کر صرف لغت کا کام اپنے ذمے لے لیا - پانچواں اڈیشن سنہ ۱۷۶۲ ع میں نکلا —

لوئی سیزدہم کو اکاڈمی کے مقاصد سے کوئی ہم دردی نہیں تھی - اس کی

بے رخی کا زیادہ اثر اکاڈمی کے کاموں پر اس لیے نہیں پڑا کہ اس نے اب ایک مستقل سرکاری حیثیت حاصل کرلی تھی - اس کے ارکان میں ملک کے ہر شعبۂ زندگی کے ممتاز افراد شامل تھے - قوم کی نظر میں اس کی وقعت قایم ہو چکی تھی - کسی فرانسیسی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی فخر نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ " چالیس میں سے ایک " ہو جاے - اکادمی کے چالیس ارکان ابدی قرار دیے گئے اس لیے کہ اس کے کسی رکن کے انتقال پر فوراً کسی دوسرے کا انتخاب عمل میں آتا تھا - لوئی سیزدہم کی عمر تخت نشینی کے وقت ۲۰ برس کی تھی - ایک ناتجربہ کاری دوسرے گرد و پیش کی صحبت اور خوش وقتی کے مشاغل سے اتنی فرصت کہاں مل سکتی تھی کہ وہ کسی علمی کام کی طرف توجہ کرتا اور اس کی قدر دانی کرتا - اس کی بے رخی کا یہ عالم تھا کہ تخت نشینی کے کچھہ عرصے بعد ارکان اکادمی کی طرف سے اس کی خدمت میں یہ معروضہ پیش کیا گیا کہ وفد کو مبارک باد دینے کے واسطے باریابی کا موقع دیا جاے - تو اس پر نوجوان لوئی نے یہ جواب دیا کہ "انھیں کہلا بھیجو کہ وفد میں جتنے کم لوگ ہوں اتنا اچھا ہے" —

لوئی سیزدہم کے عہد حکومت میں نظم معاشرت تہ و بالا ہو رہا تھا ، سیاسی ہیجان بڑھ رہا تھا - جنگ ہشت سالہ کے بعد سے فرانس کا سیاسی تفوق یورپ میں ختم ہوچکا تھا اور لوئی سیزدہم کے زمانے میں بادشاہی آمادہ بہ زوال ہوگئی تھی - طبقۂ سوم کی ترقی نے امرا اور بادشاہی دونوں کو اپنے مطالبات سے مرعوب کرلیا تھا - ملک کی معاشی حالت پست اور دربار کے مسرفانہ اخراجات میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا - غرض کہ انقلاب سے پہلے ہی اختیارات مملکت بادشاہ اور جاگیرداروں کے ہاتھہ سے نکل کر عوام کے نمائندوں کے ہاتھہ میں آگئے تھے - سنہ ۱۷۸۹ ء میں مجلس قومی نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھہ میں لی اور

سنہ ۱۷۹۳ ع میں لوئی سیزدھم کو غداری کے جرم میں قتل کیا گیا - انقلاب پسند صرف ایک نیا نظام حکومت قایم کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ حکومت کے ہر ادارے کو مٹانے اور پھر سے بنانے پر مصر تھے - لیکن صرف " اکاڈمی فرانسیسی " ایک ایسا ادارہ تھا جسے مٹاکر انہوں نے پھر سے بنانے کی طرف توجہ نہ کی - اکاڈمی کی تائید میں چند انقلاب پسند تھے جو اسے " خاندان والٹیر " (Famille de voltaire) کہہ کر پکارتے تھے لیکن انتہا پسند انقلابیوں کے نزدیک اکاڈمی مطلق العنانی کے زمانے کی یادگار تھی اس لیے اس کا خاتمہ ہی بہتر تھا - چنانچہ اکاڈمی کا خاتمہ ہوگیا - لیکن کچھہ عرصے بعد جب انقلاب کا ہنگامہ ختم ہوا نپولین اول نے دیکھا کہ اس کی بلند حوصلگی کے لیے میدان خالی ہے - اس نے جمہوریت کو طاق میں بٹھا کر تخت و تاج پر قبضہ کیا اور از سر نو شاہی کی بنیادیں استوار کیں - اس کے زمانہ حکومت میں قدیم اداروں نے آہستہ آہستہ خاک و خون سے اپنا سر اٹھایا - انقلابیوں کے نزدیک علم و فن خالی ڈھکوسلے تھے - حالانکہ جن لوگوں نے انقلاب کی بنیاد ڈالی تھی وہ اہل علم ہی کا طبقہ تھا - خود اکاڈمی کے بعض ارکان نے ملک میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے اپنے تئیں مصائب میں مبتلا کیا تھا - لیکن یہ سب کچھہ فراموش کر دیا گیا اور ناشکری کے ساتھہ انقلابیوں نے اپنے محسن کے گلے پر چھری پھیرنے میں مطلق تامل نہ کیا —

نپولین اول نے اکاڈمی کو پھر سے زندہ کیا - رشیلیو کے قایم کردہ ضوابط میں چند جزوی تغیرات کر کے اس کی سرکاری حیثیت برقرار کی گئی - اس وقت سے آج تک اکاڈمی ایک سرکاری ادارہ ہے اور آج بھی اس کی رکنیت فرانس کے ارباب علم و فضل کے لیے سرمایۂ افتخار تصور کی جاتی ہے - اب بھی اس کے ذمہ سب سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ لغت میں نئے الفاظ داخل کرنے کی اجازت اور متروک الفاظ کے متعلق فتویٰ دے - کوئی نیا لفظ فرانسیسی

لغت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک اکادمی نے اس پر صاد نہ کر دیا ہو - گویا یہ ادارہ فرانسیسی قوم کے لیے زبان کا امین ہے - زبان کے متعلق ہر مسئلے پر اس کی رائے قطعی تصور کی جاتی ہے - اس کی مساعی کی بدولت فرانسیسی زبان میں نفاست ' سلاست اور صحت و صفائی کی خوبیاں پیدا ہوئیں - فرانسیسی ادب میں بھی یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں - اس کی لطافت اور پاکیزگی بڑی حد تک اسی ادارے کی مرہون منت ہے —



تبصرے

نام کتاب	صفحہ
ادب	
بہادر شاہ ظفر	۷۲۴
دیوان معروف	۷۳۷
انجام (ڈراما)	۷۳۹
ٹیگور اور ان کی شاعری	۷۴۰
نیم شب (ڈراما)	۷۴۱
جوش کے سو شعر	۷۴۳
غالب کے سو شعر	۷۴۳
آہ کے سو شعر	۷۴۴
محمود اور فردوسی	۷۴۴
سالنامۂ بزم اردو جامعہ عثمانیہ	۷۴۵
بچوں کی رباعیاں	۷۴۷
تاریخ و سیر	
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش	۷۴۸
انقلاب فرانس	۷۵۲
دو خدائی خدمت گار	۷۵۳
ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ	۷۵۴
ضروری کہانیاں	۷۵۵
مذہب و اخلاق	
فلسفۂ تعلیم اسلام	۷۵۶
اسلام اور حق خلع	۷۵۸
چالیس حدیثیں	۷۵۹
مسلمان بیبیاں	۷۶۰
متفرقات	
اجتماعیت	۷۶۰
اردو کے جدید رسالے	
ایشیا	۷۶۱
رومان (مصور ماہنامہ)	۷۶۲

نام کتاب	صفحہ
کوثر	۷۶۳
مصحف	۷۶۴
شاعر	۷۶۴
کنول	۷۶۵
شہاب	۷۶۸

زنانہ رسالے

نام کتاب	صفحہ
صدائے نسواں	۷۶۸

خاص نمبر اور سالنامے

نام کتاب	صفحہ
رسالہ ھمایوں کا فرانسیسی ادب نمبر	۷۶۹
نیرنگ خیال کا مشرق نمبر	۷۷۴
سالانا مجلہ کابل	۷۷۵
نظام گزٹ سالگرہ نمبر	۷۷۶
رھبر نسواں (سالگرہ نمبر	۷۷۷

دوسری زبانوں کے رسالے

نام کتاب	صفحہ
ھلس	۷۷۷





تبصرے

ادب

بہادر شاہ ظفر

(مولفہ منشی امیر احمد علوی صاحب بی۔ اے۔ صفحات ۱۵۲
قیمت مجلد ایک روپے بارہ آنے ' غیر مجلد ایک روپے چار آنے)

اس کتاب میں تیموری خاندان کے آخری تاجدار بہادر شاہ کے حالات زندگی ابتدا سے دم آخر تک درج ہیں - فاضل مولف نے یہ تذکرہ بہت دردمندانہ طرز میں لکھا ہے - جن حالات میں بادشاہ (جو درحقیقت نام کے بادشاہ تھے) تخت پر بیٹھے' ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو جو سلوک اُن سے کیے' غدر میں جو جو مصائب اُن پر اور اُن کی اولاد پر گزرے اور قید فرنگ میں جیسی کچھ گزری ' ان سب کا بیان اچھی خاصی داستان غم ہے اور کون ہے جسے ان دردناک حالات سے ہمدردی نہ ہوگی —

غدر کے زمانے میں انگریزوں کے دلوں میں انتقام کا مادہ ایسا مشتعل ہو رہا تھا اور وہ غم و غصہ سے ایسے اندھے ہو رہے تھے کہ یہ بھی

نہ دیکھا کہ ایک تراسی برس کا بوڑھا جس کے پاس نہ جاہ و دولت ہے نہ قوت و اقتدار، جس میں نہ ہمت مردانہ باقی تھی نہ قوت عمل وہ کیا ہوس سلطنت گیری کرے گا اور اُس میں انگریزی فوج سے مقابلے کا کیا دم خم ہوگا - وہ بیچارہ باغیوں کے بس میں تھا وہ جو چاہتے اُس کے نام سے کرتے اور فرامین پر بے پوچھے اُس کی مہریں کر دیتے تھے - یہ حالات ایسے نہ تھے جو معلوم نہ ہو سکتے یا قیاس نہ کیے جاسکتے لیکن اس ہنگامۂ رستخیز میں اتنی رواداری کس میں تھی جو اس کے لیے تھوڑی سی بھی دردسری کرتا - کورٹ مارشل قائم کی، فرد جرم مرتب کی اور سزا دے دی - ظفر کی زندگی بڑی عبرت انگیز ہے —

ظفر کی تعلیم بہت اچھی ہوئی تھی - وہ ان سب ہنروں میں جو اس زمانے میں امرا و سلاطین کے لیے لازم سمجھے جاتے تھے، طاق تھے - فارسی ادب، خوشنویسی، تیر اندازی، نشانہ بازی، شہسواری، شعر شاعری وغیرہ میں پوری مہارت حاصل تھی —

زوال کے زمانے میں امرا اور بادشاہ عیش و عشرت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور جو زیادہ صاحب ذوق ہوتے ہیں انہیں شعر شاعری، تصوف یا مذہب سے شغف ہو جاتا ہے - شراب کے نشہ کی طرح ان کا اثر چھا جاتا ہے، فکر پاس نہیں پھٹکتا اور یہ مشغلے "مکروہات دنیا" سے محفوظ رکھتے ہیں - بادشاہ نے بھی پیری مریدی شروع کر دی تھی - مریدوں کو شجرہ عنایت ہوتا تھا - وحدت الوجود کی تعلیم دیتے تھے اور اکثر مریدوں کو پانچ روپے ماہانہ بطور مدد معاش ملتا تھا - اس لالچ میں مریدوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی —

بادشاہوں اور امرا کی شاعری کے متعلق اکثر سوء ظن کیا جاتا ہے -

حضرت ظفر کی شاعری کے متعلق بھی بہت سے لوگ ایسا ہی گمان رکھتے ہیں - قابل مولف اس سوء ظن کو ہیچ و پوچ خیال کرتے ہیں - آزاد کے قول پر سختی سے تعریض کی ہے اور اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ بذات خود بہت بڑے شاعر تھے - لیکن یہ بحث پھر بھی کسی قدر تشنہ معلوم ہوتی ہے —

غدر کے بعد بادشاہ فوجی عدالت میں پیش ہوتے ہیں اور ان پر فرد قرار جرم لگائی جاتی ہے - بادشاہ نے ان جرموں سے انکار کیا اور اپنا تحریری بیان پیش کیا - اس بیان کی پوری نقل اس کتاب میں درج ہے - لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ تمام عبارت خود بادشاہ کی ہے یا انگریزی ترجمے سے ترجمہ کی گئی ہے - طرز عبارت سے شبہ ہوتا ہے - اول تو شاہی دفتر کی زبان فارسی تھی جیسا کہ خود بادشاہ نے اپنے اس بیان میں فرمایا ہے - دوسرے اس میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو بادشاہ کے قلم کے نہیں معلوم ہوتے مثلاً :—

" میرے سکریٹری سے انھیں صاف کرواتے" - " مختلف تحریریں روئداد کی فائل بن گئی ہیں " - " ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتا تھا " —

ان جملوں میں سکریٹری، فائل اور خاص کر صدائے احتجاج کے الفاظ ایسے ہیں جو بادشاہ کے نہیں ہوسکتے - " صدائے احتجاج " آج کل کا فقرہ ہے اُس وقت یہ استعمال نہیں ہوتا تھا —

بادشاہ کے پانچ دیوان تھے جن میں سے آخری دیوان ' هنگامۂ غدر میں تلف ہوگیا - باقی چار چھپ چکے ہیں - ان کے علاوہ فارسی نثر میں بھی ان کی تالیفات ہیں —

دیوان معروف

(مرتبہ مولانا شاہ عبد الحامد قادری بدایونی - ناشر عابد القادری صاحب بدایونی ' مولوی محلہ ' بدایوں - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

نواب الہی بخش خاں معروف دہلی کے نامور امرا میں سے تھے - ان کے والد مرزا عارف جان احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے زمانے میں دلی میں آکر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ معروف کے بڑے بھائی نواب فخر الدولہ دلاور الملک مرزا احمد بخش خاں والیء ریاست فیروز پور جھرکا و لوہارو تھے - حضرت معروف کا میلان تصوف و معرفت کی جانب تھا - خواجہ ضیاء الدین سے بیعت ہوے اور سلسلۂ چشتیہ میں مرید صاحب اجازت تھے - آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں ' بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم - بنیادی بیگم کے بطن سے زین العابدین خاں عارف تھے - جنہیں مرزا غالب اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے - اور ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - امراو بیگم کی شادی مرزا نوشہ (غالب) سے ہوئی —

معروف کو شعر و سخن کا خاص ذوق تھا اور شاہ نصیر سے تلمذ تھا - آزاد نے لکھا ہے کہ " جو دیوان معروف اب رائج ہے وہ تمام و کمال انہی (ذوق) کا اصلاح کیا ہوا ہے " - نواب مرزا سعید الدین احمد خاں طالب خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر نے اس کی بدلائل معقول تردید کی ہے اور اپنے والد مرحوم کے حوالے سے اس بیان کو غلط ثابت کیا ہے - نواب ضیاء الدین خاں نیر نے بالمشافہ آزاد سے اس بارے میں گفتگو کی اور اُن کے بیان کو خلاف وقائع نگاری بتایا اور حافظ غلام رسول ویران تلمیذ ذوق نے بھی اس کی تائید کی —

معروف کے دو دیوان ہیں - جن میں سے ایک اب طبع ہوا ہے - یہ دیوان

معروف کے پرپوتے مرزا نصراللہ خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا صدر محاسب سرکار عالی کے پاس بحفاظت تمام موجود ہیں۔ پہلا دیوان انہوں نے اپنا سے مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی نے طبع کرایا ہے - دیوان کے آخر میں چند مخمس ہیں جو بعض نامی شعرا کی غزلوں کی تضمینیں ہیں - مخمسوں کے بعد رباعیات، قطعات اور مطلعات ہیں - سب سے آخر میں چار مثنویاں اور مشہور تسبیح زمرد ہے - تسبیح زمرد کا قطعۂ تاریخ فارسی میں ذوق مرحوم کا لکھا ہوا ہے - خاتمے پر نواب مرزا سعیدالدین خاں طالب مرحوم کی تقریظ ہے جو پڑھنے کے قابل ہے - اس کے بعد احسن مارہروی صاحب کا مفصل تبصرہ ہے —

کلام کے متعلق شیفتہ جیسے نقاد کی یہ رائے ہے - "اکثر خیالات رنگین و مضامین دلنشین دارد" - حضرت معروف کو اپنے اُستاد شاہ نصیر کی طرح سنگلاخ اور نئی نئی زمینوں میں غزلیں کہنے کا شوق تھا اور اُسے خوب نبھاتے تھے - اُن کے اشعار ہر رنگ میں پائے جاتے ہیں جن کا بہت اچھا انتخاب احسن صاحب نے اپنے تبصرے میں کر دیا ہے - لیکن زیادہ تر انہیں زبان کے محاورے اور روزمرہ کے لکھنے کا اپکا تھا اور اس لحاظ سے اُن کا کلام خاص طور پر مطالعے کے قابل ہے - اس میں ایسے ایسے محاورے اور الفاظ نظر آتے ہیں جو اُن کے ہم عصر شعرا کے کلام میں نہیں ملتے - ان کی زبان مستند اور ٹکسالی ہے اور اس لیے زبان دانی کے شائقین اور زبان کے محققین کے لیے بے بہا سرمایہ ہے - مولانا حالی نے زبان کو درستی اور صفائی کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے منجملہ دیگر شرائط کے شعرائے اہل زبان کے کلام کا مطالعہ بھی ضروری قرار دیا ہے - چنانچہ وہ فرماتے ہیں :—

> "اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور ان کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ اُن کے الفاظ و محاورات بقدر معتد بہ نا معلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں - لیکن

چونکہ ایسا موقع ہر شخص کو ملنا دشوار ہے اس لیے ضرور ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے۔ نہ اس ارادے سے کہ خیالات و مضامین میں ان کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں " —

اس ضمن میں ایسے شعرا کے نام بھی بتائے ہیں جن کے کلام کا مطالعہ ضروری ہے - ان میں حضرت معروف کا نام بھی ہے - معروف کے کلام کی بڑی خوبی اسی ایک بات میں ہے۔ ہمیں مرزا نصراللہ خاں صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کی بدولت یہ کلام طبع ہو کر شایع ہو گیا —

انجام (ڈراما)

مصنفۂ محمد مجیب صاحب بی - اے (آکسن) حجم ۱۱۴ صفحات - کاغذ اچھا - طباعت دیدہ زیب - ٹائپ کی چھپائی اور پختہ جلد - قیمت ۱۲ آنے - ملنے کا پتا - مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی —

اس سماجی ڈرامے میں مجیب صاحب نے ان حاملان عرش کی پردہ کشائی کی کوشش کی ہے جو خانقاہوں اور درگاہوں میں کذب و افترا کا جادو جگایا کرتے ہیں - ایک سابق حاکم عدالت شیخ نجم الدین پنشن لینے کے بعد توبہ و استغفار کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جیسا کہ ان کے طبقے کا خاصہ ہے' پچھلے گناہوں کا احساس اب ان کی جان کا لاگو ہو گیا ہے - ان کی بیمار روح علاج کی غرض سے مولانا عبداللہ اور شاہ نور محمد کے حجروں کی زنجیر ہلاتی ہے - یہ دونوں بگلا

بھگت شیخ صاحب کے ہراس اور وہم کو اس درجہ بڑھا دیتے ہیں کہ وہ فساد اعصاب میں مبتلا ہو کر آپ اپنی جان لے لیتے ہیں —

فنی اعتبار سے ہمیں اس ڈرامے میں کوئی خوبی نظر نہ آئی - شیخ صاحب کے ذہنی ہیجان کے گرد کوئی پر اسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں اتنی زیادتی کی گئی ہے کہ ڈراما بے نمک ہوگیا - پلاٹ کے دو پہلو تھے جن میں سے ایک نہ ایک کی وضاحت ضروری تھی - یا تو سجادہ نشینوں اور خرقہ پوشوں کے مکروہ چہرے بے نقاب کیے جاتے اور یا پنشن خوار عبادت گزاروں کی ذہنی پراگندگی کو ظاہر کیا جاتا - ڈرامے کے نصف حصے تک موضوع میں میں ابہام موجود تھا جو بعد میں بالکل دب گیا - خواب میں سیہ فام آدمی کا بار بار آنا اور شیخ صاحب کی موت کے بعد بھی ہر آدمی کا ملک الموت کے راز دار کی طرح سر ہلا کر یہ کہنا کہ ' یہ بھی ایک بھید کی بات ہے' — پلاٹ میں بلا ضرورت الجھن پیدا کر دیتا ہے - پہلے ایکٹ کے تیسرے منظر میں فقیر کی سات سطر طویل صدا کو چھ چھ مرتبہ دہرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی —

زبان کی سادگی اور صفائی ڈرامے کی خشکی کی تھوڑی سی تلافی کر دیتی ہے -

' نا خدا '

ٹیگور اور ان کی شاعری-

از مخدوم محی الدین صاحب بی - اے (عثمانیہ) حجم ۱۲۸ صفحات - کاغذ ، کتابت و طباعت معمولی - قیمت ایک روپیہ ۸ آنے - مطبوعۂ عہد آفرین پریس ، حیدرآباد دکن-

ٹیگور کی مختلف تحریروں کے تراجم اردو زبان میں کثرت سے شایع ہو رہے ہیں - لیکن اب تک کوئی ایسی کتاب نہ لکھی گئی تھی جو ان کی شخصیت کو

واضح کرتی - مقام مسرت ہے کہ اب اس طرف بھی توجہ ہونے لگی ہے اور یہ کتاب اس امر کا پہلا ثبوت ہے —

پیش نظر کتاب میں ٹیگور کی شخصیت ' ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور ان کے فلسفۂ زندگی پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے - 'ٹیگور کا پیام' 'گاندھی اور ٹیگور' اور 'شانتی نکیتن' پر علحدہ ابواب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے - بنگلہ زبان سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے صاحب کتاب کا دائرۂ نظر لا محالہ محدود رہ گیا - ٹیگور کی شاعری کی لفظی و معنوی خوبیوں کو وہ نہ بتلا سکے اور نہ یہ دکھلا سکے کہ نثر و نظم دونوں میں ان کا طرز تحریر کن لطافتوں اور اور نزاکتوں کا حامل ہے - تا ہم اس کتاب میں انسان اور فلسفر کی حیثیت سے ٹیگور پر جو کچھہ کہا گیا وہ بہت غنیمت ہے - اور اس میں شک نہیں کہ اس کے لکھنے میں مخدوم صاحب نے محنت کی اور با مذاقی و سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے - کتاب کی قیمت زیادہ ہے —

'نا خدا'

نیم شب (ڈراما)

از اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم - اے - حجم ۷۶ صفحات -
کاغذ اچھا - کتابت و طباعت اچھی - قیمت ۸ آنے - ملنے کا پتا -
مکتبہ جامعۂ ملیہ دھلی

انجیل میں ایک سبق آموز قصہ ہے - وہ یہ کہ بالاق نے بڑی خوشامدوں کے بعد بلعام کو تیار کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو بد دعا دے - لیکن عین موقع پر بلعام کی مت پھر گئی اور اس نے تباہی و ہلاکت کی بد دعا کے بجائے بنی اسرائیل کو برکت کی دعا دے ڈالی —

یہ قصہ ہمیں یوں یاد آیا کہ ڈراما نگار نے ان صفحات میں جن لوگوں کو

مردود قرار دینے کی کوشش کی تھی ' یہی اسطور میں وہی مخلص نظر آتے ھیں اور وہ پنڈت ' زمیندار اور ساھوکار جو وطن کے ملجا و ماوی بتلائے گئے ھیں ' نہایت ھی شقی القلب اور سیاہ باطن معلوم ھوتے ھیں —

ڈرامے کا موضوع مصنف کے الفاظ میں یہ ھے : " ھندوستان میں اس صدی کے اندر اشتراکیت بہت مقبول ھوگی - اس کے سیاسی ' مذھبی اور معاشرتی نتائج کیا ھوں گے ؟ ... ... تمثیل نگار صرف یہ دکھانا چاھتا ھے کہ اس قسم کی تحریک اگر معرض وجود میں آئی تو افراد پر اس کا اثر کیا ھوگا ... ... میں اس کا مدعی نہیں ھوں کہ اس تمثیل میں میرے خیالات کا اثر موجود نہیں ھے - ھر تصنیف مصنف کی شخصیت کا آئینہ ھوتی ھے - " تمثیل نگار کی صاف بیانی کے بعد اس حجت کا کوئی محل نہیں کہ اس ڈرامے میں ان کی شخصیت نے بنیئے اور پنڈت کو ھی اپنے جذبات کا آئینہ دار کیوں بنایا - البتہ ھمیں ساھوکار کی زبان سے ان کا یہ استدلال سمجھہ میں نہ آیا کہ " میں روپیہ قرض دیتا تھا جس سے کسانوں کے بھگڑے کام نکلتے تھے - میں روپیہ نہ دیتا تو وہ کھیتی باڑی نہ کر سکتے ... ... مہاجنی اتنا برا کام نہیں جتنا آپ سمجھتے ھیں " - (صفحہ ۵۵) پنڈتوں اور ملاؤں کی یہ تائید بھی قابل غور ھے : " میں دوسروں کو سیدھا رستہ دکھاتا ھوں ... ... میں نے ساھوکار کو سود لینے سے نہیں روکا اور نہ زمیندار کو لگان لونے سے منع کیا - جب لوگوں پر ظلم ھوتا تھا تو میں ان سے جاکر کہتا تھا کہ صبر کرو پرمیشور کی یہی مرضی ھے " - (صفحہ ۵۸) یعنی ڈراما نگار ایک ایسے سماجی نظام کی تائید کرتا ھے جس میں زمینداروں کی ضرورت اس لیئے ھے کہ وہ لگان لیں اور اس کے ایک حصے کو خیرات کریں — اور ظاھر ھے کہ اس سے بڑھ کر خدمت خلق کوئی نہیں — اور ساھوکاروں کے لیئے ناگزیر نہیں کہ وہ کاشتکاروں کو قرض دیں ورنہ وہ طفیلیوں کو اناج کہاں سے دیں گے؛ زمیندار کو لگان کس طریقے سے ادا کریں گے

اور پلٹنوں کے حلوے مانڈے کا انتظام کیوں کر کریں گے - ثابت یہ ہوا کہ لگان اور سود دینا منشائے ربانی ہے اور جبر و تشدد کو خاموشی سے برداشت کرنا عین سعادت ہے —

قریشی صاحب ان لوگوں سے بہت خفا ہیں جو سماج میں ایسا تغیر کرنا چاہتے ہیں جس سے غریب و امیر کا فرق مٹ جائے اور ہر انسان کو زندہ رہنے کا موقع ملے - اس خفگی کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوا ہے - ان لوگوں کو جی بھر کر گالیاں دی گئی ہیں اور ان کے ذکر کے پہلے "کتوں" کا اسم صفت ہر جگہ نظر آئے گا ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ 'وطن' کو بین القومی جمہور کے ہاتھوں بیچ رہے ہیں - مطلب یہ ہے کہ وہ سیٹھوں اور ساہوکاروں کی دست برد سے غریبوں کو نجات دلا رہے ہیں اور بنی نوع انسان کو قومی و وطنی تعصبات سے آزاد کر رہے ہیں - ان پر یہ تہمت بھی لگائی گئی ہے کہ وہ عزیزوں کو اپنے مسلک پر قربان کر دیتے ہیں یہ لغو اور لا یعنی بہتان دنیا کی ہر مذہبی و سیاسی تحریک پر لگایا جا سکتا ہے - ڈراما نگار کو اعتراض کے لیے زیادہ سلجھدہ پیرایہ تلاش کرنا چاہیے تھا —

ڈرامے کا فنی معیار بھی پست ہے — 'نا خدا'

جوش کے سو شعر

مرتبہ محمود علی خاں صاحب - قیمت ۴ آنے - ملنے کا پتا - مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی -

اس سلسلے کی کئی کڑیاں پہلے اشاعت پذیر ہو چکی ہیں - اس انتخاب میں یہ جدت کی گئی ہے کہ ایک نظم گو شاعر کی ایسی پانچ نظموں کو یک جا کر دیا ہے جن میں من جملہ ۱۰۰ اشعار ہیں - ہم اس جدت کو بدعت کہہ سکتے ہیں کیونکہ ترتیب میں حسن کلام کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایسی نظمیں ملیں جن میں ۱۰۰ سے کم یا زیادہ شعر نہ ہوں - اس پابندی کی وجہ سے

ان میں صرف ایک ایسی نظم شامل کی جا سکی جو واقعی جوش کی اچھی نظموں میں سے ہے - ہماری مراد 'کسان' سے ہے - اس مجموعہ کو دیکھ کر کوئی انجان جوش کے کمالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا - ہمارے خیال میں نظم گو اور غزل گو شاعروں کے کلام کے انتخاب میں ایک ہی طریقہ استعمال نہیں کیا جاسکتا - امید ہے کہ آیندہ اس کی رعایت نظر انداز نہ کی جائے گی - 'نا خدا'

غالب کے سو شعر

مرتبہ محمود علی خاں صاحب - قیمت ۴ آنے ملنے کا پتا - مکتبہ جامعۂ ملیہ دھلی -

میرزا غالب کے حین حیات میں ان کے پورے دیوان کو کھنگال کر ۱۸ سو اشعار منتخب کیے گیے تھے - اب محمود صاحب نے ان میں سے بھی سو شعروں کو چھانٹ لیا اور حق یہ ہے کہ فی الجملہ اچھا انتخاب کیا — 'نا خدا'

آہ کے سو شعر

مرتبہ پنڈت برج بہادر ایم - اے - قیمت ۴ آنے ملنے کا پتا - مکتبہ جامعۂ ملیہ دھلی —

اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آہ سیتاپوری خوش فکر اور نکتہ رس شاعر ھیں - حسن تغزل کے ساتھ ان کے کلام میں غور و فکر کی کمی نہیں ہے - شعروں کا انتخاب خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے — 'نا خدا'

محمود اور فردوسی

مولانا قاضی عبدالصمد سیوہاروی صاحب - چھوٹی تقطیع - صفحات ۱۱۲ - قیمت آٹھ آنے - مکتبہ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے —

چھ سال قبل عبدالصمد صاحب کے والد ماجد قاضی ظہورالحسن صاحب

نے اسی نام کا ایک رسالہ شایع کیا تھا، جس میں اس الزام و اعتراض کا ازالہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ سلطان محمود غزنوی نے فردوسی کے ساتھ وعدہ خلافی کی - مولف نے اپنے قابل باپ کی کتاب میں بہت سی مفید اور کار آمد باتوں کا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب کی حیثیت بدل سی گئی ہے اور ایک جدید تالیف ہوگئی ہے، اسی لیے لایق باپ نے اپنے ہونہار فرزند کے نام اس کا ہبہ کر دیا ہے - کتاب بے شبہ بہت چھان بین اور تحقیق و تفحص کے ساتھ لکھی گئی ہے - مولف نے نہ صرف اصل الزام کے بے بنیاد ثابت کرنے میں پر زور دلایل پیش کیے ہیں بلکہ فردوسی کے اہم و معتبر سوانح و حالات بھی یکجا جمع کر دیے ہیں -

(چ)

سالنامۂ بزم اردو جامعہ عثمانیہ

مرتبۂ سعادت علی رضوی صاحب بی - اے، صدر بزم اردو -
بڑی تقطیع، صفحات ۹۴ - قیمت بارہ آنے - ملنے کا پتا
معتمد بزم اردو، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے تقریباً ہر شعبے میں ایک علحدہ بزم قایم ہے - ان بزموں کا مقصد طلبہ میں علمی ذوق اور تحریری و تقریری قابلیت پیدا کرنا ہے - شعبۂ اردو کو جامعہ عثمانیہ میں خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیے اور اس کے طلبہ کی بزم کو دیگر بزموں پر خاص امتیاز و تفوق - بزم اردو کے قیام کو چار سال کا عرصہ ہوا ہے - اس قلیل عرصے میں اس نے اپنے لائحہ عمل کے مطابق جو کام کیا ہے وہ لایق تحسین ہے - بزم نے طلبہ میں ادبی ذوق اور تقریری و تحریری

صلاحیت پیدا کرنے کی لایق قدر کوششیں کی ہیں - کئی بین الکلیاتی فی البدیہہ تحریری و تقریری مقابلے منعقد کیے- تحقیقی و تنقیدی مقالے لکھوائے اور ان میں سے بعض کو شایع بھی کیا جس کے لیے بزم کے کار پرداز مستحق مبارکباد ہیں- موجودہ سالنامہ میں طلبہ کے چند تحقیقی و تنقیدی مضامین ہیں جو اچھے خاصے ہیں' کہیں کہیں تحقیق کی فروگزاشتیں ہیں اور تنقید میں صحیح اور صائب رایوں کی کمی نظر آتی ہے' جو طالب علمانہ مشقوں میں لایق در گزر ہیں- ایک مضمون "میر حسن کے استاد" ہے - مضمون نگار نے اس میں میر تقی میر پر ایک اعتراض بڑی دلیری اور بیباکی سے کیا ہے :-

"ان کے (یعنی میر حسن کے) ہم عصر شعرا میں میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے ' مشق سخن از مرزا رفیع می کند ' - جو بالکل غلط ہے - آگے چل کر لکھتے ہیں ' بافقیر نیز آشنا ' معلوم ہوتا ہے کہ یہ آشنائی برائے نام تھی- میر صاحب میر حسن کے حالات سے مطلق آگاہ نہیں تھے یوں ہی سن سنا کر لکھ دیا ہوگا" —

مضمون نگار خود واقف نہیں کہ یہ میر حسن' ایک دوسرے میر حسن ہیں - صاحب مثنوی و تذکرہ نہیں- خود میر حسن نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان کو ایک دوسرا شاعر لکھا ہے اس کے سوا میر نے "بافقیر نیز آشنا" والا فقرہ بھی نہیں لکھا ہے- اگر میر حسن اور میر کے تذکرے مضمون نگار دیکھ لیتے تو ان کے شبہات دور ہوجاتے اور اس قدر وثوق سے میر صاحب پر بیجا نکتہ چینی کرنے کی نوبت نہ آتی-

اس سال نامے کے دیکھنے سے ہمیں ایک بات خاص طور پر کھٹکتی ہے - غیر زبان کے شاعروں پر بعض تنقیدیں ہیں جو بہت ہی بے تکان اور آزاد قلم کی تراوش معلوم ہوتی ہیں - لیکن در اصل یہ انگریزی تنقیدی کتابوں کے اقتباسات یا ان کے خلاصے ہیں جن کو توڑ مروڑ کر اردو میں

منتقل کیا گیا ہے، چنانچہ اس کے آثار "ملٹن اور تقشف" والے مضمون میں خاص طور سے نمایاں ہیں - جب تک ان شاعروں کا کلام اردو میں ہمارے پیش نظر نہ ہو اس وقت تک اس پر آزاد تنقید نگاری کے کیا معنی؟ ایسی تنقیدوں سے تو کہیں بہتر یہ ہے کہ ان کے کلام کے عمدہ اور معیاری نمونے اردو میں منتقل کیے جائیں - اس سے ہماری زبان میں قابل قدر اضافہ ہوگا، غور و فکر کا وسیع میدان ہمارے پیش نظر ہوگا اور ہمارے خیالات میں وسعت پیدا ہوگی - خشک تنقیدوں سے یہ فایدہ کبھی نصیب نہیں ہوسکتا - ہمیں امید ہے کہ بزم کے ارباب حل و عقد اور کار پرداز ہمارے اس دوستانہ مشورے کو غور و تامل سے دیکھیں گے —

(چ)

بچوں کی رباعیاں

یہ محمود اسرائیلی صاحب کی اکتیس رباعیوں کا مجموعہ ہے جو بچوں کے لیے مرتب کیا گیا ہے - اس میں عام مذہبی اور اخلاقی صداقتوں پر زور دیا گیا ہے تا کہ بچوں کی سیرت کی تشکیل اور ان کے اخلاق کی تعمیر پر عمدہ اثرات پڑسکیں - رباعیاں اچھی خاصی ہیں - کہیں کہیں مشکل الفاظ آگئے ہیں جو بچوں کے لیے فہم مطالب میں حارج ہیں مثلاً عکس رعنا بمعنی خوبصورت سایہ؛ مشاطۂ قدرت بمعنی بہار؛ نقش عمل بمعنی عادت وغیرہ - اس دشواری کو دور کرنے کے لیے اخیر میں ایک صفحے پر فرہنگ دے دی ہے - کتاب ایک آنے میں سستی ہے اور مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے — (چ)

تاریخ و سیر

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش —

از خالدہ ادیب خانم- حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات - کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب- قیمت ۲ روپے- ملنے کا پتا مکتبہ جامعۂ ملیۂ اسلامیۂ دھلی

خالدہ ادیب خانم ان معدودے چند خاتونوں میں سے ھیں جنھیں جنسی مساوات اور آزادیٔ نسواں کی تحریکوں کی ناقابل تردید تائید میں پیش کیا جاسکتا ھے - اگر ھم یہ کہیں تو حسن ظن نہ ھوگا کہ دور حاضر کی سب سے بڑی عورتوں میں ان کا نام اول آتا ھے - ان کی ھستی پر صرف ترک یا مسلمان ھی نہیں بلکہ حریت اور آزادی کا ھر پرستار فخر کرسکتا ھے - پیش نظر کتاب ان کے ان توسیعی لکچروں کا مجموعہ ھے جو انہوں نے گزشتہ جنوری اور فروری میں جامعۂ ملیہ میں دیے تھے - جامعۂ ملیہ نے اپنی پوری عمر میں جو سب سے بڑی خدمت انجام دی وہ یہ ھے کہ اس نے اھل ھند کو روؤف بے اور خالدہ ادیب جیسی ھستیوں سے روشناس کرایا - اس کے لیے وہ ملک و قوم کے شکریہ کی مستحق ھے —

خالدہ خانم کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی حامل ھے - اگر ایک طرف وہ جنگ آزادی کے سپاھیوں کی رھبری کر سکتی ھیں تو دوسری طرف انھیں انتظامی معاملات اور تنظیم تعلیمات کا بڑا اچھا سلیقہ ھے - انھیں بیک وقت تقریر اور تحریر دونوں پر حیرت انگیز عبور حاصل ھے- اس کے ساتھ ان کے ذاتی وصف

ایسے ہیں کہ جو ان سے کبھی ملا ان کا گرویدہ ہو گیا —

ان تقریروں میں خالدہ خانم کی ہمہ گیر شخصیت کا پورا عکس موجود ہے - اس آئینے میں ترکی کی تاریخ کا ہر پہلو صاف صاف نظر آجاتا ہے اور اس خوردبین میں مستور حقیقت روشن نظر آتی ہے - یوں تو انہوں نے ترکی کے ہر دور پر تفصیلی نظر ڈالی ہے اور ہر خطبہ ان کے وسیع مطالعے اور قوت فکر پر دلالت کرتا ہے لیکن خاص طور پر وہ ابواب بہت پر مغز اور ٹھوس ہیں جن میں جدید ترکی کا ذکر ہے - بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی اعتقادات کو پس پشت ڈال دیا اور ان معاملات کے بیان میں بھی از حد ضبط و اعتدال سے کام لیا جو ان کے لیے یقیناً ناگوار تھے - تاریخ نگار کے امتحان کی وہ گھڑی بڑی کٹھن ہوتی ہے جب اسے ایک ایسے واقعے کو بیان کرنا پڑتا ہے جس میں وہ خود حصہ لے چکا ہو - ترکی کی تہذیب و معاشرت اور ادبی رجحانوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے پہلے اور آخری ابواب کو چھوڑ کر باقی کتاب ایسی ہے جسے لکھنے کے لیے خالدہ خانم سے زیادہ کوئی اہل نہ ہوسکتا تھا - یہ دونوں باب ایسے اختلافی مسائل سے متعلق ہیں جن پر ان کے دوران قیام میں بڑی بحث ہو چکی ہے - یہ بھی ان تقریروں کی اثر پذیری اور مقبولیت کا ثبوت ہے کہ ان پر ہر زاویۂ نگاہ سے اظہار خیال کیا گیا اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا —

فاضل خطیبہ نے مشرق و مغرب کے متعلق جو کچھ کہا اس کے بعض حصوں کے ماننے میں ہمیں تامل ہے - وہ کہتی ہیں کہ مشرق کی تباہیوں کی وجہ اس کی روح پرستی اور مغرب کی تباہ کاریوں کی وجہ اس کی مادہ پرستی ہے - ایک روح کے بار سے دب گیا اور دوسرا مادے کے بوجھ سے ہلاک ہو رہا ہے - اس سے جو نتیجہ نکالا گیا وہ صحیح نہیں ہے - ان کا خیال ہے کہ مشرق کی روح پروری نے ہی یہاں کے سماج کو جامد بنا دیا - لیکن دوسرا زاویۂ نگاہ یہ کہتا ہے کہ یہاں کے

ساکن اور جامد نظام زندگی نے ھی روح نوازی کا ایسا غلغلہ پیدا کردیا ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر سرزمین میں — عام اس سے کہ اس کے جغرافیہ تعینات شرق میں ہوں یا غرب میں — خاص مادی حالات مخصوص ذہنیتیں پیدا کردیتے ھیں جو مادی تغیرات کے ساتھہ بدلتے رہتے ھیں - مشرق کا نظام زندگی اُنیسویں صدی کے اوائل تک کم و بیش ایک سا رہا - اقتصادی ضروریات کو حاصل کرنے کا طریقہ تقریباً ایک سا تھا اور مال کی تقسیم کے طریقے بھی یکساں ھی رہے - یہی طریقہ کل تک روس اور شمالی امریکہ میں رائج رہ چکا اور کبھی یورپ میں بھی رائج تھا - ان کے حالات بتلاتے ھیں کہ کسانی اور ساملتی دور میں روح نوازی کو ہر ملک میں یہی فروغ حاصل تھا - کسی ملک کے فلسفۂ زندگی کو سمجھنے کے لیے وہاں کے نظام زندگی کو پہلے سمجھنا چاھیے - ہر فلسفہ اپنے ماحول کی پرچھائیں ہے - لیکن خالدہ خانم موضوعی مطالعۂ تاریخ دنیا کو بے حرکت اور ساکن تصور کرتی ھیں اور یہ نہیں سمجھتیں کہ تاریخ کے قوانین کسی تخیلی اخلاق کے پابند نہیں ھیں -

جاپان مشرقی ممالک کا پیشوا ہے لیکن اب اس کی روح بادشاہ اور وطن کے آستانوں کو انسانیت کے لہو سے دھویا کرتی ہے - سوویٹ چین ' روسی ترکستان یا ترکی میں اس روایتی مشرقی روح کا نام و نشان باقی نہیں ہے - مقام عبرت ہے کہ ہزاروں سال کی تہذیب و معاشرت 'مادہ پرستی' کے دھارے میں تنکے کی طرح بہ رھی ہے اور ھماری چیخ پکار اسے غرقاب ہونے سے نہیں بچا سکتی - مگر یہی روح شمالی امریکہ کے ھلوں اور کرگھوں کو اپنا نغمہ سنارھی ہے —

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مشرق کی روح کا اس کے ھلوں اور کرگھوں سے گہرا تعلق ہے اور انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا - مشرق کی روح کو مغرب کے مادے نے پسپا نہیں کیا بلکہ وھاں کی مشین کا مقابلہ یہاں کی تکلی نہ کر سکی - انصاف سے دیکھا جائے تو روح نوازی خیال و عمل کے تضاد کی فلسفہ گری ہے —

مغرب کی تباہ کاریوں کے لیے وہاں کی مادہ پرستی یا میکانکی ذہنیت نہیں بلکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام ذمہ دار ہے جو انسان کو مشین کا غلام بنا رہا ہے مشرق کی روح پروری نے اس نظام کے استبداد کو کم نہیں کیا بلکہ زیادہ مہلک کر دیا اور فاضل خطیبہ نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے - لیکن یہ مظالم بھول کر کچھ اور روح کے اس حسین ترین 'ست جگ' کے مظالم سے بہت کم ہیں جب منو بھگوان نے (جنہیں خالدہ خانم نے ڈاکٹر بھگوان داس کے حوالے سے نقل کیا ہے) شودروں یعنی کسانوں پر روحانی، ذہنی اور جسمانی غلامی کا ایسا بار لاد دیا تھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی - جس ملک میں گایوں اور بادروں کو انسانوں سے زیادہ قابل تعظیم سمجھا گیا، وہ روح نوازی کا معلم اول سمجھا جاتا ہے - خالدہ خانم نے اپنے آخری خطبے میں اس روح اور مغربی مادہ کے امتزاج کو دنیا کی برائیوں کا واحد حل بتلایا ہے - اگر دنیا ترقی کر رہی ہے اور انسان اپنے اضداد پر فتح مند ہو کر ارتقاء کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آیندہ نظام کی بنیاد دو کمتر تہذیبوں کے میل پر رکھی جائے - یقیناً ان میں خوبیاں بھی ہیں اور آئندہ نظام صرف ان کا ہی نہیں بلکہ دنیا کی تمام تہذیبوں کا نچوڑ ہوگا —

یہ ایک بنیادی مسئلہ تھا جس پر ہمیں وضاحت سے اظہار خیال کرنا پڑا - ترکوں کے زوال کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مال پیدا کرنے کی طرف اتنی توجہ نہ کرتے تھے جتنی اسے اڑانے کی طرف - اور ہر عسکریت پسند قوم کی طرح ان میں شروع سے انحطاط کے آثار موجود تھے - فاضل خطیبہ نے اس ضمن میں جو کچھ کہا وہ تشنہ اور غیر تشفی بخش ہے - ہمیں یہ بھی نہ بتلایا گیا کہ اپنے اسلامی اور غیر اسلامی مقبوضات میں ان کی حکومت کا کیا رویہ رہا - کیونکہ صرف عیسائیوں کو ہی نہیں بلکہ عربوں کو بھی ان سے سخت شکایت تھی —

اس نکتہ چینی سے مراد دوسرے نقطۂ نظر کی وضاحت ہے - اس سے ان خطیبوں کی شان پر حرف نہیں آتا - ہم پھر کہتے ہیں کہ ترکی کی تاریخ پر اس بلند معیاری اور وسیع النظری سے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی - ہم ہر ناظر کو اس عظیم الشان علمی کارنامے کی طرف متوجہ کرتے ہیں — "نا خدا"

انقلاب فرانس -

از مولوی عبدالقادر بی - اے (جامعہ) - حجم ۱۱۸ صفحات - کاغذ معمولی - کتابت و طباعت غنیمت - قیمت ۱۲ آنے - ملنے کا پتا ' مکتبہ جامعۂ ملیہ دھلی -

قال نیک ہے کہ ہماری زبان میں سیاسی و تاریخی مضامین پر کثرت سے کتابیں شایع ہونے لگی ہیں خواہ ان میں ابھی یورپین تصانیف کی بالغ نظری اور وسعت علمی پیدا نہ ہوئی ہو لیکن رفتہ رفتہ یہ بیل منڈھے چڑھیگی اور پھر اس شکایت کا موقع بھی نہ رہے گا —

پچھلی مرتبہ اس موضوع پر ایک دوسری کتاب کا ریویو کرتے ہوئے ہم نے جو کچھ کہا تھا وہ اس پر بھی صادق آتا ہے - ان صفحات میں انقلاب فرانس کے واقعات باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ قلمبند کیے گیے ہیں اور سلاست زبان نے انہیں زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے - مولف اچھے واقعہ نویس معلوم ہوتے ہیں لیکن جب وہ سماجی مسائل پر تنقید کرتے ہیں تو عجیب و غریب نتیجے نکالنے لگتے ہیں - کتاب کا آغاز جس جملے سے ہوتا ہے ہمارے خیال میں وہ غلط اور گمراہ کن ہے : " جو مستبد نظام صدیوں سے اہل فرانس کے مصائب کا باعث تھا ' اس کی بنا ایک فلسفہ ' ایک مذہب پر تھی جو بگڑ گیا تھا - اکثر ظلم بگڑے ہوے مذہب سے پیدا ہوتا ہے " - تاریخ کی شہادت اس کے برعکس ہے - کوئی فلسفہ یا مذہب سماجی نظام کی بنا نہیں ڈالتا بلکہ سماج کا ماحول ہر فلسفہ اور ہر مذہب

کو جنم دیتا ہے - فلسفہ یا مذہب میں برائی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ نہ تو وہ سماج کے بہاؤ کو اپنی منشا کے مطابق بدل سکتا ہے اور نہ خود کو اس کے تغیرات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے - ہمیں معلوم نہیں کہ فرانس میں فلسفہ یا مذہب کا وہ کون سا دور تھا جب سماج میں استبداد نہ تھا - اگر کوئی ایسا دور تھا بھی تو وہ صرف اس زمانے میں جب انسان فلسفہ یا مذہب کی نعمتوں سے بیگانۂ محض تھا —

اس قسم کی فروگزاشتیں صرف ان مقامات پر نظر آتی ہیں جہاں مولف پر فلسفیانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے - ورنہ یوں واقعات کو سلجھا کر دکھلانے میں انہوں نے اچھا اسلوب پیدا کیا ہے — 'نا خدا'

دو خدائی خدمت گار -

از مسٹر مہادیو دیسائی - مترجمہ محمود علی خاں صاحب - کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب - حجم ۱۰۰ صفحات - صوبۂ سرحد کا نقشہ اور متعدد سادی تصاویر - قیمت ۱۲ آنے - ملنے کا پتا، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی —

مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سیکریٹری مسٹر مہادیو دیسائی نے صوبۂ سرحد کے نامور رہنما خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان کی سیرت اور سوانح لکھ کر قومی ادب کو فایدہ پہنچایا ہے - خان برادران کے اصولوں سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کے ایثار و خلوص سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا - اپنے ملک کے لیے انہوں نے بڑی قربانیاں کیں اور بہتیرے دکھ جھیلے - یہ ان کی ہی لگن تھی جس نے اہل سرحد میں سیاسی بیداری کی روح پھونک دی، جس نے حکومت کو وہاں بھی رفارم کے نفاذ کے لیے مجبور کر دیا - جس صوبے کے لوگ ہندوستان میں سب سے زیادہ تشدد پسند سمجھے جاتے تھے وہ گاندھی جی

کے سب سے سچے پیرو ثابت ہوے اور انہوں نے عدم تشدد کی راہ میں بڑی سختیاں برداشت کیں - یہ خان برادران کا ہی کرشمہ تھا کہ ان ہونی بات کو صحیح کر دکھایا —

یہ کتاب اس لایق ہے کہ ہر آدمی اسے پڑھے - ترجمے کی عبارت صاف اور سلیس ہے — 'نا خدا'

ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ -

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں - بڑی تقطیع ' صفحات ۲۳ -

یہ مسٹر این سی مہتا - آی - سی - ایس کی اس انگریزی تقریر کا ترجمہ ہے جو موصوف نے ۱۲ نومبر ۳۴ع کو پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ متحدہ کے اجلاس منعقدۂ مظفر نگر کے موقع پر فرمائی تھی —

ہندوستانی تہذیب و تمدن پر اسلام کے بڑے گہرے اثرات پڑے ہیں - ان سب کو علمی و اصولی طریقے پر روشنی میں لانا بہت بڑا اور عظیم الشان کام ہے جس کو کوئی شخص تنہا انجام نہیں دے سکتا - اس کے لیے علما و محققین کی ایک منظم جماعت درکار ہے - مسٹر مہتا نے اس مضمون کا ایک نہایت سرسری خاکہ کھینچ دیا ہے ' جس میں باختصار تمام پہلے اسلام کے آغاز اور اس کی اہم تعلیمات و خصوصیات سے بحث کی ہے - اس کے بعد ان اسلامی اثرات کو بڑی فراخ دلی سے دکھایا ہے جو ہندوستان کی تہذیب اور علوم و فنون پر پڑے ہیں اور جن سے ہندوستانی تہذیب وغیرہ میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی ہے - ان کا طرز بیان مدلل اور دلنشیں ہے - تقریر کا ترجمہ مولوی سبطین احمد صاحب (علیگ) نے کیا ہے اور اچھا کیا ہے — (چ)

ضروری کہانیاں -

مرتبہ قاضی عبدالصمد سیوہاروی صاحب - چھوٹی تقطیع ' صفحات ۷۲ - قیمت چھ آنے - مکتبۂ شرقیہ دہلی سے مل سکتی ہے -

اس میں ہندوستان کی مختلف اقوام کے مشاہیر کی تاریخی کہانیاں جمع کی گئی ہیں - اس کا مقصد یہ ہے کہ " طلبا کو ہندوستانی اقوام کے باہمی حسن سلوک اور ارتباط کا حال معلوم ہو " - ہندوستان کی مروجہ تاریخیں بیشتر اس انداز میں لکھی گئی ہیں کہ جن سے طلبہ کے دل و دماغ تعصب اور باہمی منافرت سے متاثر ہو جاتے ہیں ' اور ہندوستانی بچے ابتدائی عمر ہی سے یہ جذبات دلوں میں پالتے چلے آتے ہیں' جن میں آگے چل کر شدت پیدا ہو جاتی ہے ' جو ملک کی بڑی بد نصیبی ہے - اگر بچوں کو ابتدا ہی سے ایسی تاریخ پڑھائی جائے کہ جس سے باہمی رواداری اور بے تعصبی کا حال معلوم ہو تو آیندہ چل کر وہ ایک دوسرے کی تاریخ پر ہمدردانہ نظر ڈالیں گے اور اِس طرح تعصب و منافرت کے جذبات دھیمے پڑ جائیں گے - اس کام کے لیے خاص قابلیت ' وسعت معلومات اور فنی دقیق النظری کی ضرورت ہے - قاضی صاحب نے یہ شبہہ بہت مبارک پیش قدمی کی ہے ' لیکن اگر وہ تاریخی کتابوں کا زیادہ تحقیق اور محنت سے مطالعہ کرتے تو ان کو زیادہ مستند اور موثر کہانیاں مل جاتیں - اور یہ مواد ان کو کتاب کی دلچسپ تبویب و ترتیب پر مجبور کرتا - موجودہ کتاب میں کہیں کہیں اعلام و سنین کی غلطیاں ہیں' جو طبع ثانی کی نوبت پر ذرا سی تلاش سے دور ہو سکتی ہیں - یہ موضوع زبان و بیان کی دلچسپی اور مواد کے اضافہ و ترقی کے امکانات رکھتا ہے - موجودہ کتاب کی لکھائی چھپائی بھی پسندیدہ نہیں -

(چ)

مذہب و اخلاق

فلسفۂ تعلیم اسلام-

اس کتاب میں اسلام کے ضروری عقائد، یعنی توحید، صفات الہی، رسالت، حشر نشر، ملائکہ، دوزخ و جنت وغیرہ کا بیان اور دلائل عقلی سے ان کے ثبوت پیش کیے گئے ہیں - فاضل مولف نے تالیف کتاب کے دو سبب تحریر کیے ہیں - ایک تو یہ کہ اس کتاب کا لکھنا مولف کے واسطے توشۂ آخرت اور والدین و متعلقین کے لیے ذریعۂ مغفرت ہو اور دوسرے یہ کہ زمانے کی ایک بڑی دینی ضرورت پوری ہو - فاضل مولف کی نیک نیتی میں کچھ کلام نہیں اور عجب نہیں کہ اللہ تعالے اپنی رحمت سے ان کی آرزوے مغفرت قبول فرمائے - لیکن "زمانے کی دینی ضرورت" پوری ہونے میں چند دشواریاں نظر آتی ہیں - لائق مولف علوم دینی میں دستگاہ کے باوصف غالباً جدید علوم مغربی سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے اور اسی لیے نئے تعلیم یافتہ اور ان کی دیکھا دیکھی معمولی اردو خواں اشخاص بھی آج کل جس قسم کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، فاضل مولف کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے - دوسرے کتاب کی عبارت جا بجا اتنی مغلق ہوگئی ہے کہ اس سے معمولی پڑھے لکھے لوگ مشکل سے استفادہ کر سکتے ہیں - ایک معتدل نمونہ ملاحظہ ہو: —

"تخلیق کے معنی ہیں مادہ یا صورت کا عدم ذاتی یا عدم اضافی سے معرض وجود میں لانا اور تسویہ کہتے ہیں اس

تناسل و تناسب اور اس اعتدال جذب کو جو دو مختلف
چیزوں کے درمیان یا ایک جز کے اجزاے ترکیبیہ میں باہم پایا
جاتا ہے تاکہ شے مکونہ معرض وجود میں آنے کے بعد عرصے
تک قائم رہے - اگر یہ ضابطہ خارجی نہ ہوتا تو اشیاے
موجودات کی بقاے شخصی محال ہوجاتی اور ممکن نہ ہوتا
کہ ایک چیز پیدا ہونے کے بعد ایک لمحہ بھی اپنے امتیازات
خصوصی کے ساتھ باقی رہتی - یہی معنی ہیں اشتداد اسر'
کے : نحن خلقنہم و شددنا اسر ہم " —

مولف کو اپنی دشوار نویسی کا شاید خود احساس ہے کہ جا بجا ذیلی حاشیوں میں اپنے مشکل الفاظ کے معنی بھی لکھ دیئے ہیں - لیکن ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آیندہ وہ متن ہی میں ایسے لغات اور پیچیدہ طرز بیان سے احتراز فرمائیں جن کی تشریح کی ضرورت ہو —

کتاب کے اکثر مباحث میں شاہ ولی اللہ (رح) صاحب کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ"، مولانا شبلی مرحوم کی "علم الکلام"، مولانا ابوالکلام کی تفسیر "ترجمان القران" سے مدد لی گئی ہے اور کوئی نئی بات کم تر نظر آتی ہے - بعض بحثیں کافی مدلل' بعض بہت تشنہ پائی جاتی ہیں اور کہیں کہیں ایسے خیالات بھی موجود ہیں جن کی وجہ سے آزاد خیال نوجوان مولوی صاحبان کی ہنسی اڑایا کرتے ہیں —

پوری کتاب ۳۲۸ صفحات پر بہت صاف ستھری چھپی ہے اور دو روپے آٹھ آنے یا (مجلد) تین روپے میں حافظ سید عبداللہ بخاری - بازار چتلی قبر' دہلی کے پتے سے طلب کی جاسکتی ہے — (ھ)

اسلام اور حق خلع —

تالیف ملا عبدالباسط صاحب منصف جالنہ (ضلع اورنگ آباد دکن) - درمیانی تقطیع - صفحات ۷۸ - قیمت ساڑھے آٹھ آنے - مولف کے پتے سے مل سکتی ہے

اس مختصر رسالے میں لایق مولف نے آیات قرآنی، احادیث اور فقہ سے مواد لیا ہے اور اس کی بنیاد پر عورتوں کے حق خلع کی حمایت کی ہے - وہ بیس سال سے اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں - اس بیست سالہ غور و فکر اور تحقیق و تلاش کے بعد انہوں نے مسئلے کے ایک خاص پہلو سے بحث کی ہے - وہ خلع کے مسئلے پر بیوی کے باپ اور بھائی کی حیثیت سے بحث کرنی چاہتے ہیں - انہوں نے اہل علم کو دعوت دی ہے کہ وہ قانون خلع پر شوہرانہ حیثیت کو چھوڑ کر پدرانہ و برادرانہ حیثیت سے نگاہ ڈالیں - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قانون کا تعلق زن اور شوہر دونوں کے ساتھ برابر کا ہے تو شوہرانہ حیثیت سے قطع نظر کرنا اور صرف بیوی کے باپ اور بھائی کی حیثیت ہی سے قانون پر نگاہ ڈالنا کہاں تک جایز ہے؟ اسلامی قانون کے وضع کرنے میں باپ، بھائی، اور شوہر کے خیالات و جذبات کو دخل نہیں ہے بلکہ ان حیثیتوں سے بالاتر رہ کر اس کی تشکیل و ترتیب عمل میں آئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون میں زن و شوہر کے حقوق ایک مکمل توازن کے ساتھ مقرر کیے گئے ہیں - لایق مولف اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ احکام مذہبی میں خلع کے باب میں چارۂ کار موجود ہے لیکن غلط تعبیر سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں - وہ ان احکام کی تشکیل و ترتیب

چاہتے ہیں اور ایک مدون قانون کے نفاذ پر زور دیتے ہیں - جب احکام موجود ہیں تو پھر ان پر بیوی کے باپ اور بھائی کی حیثیت سے نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں- اس یک طرفہ تعبیر سے اسلامی قانون کا اصلی اور صحیح توازن بر قرار نہیں رہ سکتا اور وہ ازدواجی مسائل اسلامی اصول قانون کے منشا کے مطابق حل نہیں ہو سکتے جن سے اس وقت مسلمان دو چار ہیں - بے شبہ یہ صحیح ہے کہ ان احکام کی اصولی تدوین کی جائے اور ان کا نفاذ حکومت کی جانب سے عمل میں آئے، لیکن تدوین کے وقت حیثیتوں کا لحاظ کرنا اصولاً غلط اور اصول قانون اسلامی کے خلاف ہے — (چ)

چالیس حدیثیں —

مرتبہ مولوی خواجہ عبدالحی فاروقی صاحب - چھوٹی تقطیع، صفحات ۴۳ - لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ -قیمت دو آنے، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے-

اس کتابچہ میں تیرہ عنوانوں پر چالیس حدیثوں کو تقسیم کیا گیا ہے - یہ بچوں کے لیے جمع کی گئی ہیں - ان میں آنحضرت صلعم کی وہ دینی اور اخلاقی ہدایات ہیں جو خصوصیت کے ساتھ بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں- بچے اپنی عمر کی ابتدائی منزل میں اگر ان سے واقف ہو جائیں تو ان کے اخلاق و سیرت پر عمدہ اثرات پڑ سکتے ہیں - لائق مرتب نے سلیقے سے تبویب کی ہے - پہلے ہر عنوان کی ایک مختصر تمہید لکھی ہے اس کے بعد آیت قرآنی کو مع ترجمہ پیش کیا ہے

اور اس کے بعد حدیث کو بیان کیا ہے - مضمون کو وضاحت و صفائی کے ساتھ ادا کیا ہے - بچوں کے لیے یہ کتاب مفید ہے —　　(چ)

مسلمان بیبیاں -

مرتبہ اعجاز الحق قدوسی صاحب - چھوٹی تقطیع ، صفحات ۸۸ -

کتابت طباعت وغیرہ اچھی - قیمت چھ آنے -

مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے -

یہ کتابچہ لڑکیوں کے لیے لکھا گیا ہے جس کا مدعا ان کی زندگی کے مذہبی ، اخلاقی اور معاشرتی پہلو کو سنوارنا ہے - اس کے لیے مولف نے صحابیات (رض) کے حالات و سوانح سے خوشہ چینی کی ہے —

کتابچہ کے خاص باب یہ ہیں - توحید ، عبادات اور اخلاق - ہر باب کئی ذیلی عنوانات پر تقسیم ہے - ہر عنوان کے تحت پہلے مولف نے اس کے مضمون کی مختصر سی تمہید لکھی ہے اور اس کی تائید میں صحابیات (رض) کے سوانح سے اہم واقعات اخذ کر کے درج کیے ہیں جو بے شبہ سبق آموز اور قابل تقلید ہیں -

(چ)

متفرقات

اجتماعیت -

از صولت علی خاں صاحب ، کاغذ کتابت و طباعت معمولی - حجم ۴۴ صفحات -

قیمت درج نہیں - ملنے کا پتا - صولت پبلک لائبریری - رام پور - یو ، پی -

اس رسالے کا موضوع مصنف کے الفاظ میں یہ ہے : " بعض قباحتوں

کی بنا پر اسلام جس طرح مغربی جمہوریت کو بعینہ اختیار نہیں کر سکا '
اسی طرح مغربی اشتراکیت کو بھی بعینہ اختیار نہیں کر سکتا - دونوں کی
اصلاح نے کے لیے اسلام نے نظام اجتماعیت اختیار کیا ہے - نماز اور حج سے
جمہوریت کی اور روزہ اور زکواۃ سے اشتراکیت کی اصلاح کی گئی ہے "۔

صاحب مضمون اس اعتبار سے تعریف کے ضرور مستحق ہیں کہ انہوں
نے خواہ مخواہ اسلام اور اشتراکیت کا ڈانڈا ملانے کی کوشش نہیں کی اور
ان جملوں میں اس نکتے کو ظاہر کر دیا جو ان دونوں کے فلسفۂ زندگی
میں مابہ الامتیاز ہے - یعنی جہاں جدید اشتراکیت طبقاتی جنگ کا اعلان
کرتی ہے' اسلام طبقاتی اتحاد ('اجتماعیت') کا مدعی ہے -

رسالہ غیر دلچسپ نہیں ہے — 'ناخدا'

اُردُو کے جدید رسالے

ایشیا —

(ماہانہ رسالہ ' مدیر ساغر نظامی ' ادبی مرکز میرٹھ فی پرچہ آٹھ آنے)

جیسی توقع تھی ساغر صاحب نے یہ رسالہ بڑی شان اور آن بان سے نکالا
ہے - سر ورق سے لے کر آخر تک ہر ورق پر ان کی خوش مذاقی اور نفاست
پسندی کا ثبوت ملتا ہے - تقطیع بھی بہت بڑی ہے جیسی ادبی دنیا کی -
نظم و نثر کے مضامین کے حاصل کرنے میں بھی پوری کوشش کی ہے ' تصاویر
کا بھی انتظام کیا گیا ہے - غرض ہر طرح اسے دلکش اور مفید بنانے کی
سعی کی گئی ہے - مضامین میں تنوع بھی ہے جو ہر مذاق کی دلچسپی

کا سامان ہو سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ رسالہ ساغر صاحب کی ادارت میں اردو زبان و ادب کی خاطر خواہ خدمت کرے گا —

رومان (مصور ماہ نامہ)—

مرتبہ اختر شیرانی اور عاشق بٹالوی۔ چندہ سالانہ ۵ روپے طلبہ سے ۴ روپے۔ کاغذ اچھا۔ کتابت و طباعت اچھی۔ حجم ۹۴ صفحات۔ ملنے کا پتا۔ مینجر رسالۂ رومان۔ لاہور۔

یہ رسالہ گزشتہ مئی سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور گوناگوں ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ ادارے کا نام ہی رسالے کی خوش اسلوبی کی ضمانت ہے۔ پیش نظر اگست نمبر میں نثر اور نظم دونوں کے کئی اچھے مضامین ہیں۔ آئندہ طبعزاد مضامین کے لیے زیادہ جگہ نکالنا چاہیے۔ لائق مدیروں کو ہم یہ مخلصانہ مشورہ دینے کی جسارت کرتے ہیں کہ اردو اخبار نویسوں کی خود نمائی کا تتبع نہ کریں۔ رسالے کی لوح کے لیے یہ شعر ہمیں تعلی آمیز معلوم ہوا :—

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل 'اختر' میں

اختر شیرانی کو ہم اس قسم کی اشتہار بازی سے بلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ اندر بھی ایک ایڈیٹر نے دوسرے کی تعریف میں پورے سوا دو صفحے کا نوٹ لکھا ہے۔ رسالے کو شخصی ادارہ بنانا نا زیبا ہے —

رسالے کا ادبی معیار بہت پاکیزہ ہے اور اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنا چاہیے —

'نا خدا'

کوثر—

بنگلور، صفحات ۳۲، بڑی تقطیع- سالانہ چندہ مع خاص نمبر ایک روپیہ۔

یہ ماہوار رسالہ بنگلور سے جناب محمود خاں محمود کی ادارت میں ستمبر ۳۵ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے- اس کا "مقصد اولین ہندوستانی زبان کی ترقی و اشاعت ہے" - لائق مدیر کا خیال ہے کہ میسور اور جنوبی ہند میں اردو کی نشو و نما کے وہ ذرائع مفقود ہیں جو حیدر آباد، لاہور، دہلی، لکھنؤ وغیرہ کو حاصل ہیں- ان کو حاصل کرنے اور بہم پہنچانے کے لیے وہ چاہتے ہیں کہ مختلف شہروں سے رسالے اور اخبار جاری کیے جائیں- فی الحال ان کو اس کی پروا نہیں کہ رسایل، اخبارات اور تصانیف و تالیفات کا لسانی و معنوی معیار بلند ہو- ان کا خیال ہے کہ اردو اس وقت انقلابی دور سے گزر رہی ہے اس لیے اس میں اگر کوئی افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو مضائقہ نہیں، آیندہ چل کر اعتدال پیدا ہو جائے گا، فی الحال صرف لوگوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کرنی چاہیے—

ان کو اس کا بھی اعتراف ہے کہ اس علاقے کے باشندوں کی زبان نقائص لفظی سے پاک نہیں- اس مسئلے پر انہوں نے بڑی سنجیدگی سے بحث کی ہے- ان کا بیان ہے کہ شمالی ہند کی زبان پر سو سال قبل ایک ایسا ہی دور گزرا ہے جس میں وہ اس علاقے کی زبان کی طرح خامیوں سے پاک نہ تھی- جس طرح وہاں کے ادیبوں نے اسے پاک صاف کیا ہے اسی طرح ہمارا بھی فرض ہے کہ اس کی اصلاح میں خاص اہتمام اور کوشش کریں- فاضل مدیر کا خیال اور رسالے کا مقصد بہت مبارک ہے اگر استقلال سے رسالے کو چلایا جائے تو کامیابی کے امکانات ہیں- رسالے میں عام پسند

علمی اور ادبی مضامین ہیں - افسانے بھی ہیں - نظمیں اور غزلیں بھی ہیں - بہر حال ایک روپیہ سالانہ چندہ میں یہ رسالہ بہت سستا ہے - امید ہے کہ اس کی قدر کی جاے گی — (چ)

مصحف

عمرآباد ' ضلع شمالی ارکاٹ - صفحات ۵۲ ' بڑی تقطیع ' کتابت
طباعت وغیرہ اچھی - سالانہ چندہ تین روپے —

اس ماہوار رسالے کا مقصد بھی کم و بیش وہی ہے جو کوثر کا ہے ' یعنی جنوبی ہند میں اردو کی اشاعت و ترویج - رسالہ ہر حیثیت سے لایق تعریف ہے - رسالے کی بزم میں ہندوستان کے بعض مشہور ادیب اور شاعر ہیں - مضامین علمی ' تاریخی اور ادبی ہیں - ان کا معیار بھی کافی بلند ہے - اگر رسالے کو استقلال سے چلایا جاے تو ترقی کر سکتا ہے ' اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن لایق مدیر شاکر نائطی صاحب کو ' ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنے رسالے میں ایسے مضامین کو جگہ نہ دیں جو ناپسندیدہ اور غیر اہم اختلافی حیثیت رکھتے ہیں ' یا جو محض بہ خیال ندرت لکھے جاتے ہیں - اس سے رسالے کے وقار میں فرق آجاتا ہے - مصحف کے دو ایک نمبروں میں ایسے مضمون ہماری نظر سے گزرے ہیں — (چ)



شاعر -

یہ ماہوار رسالہ حضرت سیماب اکبرآبادی کی ادارت میں آگرہ سے نکلتا ہے - اس کے نام سے ظاہر ہے کہ شعر و سخن کے لیے مختص ہے - اس

میں زیادہ تر نظمیں اور غزلیں ہیں - مشہور شعرا کے کلام پر تنقیدیں ہیں - بہر حال شعر و شاعری کے اکثر مباحث اس رسالے میں درج ہوتے ہیں - فاضل مدیر ملک کے مشہور شاعروں کے کلام پر لفظی ' بیانی ' عروضی اور معنوی اعتبار سے نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود ان کے رسالے میں بعض افسوس ناک غلطیاں رہ جاتی ہیں مثلاً ستمبر کے پرچے میں صفحہ ۴ پر مضاف الیہ کو مضاف علیہ لکھہ دیا ہے - اس صفحے پر " پروانگی ہوی " کو غلط محاورہ بتایا ہے اور میرانیس کے اس مصرعے پر اعتراض کیا ہے : —

" برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوی " - یہ اعتراض محض ناواقفیت کی بنیاد پر کیا گیا ہے ' اس محاورہ کا استعمال عام اور صحیح ہے ' اسے مستند اساتذہ نے استعمال کیا ہے - میرامن دہلوی لکھتے ہیں " بارے جب پروانگی ہوی وزیر حضور میں آیا ' - لایق مدیر کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ تنقیدی مباحث میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کریں اور خاص کر اپنے مضمون نگاروں کی تحریروں کو پہلے تنقیدی نظر سے دیکھہ لیا کریں - رسالہ بہ حیثیت مجموعی بہت اچھا ہے - جو حضرات شعر و شاعری سے ذوق رکھتے ہیں ان کے لیے یہ دلچسپی کا سامان ہے - سالانہ چندہ تین روپے ہے - منیجر شاعر بک ڈپو قصرالادب آگرہ سے مل سکتا ہے — (ج)

کنول -

مرکز اشاعت ' ہیلنگ کی منڈی - آگرہ - ۷۲ صفحات - لکھائی چھپائی وغیرہ اچھی - سالانہ چندہ سوا دو روپے - نمونے کا پرچہ پانچ آنے -

آگرہ سے یہ رسالہ منظر صدیقی صاحب اکبر آبادی کی ادارت میں

جولائی ۳۵ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے - اس کے دس زبردست مقاصد ہیں جن کو بڑی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ان کو باختصار اس طرح درج کیا جاسکتا ہے :—

اردو زبان و ادب کی خدمت ' تقلید و قدامت پرستی کے خلاف احتجاج ' ملک میں اجتہاد و اختراع کی مساعی کو امداد پہنچانا ' فن تنقید اور اصلاح زبان پر تحقیقی و تعمیری مضامین کی اشاعت ' اردو ادب کے شاہکار اور نظم اردو کے "رنگین اور کوثر بار نمونے" پیش کرنا - تہذیب و معاشرت کی اصلاح اور اخلاقی اور علمی پستیوں کو دور کرنے کی "کامیاب جد و جہد" - ایسے افسانوں کی اشاعت جن سے مستقبل روشن اور حال کامیاب نظر آے اور جن میں "جمود و خمود میں بیداری پیدا کرنے والا عنصر غالب ہو" - فلمی مضامین کی اشاعت اور فلمی اردو کی خرابی کی اصلاح - ایشیا کے ادیبوں کی تصاویر اور سوانح حیات کی اشاعت اور ان کی ادبی خدمات پر تبصرے - تصاویر کی اشاعت فنی نقطۂ نظر سے - مشرقی خواتین کے مضامین کی اشاعت تاکہ ان کا مستقبل روشن بن جاے —

فاضل مدیر کے ارادے بہت بلند ہیں خدا کرے کہ وہ باوور ہوں' لیکن ان کے پورا کرنے کا جو سامان انہوں نے کیا ہے وہ اطمینان بخش اور امید افزا نہیں - تاہم رسالے کا معیار کافی بلند ہے مضامین میں بھی تنوع ہے لیکن رسالہ اپنے مقاصد کی خیالی رفعت کے مقابلے میں عملاً بہت پست ہے -

(چ)

فاران —

یہ ماہوار رسالہ بجنور سے نکلنا شروع ہوا ہے - محمد مجید حسن صاحب اس کے مالک ہیں اور سعیدی انصاری صاحب اڈیٹر - اس کا مقصد "ادبی ' تنقیدی ' مذہبی ' اصلاحی ' صنعتی ' سائنٹفک ' ورزشی ' تاریخی ' پولیٹکل " اور " سنجیدہ ' ٹھوس ' پر از معلومات " مضامین " کی اشاعت ہے - رسالہ ۸۰ صفحوں پر چھپتا ہے ' مضامین وغیرہ متنوع اور اچھے خاصے ہیں - سالانہ چندہ تین روپے ہے جو رسالے کی ضخامت کے اعتبار سے بہت کم ہے - مالک رسالہ بجنور (یو پی) سے مل سکتا ہے — (چ)

ادب لطیف —

لاہور کی سر زمین رسالوں کے حق میں بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے ' شاید ہی کوئی منحوس مہینہ ایسا جاتا ہو کہ جس میں کوئی نیا رسالہ جنم نہ لیتا ہو - ادب لطیف ' چودھری برکت علی صاحب کی ادارت میں لاہور سے مارچ ۳۵ ع سے نکل رہا ہے - رسالہ ہو نہار معلوم ہوتا ہے - اس کے قلمی معاونین میں ملک کے مشہور ادیب اور انشا پرداز ہیں - لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے - اشتہارات سمیت ۶۴ صفحوں پر چھپتا ہے - سالانہ چندہ تین روپے - پنجاب بک ڈپو - لوئر مال (۵) - لاہور سے مل سکتا ہے - (چ)



شباب ـــ

یہ ہفتہ وار جریدہ بمبئی سے حکیم محمد علی خاں صاحب دہلوی کی سر پرستی اور جناب قیصر دہلوی کی ادارت میں نکل رہا ہے ' جس میں مذہبی' سیاسی' طبی اور مزاحی مضامین شایع ہوتے ہیں - " اسٹیج یونیور " کے عنوان کے تحت سنیما کے متعلق خاص خاص خبریں درج کی جاتی ہیں - فلم کے ادا کاروں کی تصویریں بھی شایع کی جاتی ہیں - ۲۶ صفحوں پر ہر مہینے چھپتا ہے ' سالانہ چندہ تین روپے ـــ



زنانہ رسالے

صدائے نسواں

یہ رسالہ دہلی سے بیگم صاحبہ مولانا محمد علی مرحوم اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کی سرپرستی اور امتہ الکریم صاحبہ کی نگرانی اور کئی اڈیٹروں کی ادارت میں نکلتا ہے - اس کا نصب العین " اسلامی خدمت ہے ' وہ ہندو عورتوں کو عموماً اور مسلم عورتوں کو خصوصاً موجودہ تہذیبی تصادم کے زمانۂ ابتدا میں پیچ اور خم اور افراط تفریط سے بچاتے ہوے حقیقی تہذیب اسلام اور تہذیب مشرق کی دعوت دیتا ہے " - رسالے کا مقصد بہت اہم اور مبارک ہے ' اس کے کارپردازوں نے اس کا معیار بلند کرنے کی کافی کوشش کی ہے - علمی ' تاریخی' اصلاحی اور صنعتی مضامین کے ساتھ نظموں اور خصوصاً غزلوں کی بھی چاشنی ہے ـــ

سالانہ چندہ دو روپے ہے ' دفتر رسالۂ صدائے نسواں جامع مسجد دہلی سے

مل سکتا ھے — (چ)

خاص نمبر اور سالنامے

رسالۂ ھمایوں کا فرانسیسی ادب نمبر - ستمبر سنہ ۱۹۳۵ ع

۷۰ صفحوں میں پورے فرانسیسی ادب پر تبصرہ کرنا ناممکن بھی ھے اور بے سود بھی - اس سے کیا فائدہ کہ مختلف ادوار اور اشخاص کا سرسری حال لکھہ دیا - اگر ایڈیٹر صاحب رسالہ ھمایوں کو اس کا احساس تھا کہ " ایک ماھوار رسالے کی قلیل ضخامت ایک زبان کی ادبیات کے ھر دور اور ھر مصنف کے کارناموں کا سرسری احاطہ بھی نہیں کر سکتی " تو پھر اس قسم کی کوشش کی ضرورت کیا تھی اس سے زیادہ اچھا یہ ھوتا کہ ھر مہینے میں کسی مشہور فرانسیسی ادیب یا شاعر پر کسی واقف کار شخص سے نقادانہ مضمون لکھا یا جاتا اور مختلف ادبی تحریکوں کے علم برداروں کے انداز بیان اور خیالات کی نفسیاتی خصوصیات بتائی جاتیں تاکہ اردو خوانوں کے علم و ذوق میں اضافہ ھوتا - اس سے کیا حاصل کہ ھر صدی کے مشہور ادیبوں اور شاعروں پر چار چار سطریں لکھہ دیں ' ان کے پیدا ھونے اور مرنے کی تاریخیں بتادیں اور یہ کچھہ نہیں بتایا کہ آخر وہ کہتے کیا تھے 'ورکس ذھنی اور ادبی رجحان کی نمائندگی کرتے تھے - اپنے زمانے سے انھیں کیا تعلق تھا اور زمانے کی رفتار پر انھوں نے اپنی شخصیت کا نقش کس انداز سے چھوڑا؟ غیر زبانوں کے انشا پردازوں اور شعرا کو اردو میں روشناس کرنے والے وہ لوگ ھونے چاھئیں جو ان زبانوں پر پوری قدرت اور ان کے ادب پر گہری نظر رکھتے ھوں - ورنہ اندیشہ اس کا ھے کہ اردوداں طبقہ غیر زبانوں کے ادب سے کہیں بدظن نہ ھو جائے اور اس کو بیکار نہ تصور کرنے لگے - اس طرح ھماری عام بد شوقی اور دوسروں کی طرف سے بے رخی کو اور تقویت

حاصل ہو جائے گی - اس میں اردو خوان طبقے کا کوئی قصور نہ ہوگا - قصور تو ان کا ہے جنہوں نے غیر زبانوں کی دلچسپ چیزیں دل پذیر انداز میں ان کے سامنے پیش نہیں کیں ہمارے خیال میں " بزم ہمایون " والوں کا فرض تھا کہ اس کام کی ذمہ داری کو محسوس کرتے اور یہ کام ان لوگوں سے کراتے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں - خالی ناموں کی فہرستیں لکھہ دینے سے لوگوں کو دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی - ہوتا یہ ہے کہ بالعموم لوگ نامانوس ناموں کو پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے ہیں اور چونکہ مضمون نگار اُن کے ذہنی نشوونما کے لیے کسی قسم کا مسالا تو بہم پہنچاتا نہیں اس لیے وہ غیر زبانوں کے ادب سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور اس کے متعلق غلط رائے قایم کر لیتے ہیں —

فرانسیسی ادب کے مختلف عہدوں پر جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ ناقص اور تشنہ ہے - مثال کے طور پر یہاں میں صرف انیسویں صدی کو لیتا ہوں جس کے متعلق میری دانست میں انگریزی زبان میں بھی اچھا خاصا مسالا مل سکتا تھا - ایک مضمون کا عنوان ہے " فرانسیسی شاعری اور رومانی تحریک " - اس تحریک کے علم برداروں کی جو فہرست دی ہے اس میں لامرتین (Lamartine) کا کہیں ذکر تک نہیں حالانکہ ہیوگو کے بعد اس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے - اس کی ہمہ گیر طبیعت نے سیاست اور ادب دونوں پر اپنا اثر چھوڑا - اس کی پر جوش اور طوفان خیز شاعری رومانیت کا اعلی ترین نمونہ پیش کرتی ہے - خود ہیوگو کی شاعری کے جو نمونے " وکٹر ہیوگو کی چند نظمیں " کے عنوان سے دیے گئے ہیں وہ اس کی صناعی کی پوری نمائندگی نہیں کرتے - پھر جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ بالکل بے مزہ اور روکھا پھیکا ہے - فرانسیسی ادب کی رومانی تحریک کے شاہکار " لے مزرابل "

(Les miserables) کا کہیں ذکر ہی نہیں حالانکہ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ موجود ہے اور ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ اس سے عام طور پر واقف ہیں۔

بودلیر (Baudlaire) کے متعلق عجیب و غریب خیال ظاہر کیا گیا ہے (ص ۴۷۵) کہ " وہ نہ مصور شاعر تھا اور نہ حسین اشیاء کو تلاش کرنے والا " - حالانکہ اس کے بالکل برعکس بودلیر فرانسیسی ادب میں ایک نئی تحریک کا بانی ہے جسے تمثیل نگاری (Symbolism) کہتے ہیں - اس تحریک کی خصوصیت خاصۃ جمال پرستی اور اسرار نگاری سمجھی جاتی ہے - بودلیر کی حسن پرستی کی کوئی انتہا نہیں - وہ غلاظت اور تعفن، تاریکی اور جہالت، بدی اور گناہ میں بھی عارض حسن کی جھلک دیکھنے کا خوگر تھا - یہ تحریک بعد میں فرانس میں خوب پھلی پھولی - مالارمے (Malarme)، ورلین (Verlaine)، ریمبو (Rinbaud) اور موجودہ زمانے میں پال ویلری (Paul Valery) اس کے بہترین نمائندے ہیں - اس تحریک کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ حسن کا روح انسانی کے ساتھ ایسا چھپا ہوا تعلق ہے کہ جسے بیان کرنے سے زبان قاصر ہے - اس لیے ضروری نہیں کہ اُن باتوں کو صاف زبان میں کہنے کی کوشش کی جائے جو بیان میں نہیں آسکتیں - ان کے لیے تو رمز و اشارہ کی زبان زیادہ موزوں ہے - چنانچہ اس تحریک کے حامی جو کچھ کہتے ہیں "در حدیث دیگراں" کہتے ہیں - بادی النظر میں ان کے انداز تحریر میں تسلسل کلام کی کمی نظر آتی ہے لیکن اگر بار بار پڑھا جائے اور غور کے ساتھ پڑھا جائے تو ایک قسم کا ربط پنہانی معلوم ہونے لگتا ہے - ان کے ہاں نفس انسانی مرکز کائنات ہے اور شاعر کا کام یہ ہے کہ نفس کے الجھے ہوئے تاروں کے ارتعاشات نغمہ کی شکل میں پیش کر دے، چاہے دنیا والوں کو وہ مجذوب کی بڑ ہی کیوں نہ معلوم ہو - مالارمے کی نظمیں

مجذوب کی بڑ ہیں - رومانی تحریک بھی یورپ کی ادبیات میں ایک بغاوت تھی اس واسطے کہ اس کے ذریعے اصناف ادب میں زندگی کے جوش و ہیجان اور جذبات و احساسات کو ظاہر کیا گیا جس نے کلاسکی اصول پر سخت ضرب لگائی - لیکن تمثیل نگاری (Symbolism) کی تحریک بہ نسبت رومانیت زیادہ انقلاب انگیز ثابت ہوئی - اس نے عروض و قواعد اور تسلسل کلام کی پابندیوں سے اپنے تئیں آزاد کر لیا - ان کی صناعی کا اظہار اتنا ہی اُلجھا ہوا ہے جتنا کہ نفس انسانی کے تاروں کا اُلجھاو - ویلیری نے اپنی صناعی کا نظریہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے - "خیال شعر میں اسی طرح چھپا رہنا چاہیے جس طرح پھل میں اس کی غذائیت - پھل کی اصل چیز غذائیت ہے لیکن بظاہر وہ ایک مزہ دار چیز معلوم ہوتی ہے - آدمی کا احساس اس کے مزے تک محدود ہے لیکن اس کے جسم کو اس کی غذائیت (Nutritive virtue) سے نشو و نما ملتی ہے" —

سمبولسٹ کے نزدیک شعر ایک راز ہے جسے برسر بازار فاش نہ ہونا چاہیے- جب حسن پرستی بوالہوسوں کا شیوہ بنے تو "اہل نظر" کو چاہیے کہ اپنی آبرو بچانے کے واسطے عام روش سے ہٹ کر اپنے طریق میں کوئی وجہ امتیاز پیدا کریں- اسی لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں پر اسرار طور پر کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں قبول عام حاصل نہیں ہوا - وہ جو زبان بولتے ہیں اسے عوام سمجھ ہی نہیں سکتے- ان کی قدر دانی اہل ذہن (Intellectuals) کے خاص طبقے تک محدود رہی اور ہے - ان کے نزدیک ادب کی بقا اور ابدیت ایک خاص شکل میں ممکن ہے جس کا اظہار ویلری نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے - وہ کہتا ہے - "ہر بڑے صناع کی تمنا ہوتی ہے کہ مستقبل کے لیے کوئی چیز چھوڑ جائے- اسے وہ بقا اور دوام سمجھتا ہے- لیکن زمانے

کے تھپیڑوں کا مقابلہ دشوار ہے - اگر کسی کی تصنیف زمانے کے دھارے پر ڈگمگاتی پھرتی رہے بجائے اس کے کہ غرق ہو جائے تو سمجھ لو کہ اُس حالت سے بالکل بدل گئی ہوگی جس حالت میں مصنف نے اسے چھوڑا تھا - ہر تصنیف اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک کہ اس میں یہ صلاحیت باقی رہے کہ اصل مصنف کے منشا کے خلاف اس سے مطلب نکل سکیں - اس کا وجود اس کے مطالب کے تغیر میں مضمر ہوتا ہے - اسے اس وقت تک زندہ سمجھیے جب تک کہ اس میں تاویلوں کی گنجائش ہے ...... لوگوں کو ہمیشہ مثالوں ' دلیلوں ' نظیروں اور بہانوں کی ضرورت رہے گی - دراصل بہترین تصنیف وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ عرصے تک اپنے پر اسرار طلسم کو قایم رکھ سکے - مدتوں لوگ اسی شش و پنج میں رہیں کہ اس میں کوئی راز کی بات ہے بھی یا نہیں " —

سمبولزم کی ادبی تحریک کے علاوہ ہمایوں کے " فرانسیسی ادب نمبر " میں کہیں پروست کا نام تک نہیں آیا جو اُنیسویں صدی کے اواخر کا بہت بڑا ادیب گزرا ہے - اس کا اثر جدید فرانسیسی ادب پر اس قدر گہرا ہے کہ اُنیسویں صدی کے ادب کا تبصرہ مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی اہمیت کو پورے طور پر واضح نہ کیا جائے - زولا کی فطرت پرستی اور لے کونت دے لیل اور دوسرے اہل پرناس (Parnasse) کی نازک خیالی نے انیسویں صدی کے فرانسیسی ادب میں نئے مسلک قائم کر دیے - ان کے متعلق کہیں ذکر ہی نہیں - ڈراما نگاروں کو بھی بالکل چھوڑ دیا گیا - فرانسوا کوپے (Francois Coppe)' روستاں (Rostand)' آنری بک (Henri Becque) فرانسوا کیورل (Francois Curel)' میربو (Mirbau)' پورت ریش (Porte -Riche) وغیرہ کا ذکر اس قسم کے تبصرے میں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -

جن ادبا اور شعرا پر تبصرہ کیا گیا ہے وہ اس قدر تشنہ ہے کہ ہمیں اسے پڑہ کر افسوس بھی ہوا اور تعجب بھی - اس قسم کے تبصروں سے دراصل لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے اور فائدہ کچھہ بھی نہیں ہوتا - اردو زبان کے سرمایے میں اس قسم کے سرسری تبصروں اور مطالعوں سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا - اردو کی ترقی کے لیے اس کی یقیناً ضرورت ہے کہ غیر زبانوں کی ادبیات کو روشناس کیا جاے لیکن سلیقے کے ساتھہ - ہمارے ادب کی ترقی کا بڑی حد تک انحصار اس پر ہے کہ غیر زبانوں کے ادبی شاہکاروں کو اردو میں منتقل کیا جاے لیکن یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے - یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی زبان کے ادب سے واقفیت رکھنے کے علاوہ دوسری زبانوں پر قدرت اور ان کی ادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں - ان ترجموں سے ہمارے ادبی سرمایے میں اضافہ ہو سکتا ہے نیز ان کے ذریعے ہمارے انشا پردازوں اور شعرا کو یہ معلوم ہوگا کہ دوسروں کے ہاں کیا کچھہ ہے جسے وہ اپنا سکتے اور اپنی زبان کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں — (ی)

———:o:———

نیرنگ خیال کا مشرق نمبر —

مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب - حجم ۱۷۵ صفحات - قیمت ۱۲ آنے - کاغذ، اچھا - کتابت و طباعت نفیس - ملنے کا پتا منیجر نیرنگ خیال - بھاٹی روڈ لاہور

نیرنگ خیال اردو کا سب سے مقبول اور جدت آفریں ماہنامہ ہے - اردو میں سب سے پہلے اسی نے خاص نمبروں کا رواج چلایا اور اب تو ہر رسالہ

' عام ' نمبروں کی بہ نسبت ' خاص ' نمبر زیادہ نکالنے میں اپنی سرخروئی سمجھتا ہے

اس نمبر کو مرتب کرنے میں ذوق و اکتساب دونوں سے کام لیا گیا ہے ۔ ملک کی زندگی کے مختلف شعبوں پر اچھے اچھے مضامین جمع کیے گئے ہیں - ایشیا کے مذاہب ' ... اور سیاسی تحریکوں پر معیاری مقالے شایع کیے گئے ہیں - آرٹ کی کئی کئی تصویریں رسالے کی زینت بڑھا رہی ہیں - یہ نمبر ایشیا کی ہینڈ بک کا کام دے سکتا ہے - ہر صاحب نظر کو چاہیے کہ اس رسالے کو فروغ دینے کی کوشش کرے -

قاضی نذرالاسلام کی جن نظموں کے تراجم "اردو" کے اپریل نمبر میں شایع ہوئے تھے ان میں سے ایک اس نمبر میں بلا حوالہ درج کر دی گئی ہے - حسن طلب کا یہ انداز اچھا نہیں ہے —

' ناخدا '



سال نامۂ مجلۂ کابل

مجلۂ کابل اپنا سال نامہ ہر سال خاص اہتمام سے شایع کرتا ہے اور سال بسال ترقی کرتا جاتا ہے - اس سال کا سالنامہ خاص اہمیت رکھتا ہے - بڑی تقطیع کے تقریباً سوا پانسو صفحات پر چھپا ہے - بے شمار تصاویر ' نقشے ' جدولیں وغیرہ ہیں - کاغذ اور کتابت بھی بہت ہی اعلیٰ اور پاکیزہ ہے - انجمن ادبی کابل کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اس کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے - اس سال نامے کے پہلے حصے میں افغانی سیاسیات اور نظم مملکت سے بحث کی گئی ہے - پہلے حکومت کے اساسی اصول بیان کیے ہیں اس کے بعد حکومت کی تنظیم کو بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے - حکومت کے مختلف شعبوں کا نام بنام ذکر کیا ہے ' وزراء اور عہدہ داروں کے وظائف و فرائض بتائے ہیں - موجودہ عہدہ داروں کے نام اور مختصر حالت درج کیے ہیں اور ان کی تصویریں شایع کی ہیں - اس کے

بعد ملکی تقسیم سے بحث کی ہے۔ صوبہ واری تقسیم کو پیش کیا ہے ۔ حکومت کے تعمیری اور رفاہی کاموں کا ذکر کیا ہے ۔ ایک طویل مقالہ افغانستان کی زبانوں پر ہے ۔ جس میں تاریخی و علمی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے ۔ ایک مضمون جغرافیانی و اقتصادی حالات پر ہے ۔ تجارتی و معاشی مسائل و حالات پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے ۔ اس کے بعد ایک مضمون میں جدید اختراعات کا ذکر کیا ہے جو ترقی یافتہ ممالک میں ہوئی ہیں ۔ یورپ کے تمام ممالک پر ایک ایک مضمون ہے جس میں وہاں کے معاشی اور سیاسی وغیرہ حالات و واقعات کو جامعیت کے ساتھ قلم بند کیا ہے ۔ علمی مضامین میں ہیئت کی تاریخ پر ایک مضمون ہے ۔ ایک بڑی طویل جدول بھی دی ہے جس میں دنیا کے تمام مشہور شہروں کے طول البلد اور عرض البلد درج کیے گئے ہیں ۔ غرض یہ سال نامہ گراں قدر معلومات سے پر ہے اور بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے جس کے لیے انجمن ادبی کابل مستحق مبارک باد ہے ۔　　(چ)



نظام گزٹ (سالگرہ نمبر) —

نظام گزٹ حیدرآباد کا یہ نمبر اعلیٰ حضرت خسرو دکن کی سالگرہ مبارک کی تقریب سے شایع ہوا ہے ۔ شروع میں حضرت اقدس و اعلیٰ اور صاحبزادگان والا تبار کا کلام معجز نظام ہے ۔ اس کے بعد مختلف شعرا کا کلام ہے ۔ بعض تاریخی اور علمی مضامین ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق کسی نہ کسی طرح ذات ہمایونی اور سلطنت آصفیہ سے ہے ۔ مضامین اور نظموں وغیرہ کے اعتبار سے یہ نمبر خوب ہے ، لیکن افسوس ہے کہ کاغذ ، کتابت اور طباعت بہت معمولی ہے ۔ اعلیٰ حضرت خسرو دکن اور شہزادگان بلند اقبال اور شہزادیان ہمایوں فال کی مختلف پانچ تصویریں ہیں جن سے رسالے کی شان دوبالا ہو گئی ہے ۔　　(چ)

رہبر نسواں (سالگرہ نمبر)

رہبر نسواں دہلی کا یہ سالگرہ نمبر مئی اور جون ۳۵ ع کے دو مشترک نمبروں پر مشتمل ہے - مطبوع مضامین وغیرہ کے اعتبار سے یہ نمبر اچھا ہے - البتہ کاغذ اور کتابت وغیرہ قابل تعریف نہیں - چند تصاویر بھی ہیں —

(چ)

دوسری زبانوں کے رسالے

ہنس

(ہنس لمیٹیڈ کا ماہانہ رسالہ - اڈیٹر منشی پریم چند
وکنہیا لال منشی صاحب - ۱۱۱ اسپلینڈ روڈ بمبئی
قیمت سالانہ چھہ روپے)

یہ رسالہ خاص اہتمام اور مقصد سے شایع کیا گیا ہے - شان نزول اس کی یہ ہے کہ گزشتہ اپریل میں اندور میں ہندی کانفرنس ہوئی - مہاتما گاندھی جی اس کے میر مجلس تھے - وہاں مشہور ادیب کنہیا لال منشی کی تحریک، مہاتما جی کی سرپرستی اور دیگر حضرات کی تائید سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ ہر صوبے میں جو خاص خاص لوگ اپنی اپنی زبان میں کام کر رہے ہیں ان میں ہندی زبان کے ذریعے سے اتحاد پیدا کیا جائے اور ہندی زبان کی ترقی اور اشاعت میں ان کی امداد حاصل کی جائے - اس غرض کے حصول کی خاطر ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ارکان کنہیا لال منشی صاحب، گری دھر شرما صاحب اور ہری ہر شرما صاحب تجویز کیے گئے اور اس کمیٹی کو یہ اختیار دیا گیا کہ حسب ضرورت وہ دوسروں کو بھی شریک کر سکتی ہے - چنانچہ اس کا پہلا کام یہ ماہانہ رسالہ ہے - اس کا مقصد یہ

ہے کہ ہر صوبے کے ادیب اس میں مضامین لکھیں جو ہندی زبان میں ڈھال کر درج رسالہ کیے جائیں گے - ہر صوبے میں جو ادبی تحریکات یا مساعی عمل میں آرھی ھیں ان کا ذکر ہوگا - صوبہ واری ادبیات کی تاریخ اور نشو و نما ' صوبہ واری زبانوں کی بہترین نظمیں مختلف زبانوں کے شعرا اور ادیبوں کا ذکر خیر ' صوبہ واری ادبیات اور تہذیب کا تقابل ' ان زبانوں کا بہترین ڈراما ' ان کا بہترین مختصر فسانہ ' ان زبانوں کی کتابوں پر تبصرہ ' ان زبانوں کے رسالوں کے اقتباسات مع ہندی کے ترجمے کے : صوبہ واری زبانوں کے بہترین ناولوں کا خلاصہ : ہندوستان کے لیے ایک رسم الخط کی ضرورت پر بحث مباحثہ وغیرہ ہوگا - یہ اس رسالے کے خاص مباحث ہوں گے - اس کے ذریعے سے تمام صوبوں کے ممتاز ادیبوں ' ادبی انجمنوں اور قومی مطابع کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ سب مل کر اس مقصد کی تائید کریں اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کریں - چنانچہ ان کی دعوت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آرھی ھیں - اس کے سرپرستوں اور حامیوں کا یہ خیال ہے کہ دس یا بیس سال کے عرصے میں ہندوستان کی ایک قومی زبان اور ایک رسم خط ہو جائے گا - ہندی نے گزشتہ دس بارہ سال کے عرصے میں جو ترقی کی ہے اسے دیکھتے ہوئے ان کا دعوی کچھ بیجا نہیں معلوم ہوتا —

یہ رسالے کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اڈیٹری کے لیے منشی پریم چند اور کانھیا لال منشی جیسے نامور ادیب ملے ھیں - ابتدا میں یہ رسالہ پریم چند صاحب کا تھا اور کئی سال تک انہیں کی ادارت میں نکلتا رہا اور اب مذکورۂ بالا تجویز کے تحت اسے ایک باقاعدہ کمپنی کا رسالہ بنا لیا گیا ہے اس کی حیثیت ذاتی نہیں رھی بلکہ قومی اور ملکی ہو گئی ہے —

اس نئی حیثیت میں اس کا پہلا نمبر اکتوبر میں شایع ہوا - ابھی اس میں کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی ہندی اردو کے جیسے اوسط درجے کے رسالے ہوتے ھیں

ویسا ھی یہ بھی ھے - لیکن یہ توقع کی جاتی ھے کہ اسے بہت جلد فروغ ھوگا اور جن مقاصد کو مد نظر رکھہ کر شایع کیا گیا ھے اُن کے حاصل کرنے میں ضرور کامیابی ھوگی کیونکہ ایک بڑی سر بر آوردہ جماعت اس کی پشتی پر ھے - مہاتما گاندھی کی راے اس رسالے کے متعلق یہ ھے : —

" ھنس ھندوستان بھر میں انوکھا پریتن (سعی) ھے یدی ھندی انھوا (یا) ھندوستانی کو راشٹر بھاشا (قومی زبان) بننا ھے تو ایسے ماسک (ماھانہ) کی آوشکتا (ضرورت) ھے - پرتیک (ھر ایک) پرانت (صوبہ) کی بھاشا میں جو لیکھہ لکھے جاتے ھیں اس کا پری چے (تعارف) راشٹر بھاشا دوارا (کے ذریعے) سب کو ملنا چاھیے - بہت خوشی کی بات ھے کہ اب ایسا پری چے دل چاھے ان کو ھنس دوارا پرتی ماس (ھر مہینے) آدھے روپے میں مل سکے گا " —
